۳۱۰ سوالات کے جوابات

فتاویٰ افکارِ اسلامی

تصنیف

ڈاکٹر حافظ محمد شہباز حسن کاہلوں

شعبہ علوم اسلامیہ انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور

مقدمہ

شیخ الحدیث حافظ عبدالستار الحماد

تقدیم

مفتی ابوالحسن مبشر احمد ربانی

نظرثانی

مولانا محمد ارشد کمال

مکتبہ افکارِ اسلامی

۳۱۰ سوالات کے
جوابات
فتاویٰ افکارِ اسلامی
تصنیف
ڈاکٹر حافظ محمد شہباز حسن کاہلوں
شعبہ علوم اسلامیہ، انجینئرنگ یونیورسٹی، لاہور
مقدمہ
شیخ الحدیث حافظ عبدالستار الحماد
تقدیم
مفتی ابوالحسن مبشر احمد ربانی
نظر ثانی
مولانا محمد ارشد کمال
www.KitaboSunnat.com
مکتبہ افکارِ اسلامی

نام کتاب ---------------------- فتاویٰ افکار اسلامی

تصنیف ---------------------- ڈاکٹر حافظ محمد شہباز حسن کاہلوں

نظر ثانی ---------------------- مولانا محمد ارشد کمال

ناشر ---------------------- مکتبہ افکار اسلامی

اشاعت ---------------------- اکتوبر 2012ء

قیمت ----------------------

مکتبہ اسلامیہ

بالمقابل رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ پاکستان فون: 042-37244973 فیکس: 042-37232369

بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد۔ پاکستان فون: 041-2631204, 2034256

E-mail:maktabaislamiapk@gmail.com

دار الفکر الاسلامی گلی نمبر 3 مین بازار نواب آباد واہ کینٹ فون: 0321-5216287

انتساب

استاذِ محترم ڈاکٹر حافظ عبدالرشید اظہر شہید رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۷ مارچ ۲۰۱۲ء) کے نام کہ جن کی علمی ترغیب وتحریض کی بنا پر راقم الحروف اس مقام پر پہنچا۔

اور

بحر العلوم حافظ عبدالمنان نور پوری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۲۶ فروری ۲۰۱۲ء) کے نام کہ جنہوں نے علم وتقویٰ کی نئی روشن مثال قائم کی۔

فہرست

عرضِ مؤلف (سپاس نامہ)

سب حمد اللہ تعالیٰ کی ہے جس نے یہ کتاب لکھنے کی توفیق عطا کی۔ یہ تالیف بنیادی طور پر اُن فتاویٰ پر مشتمل ہے جو جولائی ۲۰۰۰ء سے نومبر ۲۰۱۰ء (دس سال چار ماہ) تک ماہنامہ دعوۃ التوحید اسلام آباد میں شائع ہوتے رہے۔ جب اِن فتاویٰ کو کتابی شکل میں مرتب کیا گیا تو اِن میں حک و اضافہ بھی کیا گیا۔ اکیسویں صدی عیسوی کے پہلے عشرے میں شائع ہونے والے اِن سیکڑوں فتویٰ جات میں نئی صورتِ حال اور نئے تقاضوں کے پیشِ نظر بعض الفاظ کو تبدیل بھی کیا گیا ہے۔ ۲۰۱۲ء کا ایک فتویٰ، جو مزاروں پر گھوڑوں اور شیروں وغیرہ کے مجسموں سے متعلق ہے، بھی اس کتاب میں شائع کر دیا گیا ہے۔

اس کتاب میں دیگر علماء کے بعض فتاویٰ بھی شامل کیے گئے ہیں جو مجلّہ دعوۃ التوحید کے باب الفتاویٰ میں شائع ہوئے تھے۔ مثلاً روزوں سے متعلق شیخ محمد بن صالح عثیمین رحمہ اللہ کے فتاویٰ، فرسٹ لیڈی سے متعلق محترم ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ کا فتویٰ، سود سے متعلق ڈاکٹر فضل الرحمٰن مدنی (ہندوستان) کے بعض جوابات وغیرہ۔

مکمل کتاب کا مسودہ چند جید علمائے کرام کو پیش کیا گیا، علمائے کرام نے بعض جوابات میں نظرِ ثانی کرنے کی رائے دی۔ معتبر علماء کی آراء کی روشنی میں کچھ فتاویٰ میں نظرِ ثانی بھی کی گئی ہے، راقم الحروف کا اب وہی مؤقف ہے جو اِس کتاب میں درج ہے، لہٰذا اس سلسلے میں مجلّہ دعوۃ التوحید کا حوالہ دینے کی بجائے اس کتاب کا حوالہ دیا جائے۔ جزاکم اللہ خیرا

سپاس نامے میں مَیں سب سے پہلے مجلّہ دعوۃ التوحید اسلام آباد کے مدیرِ اعلیٰ محترم حافظ مقصود احمد حفظہ اللہ کا شکر گزار ہوں کہ جن کی ادارت میں یہ فتاویٰ مجلّہ میں طبع ہوئے اور وہ عموماً اِن پر نظرِ ثانی بھی کرتے رہے۔

حافظ عبدالستار الحماد ﷾ نے مقدمہ جبکہ مولانا مبشر احمد ربانی ﷾ نے تقدیم تحریر کی۔ راقم ان علمائے کرام کا بھی شکریہ ادا کرتا ہے۔

میں محترم بھائی محمد ارشد کمال ﷾ کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے کمال ذمے داری سے کتاب کی نظر ثانی کی، بعض مقامات پر مفید اضافے بھی کیے اور روایات کی تخریج و تحقیق میں بھرپور حصہ ڈالا۔ جزاهم الله خيرا

آخر میں علمائے کرام اور قارئین سے التماس ہے کہ اِس کتاب کی اصلاح اور بہتری کے لیے اپنی قیمتی آراء سے ضرور مطلع کیجیے۔ تمام معقول تجاویز نہ صرف فراخدلی سے قبول کی جائیں گی بلکہ آئندہ اشاعت میں شکریے کے ساتھ انہیں کتاب کی زینت بھی بنایا جائے گا۔ ان شاءاللہ

ڈاکٹر حافظ محمد شہباز حسن کاہلوں

مدرس شعبہ علوم اسلامیہ

انجینئرنگ یونیورسٹی، لاہور

۵ رمضان المبارک ۱۴۳۳ھ (۲۵ جولائی ۲۰۱۲ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

الحمد لله صاحب الجلالة والصلوة والسلام على خاتم الرسالة۔

اللہ تعالیٰ نے اس عالم رنگ وبُو میں جن وانس کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ یکسوئی کے ساتھ اس کی عبادت کریں اور عبادت کرتے وقت اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں، اور عبادت صرف چند ایک مراسمِ عبودیت بجالانے کا نام نہیں بلکہ بندۂ مسلم کا ہر وہ کام جس کی بجا آوری سے اللہ رب العزت خوش ہو عبادت کہلاتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے وسائل معلوم کرنے کے لیے ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں ہے کیونکہ آپ ہی ہمارے اور ہمارے پروردگار کے درمیان ایک مستند نمائندہ کی حیثیت رکھتے ہیں، ہمیں صرف رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کن کن کاموں کی بجا آوری سے خوش ہوتے ہیں اور وہ کون کون سے کام ہیں جن کے ارتکاب سے وہ ناراض ہوتے ہیں، بندوں کو اس کی اطلاع دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے وحی کا سلسلہ جاری کیا ہے جو قرآن اور اس کے بیان پر مشتمل ہے، رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اللہ کی وحی سے آگاہ کرنے کے لیے کئی ایک طریقے استعمال فرمائے، ان میں سے ایک کامیاب اور کارگر طریقہ سوال و جواب کا ہے، چنانچہ اکثر طور پر دینِ اسلام کی بنیادی باتوں کی تعلیم سوال و جواب کی صورت میں دی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے از خود اس امت کو یہ انداز اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَسْـَٔلُوٓا۟ أَهْلَ ٱلذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴾ (١٦/ النحل: ٤٣)

''اگر تمہیں کسی بات کا علم نہ ہو تو اہلِ ذکر سے پوچھ لیا کرو۔''

اس قرآنی ہدایت کے بعد صحابہ کرام کو اگر کسی دینی مسئلہ میں مشکل پیش آتی تو سرخیل اہل ذکر جناب رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کرتے، قرآن کریم نے یَسْئَلُوْنَكَ کے انداز سے ایسے کئی ایک مسائل کی نشاندہی کی ہے جو صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیے اور اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ذریعے ان کے جوابات دیئے۔ کتب حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے بے شمار ایسے فتاویٰ منقول ہیں جو آپ نے صحابہ کرام کے سوال کرنے پر ارشاد فرمائے۔ ان کی تفصیل امام ابن قیم رحمہ اللہ کی مایہ ناز تالیف اعــــلام الـموقعين عن رب العالمين میں دیکھی جاسکتی ہے، جسے نواب صدیق حسن خان نے ''فتاویٰ امام المتقین'' کے نام سے فارسی میں ترجمہ کر کے الگ سے شائع کر دیا تھا، رسول اللہ ﷺ اللہ کی طرف سے اس کی نازل کردہ وحی کے ساتھ فتویٰ دیتے تھے اور آپ کے فتاویٰ الفاظ کے اعتبار سے مختصر اور احکام ومعانی کے لحاظ سے بڑے پُر مغز اور جامع ہیں۔ اگر کسی مسئلہ میں فتاویٰ نبویہ میسر ہوں تو کسی کو ان سے روگردانی کا حق نہیں ہے، اگر کسی سوال کا جواب دینے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے پاس وحی کا علم نہ ہوتا تو آپ خاموش رہتے اور وحی کا انتظار کرتے، امام بخاری نے اپنی صحیح میں ایک عنوان یوں قائم کیا ہے: رسول اللہ ﷺ نے کوئی مسئلہ اپنی رائے یا قیاس سے نہیں بتایا۔

(صحیح بخاری، الاعتصام، باب نمبر۸)

امام بخاری رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے جب کسی چیز سے متعلق سوال کیا جاتا جس کے متعلق کوئی وحی نہ اتری ہوتی تو آپ فرماتے: مَیں نہیں جانتا، یا وحی اترنے تک خاموش رہتے اور کچھ جواب نہ دیتے، پھر آپ نے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ سے روح کے بارے میں سوال ہوا تو آپ خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا حتی کہ روح کے متعلق وہ آیت (نمبر۸۵) اتری جو سورۃ الاسراء میں ہے۔

(صحیح بخاری، التفسیر: ۴۷۲۱)

اسی طرح ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ کرۂ ارض میں کون سا خطہ بہتر

اور کون سا بدتر ہے تو آپ نے فرمایا: ''مَیں نہیں جانتا۔'' فرشتۂ وحی سے معلوم کر کے بتاؤں گا، چنانچہ فرشتہ وحی لے کر نازل ہوا تو آپ نے سائل کو جواب دیا۔

(مستدرك حاكم، ص: ٧، ج٢)

رسول اللہ ﷺ کے بعد آپ کے صحابہ کرام بھی فتویٰ دینے میں بہت احتیاط کرتے اور جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرتے تھے، چنانچہ امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ کا یہ قول بیان کیا ہے:

مَیں نے مسجد نبوی میں ایک سو بیس صحابہ کرام کا دیدار کیا، فتویٰ دینے میں ان حضرات کے احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش ہوتی کہ اس کے بجائے کوئی دوسرا افتاء کے فرض سے عہدہ برآ ہو۔ (اعلام الموقعین، ص: ٦٤، ج١)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ سوالات کا جواب دینے میں لوگوں کی تین اقسام حسبِ ذیل ہیں:

☆ وہ صرف قرآن و حدیث اور اقوالِ صحابہ کی روشنی میں جواب دیتے ہیں، اگر اُن کے پاس کتاب و سنت پر مبنی کوئی دلیل نہیں ہوتی تو خاموشی اختیار کرتے ہیں۔

☆ جب ان کے پاس کوئی دلیل ہوتی ہے تو اس کے مطابق جواب دیتے ہیں بصورت دیگر وہ اشباہ و نظائر پر غور و خوض کر کے عقل و قیاس سے جواب دیتے ہیں، یہ دونوں اقسام قابلِ ستائش اور لائقِ تعریف ہیں۔

☆ قرآن و حدیث پر غور و فکر کرنے کے بجائے اپنی رائے اور عقل استعمال کرتے ہوئے وہ فرضی مسائل کے ڈھیر لگا دیتے ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں اس آخری قسم کی تردید کی ہے۔

(فتح الباری، ص: ٣٥٧، ج: ١٣)

چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان یوں قائم کیا ہے:

محض رائے زنی اور خواہ مخواہ قیاس کرنے کی مذمت کا بیان۔

(صحيح بخاری، الاعتصام، باب نمبر: ٧)

امام بخاری رحمہ اللہ نے خواہ مخواہ قیاس کرنے کو درج ذیل آیت میں داخل قرار دیا ہے:

"تم ایسی بات نہ کہو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔" (۱۷/ الاسراء: ۳۶)

اس امر کی وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ قیاس کے منکر نہیں البتہ ان کے نزدیک وہ قیاس قابلِ مذمت ہے جو شرعی نص کے مقابلہ میں ہو اور اس کے استعمال میں ضرورت سے زیادہ وسعت ہو۔ اگر اصل، فرع، حکم اور علت واضح ہیں تو اس قسم کا قیاس قابلِ تعریف ہے چنانچہ آپ نے اس سلسلہ میں ایک عنوان اس طرح قائم کیا ہے:

"ایک معلوم امر کو دوسرے واضح امر سے تشبیہ دینا جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے تاکہ سائل سمجھ جائے۔"

(صحیح بخاری، الاعتصام، باب نمبر:۱۲)

دراصل ہمارے ہاں کچھ حضرات نے قرآن وحدیث کے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگانے کے لیے ایک چور دروازہ کھولا ہے اور انہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ زندگی کے مسائل لامحدود ہیں جبکہ قرآن وحدیث کی نصوص کا دائرہ اتنا وسیع نہیں کہ ان سے تمام مسائل زندگی حل کیے جائیں، اس بنا پر عقل وقیاس کا سہارا لینا از بس ضروری ہے، اس بنا پر انہوں نے فقہ الرائے کو رواج دیا ہے، ہمارے ہاں داخلِ نصاب کتبِ فقہ اسی فکری بنیاد پر لکھی گئی ہیں لیکن امام بخاری کا دعویٰ ہے کہ کتاب وسنت میں زندگی کا ہر مسئلہ موجود ہے البتہ اسے تلاش کرنا ہمارا کام ہے لیکن فقہ الرائے کے حاملین نے اس کٹھن کام پر مغز ماری کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی بلکہ کتاب وسنت کے متوازی الگ ایک فقہ کا دروازہ کھول دیا جس کی بنیاد قیاس محض اور خالص رائے زنی پر ہے۔ پھر قیاس کے بے دریغ استعمال سے ایسی ایسی مفروضہ صورتیں سامنے لاتے ہیں جنہیں پڑھ کر انسان مارے شرم کے اپنا سر جھکا لیتا ہے اور سوچتا ہے کہ یہ کون سے اسلام کی ترجمانی کی جارہی ہے اور مسائلِ زندگی حل کرنے کے لیے یہ انوکھا طریقہ کہاں سے دستیاب ہوا ہے؟ اللہ تعالیٰ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی قبر کو جنت کا باغیچہ بنائے اور ان پر اپنی ان گنت رحمتیں نازل فرمائے کہ انہوں نے اس امت کے مفتیانِ کرام کو عقل وقیاس کی خار دار وادیوں سے بچا کر کتاب وسنت سے تمسک کے راستے ان کے سامنے وا کیے ہیں، چنانچہ انہوں نے اپنی صحیح میں ایک عنوان یوں قائم کیا ہے:

وہ احکام جو دلائل سے معلوم کیے جاتے ہیں نیز دلالت کا معنی اور اس کی تفسیر کیا ہے۔ (بخاری، الاعتصام، باب نمبر: ٢٤)

اس عنوان کے بعد امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے گھوڑوں کے احکام بیان فرمائے کہ گھوڑے تین طرح کے لوگوں کے لیے ہیں، ایک شخص کے لیے ان کا رکھنا باعثِ ثواب، دوسرے کے لیے پردہ پوشی کا سبب اور تیسرے کے لیے وبالِ جان ہیں۔ پھر آپ سے گدھوں کے متعلق سوال ہوا تو درج ذیل آیت کریمہ کی طرف راہنمائی فرمائی:

﴿ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ ﴾ (٩٩/ الزلزال: ٧)

''جو ایک ذرہ برابر بھلائی کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا۔''

اس حدیث کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے ایک خاص چیز کے حکم کو عام کے تحت داخل فرمایا ہے، یہ بھی کتاب وسنت سے تمسک کی ہی ایک صورت ہے، اس قسم کی دلالت کو دلالتِ شرعی کہتے ہیں۔ اس کے بعد امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک دوسری حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک عورت نے سوال کیا کہ حیض سے فراغت کے بعد غسل کیسے کیا جائے تو آپ نے فرمایا کہ ''مشک لگا ہوا روئی کا ایک ٹکڑا لے کر اس سے پاکی حاصل کر۔'' اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس سے کیسے پاکی حاصل کروں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس سے پاکی حاصل کرو۔'' اس نے پھر عرض کیا: یارسول اللہ! میں اس سے پاکی کیسے حاصل کروں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس سے پاکی حاصل کر۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی منشا کو معلوم کرلیا چنانچہ میں نے اس عورت کو اپنی طرف کھینچ کر اسے طریقہ سکھا دیا۔ (بخاری، الاعتصام: ٧٣٥٧)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اللہ کی عطا کردہ عقل وبصیرت سے رسول اللہ ﷺ کی غرض کو سمجھ گئیں کہ اس سے آپ کی مراد یہ ہے کہ وہ اسے اپنے بدن پر پھیر کر اُس سے پاکی حاصل کرے، چنانچہ ایک دوسری حدیث میں اس کی وضاحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حیا کی وجہ سے منہ دوسری طرف کرلیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسے بتایا کہ مشک لگا ہوا رُوئی کا ٹکڑا لے کر جہاں جہاں خون کے نشانات ہیں وہاں لگا دو تا کہ ناگواری کے اثرات ختم ہو جائیں۔

(بخاری، الحیض: ۳۱٤)

حافظ ابن حجر ﷫ لکھتے ہیں کہ سوال کرنے والی عورت کو اِس بات کا علم نہ تھا کہ خون کے نشانات پر خوشبودار روئی کا ٹکڑا پھیرنا وضو کہلاتا ہے، جبکہ اس کے ساتھ خون اور ناگواری کا ذکر ہو، رسول اللہ ﷺ نے حیاداری کی وجہ سے صراحت نہ کی لیکن حضرت عائشہ ؓ نے اپنی عقل و بصیرت کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کی مراد کو سمجھ لیا اور اسے بتا دیا جس کی رسول اللہ ﷺ نے اپنی خاموشی سے تائید کر دی۔ اس قسم کی راہنمائی کو دلالتِ عقلی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (فتح الباری، ص: ٤٠٥، ج: ١٣)

امام بخاری نے عنوان میں دلالت کے معنیٰ اور اس کی تفسیر کا ذکر کیا تھا، تفسیر کا معنی یہ ہے کہ مکلّف و مامور کو جو حکم دیا گیا ہے اس کی تشریح کر دی جائے تاکہ وہ ایسا عمل کر سکے جیسا کہ حضرت عائشہ ؓ نے درج بالا حدیث میں لفظ "توضئی" کی وضاحت کی ہے۔

امام بخاری ﷫ اس عنوان سے فقہ الرائے کے بجائے فقہ الحدیث کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن و حدیث کی نصوص سے احکام معلوم کرنے کے کئی ایک طریقے ہیں، محدثین کرام نے عام طور پر چار طریقوں کی نشاندہی کی ہے جو حسب ذیل ہیں:

☆ نص کی عبارت ہی اس حکم کو بیان کرتی ہو، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ﴾ (٢٢/ الحج: ٣٠)

"جھوٹی بات سے اجتناب کرو۔"

اس نص کی عبارت سے ہی پتہ چلتا ہے کہ جھوٹی گواہی دینا حرام ہے۔ اسے عبارۃ النص کہتے ہیں۔

☆ نص کے الفاظ میں کوئی اشارہ ملتا ہو جس سے کوئی دوسرا حکم ثابت ہوتا ہو، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ (٣/ آل عمرٰن: ١٥٩)

"آپ اُن سے مشورہ کریں۔"

اس عبارت میں اشارہ ہے کہ امتِ مسلمہ میں مجلسِ مشاورت ہونی چاہیے، جس سے

اہم معاملات میں مشورہ کیا جا سکے، اسے اشارۃ النص کہا جاتا ہے۔

☆ ایک مسئلہ میں نص کا حکم کسی دوسرے حکم کی طرف از خود راہنمائی کرے، جیسا کہ والدین کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ ﴾ (١٧/ الاسراء: ٢٧)

''انہیں اُف تک نہ ہو۔''

والدین کو اُف نہ کہنے کے امتناعی حکم میں ایک دوسرے حکم کی راہنمائی موجود ہے کہ والدین کو مارنا پیٹنا بالاولیٰ حرام ہے، اسے فقہی اصطلاح میں دلالۃ النص کہا جاتا ہے۔

☆ نص کے الفاظ کسی ایسے معنی کا تقاضا کریں جسے تسلیم کیے بغیر نص کا مفہوم متعین نہ ہو سکے، مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ ﴾ (٤/ النساء: ٢٣)

''تم پر مائیں حرام ہیں۔''

اس تحریم سے مراد حرمتِ نکاح ہے، اسے تسلیم کیے بغیر نص کا معنی متعین نہیں ہوتا، اسے اقتضاء النص کہا جاتا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا منشا یہ ہے کہ احکام کے اثبات کے لیے رائے زنی یا قیاس کا بے دریغ استعمال درست نہیں بلکہ اگر کسی خاص حکم کے لیے کوئی نص نہیں ملی تو اُسے عمومی طور پر کسی دوسری منصوص چیز کے حکم میں داخل کیا جا سکتا ہے، اس اسلوب و انداز میں فقہائے کرام کے لیے راہنمائی ہے کہ وہ بھی فتویٰ دیتے وقت ان اصولوں کو مدنظر رکھا کریں چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> امام بخاری کے قائم کردہ عنوان سے پتہ چلتا ہے کہ رائے کی دو اقسام ہیں؛ ایک رائے مذموم کہ مسائل کے استنباط و اثبات میں خواہ مخواہ عقل و قیاس سے کام لیا جائے اور دوسری رائے محمود، اس سے وہ عقل و بصیرت مراد ہے جس کے ذریعے ہم رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال سے بذریعہ عبارت و اشارہ احکام و مسائل ثابت کرتے ہیں، استنباطِ احکام کے اصول و ضوابط اس قسم کی

رائے محمود کے تحت سرانجام پاتے ہیں۔ (فتح الباری، ص: ٤٠٤، ج: ١٣)

دینِ اسلام میں منصبِ افتاء انتہائی اہم ذمہ داری ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ قرآنِ مجید میں خود اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ ۖ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ ﴾ (٤/ النساء: ١٢٧)

''(اے پیغمبر!) لوگ آپ سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں، آپ فرما دیں کہ اللہ تمہیں ان کے متعلق فتویٰ دیتا ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ علامہ ابنِ قیم رحمہ اللہ نے اپنی مایہ ناز اور بلند پایہ تصنیف کا نام اعلام الموقعین عن رب العالمین رکھا ہے، یعنی مفتی حضرات سے جب دینی مسائل دریافت کیے جاتے ہیں تو اُن کا جواب دیتے وقت گویا وہ اللہ رب العزت کی طرف سے دستخط کرتے ہیں، علامہ موصوف لکھتے ہیں:

> جب ملوک وسلاطین کی طرف سے دستخط کرنے کا منصب اس قدر بلند ہے کہ اس کی قدر ومنزلت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور دنیا میں اسے اعلیٰ مرتبہ شمار کیا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دستخط کرنے کی عظمت وشان تو اس سے کہیں زیادہ بلند اور برتر ہے۔ (اعلام الموقعین، ص: ١٠، ج: ٦)

چونکہ فتویٰ کا موضوع اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ احکام بیان کرنا ہے تاکہ لوگ ان کے مطابق عمل کر سکیں، اس لیے مفتی کو اللہ تعالیٰ کا ترجمان قرار دیا جاتا ہے۔

بہرحال مفتی کو فتویٰ دیتے وقت کتاب وسنت اور اقوالِ صحابہ کو سامنے رکھنا چاہیے، اسے رائے عقل وقیاس کی خارداروادیوں میں مارا مارا پھرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے، اس بنا پر مفتی کو قرآنی احکام پر پورا پورا عبور ہونا چاہیے اور ذخیرۂ احادیث پر بھی اس کی گہری اور وسیع نظر ہو، علاوہ ازیں اسے مجتہدانہ بصیرت سے مالا مال ہونا چاہیے تاکہ ہر پیش آمدہ مسئلے کا حل قرآن وحدیث اور اس کے اشباہ ونظائر کے مطابق پیش کر سکے نیز وہ کسی حالت میں بھی ان حقائق سے صرف نظر کر کے محض اقوالِ ائمہ اور آراءِ رجال کی روشنی میں فتویٰ نہ دے کیونکہ وہ

کسی خاص فقہ یا امام کا نمائندہ نہیں بلکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کا جانشین ہے جیسا کہ علامہ شاطبی فرماتے ہیں:

مفتی امت میں رسول اللہ ﷺ کا قائم مقام ہوتا ہے کیونکہ علماء حضرات، انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث ہیں اور انبیاء علیہم السلام نے ترکہ میں درہم و دینار نہیں چھوڑے بلکہ انہوں نے بطورِ وراثت علم چھوڑا ہے۔

(الموافقات، ص: ٢٤٤، ج:١)

اس طرح مفتی تبلیغ احکام میں رسول اللہ ﷺ کا نائب ہوتا ہے جیسا کہ آپ کا ارشاد ہے:

''آگاہ ہو جاؤ، جو لوگ حاضر ہیں وہ ان لوگوں کو احکام پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔'' (بخاری، العلم، ١٠٥)

مفتی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں فقہی جمود و تعطل کے بجائے وسعتِ قلبی اور فراخ دلی ہو، کیونکہ مسائلِ زندگی میں عوام کو سہولت صرف اس صورت میں مل سکتی ہے جب وہ جمود سے پاک اور اسلاف کے علمی ذخیرہ سے تعصب کے بغیر استفادہ کرنے کا قائل و فاعل ہو۔

الحمدللہ! مفتیانِ اہلِ حدیث کے فتاویٰ مذکورہ بالا خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں اور وہ اپنے فتاویٰ کی بنیاد قیل و قال اور آراءِ رجال کے بجائے ہمیشہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ پر رکھتے ہیں، اس کے علاوہ وہ صحابہ کرام اور اسلافِ امت کے فتاویٰ کو بھی نظر انداز نہیں کرتے، ان کے ہاں کسی خاص مکتبِ فکر کی فقہ پر زور نہیں ہوتا نیز اُن میں شخصیت پرستی اور اکابر پرستی کا دُور دُور تک کوئی نشان نہیں ملتا چنانچہ اہلِ حدیث علماء کے درج ذیل فتاویٰ میں مذکورہ بالا امتیازات کی جھلک نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہے:

☆ فتاویٰ نذیریہ از شیخ الکل سید نذیر حسین محدث دہلوی
☆ فتاویٰ اہلِ حدیث از مجتہد العصر حافظ محمد عبداللہ محدث روپڑی
☆ فتاویٰ ثنائیہ از شیخ الاسلام ابوالوفاء مولانا ثناء اللہ امرتسری

☆ فتاویٰ علمائے اہلِ حدیث از شیخ الحدیث ابوالحسنات علی محمد سعیدی
☆ فتاویٰ ستاریہ از علامہ ابو محمد عبدالستار بن عبدالوہاب دہلوی
☆ فتاویٰ سلفیہ از متکلمِ اسلام مولانا محمد اسماعیل سلفی
☆ فتاویٰ برکاتیہ از مولانا ابوالبرکات احمد بن محمد اسماعیل۔

اسی طرح حال ہی میں شائع ہونے والے درج ذیل فتاویٰ ہیں:

☆ فتاویٰ صراطِ مستقیم از مولانا علامہ محمود احمد میرپوری
☆ احکام و مسائل از محدث العصر حافظ عبدالمنان نور پوری
☆ فتاویٰ ثنائیہ مدنیہ از شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ مدنی
☆ ''آپ کے مسائل اور ان کا حل'' از مولانا ابوالحسن مبشر احمد ربانی
☆ فتاویٰ علمیہ از علامہ حافظ زبیر علی زئی
☆ فتاویٰ اصحاب الحدیث جسے راقم الحروف نے مرتب کیا ہے، اس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں، تیسری زیرِ طباعت اور چوتھی زیرِ ترتیب ہے۔

زیرِ نظر ''فتاویٰ افکار اسلامی'' بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہے، جو مسلکِ سلف کا ترجمان ہے، اس کا ایک ایک فتویٰ کتاب و سنت اور فہم سلف پر مبنی ہے، اسے ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر حافظ محمد شہباز حسن حفظہ اللہ نے مرتب کیا ہے۔ دراصل یہ فتاویٰ ماہنامہ ''دعوۃ التوحید'' اسلام آباد میں شائع ہونے والے سوالات و جوابات کا مجموعہ ہے جسے فاضل مؤلف نے نئی فقہی ترتیب کے ساتھ قارئین کرام کے لیے پیش کیا ہے، یہ فتاویٰ کتاب و سنت کے دلائل سے مزین ہے، اندازِ بیان انتہائی سادہ مگر پُرکشش اور سہل ہے، اس فتاویٰ کے حسبِ ذیل چند بڑے بڑے عناوین سے اس کی اہمیت و افادیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

☆ توحید رب العالمین ☆ شرک وخرافات ☆ ایمانیات
☆ القرآن وتفسیر القرآن ☆ سجدۂ تلاوت کے احکام ومسائل
☆ فقہ الحدیث ☆ رسالت وسیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم
☆ ایمان واسلام اور کفر ☆ سنت وبدعت

☆ مسجد کے احکام و مسائل ☆ طہارت اور وضو
☆ اذان ☆ نماز جمعہ
☆ نماز جنازہ کے مسائل ☆ رمضان المبارک اور روزہ
☆ حج کے احکام و مسائل ☆ قربانی کے احکام و مسائل
☆ ذبح کرنے کے مسائل ☆ شکار کے مسائل
☆ حدود و تعزیرات ☆ نکاح کے مسائل
☆ طلاق کے احکام و مسائل ☆ خواتین کے مخصوص مسائل
☆ خرید و فروخت اور حلال و حرام کے مسائل
☆ اصلاحِ عقائد و اعمال اور رسومات ☆ گناہانِ کبیرہ
☆ اسلامی آداب و اخلاق ☆ تصویر و طن

ان عنوانات کے تحت زندگی سے متعلق بے شمار مسائل ہیں، جن کا کتاب و سنت کی روشنی میں حل پیش کیا گیا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤلف کے علم و عمل میں برکت اور قلم و بیان میں مزید روانی عطا فرمائے نیز انہیں اُپنے ہاں اجرِ جزیل عطا فرمائے۔ (آمین یارب العالمین)

وصلی اللہ علی نبیہ محمد و اٰلہ و اصحابہ اجمعین۔

۲۵ رمضان ۱۴۳۳ھ — طالب الدعوات

۱۴ اگست ۲۰۱۲ء — ابو محمد عبد الستار الحماد

بروز منگل — مرکز الدراسات الاسلامیۃ

سلطان کالونی میاں چنوں

0300-4178626

تقدیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله الذی وفق و سدد من شاء من عباده لابراز الحق و ابداء ہ و الکشف عن مکنون عقود اللآلی بعد خفائه و صلی الله علی عبده ورسوله محمد و اٰله و اصحابه السالکین علی الصراط المستقیم المخالفین لأعدائه و سلم تسلیما کثیرا، أما بعد

شرعی علم اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، جس کی بنا پر انسان اپنے خالق و مالک، الٰہ و معبود کی پہچان کر سکتا ہے اور اس کے اوامر و نواہی کی پابندی کر کے اس کی رضا و رغبت کو پا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو جہالت کی تاریکیوں سے نکالنے کے لیے اپنے انبیاء و رسل علیہم السلام مبعوث کیے جنھوں نے اپنی اپنی قوموں کو کفر و شرک اور معصیت و گمراہی کے اندھیاروں سے نکالنے کے لیے شب و روز مسلسل محنت شاقہ کی۔ انہیں اللہ کی وحی سے حاصل کردہ علم سے روشناس کرایا اور سب سے آخر میں اپنے آخری نبی سید الاولین والآخرین، شفیع الموحدین والمذنبین، رحمۃ للعالمین محمد ﷺ کو بھیجا، جنھوں نے وحی الٰہی کو لوگوں تک مکمل صحیح صورت میں پہنچایا اور جب آپ اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے تو اس شرعی علم کو آگے پہنچانے کا بارِ گراں امت کے علماء کے کندھوں پر آن پڑا اور وہ علماء انبیاء کے صحیح طور پر وارث اور جانشین ہیں جنھوں نے قرآن و سنت کے علم پر مبنی باتیں اور اعمال لوگوں تک پہنچائے اور اپنی وراثتِ علمی کو سنبھالا۔

اس امت کی راہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے بے شمار علماء، فقہاء، محدثین، مفسرین وغیرھم پیدا کیے جنھوں نے شبانہ روز محنت و جانفشانی سے لوگوں کی راہنمائی کی اور ان کے پیش آمدہ مسائل کا حل قرآن و سنت کے چشمہ صافی سے پیش کیا اور امت کی اصولی و فکری راہنمائی کی۔

انہوں نے کتاب و سنت سے لبریز متعدد کتب، شروحات، تفاسیر وغیرہ تالیف کیں۔

عقائد واعمال پر مشتمل ان مٹ نقوش اس دنیا میں چھوڑے۔ جب تک یہ دنیا رنگ و بُو کا عالم قائم ہے علمائے حق یہ فریضہ سرانجام دیتے رہیں گے۔

لوگوں کے سوالات کے صحیح جوابات پر مشتمل کئی ایک اہلِ علم وقلم کے فتاویٰ جات منصۂ شہود پر آچکے ہیں، جیسا کہ عصر حاضر میں استاذ العلماء حافظ عبدالمنان نور پوری رحمہ اللہ کے ''احکام و مسائل''، حافظ عبدالستار الحماد حفظہ اللہ کا ''فتاویٰ اصحاب الحدیث''، راقم الحروف کی کتاب ''آپ کے مسائل اور ان کا حل قرآن و سنت کی روشنی میں''، استاذِ محترم مفتی محمد عبیداللہ خان عفیف حفظہ اللہ کا ''فتاویٰ محمدیہ'' وغیرھا۔

اور اسی سلسلہ مروارید کی کڑی ڈاکٹر حافظ محمد شہباز حسن حفظہ اللہ و رعاہ و صانہ من کل تلهف و تأسف کا ''فتاویٰ افکارِ اسلامی'' ہے۔ جو کہ مسلسل کئی سالوں سے ماہنامہ ''دعوۃ التوحید'' اسلام آباد میں عوام الناس کے سوالوں کے جوابات پر مشتمل ہے۔ راقم الحروف نے اس فتاویٰ کو چند ایک مقامات سے دیکھا ہے اور بعض مقامات پر کچھ تخریج میں حصہ ڈالنے کی کوشش بھی کی ہے۔

الحمدللہ یہ فتاویٰ بھی اسلاف کے نکتہ نظر کی بہترین راہنمائی کرتا ہے اور کتاب وسنت کے دلائل وبراہین کے ساتھ مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ زبان و بیان میں سلاست اور چاشنی سے لبریز ہے۔ اہلِ علم حضرات کا فقہ المسائل میں بسا اوقات اختلاف بھی ہو جاتا ہے جس سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے۔ بڑے بڑے علماء بعض اوقات کئی تفردات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن کتاب وسنت کے دلائل آنے پر رجوع کرنا بھی اہلِ حق کی شان ہے۔

اللہ تعالیٰ حافظ صاحب کے علم عمل، عمر، رزق، مال، گھربار اور تمام امورِ زندگی میں برکاتِ کثیرہ اور انواراتِ غزیرہ نازل فرمائے اور انہیں دینِ حنیف کے لیے کام کرتے رہنے کی توفیق عطا کیے رکھے اور ان کے فتاویٰ کو نجات کا ذریعہ اور وسیلہ بنائے۔ اور صالحین کے ساتھ الحاق فرمائے۔ آمین۔

خادم العلم و أهله: ابو الحسن مبشر احمد ربانی عفا الله عنه

رئیس مرکز الحسن/۸۸۲ سبزہ زار لاہور

توحید باری تعالیٰ

’توحید‘ کا تذکرہ قرآن وحدیث میں

سوال بعض لوگوں کے سامنے جب اللہ تعالیٰ کی توحید بیان کی جاتی ہے تو وہ چڑتے ہیں، بعض تو یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ تم نے توحید توحید کی رٹ لگائی ہوئی ہے جبکہ قرآن و سنت میں توحید کا لفظ بھی نہیں آیا۔ کیا قرآن وحدیث میں لفظ ’’توحید‘‘ استعمال نہیں ہوا؟

جواب توحید دین اسلام کی اساس ہے۔ توحید کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کو ایک قرار دینا، ایک کو عربی زبان میں واحد اور احد کہا جاتا ہے۔ جبکہ احد اور واحد اللہ تعالیٰ کے الاسماء الحسنیٰ ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝﴾ (۱۱۲/الاخلاص:۱)

’’کہیے کہ اللہ ایک ہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ کے الواحد ہونے کا تذکرہ درج ذیل آیات میں ہے:

① ﴿ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝﴾ (۱۲/یوسف:۳۹)

’’بھلا کئی جدا جدا رب اچھے یا یکتا و بڑا غالب اللہ؟‘‘

② ﴿قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝﴾ (۱۳/الرعد:۱۶)

’’کہہ دو کہ اللہ ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا اور وہ یکتا و غالب ہے۔‘‘

③ ﴿وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝﴾ (۱۴/ابراہیم:۴۸)

’’وہ سب یگانہ اور بڑے زبردست کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے۔‘‘

④ ﴿وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝﴾ (۳۸/ص:۶۵)

’’اللہ یکتا و بڑے غالب کے سوا کوئی معبود نہیں۔‘‘

⑤ ﴿هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝﴾ (۳۹/الزمر:۴)

’’وہی اللہ یکتا، بڑا غالب ہے۔‘‘

⑥ ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝﴾ (۴۰/المؤمن:۱۶)

’’آج کس کی بادشاہت ہے؟ اللہ کی جو اکیلا اور بڑا غالب ہے۔‘‘

بہت ساری آیات میں اللہ تعالیٰ کے ’’اللہ واحد‘‘ ہونے کا تذکرہ ملتا ہے، چند آیات

ملاحظہ کریں:

﴿ وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ﴾ (۲/البقرۃ:۱۶۳؛ ۱۶/النحل:۲۲)

﴿ إِنَّمَا اللَّهُ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ﴾ (۴/النساء:۱۷۱)

﴿ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ﴾ (۵/المائدۃ:۷۳)

﴿ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ﴾ (۶/الانعام:۱۹؛ ۱۶/النحل:۵۱)

﴿ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ﴾ (۱۸/الکھف:۱۱۰؛ ۲۱/الانبیاء:۱۰۸؛ ۴۱/حٰم السجدۃ:۶)

﴿ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ﴾ (۲۲/الحج:۳۴)

﴿ إِنَّ إِلَٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ﴾ (۳۷/الصفٰت:۴)

﴿ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا ﴾ (۹/التوبۃ:۳۱)

کفار و مشرکین توحید الٰہی سے بدکتے تھے، جبکہ انبیاء و رسل علیہم السلام لوگوں کو اللہ کی وحدانیت کی طرف بلاتے تھے اور اپنے ماننے والوں کو بھی توحید کا پرچار کرنے کی تلقین کرتے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْآنِ وَحْدَهُ وَلَّوْا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ نُفُورًا ﴾

(۱۷/بنی اسراءیل:۴۶)

''اور جب تم قرآن میں اپنے رب یکتا کا ذکر کرتے ہو تو وہ بدک جاتے ہیں اور پیٹھ پھیر کر چل دیتے ہیں۔''

﴿ وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ ﴾

(۳۹/الزمر:۴۵)

''اور جب تنہا اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان کے دل منقبض ہو جاتے ہیں۔''

﴿ ذَٰلِكُم بِأَنَّهُ إِذَا دُعِيَ اللَّهُ وَحْدَهُ كَفَرْتُمْ ﴾ (۴۰/المؤمن:۱۲)

''یہ اس لیے کہ جب تنہا اللہ کو پکارا جاتا ہے تو تم انکار کر دیتے ہو۔''

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والوں نے کہا تھا:

﴿ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ ﴾

(٦٠/الممتحنۃ:٤)

''اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے دشمنی اور بغض ظاہر ہو گیا یہاں تک کہ تم اس اکیلے اللہ پر ایمان لاؤ۔''

مذکورہ بالا آیات کے علاوہ بہت سی احادیث میں ایسے الفاظ ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ اپنی زبان مبارک سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اعلان کرتے تھے۔ لا الہ الا اللہ توحید ہی تو ہے جس کی دعوت نبی ﷺ لوگوں کو پیش کرتے تھے، آپ ﷺ فرماتے ہیں:

((يَا أَيُّهَا النَّاسُ قُولُوْا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا)) (مسند احمد ٣/٤٩٢)

''لوگو! لا الہ الا اللہ کہہ دو، تم فلاح پا جاؤ گے۔''

نبی اکرم ﷺ مناسک حج ادا کرتے ہوئے کوہ صفا پر چڑھے حتی کہ بیت اللہ نظر آنے لگا فَكَبَّرَ اللّٰهَ وَ وَحَّدَهُ

''تو آپ نے اللہ اکبر کہا اور اللہ کی توحید بیان کی۔''

آپ نے یہ کلمات پڑھے:

((لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِي وَ يُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ أَنْجَزَ وَعْدَهُ وَ نَصَرَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ))

(مسلم، الحج، حجة النبی ﷺ، ح: ۱۲۱۸؛ ابوداؤد، المناسك، صفة حجة النبی ﷺ، ح: ۱۹۰۵)

''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، سلطنت اسی کی ہے، تعریف کا حقدار وہی ہے، وہی زندگی اور موت دیتا ہے اور وہی ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا، اپنے بندے (محمد ﷺ) کی مدد کی اور تمام گروہوں کو اس اکیلے ہی نے پسپا کر دیا۔''

اس حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ مشعر الحرام (مزدلفہ) پر آئے تو بھی آپ نے اللہ کی توحید بیان کی۔

نبی اکرم ﷺ نے جب معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا تو ان سے فرمایا:

((فَلْيَكُنْ اَوَّلَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلٰى اَنْ يُّوَحِّدُوْا اللّٰهَ تَعَالٰى))

(بخاری، التوحید، ماجاء فی دعا النبی امته الی توحید الله تبارك و تعالی، ح:۷۳۷۲؛بیهقی۷/۲)

''سب سے پہلے انہیں اللہ تعالیٰ کی توحید کی دعوت دینا۔''

احادیث میں لفظ ''التوحید'' اور ''اهل التوحید'' بھی موجود ہے، نیز محدثین اور شارحین حدیث نے توحید سے متعلق احادیث بیان کرتے وقت تبویب میں لفظ التوحید اکثر استعمال کیا ہے۔ ((مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ)) حدیث پر مسلم (کتاب الایمان) میں امام نووی رحمہ اللہ نے یہ عنوان قائم کیا ہے:

الدلیل علی من مات علی التوحید دخل الجنة قطعا (ح:۲۸)

''اس بات کی دلیل کہ توحید پر فوت ہونے والا شخص قطعی طور پر جنتی ہے۔''

عاص بن وائل سہمی نے دورِ جاہلیت میں نذر مانی کہ وہ سو اونٹ نحر کرے گا (وہ فوت ہو گیا تو اس کے ایک بیٹے) ہشام بن العاص نے اپنے حصے کے پچاس اونٹ نحر کر دیے جبکہ (دوسرے بیٹے) عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہ) نے اس سلسلے میں نبی ﷺ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا:

((اَمَّا اَبُوْكَ فَلَوْ كَانَ اَقَرَّ بِالتَّوْحِيْدِ فَصُمْتَ وَتَصَدَّقْتَ عَنْهُ نَفَعَهٗ ذٰلِكَ))(مسنداحمد ۱۸۲/۲؛ ابن ابی شیبة ۳۸۶/۳۔۳۸۷)

''اگر تمہارے باپ نے توحید کا اقرار کیا ہوتا تو تم اس کی طرف سے روزے رکھ لیتے اور صدقہ ادا کر دیتے تو یہ عمل اسے فائدہ دیتا۔''

اس حدیث میں لفظ ''التوحید'' واضح طور پر موجود ہے۔ بعض روایات میں اہل التوحید کی عظمت بھی بیان کی گئی ہے۔ جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((يُعَذَّبُ نَاسٌ مِّنْ اَهْلِ التَّوْحِيْدِ فِي النَّارِ حَتّٰى يَكُوْنُوْا فِيْهَا حُمَمًا ثُمَّ

تُدْرِكُهُمُ الرَّحْمَةُ فَيَخْرُجُوْنَ وَ يُطْرَحُوْنَ عَلٰى اَبْوَابِ الْجَنَّةِ))
قَالَ((فَيَرُشُّ عَلَيْهِمْ اَهْلُ الْجَنَّةِ الْمَاءَ فَيَنْبُتُوْنَ كَمَا يَنْبُتُ الْغُثَاءُ فِيْ حَمَّالَةِ السَّيْلِ ثُمَّ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ))

(ترمذی، صفة جهنم ، ما جاء ان للنار نفسين وما ذكر من يخرج من النار من اهل التوحيد، ح : ٢٥٩٧)

''اہلِ توحید کے کچھ لوگوں کو جہنم کا عذاب دیا جائے گا حتی کہ وہ اس میں کوئلہ ہو جائیں گے، پھران پر رحمتِ الٰہی ہوگی تو انہیں نکال کر جنت کے دروازوں پر ڈال دیا جائے گا، آپ نے فرمایا: اہل جنت ان پر پانی چھڑکیں گے تو وہ لوگ ایسے نکلیں گے جیسے سیلاب کے کوڑے کرکٹ میں دانا اُگ آتا ہے، پھر وہ (اہلِ توحید) جنت میں داخل ہوں گے۔''

اس حدیث میں لفظ "التوحید" صراحت کے ساتھ موجود ہے، لہٰذا توحید سے چڑنے کی بجائے توحید کے داعی بن کر سعادتِ دارین حاصل کریں۔

علاوہ ازیں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

ان رجلا لم يعمل من الخير شيئا قط الا التوحيد، فلما حضرته الوفاة...... (مسند احمد ۳۹۸/۳، بسند حسن)

نیز سیدہ یسیرہ سے مروی ہے:

عليكن بالتسبيح و التهليل و التقديس و لا تغفلن فتنسين التوحيد...... (مستدرك حاكم ۵۴۷/۱، بسند حسن)

'اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' کا مطلب؟

سوال ایک عالم سے میں نے سنا ہے، کہتے تھے: لا الله الا الله سے مراد ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود اس کائنات میں موجود نہیں ہے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ لا الله الا الله کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی خالق اور رازق نہیں۔ کیا کلمہ لا الله الا الله کا یہی

مفہوم ہے؟ صحیح مفہوم سے آگاہ کریں۔

جواب لا الٰہ الا اللہ کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ یہ کہنا کہ اللہ کے سوا کسی اور معبود کا وجود ہی نہیں، غلط ہے۔ کیونکہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنہیں لوگوں نے اللہ کے سوا معبود قرار دے رکھا ہے۔ بہت سے لوگ سورج چاند کی پوجا کرتے ہیں، ہندو گائے کو معبود قرار دیتے ہیں، مشرکین مکہ بہت سے معبودوں کی عبادت کرتے تھے۔ بعض مسلمان انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کو پکارتے ہیں اور ان سے فریادیں کرتے ہیں۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے کئی معبودان کا ذکر ملتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (۱۱/ھود:۱۰۱)

یہ آیت بہت سے معبودوں کے وجود پر دلالت کرتی ہے یہ الگ بات ہے کہ وہ معبودان باطلہ ہیں، معبود برحق صرف اور صرف ایک اللہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ﴾

(۳۱/لقمن:۳۰)

"یہ سب (انتظامات) اس وجہ سے ہیں کہ اللہ حق ہے اور اس کے سوا جنہیں لوگ پکارتے ہیں سب باطل ہیں۔"

لا الٰہ الا اللہ کا محض یہ مطلب بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی خالق اور رازق نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو خالق اور رازق تو مشرکین بھی مانتے تھے جیسے کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

﴿قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ﴾ (۱۰/یونس:۳۱)

(دیکھیے ۲۹/العنکبوت:۶۱، ۶۳، ۳۱/لقمن:۲۵، ۲۳/المؤمنون:۸۴تا۹۰)

اللہ تعالیٰ کو خالق و رازق ماننے کے باوجود مشرکین لا الٰہ الا اللہ کا انکار کرتے تھے، قرآن

مجید میں ہے:

﴿إِنَّهُمْ كَانُوٓا۟ إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا ٱللَّهُ يَسْتَكْبِرُونَ ۝ وَيَقُولُونَ أَئِنَّا لَتَارِكُوٓا۟ ءَالِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٍۭ ۝﴾ (۳۷/الصّٰفّٰت: ۳۵۔۳۶)

جن لوگوں نے لا الہ الا اللہ کی تفسیر ''اللہ کے سوا کوئی اور رازق نہیں ہے'' بیان کی ہے دراصل انہوں نے اپنے شرکیہ عقائد کو رائج کرنے کے لیے چور دروازہ کھولنے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ اللہ کو خالق و رازق لا الہ الا اللہ کہہ کر مان لیں مگر عبادت جس کی چاہیں کریں، اللہ کے بندوں اور ان کی قبروں کو پوجنا، ان کا طواف کرنا، ان کے لیے نذریں اور چڑھاوے چڑھانا وغیرہ سب کاموں کا جواز نکال لیا جاتا ہے۔ (اعاذنا اللہ منہا)

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا ثبوت

سوال ہمارے علاقہ یا شاید پورے ملک میں ایک فتنہ یا مسئلہ کھڑا کیا گیا ہے کہ لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ جسے ہم کلمہ طیبہ کا نام دیتے ہیں اس کا قرآن وحدیث سے کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ لوگ علماء سے رجوع کرتے ہیں لیکن اطمینان نہیں ہوتا۔ افضل الذکر لاالہ الا اللہ کا ثبوت ہے لیکن محمد رسول اللہ سمیت پورے کلمے کا ثبوت نہیں ملتا۔ اسلام قبول کرتے وقت یہ کلمہ پڑھنا چاہیے یا کلمہ شہادت اگر کلمہ شہادت پڑھنا چاہیے تو کیا یہ کلمہ پڑھنے والا مسلمان ہو جائے گا؟ وہ لوگ گرامر کے اعتبار سے بھی اس کلمہ کو درست قرار نہیں دیتے۔ کہ ایک ہی جملہ بنتا ہے۔ لفظ اللہ کو مبدل منہ اور محمد رسول اللہ کو بدل بناتے ہیں کہ ایک ہی چیز ہو گئی اور محمد ﷺ بھی اس کلمہ کی وجہ سے اللہ ثابت ہو گئے۔ براہ کرم مجلّہ میں اس بات کی خوب وضاحت کریں کیونکہ یہ بھی توحید ہی کی ایک بات ہے، عقیدے سے اس کا تعلق ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ اس مضمون کے بیک وقت میں نے دو خط لکھے ہیں، ایک ماہنامہ محدث لاہور کو لکھا ہے؛ ہوسکتا ہے ان کے مضامین پہلے سے مرتب کر دیے گئے ہوں، اگر وہ بھی اس مسئلہ پر تحقیق کر کے لکھتے ہیں تو اگر یہ مسئلہ دو رسالوں میں آجائے گا تو میرے خیال میں کوئی حرج نہیں جیسا آپ مناسب سمجھیں کیونکہ اس مسئلے کا فتنہ پھیلا ہوا ہے، اس لیے اس کا جواب جلد از جلد ضروری ہے۔

جواب: اسلام کی بنیاد تو حید و رسالت پر ہے۔اسلام میں داخل ہونے کے لیے جس طرح توحید کا اقرار ضروری ہے اسی طرح رسالت کا اقرار بھی لازمی ہے۔توحید و رسالت کا اقرار لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں جمع ہے۔اقرار کی نیت سے لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھنے والا مسلمان ہو جاتا ہے۔

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ اس آدمی کو جہنم پر حرام کر دے گا جو اس بات کی شہادت دے کہ لاالہ الا اللہ اور یہ کہ محمد رسول اللہ (مسند احمد ۵/ ۳۱۸؛ مسند ابی عوانۃ ۱/ ۱٦)

اسی طرح بخاری (ح:۱۳٦۹)اور تلخیص الحبیر از ابن حجر عسقلانی (ح:۱۷۰۵) اور دیگر کتب حدیث میں بہ کثرت احادیث ہیں۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں حتی کہ وہ اس بات کی شہادت دیں کہ لاالہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ......

(مسلم ، الایمان ، الامر بقتال الناس حتی یقولوا :لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ ، ح:۲۲)

اگر چہ مکمل کلمہ طیبہ کا ذکر بعض احادیث میں موجود ہے اگر بالفرض بعینہ مکمل کلمہ طیبہ کا ذکر قرآن وحدیث میں نہ ملتا ہو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے الفاظ میں جمع ہوتی ہے۔ اسی لیے بعض محدثین نے کتب حدیث میں تبویب لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے الفاظ سے کی ہے۔جیسا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح مسلم کی اوپر ذکر کردہ حدیث پر امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی تبویب (باب قائم کرنے) سے ظاہر ہوتا ہے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث نبوی میں بعینہ لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ابو نعیم الاصبہانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

حدثنا ابو محمد بن حیان ثنا عبداللہ بن اسحاق بن یوسف ثنا ابی ثنا حفص بن عمر العدنی ثنا الحکم بن ابان عن

عکرمة عن ابن عباس ان النبیﷺ قال:((مَنْ خَالَفَ دِيْنَ اللّٰهِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَاقْتُلُوْهُ وَمَنْ قَالَ لاالٰه الا اللّٰه محمد رسول اللّٰه فَلَاسَبِيْلَ لِاَحَدٍ عَلَيْهِ اِلَّا اَصَابَ حَدًّا فَاِنَّهٗ يُقَامُ عَلَيْهِ))

(تاریخ اصبهان ۱/۲۶۱، ط۔۱، دارالکتب العلمیة، بیروت، اس کی سند میں حفص بن عمر العدنی ضعیف راوی ہے۔)

''نبی ﷺ نے فرمایا: مسلمانوں میں سے جو اللہ کے دین کی مخالفت کرے اسے قتل کردو (کیونکہ مرتد کی سزا قتل ہے) اور جو شخص لاالٰه الا اللّٰه محمد رسول اللّٰه کہے اس کا مؤاخذہ کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں مگر جو کوئی حد کو پہنچنے والے جرم کا ارتکاب کرے گا اس پر حد قائم کی جائے گی۔''

نیز اس حدیث کو دیوان النسائی (۲۶۷) میں اور تحفۃ الاشراف میں من قال...... کے بیان میں دیکھا جا سکتا ہے۔

مندرجہ بالا احادیث نبویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ توحید و رسالت کے اعلان کے طور پر عہد نبوی میں لاالٰه الا اللّٰه محمد رسول اللّٰه کے الفاظ استعمال ہوتے تھے۔ [1]

مزید برآں یہ مسئلہ عوام کی سطح کا نہیں تھا جس کا اپنی ''علمیت'' ظاہر کرنے کے لیے ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ یہ خالص علمی بحث ہے جو کہ صرف لفظوں کی حد تک محدود ہے ورنہ کوئی مسلمان لاالٰه الا اللّٰه کا منکر ہے نہ محمد رسول اللہ کا۔ عوام تو اس بحث سے شاید یہی سمجھیں گے

---

[1] امام بیہقی کی کتاب الاسماء و الصفات، ص:۱۲۶۔۱۲۷ میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بسند حسن لذاتہ آیت ﴿كَلِمَةَ التَّقْوٰى﴾ (الفتح:۲۶) کی تفسیر میں ہے: و هی لاالٰه الا اللّٰه محمد رسول اللّٰه یعنی ﴿كَلِمَةَ التَّقْوٰى﴾ سے مراد لاالٰه الا اللّٰه محمد رسول اللّٰه ہے۔ (محمد ارشد کمال)

اسی طرح فوائد الحنائی للامام العدل ابی القاسم الحسین بن محمد الحنائی المتوفی ۴۵۹ھ میں ۱/۱۵۲ پر، جس کی تخریج الامام الحافظ ابی محمد عبدالعزیز بن محمد النخشی المتوفی ۴۵۶ھ نے کی ہے، یہی روایت موجود ہے اور انہوں نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ ھذا: حدیث صحیح نیز دیکھیں تاریخ دمشق ۶۳/۲۵۸؛ تفسیر طبری (۳۱۶۵۰) ۱۰/۲۵۴، ط: دارالحدیث القاهرة۔ ۲۱/۳۰۹ بتحقیق الدکتور عبداللّٰه بن عبدالمحسن الترکی، کتاب الایمان لابن مندة (۲۰۰)، ص: ۱۶۵ (ابوالحسن مبشر احمد ربانی عفا اللّٰه عنه)

کہ مسلمانوں کا کلمہ ہی غلط ہے۔ جبکہ ایسا ہرگز نہیں ہے اور یہی بات اگر یہود ونصاریٰ کے ہاتھ لگ جائے تو شاید انہیں عورتوں کی امامت کے مسئلے کی طرح ایک اور موقع اپنی ''فقاہت'' پھیلانے کا حاصل ہو جائے۔

باقی رہی یہ بات کہ لاالہ الا اللہ محمدرسول اللہ گرامر کے اعتبار سے ہی درست نہیں، تو یہ بات بھی لاعلمی اور جہالت پر مبنی ہے کیونکہ لاالہ الااللہ میں لفظ اللہ کسی طرح بھی محمد رسول اللہ کا مبدل منہ نہیں بنتا اور نہ محمد رسول اللہ لفظ اللہ کا بدل ہے۔ لاالہ الا اللہ الگ جملہ ہے اور محمد رسول اللہ دوسرا الگ جملہ اور دونوں جملوں میں الگ الگ چیزوں کا بیان ہے: پہلے جملے میں اللہ تعالیٰ کے الٰہ ہونے کا جبکہ دوسرے جملے میں محمد ﷺ کے رسول ہونے کا بیان ہے۔ تعجب ہے کہ لوگ الٰہ اور رسول کے فرق کو نہیں سمجھتے۔ اور نہ یہ بدل کا مفہوم ہی سمجھتے ہیں ورنہ غلط فہمی کا شکار نہ ہوتے۔ کلمہ طیبہ میں بدل کی اقسام بدل الکل، بدل البعض، بدل الاشتمال وغیرہ میں سے کوئی بھی قسم نہیں پائی جاتی۔

اگر لاالہ الا اللہ محمدرسول اللہ گرامر کے اعتبار سے غلط ہوتا تو امام نووی رحمہ اللہ جیسے (تہذیب الاسماء واللغات جیسی کتب کے مصنف) لغت کے ماہر صحیح مسلم میں لاالہ الا اللہ محمدرسول اللہ کے الفاظ سے تبویب نہ کرتے جیسا کہ اوپر گزرا اور نہ حدیث میں ہی لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے الفاظ اس طرح آتے۔

مزید برآں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ گرامر قرآن وحدیث پر حاکم نہیں ہے۔ اہل زبان کے استعمالات کا نام ہی تو گرامر ہے۔

عربی زبان اور قرآن وحدیث کے محاورات اور جملوں کو دیکھ کر ہی تو قواعدِ نحو (گرامر) وضع کیے گئے ہیں۔ گرامر کی صحیح حیثیت اور مقام ومرتبہ سے لاعلمی کی وجہ سے ہی بعض لوگ غلط فہمیاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ ایسی ہی حرکت جعلی قرآن فرقان الحق کے مصنف نے کی ہے۔ مسلمانوں میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لیے اس نے گرامر کی رُو سے قرآن کی ''غلطیاں'' نکالی ہیں۔ قاتلہ اللہ! جو کہ اس کی حماقت اور جہالت کا ثبوت ہے۔ اسے اتنی بھی خبر نہیں کہ گرامر تو خود قرآن سے بنی ہے۔ اور قرآن کے نزول سے بہت

بعد کی پیداوار ہے۔

ذاتِ باری تعالیٰ پر آفاقی و انفسی دلائل

سوال ایک عام درجے کے جدید سائنسی ذہن کو اللہ کے وجود کا کیسے یقین دلایا جا سکتا ہے؟ کیونکہ اللہ کا وجود تو تجربے اور مشاہدے سے ماورا ہے۔ وہ تو ایمان بالغیب چاہتا ہے۔ جبکہ سائنس تجربے اور مشاہدے کی قائل ہے۔

جواب ذاتِ باری تعالیٰ کا مشاہدہ یا تجربہ تو نہیں کیا جا سکتا البتہ یہ کائنات اور اس کے اندر عظیم الشان نظم وضبط اور خود انسان کی ہستی اور اس میں ودیعت کی گئی صلاحیتیں ذاتِ باری تعالیٰ پر دلالت کرتی ہیں، مخلوق کے لیے بدیہی طور پر خالق کا ہونا ضروری ہے۔ اللہ نے انسانوں کو مرد اور عورت کی شکل میں پیدا کیا ہے اور مذکر اور مونث کا وجود اور ان کی خلقت میں تناسب بذاتِ خود خالق کی ایک دلیل ہے، پھر انسانوں کی زبانوں، رنگوں اور شکل وصورت کا مختلف ہونا بھی وجودِ باری تعالیٰ کی دلیل ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ﴾

(۳۰/الروم:۲۲)

”اور اس کی نشانیوں میں سے زمین وآسمان کا بنانا بھی ہے اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا الگ الگ ہونا (بھی)۔“

اگر تمام انسان قد وقامت اور رنگ ڈھنگ میں ایک جیسے ہوتے تو کیا کچھ نہ ہوتا۔ انسانی زندگی کا سارے کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ اگر کہیں دو آدمی بھی شکل وصورت میں تھوڑے بہت ملتے ہوں تو عام لوگ کتنے مغالطوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے مطابق انسانوں کی شکل وشباہت میں فرق رکھا ہے۔ چنانچہ اس کائنات میں کوئی دو اشخاص بھی ایسے نہیں ہیں جو پوری طرح یکساں ہوں۔

اسی طرح سبزیوں، پھلوں اور میوہ جات کا ذائقہ اور رنگ الگ الگ ہونا بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ

صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۙ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴾ (۱۳/الرعد:۴)

''اور زمین میں طرح طرح کے ٹکڑے ہیں جو ایک دوسرے سے ملے جلے ہوئے ہیں۔ اور انگور کے باغ اور کھیتی ہے اور کھجور کے درخت دو شاخے اور الگ الگ جڑ والے سب کو ایک ہی پانی دیا جاتا ہے۔ اور (باوجود اس کے) ہم ذائقے میں ایک کو دوسرے پر فوقیت دیتے ہیں۔ بے شک ان باتوں میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں۔''

انسانوں کا اپنی قسموں میں مختلف ہونا بھی وجود باری تعالیٰ کے دلائل میں سے ہے۔ ان گنت براہین اور کونی آیات وجود الٰہی اور اس کی وحدانیت کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

ففی کله شیء له اٰیة تدل علی أنه واحد

ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَاۗبَّةٍ ۭ ﴾

(۴۲/الشوریٰ :۲۹)

''اور اس کی قدرت کے دلائل میں سے ہے یہ بات کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ان دونوں میں (ہر قسم کے) جاندار پھیلا دیے۔''

آیت مذکورہ میں دابۃ (جاندار ہستی) کے وجود کو رب تعالیٰ کے وجود کی دلیل قرار دیا گیا ہے۔ جدید سائنس بھی طویل تحقیق و تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ تمام حیوانات و نباتات کی تخلیق نخر مایہ (Protoplasm) سے ہوئی ہے جن کے کیمیائی (Chemical) اجزا آکسیجن، ہائیڈروجن، کاربن، نائٹروجن، فاسفورس، سلفر، کلورین، کیلشیم، سوڈیم اور میگنیشیم وغیرہ بھی دریافت کر لیے گئے ہیں۔ مگر انتہائی کوشش کے باوجود پوری دنیائے سائنس ان کیمیائی اجزا و عناصر (Elements) کو باہم ملا کر پروٹو پلازم بنا لینے میں کامیاب نہ ہوسکی، وہ ان اجزا و عناصر کو لاکھ طرح سے ملاتی ہے مگر وہ پروٹو پلازم نہیں بنتا۔ ایک سائنس دان نے پورے پندرہ سال تک ان عناصر کو ہر طرح سے ترکیب دینے کی کوشش کی، مگر اس میں زندگی

کی کوئی رمق بھی نمودار نہ ہوئی۔ اس سے مادیت و دہریت کا یہ دعویٰ باطل ہو جاتا ہے کہ زندگی کا ظہور بغیر کسی خالق (Creator) کے خود بخود ہو گیا اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس عالم ہست و بود میں ایک با ارادہ و اختیار ہستی کی کارفرمائی جاری وساری ہے۔

(اسلام اور جدید سائنس از محمد شہاب الدین ندوی ص: ۵۷۔۵۸، ط: ۱، ۱۹۸۸ء، مکتبہ تعمیر انسانیت، اردو بازار لاہور)

باقی رہی یہ بات کہ سائنس صرف تجربے اور مشاہدے کی قائل ہے تو یہ قطعی غلط ہے کیونکہ سائنس ان حقائق کو بھی جاننے کا دعویٰ کرتی ہے جو تجربے یا مشاہدے کی گرفت سے باہر ہیں مثلاً ایٹم کو آج تک کسی نے نہیں دیکھا۔ قانونِ تجاذب (Law of gravitation) بالکل نا قابل مشاہدہ ہے۔ اسی طرح ہم انرجی (Energy) کو نہیں دیکھ سکتے مگر اس کی کارستانیوں سے آگاہ ہیں۔ جن کی وجہ سے ہم نے یقین کر لیا کہ قوت (انرجی) نام کی کسی چیز کا وجود ضرور ہے۔ اسی طرح تخلیق کے عمل کی ارتقائی کڑیاں کسی نے بھی نہیں دیکھیں لیکن اس کے باوجود اس کے وجود کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔

اللہ نگہبان

سوال ہمارے محافظ فرشتے ہیں یا صرف اللہ تعالیٰ؟ کیا مخلوقات کو نگہبان کہنا درست ہے؟

جواب فرشتوں سمیت تمام مخلوقات کا محافظ اور نگہبان اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کوئی محافظ و نگہبان نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ مَّا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ ۚ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّونَهُ شَيْئًا ۚ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ ۝ وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُودًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَنَجَّيْنَاهُم مِّنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ ۝﴾ (ہود: ۵۷۔۵۸)

"پس اگر تم روگردانی کرو (تو کرو) میں تو تمہیں وہ پیغام پہنچا چکا جو دے کر مجھے تمہاری طرف بھیجا گیا تھا۔ میرا رب تمہارے قائم مقام دیگر لوگوں کو کر دے گا اور تم اس کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکو گے، یقیناً میرا پروردگار ہر چیز پر نگہبان ہے۔ اور

جب ہمارا حکم آ پہنچا تو ہم نے ھُود کو اور ان کے مسلمان ساتھیوں کو اپنی خاص رحمت سے نجات عطا کی اور ہم نے اُن (سب) کو سخت عذاب سے بچالیا۔''

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَرَبُّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ ۞ قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ ۖ لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيهِمَا مِن شِرْكٍ وَمَا لَهُ مِنْهُم مِّن ظَهِيرٍ ۞ ﴾ (۳۴/سبا:۲۱-۲۲)

''اور آپ کا رب ہر چیز پر نگہبان ہے۔ کہہ دیجیے! اللہ کے سوا جن جن کا تمہیں گمان ہے (سب) کو پکارلو، نہ ان میں سے کسی کو آسمانوں اور زمینوں میں سے ایک ذرہ کا اختیار ہے نہ ان کا ان میں کوئی حصہ ہے نہ ان میں سے کوئی اُس (اللہ) کا مددگار ہے۔''

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ اللَّهُ حَفِيظٌ عَلَيْهِمْ وَمَا أَنتَ عَلَيْهِم بِوَكِيلٍ ۞ ﴾ (۴۲/الشوریٰ:۶)

''اور جن لوگوں نے اس کے سوا دوسروں کو کارساز بنالیا ہے اللہ ان پر نگران ہے اور آپ ان پر کارساز نہیں ہیں۔''

نبی اکرم ﷺ سے ثابت شدہ بہت سی دعاؤں سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تمام مخلوقات کو اللہ ہی کی پناہ اور حفاظت میں دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے کی چند ادعیہ مسنونہ درج ذیل ہیں:

① ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

جب تم میں سے کوئی شخص اپنے بستر کی طرف آئے تو اپنی چادر کے پلو سے اسے جھاڑے اور اللہ کا نام لے کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ اس کے بستر پر اس کے بعد کیا چیز آئی ہے۔ جب لیٹنے لگے تو دائیں پہلو پر لیٹ کر یہ کلمات پڑھے:

((سُبْحَانَكَ رَبِّي بِكَ وَضَعْتُ جَنْبِي وَبِكَ أَرْفَعُهُ إِنْ أَمْسَكْتَ نَفْسِي

فَاغْفِرْلَهَا وَإِنْ اَرْسَلْتَهَا فَاحْفَظْهَا بِمَا تَحْفَظُ بِهِ عِبَادَكَ الصَّالِحِيْنَ))

(مسلم ، الذكر والدعا والتوبة والاستغفار ، الدعاء عند النوم ، ح: ۲۷۱۴)

''پاک ہے تُو اے میرے رب! تیرے (نام کے) ساتھ ہی مَیں نے اپنا پہلو رکھا اور تیرے (نام کے) ساتھ ہی اسے اٹھاؤں گا۔ اگر تُو میری جان کو روک لے تو اسے معاف کر دینا اور اگر اسے چھوڑ دے تو اس کی حفاظت کرنا جس کے ساتھ تُو اپنے نیک بندوں کی حفاظت کرتا ہے۔''

② مسافر کو مقیم کے لیے یہ دعا کرنے کی تعلیم دی گئی ہے:

((اَسْتَوْدِعُكَ اللّٰهَ الَّذِىْ لَا يَضِيْعُ وَدَائِعُهُ))

(مسند احمد ۲/۴۰۳؛ ابن ماجة ، ح: ۲۸۲۵)

''مَیں تجھے اللہ کے سپرد کرتا ہوں جس کے سپرد کی ہوئی چیزیں ضائع نہیں ہوتیں۔''

③ مقیم کی مسافر کے لیے مسنون دعا یہ ہے:

((اَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكَ وَاَمَانَتَكَ وَخَوَاتِيْمَ عَمَلِكَ))

(ابن ماجة ، الجهاد ، تشييع الغزاة و وداعهم ، ح: ۲۸۲۶)

''مَیں تیرے دین، تیری امانت اور تیرے اعمال کے خاتموں کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔''

مذکورہ بالا ادعیہ ماثورہ میں ((فَاحْفَظْهَا بِمَا تَحْفَظُ بِهِ))، ((اَسْتَوْدِعُكَ اللّٰهَ)) اور ((اَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ)) کے الفاظ قابل غور ہیں۔

نیز اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کوئی بچانے والا نہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں مخلوقات کے محافظ ہونے کی نفی ہے:

﴿ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴾ (۲/البقرة: ۱۰۷)

''کیا آپ کو علم نہیں کہ زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ ہی کے لیے ہے اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی ولی اور مددگار نہیں۔''

نیز فرمایا:

﴿وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۚ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ﴾ (۲۹/العنکبوت:۲۲)

”تم نہ تو زمین میں اللہ کو عاجز کر سکتے ہو اور نہ آسمان میں، اللہ کے سوا تمہارا کوئی ولی ہے نہ مددگار۔“

شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا:

﴿وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ﴾ (۱۱/ھود:۸۶)

”میں تم پر قطعاً نگہبان (اور داروغہ) نہیں ہوں۔“

یہی اعلان نبی ﷺ نے بھی کیا۔ (۶/الانعام:۱۰۴)

درج ذیل آیات میں بھی یہی مضمون بیان کیا گیا ہے:

﴿وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا﴾ (۴/النساء:۸۰)

﴿وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ﴾ (۶/الانعام:۱۰۷)

﴿فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۭ﴾ (۴۲/الشوریٰ:۴۸)

مندرجہ بالا حوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل محافظ اور نگہبان اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ البتہ کتاب وسنت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تمام انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے محافظ مقرر کیے گئے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ﴾ (۸۶/الطارق:۴)

”کوئی ایسا نہیں جس پر نگہبان فرشتہ نہ ہو۔“

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ۭ﴾ (۱۳/الرعد:۱۱)

”اس (اللہ تعالیٰ) کے پہرے دار اس (انسان) کے آگے پیچھے مقرر ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی نگہبانی کرتے ہیں۔“

سورۃ الانعام میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ﴾ (۶/الانعام:۶۱)

''اور وہی اپنے بندوں کے اوپر غالب و برتر ہے اور وہ تم پر نگہبانی کرنے والا بھیجتا ہے۔''

﴿ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ ﴾ اور ﴿ يُرْسِلُ ﴾ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محافظ اللہ کے حکم سے اور اسی کی طرف سے مقرر ہیں۔ ان پر بھی اللہ تعالیٰ کا حکم چلتا ہے۔ جسے اللہ نہ بچانا چاہے اسے کوئی بھی بچا نہیں سکتا۔

کیا غیر مسلم کو نیک اعمال کا فائدہ ہوتا ہے؟

سوال آج کل بعض لوگ کفار و مشرکین کی مدح سرائی کرتے ہیں۔ ان کے اخلاق اور نیکی کی تعریف کرتے ہیں تو کیا کفار کو اُن کی نیکی کا فائدہ ہوتا ہے؟

جواب اچھے کام کو اچھا کہنا چاہیے، دوسری بات یہ ہے کہ نیکی کرنے والا کوئی بھی ہو اسے یقیناً کسی نہ کسی اعتبار سے فائدہ ہوتا ہے۔ مسلمان کو دنیا کے فائدے کے ساتھ ساتھ آخرت کا فائدہ بطورِ خاص حاصل ہوتا ہے۔ البتہ کفار کو اُن کے نیک اعمال کا بدلہ دنیا میں ہی مل جاتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہو تو انہیں شہرت بھی مل جاتی ہے۔ مال و دولت کی ریل پیل ہو جاتی ہے۔ دنیا میں عزت اور وقار بھی مل سکتا ہے۔ مگر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے آخرت میں ان کے لیے کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَقَدِمْنَا إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَّنثُورًا ۝ ﴾

(۲۵/الفرقان:۲۳)

''اور انہوں نے جو جو اعمال کیے تھے ہم نے ان کی طرف بڑھ کر انہیں پراگندہ ذروں کی طرح کر دیا۔''

ایک اور آیت میں کفار کے اعمال کو راکھ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَّثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ ۖ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ ۖ لَّا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ ۝ ﴾

(۱۴/ابراہیم:۱۸)

''ان لوگوں کی مثال جنہوں نے اپنے رب سے کفر کیا، ان کے اعمال اس راکھ کی مانند ہیں جس پر تیز ہوا آندھی والے دن چلے، جو بھی انہوں نے کیا اس میں سے کسی چیز پر قادر نہ ہوں گے، یہی دُور کی گمراہی ہے۔''

ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے کفار کے اعمال کو سراب (دھوپ میں چمکتی ہوئی ریت جو دُور سے پانی معلوم ہوتی ہے) اور اندھیروں کی مانند قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـــًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ؀ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّـجِّيٍّ يَّغْشٰـىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ؀﴾ (۲۴/النور:۳۹-۴۰)

''کافروں کے اعمال مثل اس چمکتی ہوئی ریت کے ہیں جو چٹیل میدان میں ہو جسے پیاسا (دُور سے) پانی سمجھتا ہے لیکن جب اس کے پاس پہنچتا ہے تو اسے کچھ بھی نہیں پاتا، ہاں اللہ کو اپنے پاس پاتا ہے جو اس کا حساب پورا پورا چکا دیتا ہے، اللہ بہت جلد حساب کر دینے والا ہے۔ یا مثل ان اندھیروں کے ہے جو نہایت گہرے سمندر کی تہ میں ہوں جسے اوپر تلے کی موجوں نے ڈھانپ رکھا ہو، پھر اوپر سے بادل چھائے ہوئے ہوں، (الغرض) اندھیرے ہیں جو اُوپر تلے پے درپے ہیں، جب اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھ سکے، اور (بات یہ ہے کہ) جسے اللہ ہی نور نہ دے اس کے پاس کوئی روشنی نہیں ہوتی۔''

روزِ قیامت کفار کے اعمال کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ؀ۭ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ؀ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ

رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا﴾

(۱۸/الکہف:۱۰۳۔۱۰۵)

”کہہ دیجئے کہ کیا میں تمہیں بتادوں کہ باعتبار اعمال سب سے زیادہ خسارے میں کون ہیں؟ وہ ہیں جن کی دنیوی زندگی کی تمام تر کوششیں بیکار ہوگئیں اور وہ اسی گمان میں رہے کہ وہ بہت اچھے کام کر رہے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں اور اس کی ملاقات سے کفر کیا، اس لیے ان کے اعمال غارت ہوگئے پس قیامت کے دن ہم ان کا کوئی وزن قائم نہ کریں گے۔“

کفار کو اُن کے اچھے اعمال کا بدلہ آخرت میں نہیں ملے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ (۲/البقرۃ:۲۰۰)

”بعض لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں: ہمارے رب! ہمیں دنیا میں دے دے۔ ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔“

اسی بات کو ایک اور سورت میں یوں بیان فرمایا:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ﴾ (۴۲/الشوریٰ:۲۰)

”جس کا ارادہ آخرت کی کھیتی کا ہو ہم اسے اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کی طلب رکھتا ہو ہم اسے اس میں سے ہی کچھ دیں گے، ایسے شخص کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔“

ایک مقام پر یوں فرمایا:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (۱۱/ھود:۱۵۔۱۶)

”جو شخص دنیا کی زندگی اور اس کی زینت پر فریفتہ ہوا چاہتا ہو ہم ایسوں کو اُن کے

اعمال (کا بدلہ) یہیں بھرپور پہنچا دیتے ہیں اور یہاں انہیں کوئی کمی نہیں کی جاتی، یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں سوائے آگ کے اور کچھ نہیں اور جو کچھ انہوں نے یہاں کیا ہوگا وہاں سب اکارت ہے اور جو کچھ ان کے اعمال تھے سب برباد ہونے والے ہیں۔"

ایک اور آیت میں فرمایا:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا﴾ (۱۷/بنی اسرائیل:۱۸)

"جس کا ارادہ صرف اس جلدی والی دنیا (فوری فائدہ) کا ہی ہو اسے ہم یہاں جس قدر جس کے لیے چاہیں سردست دیتے ہیں بالآخر اس کے لیے ہم جہنم مقرر کر دیتے ہیں جہاں وہ برے حالوں دھتکارا ہوا داخل ہوگا۔"

البتہ جو لوگ ایمان کی بنیاد پر نیک اعمال کریں انہیں آخرت میں بھی ان کے اعمال کا فائدہ ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا﴾ (۱۷/بنی اسرائیل:۱۹)

"اور جس کا ارادہ آخرت کا ہو اور جیسی کوشش اس کے لیے ہونی چاہیے وہ کرتا بھی ہو اور وہ مومن بھی ہو تو یہی لوگ ہیں جن کی کوشش کی اللہ کے ہاں (پوری) قدر کی جائے گی۔"

ہاں ایسے کفار جنہوں نے کفر کی حالت میں کچھ اعمال کیے اور بعد میں مسلمان ہو گئے ان کے حالت کفر کے نیک اعمال رائیگاں و بیکار نہیں جائیں گے بلکہ انہیں ان کے نامہ اعمال میں شامل کیا جائے گا۔ حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، میں نے عرض کیا:

یا رسول الله! ارایت اشیاء کنت اتحنث بها فی الجاهلیة من صدقة او عتاقة او صلة رحم فهل فیها من اجر؟ فقال النبی ﷺ: ((اَسْلَمْتَ عَلٰی مَا سَلَفَ مِنْ خَیْرٍ))

(بخاری، الزکوٰۃ، من تصدق فی الشرک ثم اسلم، ح: ۱۴۳۶)

''اللہ کے رسول! مجھے ان کاموں کے بارے میں بتائیں جنہیں میں زمانہ جاہلیت میں نیکی سمجھ کر کیا کرتا تھا۔ مثلاً صدقہ کرنا، غلام آزاد کرنا اور صلہ رحمی (وغیرہ) تو کیا ان کاموں کا مجھے اجر ملے گا؟'' تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''تم نے اپنی سابقہ نیکیوں سمیت اسلام قبول کیا ہے۔''

اس حدیث کی تشریح میں مولانا محمد داؤد راز رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

امام بخاری نے اس حدیث سے یہ ثابت کیا ہے کہ اگر کافر مسلمان ہو جائے تو کفر کے زمانہ کی نیکیوں کا بھی ثواب ملے گا۔ یہ اللہ پاک کی عنایت ہے۔ اس میں کسی کا کیا عمل دخل ہے۔ بادشاہ حقیقی کے پیغمبر نے جو کچھ فرما دیا وہی قانون ہے۔ اس سے زیادہ صراحت دار قطنی کی روایت میں ہے کہ جب کافر اسلام لاتا ہے اور اچھی طرح مسلمان ہو جاتا ہے تو اس کی ہر نیکی، جو اُس نے اسلام قبول کرنے سے پہلے کی تھی، لکھ لی جاتی ہے اور ہر برائی، جو اسلام قبول کرنے سے پہلے کی تھی، مٹا دی جاتی ہے۔ اس کے بعد ہر نیکی کا ثواب دس گناہ سے سات سو گنا تک ملتا رہتا ہے اور ہر برائی کے بدلے ایک برائی لکھی جاتی ہے۔ بلکہ ممکن ہے اللہ پاک اسے بھی معاف کر دے۔

کون سے معبود جہنم میں ہوں گے؟

سوال قرآنِ مجید میں خبر دی گئی ہے کہ مشرکین کے ساتھ ان کے معبودوں کو بھی جہنم میں ڈال دیا جائے گا، جبکہ انبیاء اور اولیاء کے پجاری بھی بہت ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام، عزیر علیہ السلام اور فرشتوں کی عبادت بھی مشرکین کرتے رہے ہیں تو اس سلسلے میں کتاب و سنت کی تعلیمات کیا ہیں؟

جواب اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ أَنتُمْ لَهَا وَارِدُونَ ۝ لَوْ كَانَ هَٰؤُلَاءِ آلِهَةً مَّا وَرَدُوهَا ۖ وَكُلٌّ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَهُمْ فِيهَا لَا يَسْمَعُونَ ۝ ﴾ (۲۱/الانبیاء: ۹۸_۱۰۰)

''بلاشبہ تم اور اللہ کے سوا جن جن کی تم عبادت کرتے ہو سب جہنم کا ایندھن بنو گے۔تم سب اس (جہنم) میں جانے والے ہو، اگر یہ (حقیقی) معبود ہوتے تو اس میں داخل نہ ہوتے اور سب کے سب اسی میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔وہ وہاں چلا رہے ہوں گے اور وہاں کچھ بھی نہ سن سکیں گے۔''

ان آیات کے بعد والی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ نیک ہیں اور انہوں نے لوگوں کو اپنی عبادت کی دعوت نہیں دی بلکہ وہ اپنی زندگی میں دعوتِ توحید دیتے رہے وہ لوگ یقیناً جنت میں داخل ہوں گے، انہیں تو جہنم کی ہوا بھی نہیں چھوئے گی۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُم مِّنَّا الْحُسْنَىٰ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ ۝ لَا يَسْمَعُونَ حَسِيسَهَا ۖ وَهُمْ فِي مَا اشْتَهَتْ أَنفُسُهُمْ خَالِدُونَ ۝ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ هَٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ۝﴾

(۲۱/الانبیاء:۱۰۱-۱۰۳)

''بے شک جن کے لیے ہماری طرف سے نیکی پہلے ہی ٹھہر چکی ہے وہ سب اُس (جہنم) سے دُور ہی رکھے جائیں گے، وہ تو جہنم کی آہٹ تک نہ سنیں گے اور اپنی مَن بھاتی چیزوں میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، بڑی گھبراہٹ (بھی) انہیں غمگین نہ کر سکے گی اور فرشتے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے کہ یہی تمہارا وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ دیے جاتے رہے۔''

صاحبِ تفہیم القرآن لکھتے ہیں:

''جن لوگوں نے خلقِ خدا کو خدا پرستی کی تعلیم دی تھی اور لوگ انہی کو معبود بنا بیٹھے یا جو غریب اس بات سے بالکل بے خبر ہیں کہ دنیا میں ان کی بندگی کی جا رہی ہے اور اس فعل میں ان کی خواہش اور مرضی کا کوئی دخل نہیں ہے ان کے جہنم میں جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ وہ اس شرک کے ذمہ دار نہیں ہیں۔البتہ جنہوں نے خود معبود بننے کی کوشش کی اور جن کا خلقِ خدا کے اس شرک میں واقعی دخل ہے وہ اب اپنے عابدوں کے ساتھ جہنم میں جائیں گے۔اسی طرح وہ لوگ بھی

جہنم میں جائیں گے جنہوں نے اپنی اغراض کے لیے غیر اللہ کو معبود بنوایا۔ کیونکہ اس صورت میں مشرکین کے اصلی معبود ہی قرار پائیں گے نہ کہ وہ جنہیں ان اشرار نے بظاہر معبود بنوایا تھا۔ شیطان بھی اسی ذیل میں آتا ہے کیونکہ اس کی تحریک پر جن ہستیوں کو معبود بنایا جاتا ہے، اصل معبود وہ نہیں بلکہ خود شیطان ہوتا ہے جس کے امر کی اطاعت میں یہ فعل کیا جاتا ہے اس کے علاوہ پتھر اور لکڑی کے بتوں اور دوسرے سامانِ پرستش کو بھی مشرکین کے ساتھ جہنم میں داخل کیا جائے گا تاکہ وہ ان پر آتشِ جہنم کے اور زیادہ بھڑکنے کا سبب بنیں اور یہ دیکھ کر انہیں مزید تکلیف ہو کہ جن سے وہ شفاعت کی امیدیں لگائے بیٹھے تھے وہ ان پر الٹے عذاب کی شدت کا موجب بنے ہوئے ہیں۔"

کفار سے دوستی اور ان کی عزت وتکریم؟

سوال کیا کفار سے دوستی اور ان کی عزت وتکریم کرنا جائز ہے؟

جواب کفار سے دوستی کرنا جائز نہیں اور ان کی عزت وتکریم کرنا بھی منع ہے۔ عزت دینا دوستی کا حصہ ہے اور کفار سے دوستی کرنا منع ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل آیات کا مطالعہ کیجیے:

① ﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَٰفِرِينَ أَوْلِيَآءَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ﴾ (۳/آل عمران:۲۸)

"مومنوں کو چاہیے کہ ایمان والوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا وہ اللہ کی حمایت میں نہیں۔"

مگر وہ مسلمان جو کسی کافر حکومت میں رہتے ہوں اور ان کے لیے کفار کے شر سے بچنا کفار سے اظہارِ دوستی کے بغیر ممکن نہ ہو تو وہ زبان سے ظاہری طور پر ایسا کر سکتے ہیں جیسا کہ آیت کے الفاظ ﴿إِلَّآ أَن تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَىٰةً﴾ سے ظاہر ہوتا ہے۔

② ﴿يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكَٰفِرِينَ أَوْلِيَآءَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۚ﴾

(۴/النساء:۱۴۴)

''ایمان والو! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ۔''

③ ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوا۟ ٱلْيَهُودَ وَٱلنَّصَٰرَىٰٓ أَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُۥ مِنْهُمْ ۗ ﴾ (۵/المائدۃ:۵۱)

''ایمان والو! تم یہود ونصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، یہ تو آپس میں ہی ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ تم میں سے جو بھی ان سے دوستی کرے وہ بلاشبہ انہیں میں سے ہے۔''

④ ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوا۟ ٱلَّذِينَ ٱتَّخَذُوا۟ دِينَكُمْ هُزُوًا وَلَعِبًا مِّنَ ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْكِتَٰبَ مِن قَبْلِكُمْ وَٱلْكُفَّارَ أَوْلِيَآءَ ۚ ﴾ (۵/المائدۃ:۵۷)

''مومنو! ان لوگوں کو دوست نہ بناؤ جو تمہارے دین کو ہنسی کھیل بنائے ہوئے ہیں، وہ ان میں سے ہوں جو پہلے کتاب دیے گئے ہیں یا (دیگر) کفار ہوں۔''

⑤ ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوا۟ عَدُوِّى وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَآءَ ﴾ (۶۰/الممتحنۃ:۱)

''ایمان والو! میرے دشمن اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ۔''

⑥ ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوٓا۟ ءَابَآءَكُمْ وَإِخْوَٰنَكُمْ أَوْلِيَآءَ إِنِ ٱسْتَحَبُّوا۟ ٱلْكُفْرَ عَلَى ٱلْإِيمَٰنِ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ﴾

(۹/التوبۃ:۲۳)

''ایمان والو! اپنے باپوں اور بھائیوں کو دوست نہ بناؤ اگر وہ کفر کو ایمان سے زیادہ عزیز رکھیں۔ تم میں سے جو بھی اُن سے محبت رکھیں وہی ظالم ہے۔''

⑦ غیر مسلموں سے دوستی اللہ جل جلالہ، اللہ کے رسول ﷺ اور قرآن کریم پر ایمان کے منافی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَوْ كَانُوا۟ يُؤْمِنُونَ بِٱللَّهِ وَٱلنَّبِىِّ وَمَآ أُنزِلَ إِلَيْهِ مَا ٱتَّخَذُوهُمْ أَوْلِيَآءَ ﴾

(۵/المائدۃ:۸۱)

''اگر انہیں اللہ پر، نبی پر اور اُس پر جو آپ پر نازل ہوا ہے، ایمان ہوتا تو یہ اُن (کفار) سے دوستی نہ کرتے۔''

مذکورہ بالا آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کافروں سے دوستی کرنے سے سختی سے منع کرتا ہے۔ کفار خواہ یہود ونصاریٰ ہوں یا کوئی اور۔ وہ اللہ اور اہلِ اسلام کے دشمن ہیں، خواہ اُن کے آباء و اجداد اور بھائی ہی کیوں نہ ہوں، جو اُن سے دوستی کرے گا وہ ظالم انہی میں شمار ہوگا۔

بھلا یہ کیسے روا ہو سکتا ہے کہ وہ ان کے دین کا تمسخر اڑاتے ہوں، اللہ تعالیٰ کی آیات میں کیڑے نکالتے ہوں، مسلمانوں کے خلاف برسرِ پیکار ہوں، ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ رہے ہوں، انہیں گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر رہے ہوں، مسلمانوں کے خلاف ہر حربہ اختیار کر رہے ہوں اور یہ نگوڑے ان سے دوستیاں کرتے پھریں! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿إِنَّمَا يَنْهَىٰكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَٰتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُم مِّن دِيَٰرِكُمْ وَظَٰهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَن تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الظَّٰلِمُونَ ۝﴾ (٦٠/الممتحنۃ:٩)

شیخ الاسلام ﷫ اقتضاء الصراط المستقیم میں فرماتے ہیں کہ دوستی عزت وامانت کا مقام ہے اور کافر ذلت اور خیانت کے مستحق ہیں اور اللہ عزوجل نے مسلمانوں کو اُن سے بے نیاز کر رکھا ہے، لہٰذا انہیں ایسی ذمہ داری دینا جائز نہیں جس کی وجہ سے انہیں مسلمانوں پر فوقیت حاصل ہوتی ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَبْدَؤُوا الْيَهُودَ وَلَا النَّصَارَىٰ بِالسَّلَامِ وَإِذَا لَقِيتُمْ أَحَدَهُمْ فِي طَرِيقٍ فَاضْطَرُّوهُ إِلَىٰ أَضْيَقِهِ))

(مسلم، السلام، النهي عن ابتداء اهل الكتاب بالسلام ح:٢١٦٧)

''یہود ونصاریٰ کو سلام کرنے میں پہل نہ کرو اور جب تم اُن میں سے کسی کو کسی راستہ پر ملو تو اسے تنگ راستے پر چلنے پر مجبور کرو۔''

معلوم ہوا کہ جو عزت وتکریم ایک مسلم کو حاصل ہے وہ ایک کافر کو ہرگز حاصل نہیں ہے۔ راہ چلتے ہوئے اگر آپ ایک مسلمان کو کھلا راستہ دیتے ہیں تو ان اہلِ کتاب سے ایسا سلوک نہ کیا جائے۔ مسلم کو غیر مسلم پر ترجیح حاصل ہے۔

الغرض: جو کفار دین کی بنیاد پر اہلِ اسلام سے نہیں لڑتے اور نہ انہوں نے کبھی مسلمانوں کو

ان کے گھر بار چھوڑنے پر مجبور کیا ہو اور نہ دیگر کفار کی مسلمانوں کے خلاف کسی بھی قسم کی مدد کرتے ہوں تو ایسے کافروں سے سلوک و احسان کرنے کا معاملہ کرنے کی اسلام اجازت دیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ﴾ (۶۰/الممتحنۃ:۸)

''جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں لڑی اور تمہیں جلاوطن نہیں کیا۔ ان کے ساتھ سلوک و احسان کرنے اور منصفانہ بھلے برتاؤ کرنے سے اللہ تمہیں نہیں روکتا۔''

کوئی بات نہیں اللہ غفور رحیم ہے!

سوال بعض لوگوں کو جب اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے منع کیا جاتا ہے تو وہ فوراً جواب دیتے ہیں کہ اللہ غفور رحیم ہے۔ ہمارے گناہوں کی وہاں حیثیت ہی کیا ہے؟ ایسے لوگوں کے طرز عمل کی اصلاح کیسے کی جائے؟

جواب یقیناً اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ لیکن انسان کو اللہ کی مغفرت اور رحمت کے سہارے گناہوں پر دلیر نہیں ہونا چاہیے کہ جہاں وہ غفور رحیم ہے وہاں شدید العقاب (سخت سزا دینے والا) بھی ہے۔ لہٰذا انسان کے لیے ضروری ہے کہ جہاں وہ اللہ کی رحمت کی امید رکھتا ہے وہاں وہ اللہ تعالیٰ کے عذابوں سے صرف نظر بھی نہ کرے۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر اللہ کے غفور ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے عذابوں کا تذکرہ کر کے اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ﴾

(۴۰/المؤمن:۳)

''(اللہ) گناہ بخشنے والا، توبہ قبول کرنے والا، سخت سزا دینے والا اور بڑا فضل کرنے والا ہے۔''

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿نَبِّئۡ عِبَادِیۡۤ اَنِّیۡۤ اَنَا الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ۙ﴿۴۹﴾ وَ اَنَّ عَذَابِیۡ هُوَ الۡعَذَابُ الۡاَلِیۡمُ ﴿۵۰﴾﴾

(۱۵/الحجر:۴۹_۵۰)

’’میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں بخشنے والا مہربان ہوں اور یہ کہ میرا عذاب (بھی) بڑی تکلیف کا عذاب ہے۔‘‘

اسی طرح کی کئی اور آیات بھی ہیں۔

مزید براں اللہ تعالیٰ غفور رحیم تو ان لوگوں کے لیے ہے جو اُس کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے۔ اپنے گناہوں کی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے ہیں، توبہ کرتے ہیں اور آئندہ اپنے اعمال کی اصلاح کر لیتے ہیں۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِهِمۡ لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِیۡعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ﴿۵۳﴾ وَ اَنِیۡبُوۡۤا اِلٰی رَبِّکُمۡ وَ اَسۡلِمُوۡا لَهٗ﴾ (۳۹/الزمر:۵۳)

’’کہہ دیجئے! اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو کیونکہ اللہ سب گناہوں کو بخش دیتا ہے، بے شک وہی بہت بخشنے والا مہربان ہے اور اپنے مالک کی طرف رجوع کرو اور اس کی فرمانبرداری کرو۔‘‘

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ثُمَّ اِنَّ رَبَّکَ لِلَّذِیۡنَ عَمِلُوا السُّوۡٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ وَ اَصۡلَحُوۡۤا ۙ اِنَّ رَبَّکَ مِنۡۢ بَعۡدِهَا لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۱۹﴾﴾ (۱۶/النحل:۱۱۹)

’’جن لوگوں نے نادانی سے برا کام کیا، پھر اس کے بعد توبہ کی اور (اپنی) اصلاح کر لی پھر تو آپ کا رب ان کی توبہ کے بعد ضرور بہت بخشنے والا اور بہت مہربان ہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ کے فرامین سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کن لوگوں کے لیے غفور رحیم ہے۔

ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہے!

سوال موسم برسات کی آمد پر کھیتوں میں مینڈکوں کی ٹرٹر کی آوازیں آنا شروع ہو

جاتی ہیں۔لوگ کہتے ہیں کہ مینڈک اللہ تعالیٰ سے بارش مانگتے ہیں۔کیا یہ بات درست ہے؟

جواب تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی پاکی و تسبیح بیان کرتی ہیں جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾

(۱۷/بنی اسراءیل:۴۴)

''ایسی کوئی چیز نہیں جو اُسے (اللہ کو) پاکی اور تعریف کے ساتھ یاد نہ کرتی ہو لیکن ان کے تسبیح بیان کرنے کو تم سمجھتے نہیں ہو۔''

جانور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرنے اور اس سے مانگنے کے علاوہ آپس میں اور دیگر مخلوقات سے بھی گفتگو کرتے ہیں مثلاً سورۃ النحل میں ایک چیونٹی کے دوسری چیونٹیوں سے ہمکلام ہونے کا تذکرہ ملتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۝ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا﴾

(۲۷/النمل:۱۸۔۱۹)

''ایک چیونٹی نے کہا! چیونٹیو! اپنے گھروں (بلوں) میں داخل ہو جاؤ، ایسا نہ ہو کہ بے خبری میں سلیمان اور اُن کا لشکر تمہیں روند ڈالے، اس کی بات سے سلیمان مسکرا کر ہنس دیے۔''

اسی طرح ہد ہد کی گفتگو کا تذکرہ بھی مذکورہ سورت میں ملتا ہے کہ اس نے سلیمان علیہ السلام سے عرض کی:

﴿اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ۝﴾

(۲۷/النمل:۲۲)

''مَیں ایک ایسی چیز کی خبر لایا ہوں کہ تجھے اس کی خبر ہی نہیں، مَیں (ملک) سبا کی ایک یقینی (سچی) خبر تیرے پاس لایا ہوں۔''

کبوتر 'باہو! باہو!' کرتے ہیں!

سوال پنجاب میں بعض لوگوں نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ سلطان باہو کے مزار پر کبوتر ''باہو باہو'' کہتے ہیں! کیا یہ حقیقت ہے؟

جواب اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ ان لوگوں کو کس نے بتایا ہے کہ کبوتر ''باہو، باہو'' کہتے ہیں۔ کیا سلیمان علیہ السلام نے انہیں اطلاع دی ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو یہ پھر ان لوگوں کی منہ کی باتیں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام دنیا کے کبوتروں کی آوازیں ایک جیسی ہے۔ وہ کبوتر جو سلطان باہو کو جانتے بھی نہیں ان کی آواز بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ سلطان باہو کی دنیا میں آمد سے پہلے بھی کبوتروں کی ایسی ہی آواز تھی جو اپنی بولی میں اللہ کی حمد وثناء اور تسبیح بیان کرتے ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے پچھلے سوال کے جواب پر ایک دفعہ پھر نظر ڈال لیں۔

اصل بات جو میں سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ لوگوں نے پہلے سے ایک تصور قائم کر لیا ہے کہ مزار پر کبوتر ''باہو، باہو'' کہتے ہیں۔ اس پیشگی تصور کی بنا پر انہیں کبوتروں کی تسبیح وتحمید میں بھی 'باہو' کی آواز سنائی دیتی ہے۔

غیر اللہ کو پکارنے کا مرض انسانوں میں تو ہے حیوانوں میں نہیں۔ وہ تو صرف خالق کائنات کی ہی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ وہ بیچارے جو جہالت کی وجہ سے خود شرک میں مبتلا ہیں انہیں سارے اپنے جیسے ہی نظر آتے ہیں، لہٰذا ایسا عقیدہ رکھنا بھی شرک کے خطرے سے خالی نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر پتا بھی حرکت نہیں کر سکتا!

سوال دوران گفتگو میں نے ایک آدمی سے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر تو پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ تو اس شخص نے کہا: میں تمہیں ہلا کر بتاتا ہوں! کیا مذکورہ شخص صاحب ایمان ہی رہتا ہے یا اسے تجدید ایمان کی ضرورت ہے یا پھر اسے کیا کرنا چاہیے؟

جواب اس شخص کو چاہیے کہ فوراً اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے اور توبہ کرے، سوال میں

بیان کردہ سوچ اور فکر کا حامل شخص قطعاً مسلمان نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کا اللہ جل جلالہ پر ایمان درست نہیں۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی کئی ایک صفات کی نفی ہوتی ہے اور ان بیسیوں آیات قرآنی کا انکار لازم آتا ہے جن میں اللہ تعالیٰ کے قادر وقدیر، عزیز وغالب اور جبار وقہار ہونے کا تذکرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مہلت دے رکھی ہے لیکن اگر وہ چاہے تو مذکورہ شخص کے ہاتھ شل اور پیروں کو چلنے سے معذور کرسکتا ہے۔ اس کی بینائی چھین اور عقل سلب کرسکتا ہے، اسے فوری موت سے ہمکنار بھی کرسکتا ہے۔ وہ جو چاہے کرسکتا ہے وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے وہ تو کن فیکون کا مالک ہے۔

صحیح راہنمائی کے لیے درج ذیل آیات پر ایک نظر ڈال لیں:

① ﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ﴾ (۱۲/یوسف:۲۱)

''اللہ اپنے ارادے اور امر پر غالب ہے۔''

② ﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (۲/البقرۃ:۲۰)

''اور اگر اللہ چاہے تو ان کے کانوں اور ان کی آنکھوں کو بیکار کردے یقیناً اللہ ہر چیز پر پوری طرح قدرت رکھنے والا ہے۔''

③ ﴿وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓي اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ۝ وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰي مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا وَّلَا يَرْجِعُوْنَ ۝﴾

(۳۶/یٰس:۶۶۔۶۷)

''اور اگر ہم چاہتے تو ان کی آنکھیں بے نور کردیتے تو یہ راستے کی طرف دوڑتے پھرتے لیکن انہیں کیسے دکھائی دیتا؟ اور اگر ہم چاہتے تو ان کی جگہ پر ہی ان کی صورتیں مسخ کردیتے تو نہ وہ چل سکتے اور نہ لوٹ سکتے۔''

④ ﴿اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَاۗءِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۝﴾ (۳۴/سبا:۹)

''اگر ہم چاہیں تو انہیں زمین میں دھنسا دیں یا ان پر آسمان سے ٹکڑے گرا دیں۔

یقیناً اس میں نشانی (پوری دلیل) ہے ہر اُس بندے کے لیے جو رُجوع اور عاجزی کرنے والا ہو۔"

⑤ ﴿ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ ﴾

(۳۵/فاطر:۲)

"اور جسے اللہ روک دے اسے کوئی جاری کرنے والا نہیں اور وہی بہت غالب بھرپور حکمت والا ہے۔"

طاغوت کسے کہتے ہیں؟

سوال طاغوت کسے کہتے ہیں؟ راہنمائی کریں۔

جواب لغت میں "طغی" سے مراد سرکشی ہے۔ ہر سرکش (جو کہ اپنی جائز حد سے تجاوز کر جاتا ہے) اور اللہ کے سواہر معبود طاغوت ہے۔(المفردات للراغب)

جو مخلوق بھی خالق کے سامنے تکبر و سرکشی کرے اور بغاوت کا رویہ اختیار کرے اسے طاغوت کہتے ہیں۔ بعض مفسرین کے نزدیک معبودِ حقیقی کے مقابلے میں ایک بندے کی سرکشی کو تین مراتب میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ بندہ اقرار تو خالق کائنات کی فرمانبرداری کا کرے لیکن عملی طور پر اس کے احکام کی صریح نافرمانی کرے جو کہ فسق ہے۔ دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری سے اصولاً منحرف ہو کر اپنے آپ کو خود مختار سمجھنے لگ جائے یا معبودِ حقیقی کے سوا کسی اور کی عبادت کرنے لگے جو کہ کفر و شرک ہے۔ سوم یہ کہ بندہ خالق کا باغی ہو کر خود اپنا حکم (الامر) چلانے لگے۔ اس مقام پر جو شخص پہنچ جائے وہ طاغوت ہے۔ اس سلسلے میں محمد بن سلیمان تمیمی رحمہ اللہ نے بڑی جامع تعریف (Definition) کی ہے، لکھتے ہیں:

والطاغوت عام فكل ما عبد من دون الله ورضى بالعبادة من معبود او متبوع او مطاع فى غير طاعة الله ورسوله فهو طاغوت (الواجبات المتحتمات)

"طاغوت کا لفظ وسیع المفہوم ہے۔ ہر وہ چیز جس کی اللہ کے سوا عبادت کی جائے اور وہ اس عبادت کو، جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے مقابلے میں کی

جارہی ہو، پسند کرے، طاغوت ہے۔''

طاغوت کا مفہوم سمجھنے کے لیے درج ذیل آیات پر غور کریں:

① ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴾ (۴/النساء:۵۱)

''(اے نبی) کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کا ایک حصہ ملا وہ بت اور طاغوت پر یقین رکھتے ہیں اور کفار (مشرکین مکہ) کے بارے میں کہتے (سمجھتے) ہیں کہ مسلمانوں سے یہ زیادہ ٹھیک راہ پر ہیں۔''

② ﴿ قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴾ (۵/المائدۃ:۶۰)

''آپ کہیں: میں تمھیں وہ لوگ بتاؤں جنھیں اللہ کی طرف سے برا بدلہ ملنے والا ہے۔ جن پر اللہ نے لعنت کی اور ان پر غصے ہوا اور ان میں سے کتنوں کو بندر اور خنزیر بنا دیا اور جنھوں نے طاغوت (شیطان) کی عبادت کی یہی لوگ بدتر مقام والے اور سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔''

③ ﴿ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ ﴾ (۲/البقرۃ:۲۵۶)

''یقیناً نیک راہی اور گمراہی واضح ہوگئی ہے تو جو کوئی طاغوت (معبودانِ باطلہ) کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے تو اس نے مضبوط کڑا (سہارا) پکڑ لیا۔''

④ ﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ ﴾ (۱۶/النحل:۳۶)

''اور ہم تو ہر قوم میں ایک رسول بھیج چکے ہیں (یہ حکم دے کر) کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔''

⑤ ﴿ وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝ ﴾ (۳۹/الزمر:۱۷)

''اور جو لوگ طاغوت کی عبادت کرنے سے بچے رہے اور انہوں نے اللہ کی طرف رجوع کیا، ان کے لیے خوشخبری ہے تو (اے نبی!) میرے ان بندوں کو خوشخبری سنا دیں۔''

گویا جسے قرآن میں لا الہ اور ما لکم من الہ سے بیان کیا گیا ہے اسی کو طاغوت کہا گیا ہے۔

طاغوت کی اقسام؟

سوال طاغوت کو کتنی اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؟

جواب طواغیب کی اقسام تو بہت سی ہیں البتہ ان کی بنیادی اقسام کو چار قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

① سب سے بڑا طاغوت ابلیس (شیطان) ہے جو لوگوں کو گمراہی اور غیر اللہ کی عبادت کی طرف بلاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ ﴾ (۴۳/الزخرف:۶۲)

''اولادِ آدم! کیا میں نے تم سے (انبیاء و رسل کے ذریعہ سے) نہیں کہہ دیا تھا کہ شیطان کو نہ پوجنا وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔''

سورۃ النساء میں ارشاد ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ ﴾ (۴/النساء:۶۰)

''کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ (تو) کرتے ہیں کہ وہ اس پر ایمان لائے ہیں جو آپ پر نازل ہوا اور جو آپ سے پہلے اترا (لیکن) وہ چاہتے ہیں کہ اپنا مقدمہ طاغوت (شیطان) کے پاس لے جائیں۔ اور انہیں تو حکم ہو چکا

ہے کہ اس کے ساتھ کفر کریں (شیطان کی بات نہ مانیں) شیطان تو چاہتا ہے کہ انہیں بہکا کر دور پھینک دے۔"

② جس کی اللہ کے سوا عبادت کی جائے اور وہ اس پر راضی ہو۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ﴾ (۲۱/الانبیاء:۲۹)

"جو کوئی ان میں سے یہ کہے کہ میں اس (رحمٰن) کے سوا بندگی کے لائق ہوں تو اسے ہم جہنم کی سزا دیں گے اور شریروں کو ہم ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔"

③ جو شخص اللہ کی نازل کردہ شریعت کے خلاف فیصلے کرے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (۵/المائدۃ:۴۴)

"اور جو لوگ اللہ کی نازل کردہ شریعت کے موافق فیصلے نہ کریں وہی کافر ہیں۔"

یہ یہود کے متعلق ہے جو جان بوجھ کر تورات کے فیصلے چھپاتے تھے اور ان پر عمل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے کافر قرار دیا۔ مگر آیت کے الفاظ عام ہیں۔ مسلمان حاکم پر کفر کا فتویٰ اسی وقت لگایا جا سکتا ہے جب وہ قرآن وحدیث کا انکار کر کے ان کے خلاف فیصلہ صادر کرے۔ ایسے شخص کے کافر ہونے میں کوئی شک نہیں ہوسکتا۔ (تفسیر قرطبی)

④ جو شخص اپنے آپ کو رب کہلوائے یا لوگوں کو اپنی عبادت کی دعوت دے۔ جیسے فرعون اور نمرود وغیرہ۔ فرعون نے کہا:

﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ (۷۹/النزعت:۲۴)

"میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔"

دوسری جگہ آتا ہے کہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کو دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا:

﴿لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ﴾ (۲۶/الشعراء:۲۹)

"اور اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو الٰہ مانا تو میں تجھے ضرور قید کر دوں گا۔"

طاغوت کے مفادات کے لیے لڑائی؟

سوال کیا طاغوت کے مفادات کے لیے لڑائی کرنا جہاد کہلا سکتا ہے؟

جواب: اہل اسلام کا جہاد قطعاً طاغوت کے مفادات کے لیے نہیں ہوتا۔ کفار ومشرکین کی جنگ اور لڑائی طاغوت کے مفادات کے لیے ہوتی ہے۔

چنانچہ ارشادِ رب العزت ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝ ﴾ (۴/النساء:۷۶)

”جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جو کافر ہوئے ہیں وہ طاغوت (شیطان) کی راہ میں لڑائی کرتے ہیں۔ تو تم شیطان کے دوستوں سے لڑو، بلاشبہ شیطان کا مکر وفریب بودا ہے۔“

جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنا دوست بنایا ہو یا جو اللہ تعالیٰ کو دوست رکھتے ہوں۔ اس سے محبت کرتے ہوں وہ کبھی طاغوت کے مفادات کے لیے کام نہیں کریں گے۔ ان کے تمام امور کفار کی روش اور ڈگر کے مخالف ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ملاحظہ کریں:

﴿ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۬ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ ﴾

(۲/البقرۃ:۲۵۷)

”اللہ ایمان والوں کا دوست ہے۔ وہ انہیں (کفر کے) اندھیروں سے نکال کر (ایمان کی) روشنی میں لاتا ہے اور جو لوگ کافر ہوئے ہیں ان کے حمایتی طاغوت ہیں، وہ انہیں روشنی سے نکال کر اندھیروں میں لے جاتے ہیں۔“

شرک

اور

خرافات

امام ضامن کا روپیہ؟

سوال "امام ضامن کا روپیہ" باندھنے کی شرعی طور پر کیا حیثیت ہے؟

جواب بعض کم عقل لوگ موسیٰ کاظم کے بیٹے علی رضا کو امام ضامن کہتے ہیں۔ امام ضامن کی نذر و نیاز کی رقم "امام ضامن کا روپیہ" کہلاتی ہے۔ جسے فاسد العقیدہ لوگ سفر پر جاتے وقت اپنے بازو پر باندھ لیتے ہیں تاکہ دورانِ سفر میں خیریت سے رہیں، جبکہ شریعت نے سفر میں خیریت و عافیت میں رہنے کے لیے دعا سکھلائی ہے نہ کہ امام ضامن کا روپیہ باندھنا۔ دعا کے آخری الفاظ یوں ہیں:

((اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ وَالْخَلِيْفَةُ فِي الْأَهْلِ اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ مِنْ وَّعْثَاءِ السَّفَرِ وَكَآبَةِ الْمَنْظَرِ وَسُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِي الْمَالِ وَالْأَهْلِ))

(مسلم، الحج، استحباب الذکر اذا رکب دابته ...، ح:۱۳۴۲)

"اللہ! تو ہی سفر میں رفیق اور گھر والوں میں نائب ہے۔ اللہ! میں سفر کی مشقت سے، مال اور اہل میں منظر کے غم سے اور ناکام لوٹنے کی برائی سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔"

مقیم و مسافر ہر کسی کا محافظ اور ضامن اللہ ہی ہوتا ہے۔ شریعتِ بیضاء میں مسافر کی مقیم کے لیے اور مقیم کی مسافر کے لیے دعا سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے۔ مسافر سفر پر نکلتے وقت مقیم کے لیے یوں دعا کرے:

((أَسْتَوْدِعُكَ اللّٰهَ الَّذِيْ لَا تَضِيْعُ وَدَائِعُهُ))

(مسند احمد ۲/ ۴۰۳؛ ابن ماجة، ح:۲۸۲۵)

"میں تمہیں اللہ کے سپرد کرتا ہوں جس کے سپرد کی ہوئی چیزیں ضائع نہیں ہوتیں۔"

اور مقیم مسافر کے لیے یوں دعا گو ہو:

((أَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكَ وَأَمَانَتَكَ وَخَوَاتِيْمَ عَمَلِكَ))

(ابن ماجة، الجهاد، تشييع الغزاة و وداعهم، ح:۲۸۲۶)

"میں آپ کے دین، آپ کی امانت اور اعمال کے خاتموں کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔"

جب یعقوب علیہ السلام سے بیٹوں نے کہا:

﴿ فَأَرْسِلْ مَعَنَا أَخَانَا نَكْتَلْ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴾ (۱۲/ یوسف:۶۳)

"تو آپ ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دیجیے کہ ہم پیمانہ بھر کر لائیں، اور یقیناً ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

تو انہوں نے جواب دیا:

﴿ فَاللَّهُ خَيْرٌ حَافِظًا ﴾ (۱۲/ یوسف:۶۴)

"اللہ ہی بہت بہتر حافظ ہے۔"

لہٰذا سفر میں خیر و عافیت میں رکھنے والا امام ضامن نہیں، اللہ رحیم و کریم ہے۔

مزید برآں نذر و نیاز عبادت ہے اور تمام عبادات اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں۔ آپ نماز میں بھی پڑھتے ہیں:

((اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ))

(بخاری، الاذان، التشهد فی الاخرۃ، ح:۸۳۱)

"زبان کی عبادتیں، بدنی اور مالی عبادات اللہ ہی کے لیے ہیں۔"

تو اگر کوئی شخص کسی اور کے لیے نذر و نیاز مانتا ہے تو وہ شرک کا ارتکاب کرتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ لَا شَرِيكَ لَهُ ﴾ (۶/ الانعام:۱۶۲۔۱۶۳)

"آپ فرما دیجیے کہ بالیقین میری نماز، میری ساری عبادت، میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہان کا مالک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔"

ملحوظہ: معلوم نہیں کہ اب بھی لوگ امام ضامن کا "روپیہ" ہی باندھتے ہیں یا روپے کی قیمت

گرنے کی وجہ سے پچاس، سو، پانچ سو، ہزار یا پانچ ہزار کا نوٹ استعمال کرتے ہیں اور یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ دیگر ممالک کے جہلاء اس مذموم مقصد کے لیے پاکستانی کرنسی درآمد کرتے ہیں یا پھر ڈالر، پونڈ وغیرہ سے ہی کام چلا لیتے ہیں!

قبر پر سجدہ کرنا شرک ہے؟

سوال کیا قبر پر تعظیمی سجدہ کرنا شرک ہے؟

جواب ہر قسم کی عبادت اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔لہٰذا تمام بدنی عبادات بھی اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔ارشاد نبوی ہے:

((اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ))

(بخاری، الاذان، التشهد فی الاخرة، ح:۸۳۱)

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ ۝ لَا شَرِيكَ لَهُ﴾ (۶/الانعام:۱۶۲۔۱۶۳)

”آپ فرمادیجیے کہ یقیناً میری نماز، میری ساری عبادت، میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہان کا مالک ہے۔اس کا کوئی شریک نہیں۔“

سجدہ عبادت کا کامل ترین مظہر ہے۔یہ انتہائی تذلل اور عاجزی وانکساری کی علامت ہے اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی اس کی حقیقی مستحق ہے،لہٰذا قبروں پر سجدہ کرنا شرک ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ﴾ (۲۲/الحج:۷۷)

”ایمان والو! رکوع اور سجدہ کرو،اور اپنے رب کی عبادت کرو۔“

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا﴾ (۵۳/النجم:۶۲)

”اللہ کے لیے ہی سجدہ کرو اور اسی کی عبادت کرو۔“

پھر یہ بھی ثابت شدہ حقیقت ہے کہ سجدہ اسی کو کیا جاتا ہے جو خالق ہو۔ یہ سجدہ تلاوت کی ایک دعا سے بھی معلوم ہوتا ہے:

((سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ خَلَقَهُ وَشَقَّ سَمْعَهُ وَبَصَرَهُ بِحَوْلِهِ وَقُوَّتِهِ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ))

(ترمذی، الجمعة، ما یقول فی سجود القرآن، ح:۵۸۰؛ ابوداؤد، ح۱۴۱۴)

"میرے چہرے نے اس ہستی کے لیے سجدہ کیا جس نے اسے پیدا کیا، اور اپنی قوت وطاقت سے کان اور آنکھیں عطا کیں۔ (ارشاد باری تعالیٰ ہے) اللہ بابرکت ہے جو بہترین پیدا کرنے والا ہے۔"

جو شخص مخلوقات میں سے کسی کو سجدہ کرتا ہے وہ دراصل اس کی عبادت کرتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت کرنے والا شمار نہیں ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۭ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴾

(۴۱/حم السجدة:۳۷)

"اور دن رات اور سورج چاند بھی اسی کی نشانیوں میں سے ہیں، تم سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو بلکہ سجدہ اس اللہ کو کرو جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے، اگر تمہیں اسی کی عبادت کرنی ہے تو۔"

﴿اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلوق کو سجدہ کرنا خالص عبادت الٰہی کے منافی ہے۔ اس لیے جو ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کا اعتقاد رکھتا ہو اور اس کا اعتراف واقرار کرتا ہو، اس کے لیے روا نہیں ہے کہ وہ کسی قبر وغیرہ کو سجدہ کرے۔

ہر قسم کا سجدہ عبادت ہے، یہ حقیقت درج ذیل حدیث سے معلوم بھی ہوتی ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

ان رسول اللهﷺ كان فی نفر من المهاجرين والانصار فجاء بعير فسجد له فقال اصحابه: يا رسول الله! يسجد لك البهائم

والشجر فنحن احق ان نسجد لك فقال:((اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَاَكْرِمُوْا اَخَاكُمْ))

(مسند احمد ٦/ ٧٦، و فيه علی بن زيد و هو ضعيف عند الجمهور)

اللہ کے رسول ﷺ مہاجرین وانصار کی ایک جماعت میں موجود تھے کہ ایک اونٹ نے آ کر آپ کو سجدہ کیا۔ صحابہ نے کہا: اللہ کے رسول! آپ کو جانور اور درخت سجدہ کرتے ہیں ان سے زیادہ تو ہمارا حق ہے کہ ہم آپ کو سجدہ کریں؟ آپ نے فرمایا: ''اپنے رب کی عبادت کرو اور اپنے بھائی کی تعظیم کرو۔''

((اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ)) کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس سجدے کی اجازت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مانگ رہے تھے آپ ﷺ نے اسے عبادت قرار دیا اور اسے رب تعالیٰ کے لیے کرنے کا حکم صادر کیا۔ اس قسم کے سجدے کو لوگ اپنے خیال کے مطابق تکریمی یا تعظیمی سجدہ کہتے ہیں جبکہ نبی اکرم ﷺ نے اسے عبادت کا نام دیا ہے۔ شریعتِ اسلامیہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی بھی چیز کو کسی بھی قسم کا سجدہ کرنا جائز نہیں۔ قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

اتيت الحيرة فرأيتهم يسجدون لمرزبان لهم فقلت: رسول اللهﷺ احق ان يسجد له فاتيت رسول اللهﷺ فقلت انی اتيت الحيرة فرايتهم يسجدون لمرزبان لهم فانت احق ان نسجد لك قال:((اَرَاَيْتَ لَوْ مَرَرْتَ بِقَبْرِیْ اَكُنْتَ تَسْجُدُ لَهٗ؟)) قال: قلت لا، قال:((فَلَا تَفْعَلُوْا))

(ابوداؤد، النکاح، فی حق الزوج علی المرأة، ٢١٤٠)

''میں شہر حیرہ میں گیا، مَیں نے وہاں کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے راجہ کو سجدہ کرتے ہیں۔ مَیں نے دل میں کہا: بلاشبہ اللہ کے رسول ﷺ سجدہ کیے جانے کے زیادہ حق دار ہیں۔ چنانچہ مَیں نے آپ کے پاس آ کر کہا: مَیں نے حیرہ میں لوگوں کو دیکھا کہ راجہ کو سجدہ کرتے ہیں۔ آپ اس بات کے زیادہ حق دار ہیں کہ

ہم آپ کو سجدہ کریں۔ آپ نے فرمایا: بھلا بتاؤ تو سہی کہ اگر تو میری قبر کے پاس سے گزرے تو کیا اس پر سجدہ کرے گا؟ میں نے عرض کیا: نہیں۔ فرمایا: ''تم یہ کام بھی نہ کرو۔''

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلوقات میں سے کسی زندہ، مردہ اور قبر و حجر وغیرہ کو سجدہ کرنا جائز نہیں۔ اسی حدیث میں آپ ﷺ نے مخلوقات کو سجدہ کرنے سے بھی منع فرمایا:

((فَلَا تَفْعَلُوْا، لَوْ كُنْتُ اٰمِرًا اَحَدًا اَنْ يَّسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ النِّسَاءَ اَنْ يَّسْجُدْنَ لِاَزْوَاجِهِنَّ لِمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَهُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ حَقٍّ))

(ابو داوٗد، النکاح، فی حق الزوج علی المرأۃ، ح:۲۱۴۰)

''ایسا مت کرو اگر میں کسی کو کسی کے لیے سجدہ کرنے کا حکم کرتا تو عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کریں کیونکہ مردوں کا اللہ نے عورتوں پر (بڑا) حق مقرر کیا ہے۔''

سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ملک شام گئے وہاں یہود و نصاریٰ کو دیکھا یسجدون لاحبارھم ورہبانیھم کہ وہ اپنے علماء اور مشائخ کو سجدہ کرتے تھے۔ انہوں نے پوچھا: ایسا کیوں کرتے ہو؟ کہا: یہ انبیاء کی تحیت (سلام) ہے۔ معاذ رضی اللہ عنہ نے آپ سے عرض کی کہ ہم زیادہ حقدار ہیں کہ اپنے نبی ﷺ کو سجدہ کریں۔ آپ نے فرمایا: ''انہوں نے اپنی کتاب بدل دی ہے۔ اگر میں کسی کے لیے سجدہ کا حکم کرتا تو شوہر کے عظیم حق کے سبب عورت کو حکم دیتا۔'' (مسند احمد ۴/۳۸۱)

قبروں پر سجدہ کرنے والوں کو نبی اکرم ﷺ نے ملعون قرار دیا ہے۔ دعائے نبوی ہے:

((اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا يُّعْبَدُ اِشْتَدَّ غَضَبُ اللّٰهِ عَلٰى قَوْمٍ اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَاءِهِمْ مَسَاجِدَ))

(مؤطا امام مالک، قصر الصلاۃ فی السفر، جامع الصلاۃ، ح:۳۱۶، مرسلاً؛ مسند حمیدی، ح: ۱۰۲۵؛ مسند احمد ۲/ ۲۴۶، موصول)

''اللہ! میری قبر کو بت نہ بنانا کہ پوجی جائے۔ ایسی قوم پر اللہ کا شدید غضب نازل ہو جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔''

ارشاد نبوی ہے:

((لَعَنَ اللّٰهُ قَوْمًا اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَاءِ هِمْ مَسَاجِدَ)) (مسند احمد ۲/ ۲۴۶)

''اس قوم پر اللہ لعنت کرے جنھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔''

اس حدیث سے ملتی جلتی دیگر بھی کئی احادیث ہیں۔اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قبروں پر سجدے کرنا قبروں کی عبادت ہے نیز ایسے لوگ مغضوب علیہم ہیں، بعض احادیث میں ایسے لوگوں کو بدترین مخلوق قرار دیا گیا ہے۔ایک حدیث میں ((اُولٰٓئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللّٰهِ)) (بخاری، ح: ۴۲۷، ۴۳۴، ۱۳۴۱، ۳۸۷۸؛ مسلم، ح: ۵۲۸) کے الفاظ ہیں۔

حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مجھے ایک حدیث پہنچی کہ ایک صحابی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم حضور کو بھی ایسا ہی سلام کرتے ہیں۔جیسا کہ آپس میں:

افلا نسجدلك؟ قال: ((لَا وَلٰكِنْ اَكْرِمُوْا نَبِيَّكُمْ وَاعْرِفُوا الْحَقَّ لِاَهْلِهٖ فَاِنَّهٗ لَا يَنْبَغِيْ اَنْ يُّسْجَدَ لِاَحَدٍ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ)) فانزل الله تعالىٰ:

﴿ وَلَا يَأْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝﴾ (۳/ آل عمران: ۸۰) ❶

کیا ہم آپ کو سجدہ نہ کریں؟ فرمایا: نہیں، بلکہ اپنے نبی کی تعظیم کرو اور سجدہ خاص حق خدا ہے اسی کے لیے رکھو۔ کہ اللہ کے سوا کسی کو سجدہ سزاوار نہیں۔اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری (ترجمہ) ''نبی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ تمہیں حکم فرمائے

---

❶ اس روایت کو علامہ سیوطی نے لباب النقول میں بایں الفاظ نقل کیا ہے: اخرج عبدالرزاق فی تفسیره عن الحسن قال: بلغنی ان رجلا قال: یا رسول الله . . . اس روایت کے ان الفاظ سے ہی پتا چل رہا ہے کہ یہ مرسل ہے۔(محمد ارشد کمال)

نیز حافظ ابن حجر عسقلانی نے اسے عبد بن حمید کے حوالے سے العجاب فی بیان الاسباب ۲/ ۷۰۵ میں نقل کیا ہے۔اسی طرح ابوالحسن علی بن احمد الواحدی نے اسباب النزول، ص: ۶۴ میں اسے حسن بصری سے بلا سند نقل کیا ہے۔ یہ مرسل ہونے کی وجہ سے ہی ضعیف ہے۔نیز دیکھیں الاستیعاب فی بیان الاسباب ۱/ ۲۶۸، ۲۶۹ (ابوالحسن مبشر احمد ربانی)

کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو رب ٹھہراؤ، کیا نبی تمہیں کفر کا حکم دے گا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو۔'' (حرمت سجدۂ تعظیم از احمد رضا خان بریلوی، ص:۱۱)

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو سجدہ کرنا اسے رب بنانا ہے۔ نیز یہ کہ ایسا کرنا کفر ہے۔

روح کون نکالتا ہے؟

سوال روح کون نکالتا ہے؟ ملک الموت، بہت سے فرشتے یا اللہ تعالیٰ؟

جواب ظاہری سبب کوئی بھی ہو حقیقتاً موت و حیات کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی محی و ممیت ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

① ﴿ وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ۝ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ۝ ﴾ (۵۳/النجم:۴۳،۴۴)

''اور یہ کہ وہی ہنساتا ہے اور وہی رُلاتا ہے، اور یہ کہ وہی مارتا اور جلاتا ہے۔''

② ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ ﴾

(۳/ال عمران:۱۵۶)

''ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنھوں نے کفر کیا اور اپنے بھائیوں کے بارے میں، جب کہ وہ سفر میں ہوں یا جہاد میں، کہا کہ اگر یہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل کیے جاتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس خیال کو اللہ ان کی دلی حسرت کا سبب بنا دے۔ اللہ جلاتا ہے اور مارتا ہے اور اللہ تمہارے عمل کو خوب دیکھ رہا ہے۔''

③ ﴿ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ ﴾ (۷/الاعراف:۱۵۸)

''جس کی بادشاہی آسمانوں اور زمین میں ہے اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق

نہیں، وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ تو تم اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے نبی اُمی پر جو کہ اللہ پر اور اس کے کلمات (احکام) پر ایمان لاتے ہیں، اور اُن کی پیروی کرو تا کہ تم راہِ راست پر آجاؤ۔"

④ ﴿ كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝﴾ (۲/البقرۃ:۲۸)

"تم اللہ کے ساتھ کیسے کفر کرتے ہو حالانکہ تم مردہ تھے تو اس نے تمہیں زندہ کیا، پھر تمہیں مار ڈالے گا، پھر زندہ کرے گا، پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔"

⑤ ﴿ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ۝﴾ (۲۲/الحج:۶۶)

"اسی نے تمہیں زندگی بخشی، پھر وہی تمہیں مار ڈالے گا اور پھر وہی تمہیں زندہ کرے گا۔ بے شک انسان البتہ بہت ناشکرا ہے۔"

⑥ ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۭ هَلْ مِنْ شُرَكَاۗىِٕكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ۧ﴾ (۳۰/الروم:۴۰)

"اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہیں روزی دی، پھر تمہیں مار ڈالے گا، پھر زندہ کرے گا۔ بتاؤ تمہارے (ٹھہرائے ہوئے) شریکوں میں سے کوئی بھی ایسا ہے جو ان میں سے کچھ بھی کر سکتا ہو؟ اللہ کے لیے پاکی اور برتری ہے ہر اس شریک سے جو یہ لوگ مقرر کرتے ہیں۔"

⑦ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا تھا:

﴿ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۭ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ (۲/البقرۃ:۲۵۸)

"میرا رب تو وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ وہ کہنے لگا: میں بھی جلاتا ہوں

اور مارتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا: اللہ سورج کو مشرق کی طرف سے لے آتا ہے تُو اسے مغرب کی طرف سے لے آ تو وہ کافر ششدر رہ گیا، اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

⑧ اللہ تعالیٰ کے احسانات کا تذکرہ کرتے ہوئے ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿ وَالَّذِي يُمِيتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ ﴾ (۲۶/الشعراء:۸۱)

''اور وہی مجھے مار ڈالے گا اور پھر وہی مجھے زندہ کرے گا۔''

⑨ ﴿ أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۖ فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ۖ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۖ وَانظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ ۖ وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴾ (۲/البقرۃ:۲۵۹)

''یا اس شخص کی طرح کہ جس کا گزر اس بستی سے ہوا جو چھت کے بل اوندھی پڑی ہوئی تھی، وہ کہنے لگا: اس کی موت کے بعد اللہ اسے کس طرح زندہ کرے گا؟ تو اللہ نے اسے سو سال مار دیا، پھر اسے اٹھا کر پوچھا: کتنی مدت آپ پر گزری؟ وہ کہنے لگا: ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ۔ اس نے فرمایا: بلکہ تُو سو سال تک رہا، اب تُو اپنے کھانے پینے کو دیکھ کہ بالکل خراب نہیں ہوا، اور اپنے گدھے کی طرف بھی دیکھ۔ ہم تجھے لوگوں کے لیے ایک نشانی بناتے ہیں، تُو ہڈیوں کی طرف دیکھ کہ ہم انہیں کس طرح اٹھاتے ہیں، پھر اُن پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ تو جب یہ سب ظاہر ہو چکا تو وہ کہنے لگا: مَیں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔''

ان آیات میں موت دینے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے۔

انبیاء ورسل علیہم السلام اور دیگر مومنین نے جو اللہ تعالیٰ سے دعائیں کیں ان سے بھی معلوم

ہوتا ہے کہ موت وحیات پر اختیار اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ یوسف علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی:

﴿ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَّأَلْحِقْنِي بِالصّٰلِحِينَ ﴾ (۱۲/یوسف:۱۰۱)

''تو مجھے اسلام کی حالت میں فوت کرنا اور نیکوں میں ملا دینا۔''

نماز جنازہ میں پڑھنے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ دعا بھی سکھلائی ہے:

((اَللّٰهُمَّ مَنْ اَحْيَيْتَهُ مِنَّا فَاَحْيِهِ عَلَى الْاِسْلَامِ وَ مَنْ تَوَفَّيْتَهُ مِنَّا فَتَوَفَّهُ عَلَى الْاِيْمَانِ))

''اللہ! تو ہم میں سے جسے زندہ رکھے اسے اسلام پر زندہ رکھنا اور جسے تو فوت کرے اسے ایمان پر موت دینا۔''

اہل ایمان اللہ تعالیٰ سے یوں دعا کرتے ہیں:

﴿ رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا ۚ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ ﴾ (۳/آل عمران:۱۹۳)

''ہمارے رب! ہم نے سنا کہ منادی کرنے والا باآواز بلند ایمان کی طرف بلا رہا ہے کہ (لوگو!) اپنے رب پر ایمان لے آؤ تو ہم ایمان لے آئے۔ ہمارے رب! اب تو ہمارے گناہ معاف کر اور ہماری برائیاں ہم سے دور کر دے اور ہماری موت نیکوں کے ساتھ کرنا۔''

وہ جادوگر جو موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں آئے تھے، جب مسلمان ہو گئے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یوں دعا کی:

﴿ رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ ﴾ (۷/الاعراف:۱۲۶)

''ہمارے رب! ہمارے اوپر صبر کا فیضان کر اور ہماری جان حالت اسلام پر نکالنا۔''

موت کا وقت بھی اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفَّاكُمْ ۚ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ قَدِيرٌ ﴾ (۱۶/النحل:۷۰)

''اللہ نے ہی تم سب کو پیدا کیا ہے، پھر وہی تمہیں فوت کرے گا، تو تم میں ایسے بھی ہیں جو بدترین عمر کی طرف لوٹائے جاتے ہیں کہ بہت کچھ جاننے بوجھنے کے بعد نہ جانیں۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۝ ﴾

(۶۳/المنفقون:۱۱)

''اور جب کسی کا مقررہ وقت آ جاتا ہے پھر اللہ اسے ہرگز مہلت نہیں دیتا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۝ ﴾ (۳۹/الزمر:۴۲)

''اللہ ہی روحوں کو اُن کی موت کے وقت اور جن کی موت نہیں آئی انہیں ان کی نیند کے وقت قبض کر لیتا ہے۔ پھر جن پر موت کا حکم لگ چکا ہوتا ہے انہیں روک لیتا ہے اور دوسری (روحوں) کو ایک مقررہ وقت کے لیے چھوڑ دیتا ہے، غور کرنے والوں کے لیے ان میں یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔''

سلیمان علیہ السلام کی موت کے بارے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ۝ ﴾ (۳۴/سبا:۱۴)

''پھر جب ہم نے اُن پر موت کا حکم بھیج دیا تو ان کی جنات کو کسی نے خبر نہ دی سوائے گھن کے کیڑے کے جو اُن کی لاٹھی کو کھا رہا تھا، تو جب وہ (سلیمان علیہ السلام) گر پڑے اس وقت جنوں پر عیاں ہو گیا کہ اگر وہ غیب دان ہوتے تو اس ذلت کے

عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔"

روح نکالنے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کی لگائی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم مطابق روح قبض کرتے ہیں۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴾

(۳۲/السجدة:۱۱)

"کہہ دیجیے کہ تمہیں موت کا فرشتہ فوت کرے گا جو تم پر مقرر کیا گیا ہے پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔"

ملک الموت کے ساتھ چونکہ دیگر فرشتے بھی ہوتے ہیں اس لیے جان نکالنے کی نسبت ان کی طرف کر دی گئی ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ﴾ (۶/الانعام:۶۱)

"اور وہی اپنے بندوں کے اوپر غالب اور برتر ہے اور تم پر نگہداشت رکھنے والے بھیجتا ہے، یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آ پہنچتی ہے اس کی روح ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے قبض کر لیتے ہیں اور ذرا بھی کوتاہی نہیں کرتے۔"

اہل ایمان کی روح نکالنے کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (۱۶/النحل:۳۲)

"وہ جن کی جانیں فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ پاک ہوں، کہتے ہیں کہ تمہارے لیے سلامتی ہی سلامتی ہے، تم جنت میں جاؤ اپنے ان اعمال کے بدلے جو تم کرتے تھے۔"

اس کے برعکس کفار و مشرکین اور ظالموں کی جان کنی کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۠ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا

نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (۱۶/النحل:۲۸)

''وہ جو اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں فرشتے جب ان کی جان قبض کرنے لگتے ہیں اس وقت وہ جھک جاتے ہیں کہ ہم برائی نہیں کرتے تھے! کیوں نہیں؟ اللہ اسے خوب جاننے والا ہے جو کچھ تم کرتے تھے۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ﴾ (۶/الانعام:۹۳)

''اور اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہوسکتا ہے جو اللہ پر تہمت لگائے یا یوں کہے: مجھ پر وحی آتی ہے حالانکہ اس کے پاس کسی بات کی بھی وحی نہیں آتی۔ اور جو شخص یوں کہے کہ جو اللہ نے نازل کیا ہے اسی طرح کا میں بھی لاتا ہوں اور اگر آپ اس وقت دیکھیں جب کہ ظالم لوگ موت کی سختیوں میں ہوں گے اور فرشتے اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے (اور کہہ رہے ہوں گے) کہ ہاں اپنی جانیں نکالو! آج تمہیں ذلت کی سزا دی جائے گی اس سبب سے کہ تم اللہ کے ذمے جھوٹی باتیں لگاتے تھے اور اللہ کی آیات سے تکبر کرتے تھے۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا﴾ (۴/النساء:۹۷)

''جو لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں جب فرشتے ان کی روح قبض کرتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے؟ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم اپنی جگہ کمزور

اور مغلوب تھے۔ فرشتے کہتے ہیں: کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم ہجرت کر جاتے؟ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ پہنچنے کی بُری جگہ ہے۔''

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا ۙ الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ﴾ (۸/الانفال:۵۰)

''کاش! تو دیکھتا جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں! ان کے چہروں اور سُرینوں پر مارمارتے ہیں اور (کہتے ہیں) تم جلنے کا عذاب چکھو!''

سورۂ محمد میں یوں فرمایا:

﴿ فَكَيْفَ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ ﴾ (۴۷/محمد:۲۷)

''ان کی کیسی درگت بنے گی جب فرشتے ان کی روح قبض کرتے ہوئے ان کے چہروں اوران کی سرینوں پر ماریں گے!''

مذکورہ بالا تمام آیات وحوالہ جات سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرشتوں کی معیت میں ملک الموت آتا ہے اور جان قبض کرتا ہے۔

قبروں پر چادریں چڑھانا؟

سوال آج کل عام رواج چل نکلا ہے کہ جب بھی کوئی عرس وغیرہ ہوتا ہے یا کوئی افسر کسی خاص مہم پر ہوتا ہے تو کسی بزرگ کی قبر پر چادر چڑھاتا ہے اور جتنا بڑا مزار ہوتا ہے اسی حساب سے اس پر چادریں چڑھانے کا زور ہوتا ہے۔ آیا شریعت مطہرہ میں اس کی کوئی گنجائش ہے؟

جواب ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر چادر چڑھانے کی نذر مانی گئی ہو تو اسے پورا نہیں کرنا چاہیے کیونکہ غیر اللہ کے لیے نذر ماننا حرام ہے۔ چادر پوش قبروں سے تذکیر آخرت کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ نیز یہ مال ودولت کا ضیاع بھی ہے۔ قبر پر چادر چڑھانے سے پہلے یہ بھی سوچ لینا چاہیے کہ نبی ﷺ کے دور میں بھی تو قبریں تھیں۔ آپ ﷺ نے کبھی کسی قبر پر چادر نہیں چڑھائی۔ اگر یہ کوئی کرنے کا کام ہوتا تو آپ ﷺ کم از کم اس ''کارِ خیر'' سے محروم نہ رہتے۔ مزید برآں روئے زمین کی قبروں سے افضل قبر (قبر نبی ﷺ) پر بھی کبھی کسی صحابی

نے غلاف نہیں چڑھایا کسی دوسری قبر کی، خواہ صاحبِ قبر کوئی بزرگ ہی کیوں نہ ہو، کیا حیثیت ہے؟ لہٰذا اس غیر شرعی حرکت سے باز آ جانا چاہیے۔

ملحوظہ: آجکل قبروں پر ایسے غلاف اور چادریں چڑھائی جاتی ہیں جن پر قرآنی آیات کندہ ہوتی ہیں جس سے آیات کی بے ادبی ہوتی ہے۔ بعض دفعہ اُن پر کتے پیشاب کر جاتے ہیں۔ بعض قبرستانوں میں تو یہ عبارت ''قبروں پر قرآنی آیات نہ لکھیں جانور پیشاب کرتے ہیں'' بڑے جلی حروف سے لکھی ہوتی ہے لیکن بے ادب ہیں کہ باز نہیں آتے۔

مسلمان 'پتھر' کو کیوں چومتے ہیں؟

سوال مسلمان ایک پتھر (حجرِ اسود) کو کیوں چومتے ہیں؟ اس پتھر کی کیا حیثیت ہے؟ کیا یہ درست ہے کہ یہ پتھر جنت سے آیا ہے؟ حجرِ اسود کے بوسے کو بنیاد بنا کر کیا نیک لوگوں کی قبروں کو چوما جا سکتا ہے؟

جواب حجرِ اسود کو چوم کر یا ہاتھ لگا کر طواف شروع کرنا مسنون ہے۔ اتباعِ سنت میں ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پتھر کو چومتے رہے ہیں جیسا کہ خلیفہ ثانی کا مشہور فرمان اور عمل ہے کہ وہ حجرِ اسود کے پاس آئے اور اسے بوسہ دے کر فرمایا:

انی اعلم انك حجر لاتضر ولاتنفع، و لو لا انی رایت رسول اللهﷺ یقبلك ماقبلتك (بخاری، الحج، ما ذکر فی الحجر الاسود، ح:۱۵۹۷)

''مَیں جانتا ہوں کہ تُو ایک پتھر ہے، نہ نقصان پہنچا سکتا ہے نہ نفع۔ اگر مَیں نے اللہ کے رسول ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو تجھے بوسہ نہ دیتا۔''

اس روایت کی روشنی میں مولانا محمد داؤد راز رحمہ اللہ نے درج ذیل تفصیل بیان کی ہے:

حجرِ اسود وہ کالا پتھر ہے جو کعبہ کے مشرقی کونے میں لگا ہوا ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ حجرِ اسود جنت کا پتھر ہے۔ پہلے وہ دودھ کی طرح سفید تھا پھر لوگوں کے گناہوں نے اسے کالا کر دیا۔ حاکم (۱/۴۵۷) کی روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ بات سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: اے امیر المومنین! یہ پتھر بگاڑ اور فائدہ کر سکتا ہے، قیامت کے دن اس کی آنکھیں، زبان اور ہونٹ ہوں گے اور وہ گواہی دے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر

فرمایا: ابوالحسن! جہاں تم نہ ہو وہاں اللہ مجھے نہ رکھے۔ ذہبی نے کہا کہ حاکم کی روایت ساقط ہے۔ (یہ روایت صحیح نہیں، اگر یہ روایت صحیح بھی ہوتی تو زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہوسکتا تھا کہ حجر اسود کو چومنے کی وجہ سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اجر وثواب عطا کریں گے اور حجر اسود سے گواہی دلوائیں گے۔ شہباز حسن) خود مرفوع حدیث میں نبی ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے بھی حجر اسود کو بوسہ دیتے وقت ایسا ہی فرمایا تھا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ (اخرجه ابن ابی شیبة)

اس کا مطلب یہ ہے کہ تجھے بوسہ دینا محض نبی ﷺ کی اتباع کی نیت سے ہے۔

اس روایت سے صاف نکلا کہ قبروں کی چوکھٹ چومنا یا قبروں کی زمین چومنا یا خود قبر کو چومنا یہ سب ناجائز کام ہیں بلکہ بدعاتِ سیئہ ہیں۔ کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کو صرف اس لیے چوما کہ نبی ﷺ نے اسے چوما تھا اور نبی ﷺ یا صحابہ سے کہیں منقول نہیں کہ انہوں نے قبر کو بوسہ دیا ہو۔ یہ سب کام جاہلوں نے نکالے ہیں اور شرک ہیں کیونکہ جن کی قبروں کو چومتے ہیں انہیں اپنے نفع ونقصان کا مالک گردانتے ہیں اور ان کے نام کی دہائی دیتے ہیں اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں۔ لہٰذا شرک ہونے میں کیا کلام ہے۔ کوئی خالص محبت سے چومے تو یہ بھی غلط اور بدعت ہوگا۔ اس لیے کہ نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے کہیں کسی قبر کو چومنے کا ثبوت نہیں ہے۔

مولانا محمد داؤد راز لکھتے ہیں:

یہ وہ تاریخی پتھر ہے جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مبارک جسموں سے مَس ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جس وقت خانہ کعبہ کی عمارت بن چکی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے کہا کہ ایک پتھر لاؤ تاکہ اسے ایسے مقام پر لگادوں جہاں سے طواف شروع کیا جائے۔ تاریخ مکہ میں ہے:

فقال ابراهيم لاسماعيل عليه السلام يا اسماعيل ايتني بحجر اضعه حتى يكون علما للناس يبتدون منه الطواف......

بعض روایات کی بنا پر اس پتھر کی تاریخ حضرت آدم علیہ السلام کے جنت سے ہبوط کے ساتھ

ساتھ شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ طوفانِ نوح کے وقت یہ پتھر بہہ کر کوہِ ابوقبیس پر چلا گیا تھا۔ اس موقع پر کوہِ ابوقبیس سے صدا بلند ہوئی کہ اے ابراہیم! یہ امانت ایک مدت سے میرے سپرد ہے۔ آپ نے وہاں سے اس پتھر کو حاصل کر کے کعبہ کے ایک کونے میں نصب کر دیا اور کعبہ شریف کا طواف کرنے کے لیے اسے شروع کرنے اور ختم کرنے کا مقام ٹھہرایا۔

حاجیوں کے لیے حجرِ اسود کو بوسہ دینا یا ہاتھ لگانا یہ کام مسنون اور کارِ ثواب ہے۔ قیامت کے دن یہ پتھر ان لوگوں کی گواہی دے گا جو اللہ کے گھر کی زیارت کے لیے آتے ہیں اور اسے ہاتھ لگا کر حج یا عمرہ کی شہادت ثبت کراتے ہیں۔

بعض روایات کی بنا پر عہدِ ابراہیمی میں پیمان لینے کا یہ عام دستور تھا کہ ایک پتھر رکھ دیا جاتا جس پر لوگ آ کر ہاتھ مارتے۔ اس کے معنیٰ یہ ہوتے کہ جس عہد کے لیے وہ پتھر گاڑا گیا ہے اسے انہوں نے تسلیم کر لیا ہے بلکہ اپنے دلوں میں اس پتھر کی طرح مضبوط گاڑ لیا، اسی دستور کے موافق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مقتدیٰ قوموں کے لیے یہ پتھر نصب کیا تا کہ جو شخص بیت اللہ شریف میں داخل ہو اس پتھر پر ہاتھ رکھے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے توحیدِ الٰہی کے بیان کو قبول کر لیا۔ اگر جان بھی دینی پڑے گی تو اس سے منحرف نہ ہو گا، گویا حجرِ اسود کا استلام اللہ تعالیٰ سے بیعت کرنا ہے۔ اس تمثیل کی تصریح ایک حدیث میں یوں آئی ہے:

عن ابن عباس مرفوعا الحجر الاسود يمين الله في ارضه يصافح به خلقه (طبرانی) [1]

''حضرت ابن عباس سے مرفوعاً روایت ہے کہ حجرِ اسود زمین میں گویا اللہ کا دایاں

---

[1] یہ روایت جابر رضی اللہ عنہ سے یوں مروی ہے: ((الحجر يمين الله في الارض يصافح بها عباده)) (تاریخ مدينة السلام ۳۳۹/۷؛ العلل المتناهية (۹۴۴)؛ الكامل لابن عدی ۳۳۶/۱؛ تاریخ دمشق ۲۱۷/۵۲) علامہ البانی نے اسے منکر قرار دیا ہے۔ (سلسلة ضعيفة: ۲۲۳)؛ اور عبداللہ بن عمرو سے صحیح ابن خزیمة (۲۷۳۷)؛ العلل المتناهية (۹۴۵)؛ مستدرک حاکم ۴۵۷/۱؛ الترغيب و الترهيب ۱۹۴/۲؛ مجمع الزوائد ۲۴۲/۳ مروی ہے۔ اسے اگرچہ منذری نے حسن اور حاکم نے صحیح کہا ہے لیکن عبداللہ بن المؤمل کی وجہ سے ضعیف ہے اور اس میں رکن سے مراد رکن یمانی نہیں بلکہ حجر اسود ہے۔ ملاحظہ ہو حاشية سندهي على مسند احمد، ۵۶۱/۱۱، ابن خزیمہ اور علل وغیرہ۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے غریب الحدیث لابن قتیبہ سے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوفاً ذکر کیا ہے۔ (ابوالحسن مبشر احمد ربانی)

ہاتھ ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے مصافحہ کرتا ہے۔''

حضرت ابن عباس کی دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:

نزل الحجر الاسود من الجنة و هو اشد بیاضا من اللبن فسودته خطایا بنی اٰدم

(ترمذی، الحج، ما جاء فی فضل الحجر الاسود، ح:۸۷۷)

''حجر اسود جنت سے نازل ہوا تو وہ دودھ سے بھی زیادہ سفید تھا مگر انسانوں کی خطا کاریوں نے اسے سیاہ کر دیا۔''

اس سے حجر اسود کی شرافت و بزرگی مراد ہے۔

ایک روایت میں یوں آیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس تاریخی پتھر کو نطق اور بصارت سے سرفراز کرے گا، جن لوگوں نے حقانیت کے ساتھ توحید الٰہی کا عہد کرتے ہوئے اسے چوما ہے ان کے حق میں یہ گواہی دے گا۔ (ترمذی، الحج، ماجاء فی الحجر الاسود، ح:۹۶۱)

ان فضائل کے باوجود کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں کہ یہ پتھر معبود ہے، یا اس کے اختیار میں نفع وضرر ہے۔

حضرت عمر کے تاریخی الفاظ (جو صحاح ستہ اور مسند احمد میں موجود ہیں، جنہیں صحیح بخاری کے حوالے سے پیچھے ذکر کیا گیا ہے) کے بارے میں علامہ طبری مرحوم لکھتے ہیں:

انما قال ذلك عمر لان الناس كانوا حديثى عهد بعبادة الاصنام فخشى عمر ان يظن الجهال ان استلام الحجر من باب تعظيم بعض الاحجار كما كانت العرب تفعل فى الجاهلية فاراد عمر ان يعلم الناس ان استلامه اتباع لفعل رسول اللهﷺ لا كان الحجر ينفع و يضر بذاته كما كانت الجاهلية تعتقده فى الاوثان (فتح البارى)

''حضرت عمر نے یہ اعلان اس لیے کیا کہ اکثر لوگ بت پرستی سے نکل کر قریبی زمانے میں اسلام کے اندر داخل ہوئے تھے۔ حضرت عمر نے اس خطرے کو

محسوس کر لیا کہ جاہل لوگ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ زمانہ جاہلیت کے دستور کے مطابق پتھروں کی تعظیم ہے۔ اس لیے آپ نے لوگوں کو آگاہ کیا کہ حجر اسود کا استلام صرف اللہ کے رسول ﷺ کی اتباع میں کیا جاتا ہے ورنہ حجر اسود اپنی ذات میں نفع یا نقصان پہنچانے کی کوئی طاقت نہیں رکھتا، جیسا کہ اہل جاہلیت کے لوگ بتوں کے بارے میں اعتقاد رکھتے تھے۔''

ابن ابی شیبہ اور دار قطنی نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بھی یہی الفاظ نقل کیے ہیں کہ آپ نے بھی حجر اسود کے استلام کے وقت یوں فرمایا:

''میں جانتا ہوں کہ تیری حقیقت ایک پتھر سے زیادہ کچھ نہیں۔ نفع یا نقصان کی کوئی طاقت تیرے اندر نہیں ہے۔ اگر میں نے نبی ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں بھی تجھے بوسہ نہ دیتا۔'' (العلل للدارقطنی ۱/۱۶۷)

بعض محدثین نے خود نبی کریم ﷺ سے بھی یہ نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے حجر اسود کو بوسہ دیتے ہوئے فرمایا:

''میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے جس میں نفع ونقصان کی تاثیر نہیں ہے۔ اگر مجھے میرے رب کا حکم نہ ہوتا تو میں تجھے بوسہ نہ دیتا۔''

اسلامی روایات کی روشنی میں حجر اسود کی حیثیت ایک تاریخی پتھر کی ہے جسے اللہ کے خلیل ابراہیم علیہ السلام نے خانۂ خدا کی تعمیر کے وقت ایک ''بنیادی پتھر'' کی حیثیت سے نصب کیا۔ اس لحاظ سے دینِ حنیف کی ہزار ہا سالہ تاریخ اس پتھر کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہے۔ اہلِ اسلام اس کی جو بھی تعظیم استلام وغیرہ کی طرح کرتے ہیں وہ سب کچھ صرف اسی بنا پر ہے۔ ملتِ ابراہیمی کے اللہ کے ہاں مقبول ہونا اور مذہبِ اسلام کی حقانیت پر بھی یہ پتھر ایک تاریخی شاہدِ عادل کی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتا ہے جسے ہزار ہا سال کے بے شمار انقلابات فنا نہ کر سکے۔ وہ جس طرح ہزاروں برس پہلے نصب کیا گیا تھا، آج اسی شکل میں اسی جگہ تمام دنیا کے حوادث کا مقابلہ کرتے ہوئے موجود ہے۔ اسے دیکھنے سے، اسے چومنے سے ایک سچے مسلمان موحد کی نظروں کے سامنے دینِ حنیف کے چار ہزار سالہ تاریخی اوراق یکے بعد دیگرے الٹنے لگ

جاتے ہیں۔ حضرت خلیل اللہ اور حضرت ذبیح اللہ علیہما السلام کی پاک زندگیاں سامنے آ کر معرفت حق کی نئی نئی راہیں دماغوں کے سامنے کھول دیتی ہیں۔ روحانیت وجد میں آ جاتی ہے۔ توحید پرستی کا جذبہ جوش مارنے لگتا ہے۔ حجر اسود بنائے توحید کا ایک بنیادی پتھر ہے۔ "دعائے خلیل ونوید مسیحا" حضرت سید الانبیاء کی صداقت کے اظہار کے لیے ایک غیر فانی یادگار ہے۔ اس مختصر سے تبصرہ کے بعد کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ مصنوعاتِ الٰہیہ میں جو چیز بھی محترم ہے وہ بالذات محترم نہیں ہے بلکہ پیغمبرِ اسلام کی تعلیم وارشاد کی وجہ سے محترم ہے۔ اسی کلیہ کے تحت خانہ کعبہ، حجر اسود، صفا مروہ وغیرہ محترم قرار پائے۔ اسی لیے اسلام کا کوئی فعل بھی، جسے وہ عبادت یا لائق عظمت قرار دیتا ہو، ایسا نہیں ہے جس کی سند سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے حق تعالیٰ تک نہ پہنچتی ہو۔ اگر کوئی مسلمان ایسا فعل ایجاد کرے جس کی سند پیغمبر علیہ السلام تک نہ پہنچتی ہو تو وہ فعل نظروں میں کیسا ہی پیارا اور عقل کے نزدیک کتنا ہی مستحسن کیوں نہ ہو، اسلام فوراً اس پر بدعت ہونے کا حکم لگا دیتا ہے اور صرف اس لیے اسے نظروں سے گرا دیتا ہے کہ اس کی سند حضرت رسولِ خدا تک نہیں پہنچتی بلکہ وہ ایک غیر ملہم انسان کا ایجاد کیا ہوا فعل ہے۔

اسی پاک تعلیم کا اثر ہے کہ سارا کعبہ باوجود یکہ ایک گھر ہے مگر حجر اسود اور رکن یمانی و ملتزم پر پیغمبرِ اسلام علیہ السلام نے جو طریقِ استلام یا چمٹنے کا بتایا ہے مسلمان اس سے انچ بھر آگے نہیں بڑھتے۔ نہ دوسری دیواروں کے پتھروں کو چومتے ہیں کیونکہ مسلمان مخلوقاتِ الٰہیہ کے ساتھ تعلقات قائم کرنے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد وعمل کے تابع ہیں۔

سماعِ موتیٰ ثابت ہے؟

سوال کیا اہل قبور سنتے ہیں؟ جب ہم قبرستان میں جا کر سلام کرتے ہیں تو کیا وہ سن کر جواب دیتے ہیں؟

جواب اہلِ قبور دنیا والوں کی باتیں نہیں سنتے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴾ (۳۵/فاطر:۲۲)

"آپ ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں (مدفون) ہیں۔"

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى ﴾ (۳۰/الروم:۵۲)

''آپ مُردوں کو نہیں سنا سکتے۔''

سوئے ہوئے شخص کو سنانے کے لیے جگانا پڑتا ہے اور جو فوت ہی ہو جائے وہ کیونکر سنے گا۔ اس سلسلے میں اصحابِ کہف کا واقعہ ہی لے لیجیے، وہ تین سو نو سال سوئے رہے۔ (الکھف:۲۵) لیکن جب اٹھے تو کہنے لگے: ہم ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ (نیند کی حالت میں) رہے ہیں۔ (ایضاً:۱۹)

۳۰۹ سال کے عرصے میں آندھیاں بھی آئی ہوں گی، زلزلے بھی آئے ہوں گے، پرندے بھی چہچہائے ہوں گے اور درندے بھی دھاڑتے رہے ہوں گے لیکن نہ تو ان اولیاء اللہ نے کچھ سنا اور نہ انہیں کچھ علم ہی تھا حتیٰ کہ انہیں اپنے سونے کا دورانیہ معلوم نہیں تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نبی (عزیر علیہ السلام) کو سو سال کے لیے موت دے دی، جب اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کر کے پوچھا کہ کتنی مدت موت کے عالم میں رہے ہو تو وہ کہنے لگے:

﴿ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ﴾ (۲/البقرۃ:۲۵۹)

''ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ۔''

حالتِ موت میں انہوں نے کچھ سنا! قطعاً نہیں۔

اسی طرح قیامت کے دن جب لوگ زندہ کیے جائیں گے تو وہ خواہ آدم علیہ السلام کے دور میں فوت ہوئے ہوں، کہیں گے:

ہم ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ (موت کے عالم میں) رہے۔ (المؤمنون:۱۱۳، طٰہٰ:۱۰۴)

بعض لوگوں کو اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وغیرہ الفاظ سے، جن سے قبر والوں کو مخاطب کیا گیا ہے، مغالطہ لگ گیا ہے۔ حالانکہ انہیں مخاطب کرنا قبروں کے سامنے ہونے کی وجہ سے ہے، یہ سماعِ موتیٰ کی دلیل نہیں۔ امام طحاوی فرماتے ہیں:

ان الميت لا يخاطب بالسلام لانه ليس اهلا للخطاب......

المقصود منه الدعاء لا الخطاب

(شرح مراقی الفلاح، ص:۳۳۱)

''سلام سے میت کو مخاطب نہیں کیا جاتا کیونکہ وہ تو خطاب کی اہل ہی نہیں ہوتی......اس سے مقصود صرف دعا ہے نہ کہ خطاب۔''

اگر مخاطب کرنے سے سننا ثابت ہوتا ہو تو پھر تو بہت سی ایسی چیزوں کے سننے کو ماننا پڑے گا کہ جن کے سننے کا کوئی بھی قائل نہیں۔ اسے ہم قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں:

قرآنِ کریم میں ﴿یایھا الذین امنوا﴾، ﴿یایھا الذین کفروا﴾، ﴿یایھا الکفرون﴾، ﴿یبنی اسرء یل﴾ ، ﴿یفرعون﴾ وغیرہ الفاظ حکایتاً پڑھے جاتے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ جب ہم یہ الفاظ بولتے ہیں تو اہلِ ایمان اور کفار وغیرہ حاضر ہوتے ہیں یا سن رہے ہوتے ہیں۔

ایک دفعہ موسیٰ علیہ السلام غسل کر رہے تھے، ایک پتھر پر انہوں نے کپڑے رکھے ہوئے تھے، وہ پتھر کپڑوں سمیت بھاگ گیا۔ آپ اس کے پیچھے بھاگے اور فرمایا:

((یَا حَجَرُ ثَوْبِی))

(بخاری، الغسل، من اغتسل عریانا وحدہ فی الخلوۃ، ح:۲۷۸)

''پتھر! میرے کپڑے (چھوڑ دے)''

خلیفہ ثانی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے حجرِ اسود کو مخاطب ہو کر فرمایا:

و الله انی لاعلم انك حجر لاتضر و لاتنفع لولا انی رایت رسول الله يقبلك ماقبلتك

(بخاری، الحج، ما ذکر فی الحجر الاسود، ح:۱۵۹۷؛ مسلم، الحج، استحباب تقبیل الحجر...... ح:۱۲۷۰)

''اللہ کی قسم! مَیں جانتا ہوں تو ایک پتھر ہے، تو نہ نفع دے سکتا ہے نہ نقصان۔ اگر مَیں نے اللہ کے رسول کو نہ دیکھا ہوتا کہ تجھے بوسہ دے رہے ہیں تو مَیں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا۔''

تو کیا پتھروں کو مخاطب کرنے سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ پتھر بھی سنتے ہیں؟

ہلال دیکھ کر پڑھنے کی دعا میں بھی چاند کو اِن الفاظ سے مخاطب کیا جاتا ہے:

((رَبِّیْ وَ رَبُّكَ اللّٰهُ))

(ترمذی، الدعوات، ما یقول عند رویة الهلال، ح:۳۴۵۱۔ اس کی سند میں سلیمان بن سفیان اور بلال بن یحییٰ بن طلحہ ضعیف راوی ہیں، نیز اس کے شواہد بھی ضعیف ہی ہیں۔ محمد ارشد کمال)

''میرا رب اور تیرا رب اللہ ہے۔''

تو کیا چاند بھی سنتا ہے؟

ایک معرکے میں اللہ کے رسول ﷺ کی انگلی زخمی ہوگئی، آپ نے انگلی سے مخاطب ہو کر فرمایا:

((هَلْ اَنْتِ اِلَّا اِصْبَعٌ دَمِیْتِ وَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ مَا لَقِیْتِ))

(بخاری، الجهاد، من ینکب او یطعن فی سبیل الله، ح:۲۸۰۲؛ مسلم، الجهاد، ما لقی النبی ﷺ من اذی المشرکین ...... ح:۱۷۹۶)

''تو تو ایک انگلی ہے جو خون آلود ہوگئی ہے، یہ تکلیف تجھے اللہ کی راہ میں پہنچی ہے۔''

تو کیا اعضائے انسانی بھی سنتے ہیں؟

ان مثالوں سے اہلِ قبور کے سماع کے بارے میں کیے جانے والے استدلال کی غلطی واضح ہو جاتی ہے۔ مذکورہ بالا مثالوں سے عیاں ہوا کہ کسی چیز کو محض مخاطب کرنا اس کے سننے کی دلیل نہیں ہوتا۔

سوال کا دوسرا حصہ سوال سن کر اہلِ قبور کے جواب دینے سے متعلق ہے۔ قبر والوں کو سلام ان کے حق میں خیر و برکت کی دعا ہے۔ یہ انہیں سنانے اور جواب لینے کے لیے نہیں ہوتا اور نہ اس کا کوئی جواب بنتا ہے۔

اگر قبر والے ہماری بات سن سکتے ہیں تو اپنی بات ہم تک پہنچانے کی ان میں کیوں صلاحیت نہیں؟

مزید برآں سلام کے کتنے ہی ایسے مواقع ہیں جہاں پر سلام صرف خیر و برکت اور سلامتی کی دعا کے طور پر استعمال ہوتا ہے جیسے فرشتوں کا اہلِ جنت کو ﴿سلام علیکم﴾ کہنا۔

(الرعد:۲۴؛النحل:۳۲؛الزمر:۷۳)

نماز کے آخر میں سلام کسے کیا جاتا ہے؟ کیا اس کا کوئی جواب دیتا ہے؟ اکیلا نمازی بھی یہی الفاظ کہتا ہے۔

((اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ)) کا نبی ﷺ نے کبھی جواب نہیں دیا تھا، بلکہ خود آپ ﷺ بھی یہی الفاظ پڑھتے تھے۔

عیسیٰ علیہ السلام نے خود اپنے آپ پر سلام کیا تھا۔ (مریم:۳۳) ہم بھی نماز میں اپنے آپ پر (اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا کے الفاظ سے) سلام کہتے ہیں۔ نیز وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ بھی کہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا کبھی کسی نے اس کا جواب دیا ہے یا جواب کے متعلق سوچا ہے؟

اہلِ قبور کے لیے ((يَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنَّا وَالْمُسْتَاْخِرِيْنَ وَ إِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ)) اور ((أَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَ لَكُمُ الْعَافِيَةَ)) کے الفاظ قبرستان میں جانے کے مقاصد کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ قبرستان کی زیارت کے موقع پر درج ذیل دعائیں مسنون ہیں:

((اَلسَّلَامُ عَلٰى أَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَ يَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنَّا وَالْمُسْتَاْخِرِيْنَ وَ إِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ))

(مسلم، الجنائز، ما يقال عند دخول القبور...... ح:۹۷۴؛نسائی:۲۰۳۷؛مسند احمد ۶/ ۲۲۱)

”ان گھروں میں رہنے والے مومنو! اور مسلمانو! تم پر سلام ہو، اللہ ہم میں سے پہلے پہنچنے والوں اور بعد میں آنے والوں پر رحمت کرے اور ہم بھی، ان شاء اللہ، تم سے ملنے والے ہیں۔“

((اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ عَلٰى أَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَ إِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ ،أَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَ لَكُمُ الْعَافِيَةَ))

(مسلم، الجنائز، ما يقال عند دخول القبور...... ح:۹۷۵)

”ان گھروں والے مومنو! مسلمانو! تم پر سلام ہو، ہم بھی، ان شاء اللہ، تم سے ملنے والے ہیں۔ میں اپنے اور تمہارے لیے اللہ سے عافیت مانگتا ہوں۔“

جب سلام سے مقصود اہلِ قبور کو سنانا نہیں اور نہ وہ سنتے ہی ہیں تو جواب دینے کا تو سوال

ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو سنتے ہی نہیں وہ جواب کیا دیں گے! ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ ۘ وَالْمَوْتَىٰ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ ثُمَّ إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ﴾ (٦/الانعام:٣٦)

''وہی لوگ قبول کرتے ہیں (جواب دیتے ہیں) جو سنتے ہیں۔ اور مُردوں کو تو اللہ زندہ کر کے اٹھائے گا پھر وہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔''

جنہیں لوگ پکارتے ہیں وہ روزِ قیامت صاف صاف اعلان کر دیں گے کہ ہم تو تمہاری پکار سے بے خبر تھے، اور یہ بھی ہے کہ وہ قیامت تک جواب نہیں دے سکتے، وہ تو اس سے بھی بے خبر ہیں کہ دوبارہ کب اٹھائے جائیں گے۔ (یونس:٢٩؛ الاحقاف:٥-٦؛ النحل:٣٠-٣١)

وہ دنیا والوں کی کیا سنیں گے اور کیا جواب دیں گے!

اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنا منع ہے؟

سوال سیالکوٹ کے ایک مولوی نے اپنی ایک کتاب میں شاہ اسمٰعیل شہید کی کتاب تقویۃ الایمان کے عقیدہ توحید سے متعلق بعض مندرجات پر اعتراضات کئے ہیں۔ اہلِ توحید کا عقیدہ بیان کرتے ہوئے ایک اعتراض اس نے ''اللہ تعالیٰ کی ذات کو سجدہ کرنے کی ممانعت'' کے تحت یوں پیش کیا: ''عقیدہ: سجدہ نہ کسی زندہ کو کیجئے، نہ کسی مردہ کو۔ نہ کسی قبر کو کیجئے، نہ کسی تھان کو۔ کیونکہ جو زندہ ہے، سو ایک دن مرنے والا ہے۔ (تقویۃ الایمان، ص:٦١)

اسماعیل دہلوی کی اس عبارت کا یہ جملہ کہ سجدہ نہ کسی زندہ کو کیجئے، غور طلب ہے۔ اسماعیل دہلوی کے قانون کے مطابق اس میں خدا تعالیٰ کو سجدہ کرنے سے ممانعت ہے۔ کیونکہ ہمارا خدا تعالیٰ تو زندہ ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: ﴿ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ﴾ وہ زندہ ہے اور قائم رہنے والا ہے۔ اسماعیل دہلوی یہ درس دے رہے ہیں کہ زندہ کو سجدہ نہ کیجئے اور ساتھ ہی آخر میں یہ مفروضہ درج کر دیا کہ کیونکہ جو زندہ ہے، سو ایک دن مرنے والا ہے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ اَلْحَيُّ الْقَيُّومُ زندہ بھی ہے اور نہ مرنے والا ہے۔ اہل سنت و جماعت کا عقیدہ یہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو سجدہ جائز نہیں۔ (ص:٥-٦)

کیا شاہ اسماعیل شہید کا یہی عقیدہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ نہیں کرنا چاہیے، جیسا کہ مولوی

موصوف نے دعویٰ کیا ہے؟

جواب یہ استدلال علمی بد دیانتی کی بدترین مثال ہے۔ یہ استدلال تاویل الکلام بما لا یرضیٰ بہ قائلہ کا مصداق ہے۔ متعصب مولوی نے سیاق وسباق سے پہلو تہی کرکے مزعومہ مطلب نکالنے کی ناکام کوشش کی ہے اور اپنی جہالت کا ثبوت دیا ہے۔ حالانکہ ''ابو داوٗد'' کی جس حدیث کی تشریح میں سوال میں درج کردہ الفاظ شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے لکھے ہیں، وہ حدیث بیان ہی اس مقصد کے لیے کی گئی ہے کہ ثابت کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی بھی زندہ یا مردہ کو سجدہ کرنا جائز نہیں۔ دیگر بادشاہوں کو اُن کی رعایا سجدہ کرتی تھی، تو ایک صحابی قیس بن سعد رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، کہ آپ زیادہ حق رکھتے ہیں، کہ ہم آپ کو سجدہ کریں۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قیس رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

((أَرَأَيْتَ لَوْ مَرَرْتَ بِقَبْرِيْ أَكُنْتَ تَسْجُدُ لَهُ؟)) فقلت :لا ، فقال:

((فَلَا تَفْعَلُوْا)) (ابوداوٗد، النکاح، فی حق الزوج علی المرأۃ، ح: ۲۱۴۰)

''بھلا بتاؤ تو سہی کہ اگر تُو میری قبر پر گزرے تو کیا اس پر سجدہ کرے گا؟ مَیں نے کہا: ''نہیں، تو آپ نے فرمایا کہ یہ کام بھی نہ کرو۔''

اس کی تشریح میں شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''سجدہ کے لائق تو وہی پاک ذات ہے، جو لازوال ہے، معلوم ہوا کہ سجدہ نہ زندہ کو روا ہے اور نہ مردہ کو اور نہ کسی قبر کو روا ہے اور نہ کسی تھان کو۔ کیونکہ زندہ ایک دن مرنے والا ہے اور مرا ہوا بھی کبھی زندہ تھا اور بشر تھا پھر مر کر الٰہ نہیں ہوا بندہ ہی ہے۔''

(تقویۃ الایمان، ص: ۱۵۵۔ ط: مؤسسۃ الحرمین الخیریۃ ، سعودی عرب)

سجدہ کے لائق وہی پاک ذات ہے جو لازوال ہے، سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک زندہ سے اللہ تعالیٰ کے علاوہ جو زندہ مخلوقات ہیں وہ مراد ہیں، انہیں سجدہ کرنا جائز نہیں۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے، کہ اس حدیث ((لَا تَفْعَلُوْا)) اور اس سے پہلے والی حدیث ((اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَاَكْرِمُوْا اَخَاكُمْ)) (مسند احمد ۶/۷۶) پر مولانا اسماعیل دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی

کتاب میں باب کے جلی حروف میں یہ الفاظ موجود ہیں:

اللہ کو سجدہ اور پیغمبر علیہ السلام کی تعظیم (ص:۱۵۳)

کیا یہ وہی عقیدہ نہیں جس کا دعویٰ مولوی صاحب نے کیا ہے کہ ''اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو سجدہ جائز نہیں۔''

جب عقیدہ ایک ہے تو کتاب کے صفحات سیاہ کرنے کا مقصد؟

شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ہم خیالوں کا ہرگز یہ عقیدہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کا سارا زور ہی اس بات پر صرف ہوتا ہے، کہ سجدہ صرف اللہ تعالیٰ کو کرنا چاہیے، دیکھیے شاہ صاحب کتنی وضاحت سے اپنا عقیدہ بیان کرتے ہیں۔تقویۃ الایمان میں ایک عنوان یہ ہے:

''سجدہ صرف اللہ کے لیے۔''

اس عنوان کے تحت ایک آیت پیش کرنے کے بعد اس کی تشریح پیش کرتے ہیں، ملاحظہ کریں:

﴿لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴾ (۴۱/حم السجدۃ:۳۷)

''سورج کو اور چاند کو سجدہ نہ کرو۔اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اسلام میں سجدہ خالق ہی کا حق ہے، لہٰذا کسی مخلوق کو سجدہ نہ کیا جائے، خواہ چاند سورج ہوں، یا نبی ولی ہوں، یا جن اور فرشتے ہوں۔ اگر کوئی کہے کہ پہلے دینوں میں مخلوق کو بھی سجدہ روا تھا مثلاً فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو اور یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا تھا اس لیے اگر ہم بھی کسی بزرگ کو تعظیمی سجدہ کریں تو کیا حرج ہے۔ یاد رکھو اس سے شرک ثابت ہو جاتا ہے، ایمان نکل جاتا ہے۔ آدم علیہ السلام کی شریعت میں بہنوں سے نکاح کرنا جائز تھا اسے دلیل سمجھ کر یہ لوگ اگر بہنوں سے نکاح کر لیں تو کیا حرج ہے، مگر سخت حرج ہے کیونکہ یہاں بہنیں محرمات ابدیہ میں داخل ہیں جو کسی صورت سے حلال ہی نہیں۔ بات یہ ہے

کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دینا چاہیے۔ اللہ کے فرمان کو بلا چوں و چراں دل و جان سے مان لینا چاہیے، خواہ مخواہ کی حجت نہیں پیش کرنی چاہیے، کہ پہلے لوگوں کے لیے تو یہ حکم نہ تھا ہم پر کیوں مقرر کیا گیا۔ ایسی باتوں سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔

اس مضمون کو مثال سے سمجھو کہ ایک بادشاہ کے یہاں ایک مدت تک ایک قانون پر عمل ہوتا رہا پھر قانون بنانے والوں نے اسے منسوخ کر کے اس کی جگہ اور قانون بنا دیا، اب اس نئے قانون پر عمل ضروری ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہنے لگے کہ ہم تو پہلے ہی قانون کو مانیں گے، نئے قانون کو نہیں مانتے وہ باغی ہے اور باغی کی سزا جیل خانہ ہے، اسی طرح ہی اللہ تعالیٰ کے باغیوں کے لیے جہنم ہے۔ (ص:۱۰۹۔۱۱۰)

یہاں پر شاہ صاحب نے غیر اللہ کو سجدہ کرنے کے تمام چور دروازے بند کر دیے ہیں۔

شرکیہ کارڈ

سوال "صاحب ذرا توجہ کی جائے یہ پانچ سورہ ہے۔" بس میں کارڈ بیچنے والے نے کہا، ان پانچ ناموں میں سے مجھے دو سورتوں (۳۶/ یٰس ، ۵۵/ الرّحمٰن) کے نام یاد ہیں، باقی وہ جانے یا اس کا خدا کہ باقی کون سی تین سورتوں کے نام اس نے بتائے، کارڈ پر سوائے خانوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا...... اس کارڈ کے بارے میں ہماری راہنمائی کریں اور یہ بتائیں کہ ایسا کارڈ خریدنا چاہیے یا نہیں؟

جواب اس کارڈ کو پانچ سورہ کہنا غلط ہے، پانچ سورہ کیا اس پر تو ایک سورت بھی نہیں ہے، صرف آیۃ الکرسی، اس کے بعد ایک آیت اور بعض آیات کے کچھ حصے ذکر کیے گئے ہیں، اس کارڈ کے اوپر جو نقش بنا ہوا ہے اس کی فضیلت کے بارے میں ایک روایت بھی اس کارڈ پر دی گئی ہے، پہلے ہم اس روایت کو ذکر کرتے ہیں، پھر اس کی غلطیوں کی نشاندہی کریں گے، لکھا ہے:

> "جناب ابن عباس سے روایت ہے کہ جو کوئی اس نقش کو ایک بار دیکھے تو گویا اس نے عبادت بہت کی اور جو دو بار دیکھے تو گویا سو بار قرآن مجید تمام کیا اور تین بار

دیکھے تو گویا کہ اس نے سونا بہت صدقہ کیا اور جو چار بار دیکھے تو ہزار حج کیے اور جو پانچ بار دیکھے اس نے ہزار رکعت نماز ادا کی اور جو چھ بار دیکھے تو خدا اُس پر آتشِ دوزخ حرام کر دے گا اور جو سات بار دیکھے اسے دولت بہت ملے گی اور جو آٹھ بار دیکھے تو سانپ، بچھو، آسیب اور دنیا کی ہر بلا سے محفوظ رہے اور جو نو بار دیکھے تو پانی میں غرق نہ ہوگا اور جو دس بار دیکھے تو عذابِ قبر اور خوفِ نکیرین سے نجات پائے گا اور گیارہ بار دیکھے تو گناہ اس کے سب بخشے جائیں گے اور بار بار دیکھے تو روزِ قیامت اس کا چہرہ مثل چودھویں رات کے منور ہوگا اور جس گھر میں یہ نقش ہوگا اس گھر میں کوئی بلا نہ آئے گی اور جو بعد نمازِ صبح دیکھے تو چالیس صبح آدم کے برابر نماز ادا کی، اور جو نمازِ ظہر کے بعد دیکھے تو اس نے تین سو حج برابر حضرت کے کیے اور جو بعد نمازِ عصر دیکھے تو چار سو حج برابر موسیٰ کے کیے اور اگر بعد نمازِ مغرب دیکھے تو پانچ سو حج برابر عیسیٰ کے کیے اور بعد نمازِ عشاء کے دیکھے تو اس نے ستر حج برابر اللہ کے رسول ﷺ کے کیے اور مقدمات یا حکام کے روبرو اس تعویذ کو بازو پر باندھ لیا جائے تو ان شاء اللہ کامیابی ہوگی۔''

مذکورہ روایت کئی اعتبار سے غلط ہے:

ابن عباس کے دور میں زیرِ بحث نقش کا کوئی وجود نہیں تھا، کارڈ پر جن دس بارہ اماموں کا ذکر ہوا ہے ان میں سے بیشتر ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

اندرونی ترتیب کی وجہ سے بھی روایت غلط ہے، مثلاً لکھا ہے کہ جو اس نقش کو چار بار دیکھے تو ہزار حج کا ثواب ملے گا اور پانچ بار دیکھنے سے ہزار رکعت نماز کا ثواب ملے گا تو گویا چار بار دیکھنے کا ثواب زیادہ ہے اور پانچ بار دیکھنے کا کم، کیونکہ ہزار رکعت نماز سے ہزار حج کا ثواب کہیں بڑھ کر ہوتا ہے، اسی پر قیاس کرتے ہوئے چھ بار دیکھنے اور گیارہ بار دیکھنے کا موازنہ کر لیا جائے، تقریباً سبھی اعمال کا یہی حال ہے۔

لکھا ہے کہ جو سات بار دیکھے تو اسے دولت بہت زیادہ ملے، اگر یہ بات درست ہو تو دنیا میں کوئی بھی شخص غریب نہ رہے، کوئی محنت و مشقت کرنے کی ضرورت نہیں بس اس کارڈ کو

سات مرتبہ دیکھ کر کروڑ پتی بن جائیں اور کارڈ فروش کو یہ کارڈ بیچنے کی بھی ضرورت نہ رہے بلکہ گھر بیٹھے اسے دیکھ دیکھ کر دولت ''بہت'' کما تا جائے۔ یاللعجب!

تعویذ (تمیمہ) کو گلے اور بازو وغیرہ پر باندھنے کا شریعت اسلامیہ میں کوئی ثبوت نہیں، بلکہ اس کی ممانعت ہے۔

اس روایت میں انبیاء ورسل علیہم السلام کی بے ادبی کا پہلو بھی پایا جاتا ہے۔

کارڈ کی دوسری جانب بعض آیات قرآنیہ (جن کی طرف پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے)، سفر کی دعا، درود ابراہیمی کا ابتدائی حصہ، اللہ تعالیٰ کے بعض اسماء الحسنیٰ، خانوں میں کچھ حروف و ہندسے، بعض اہلِ بیت اور اور مخصوص فرقے کے ائمہ کے نام، تلواریں و علم، نادِعلی اور دیگر شرکیہ وظائف ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں نے کاروبار میں برکت کا جھانسا دے کر اپنے عقائد باطلہ جہلاء میں رائج کرنے کی کوشش کی ہے، نادِعلی (خواہ کبیر ہو یا صغیر) میں مخلوق کو پکارنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ جبکہ قرآن مجید میں تمام تر مشکلات میں اللہ تعالیٰ کو پکارنے کا حکم اور ذکر ملتا ہے، انبیاء علیہم السلام اور دیگر نیک لوگ مشکلات اور دیگر حالات میں اللہ تعالیٰ کو ہی پکارتے رہے ہیں۔

(۲۱/الانبیاء:۹۰؛ ۷۲/الجن:۱۹؛ ۳۲/السجدۃ:۱۶؛ ۱۷/بنی اسرائیل:۵۷؛ ۱۸/الکھف:۲۸؛ ۶/الانعام:۵۲)

قرآن مجید میں صرف اللہ تعالیٰ کو پکارنے کا حکم ملتا ہے۔

(۷/الاعراف:۵۵؛ ۴۰/المومن:۱۴، ۶۰، ۶۵)

مشکلات میں جب اللہ تعالیٰ کو پکارا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ہی مشکل کشائی کرتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِن يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ ۖ وَإِن يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ ۚ يُصِيبُ بِهِ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۚ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝ ﴾

(۱۰/یونس:۱۰۷)

''اور اگر آپ کو اللہ کوئی تکلیف پہنچائے تو بجز اس کے اور کوئی اسے دور کرنے والا نہیں ہے اور اگر وہ آپ کو کوئی خیر پہنچانا چاہے تو اس کے فضل کو کوئی ہٹانے والا نہیں وہ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے نچھاور کر دے اور وہ

بڑی مغفرت بڑی رحمت والا ہے۔"

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ ۖ وَإِنْ يَمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴾ (۶/الانعام:۱۷)

"اور اگر آپ کو اللہ کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کا دُور کرنے والا اُس کے سوا کوئی اور نہیں اور اگر آپ کو اللہ کوئی نفع پہنچائے تو وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔"

اللہ کے سوا کوئی (فوق الاسباب) مشکل کشا اور مددگار نہیں، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴾

(۳/اٰل عمران:۱۶۰)

"اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کرے، ایمان والوں کو اللہ پر ہی بھروسہ رکھنا چاہیے۔"

مذکورہ بالا گزارشات اور حوالہ جات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس نقش کے بہت سے مندرجات اسلامی تعلیمات کے منافی اور عقل سلیم کے خلاف ہیں، لہٰذا اس طرح کے شرکیہ کارڈ کی خرید وفروخت ناجائز ہے۔

شرک کی معافی ہوسکتی ہے؟

سوال کیا شرک کرنے کا گناہ بھی معاف ہوسکتا ہے؟

جواب کوئی ایسا گناہ نہیں جو معاف نہ ہوسکتا ہو۔ کتنے ہی لوگ تھے جو نجاستِ شرک میں لت پت تھے لیکن بعد میں ﴿ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ ﴾ کے مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ اگر شرک کرنے کا مرتکب شخص شرک کرنے سے باز آجائے، اپنے دعوے سے دستبردار ہو جائے اور خلوصِ دل سے توبہ کر لے تو اللہ رحیم وکریم اس کی توبہ قبول کر لیتے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝ وَأَنِيبُوا إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَأَسْلِمُوا لَهُ ﴾ (۳۹/الزمر:۵۳۔۵۴)

''بلا شبہ اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ بے شک وہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔ لہٰذا تم اپنے رب کی طرف رجوع کرو اور اس کے فرمانبردار بن جاؤ۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَمَن يَعْمَلْ سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَجِدِ اللَّهَ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝ ﴾ (۴/النساء:۱۱۰)

''اور جو شخص کوئی برائی کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے پھر اللہ سے استغفار کرے تو وہ اللہ کو بہت بخشنے والا اور بہت مہربانی کرنے والا پائے گا۔''

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿ أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ ﴾ (۹/التوبۃ:۱۰۴)

''کیا انہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔''

بشرطیکہ توبہ جان کنی سے پہلے اور سورج کے مغرب سے طلوع ہونے سے پہلے پہلے کر لی جائے، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۚ ﴾ (۴/النساء:۱۷،۱۸)

''اللہ انہی لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہے جو بوجہ نادانی کوئی برائی کر گزریں۔ پھر جلد اس سے باز آ جائیں اور توبہ کریں تو اللہ بھی ان کی توبہ قبول کرتا ہے۔ اللہ بڑے

علم اور بہت حکمت والا ہے۔ اور اُن کی توبہ نہیں جو برائیاں کرتے چلے جائیں۔ یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے پاس موت آ جائے تو کہہ دے: میں نے اب توبہ کی، اور اُن کی توبہ بھی قبول نہیں ہوتی جو کفر پر ہی مرجائیں۔"

اگر شرک کے گناہ سے توبہ کئے بغیر کسی کی موت واقع ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اسے قطعاً معاف نہیں کرے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ﴾ (۴/النساء:۱۱۶)

"اسے اللہ قطعاً نہ بخشے گا کہ اس کے ساتھ شریک مقرر کیا جائے، اور شرک کے علاوہ گناہ جس کے چاہے معاف کر دیتا ہے اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے والا بہت دُور کی گمراہی میں جا پڑا۔"

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہوا:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى إِثْمًا عَظِيْمًا ﴾ (ایضا:۴۸)

"یقیناً اللہ اپنے ساتھ شریک کئے جانے کو نہیں بخشتا اور اس کے سوا جسے چاہے بخش دیتا ہے اور جو اللہ کے ساتھ شریک مقرر کرے۔ اس نے بہت بڑا گناہ اور بہتان باندھا۔"

مشرک پر جنت حرام ہے۔ (۵/المائدۃ:۷۲)

ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

((يَا ابْنَ آدَمَ إِنَّكَ مَا دَعَوْتَنِيْ وَرَجَوْتَنِيْ غَفَرْتُ لَكَ عَلٰى مَا كَانَ مِنْكَ وَلَا أُبَالِيْ، يَا ابْنَ آدَمَ لَوْ بَلَغَتْ ذُنُوْبُكَ عَنَانَ السَّمَاءِ ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِيْ غَفَرْتُ لَكَ وَلَا أُبَالِيْ، يَا ابْنَ آدَمَ إِنَّكَ لَوْ أَتَيْتَنِيْ بِقُرَابِ الْأَرْضِ خَطَايَا ثُمَّ لَقِيْتَنِيْ لَا تُشْرِكُ بِيْ شَيْئًا لَأَتَيْتُكَ بِقُرَابِهَا مَغْفِرَةً))

(ترمذی ، الدعوات ، فی فضل التوبة و الاستغفار.....ح:۳۵۴۰)

''ابن آدم! جب تک تُو مجھے پکارے اور مجھ سے امید رکھے گا میں تجھے بخشتا رہوں گا چاہے تجھ سے کس قدر گناہ صادر ہوں اور مجھے پروا نہیں۔ آدم کے بیٹے! خواہ تیرے گناہ آسمان کے کنارے تک پہنچ جائیں اور پھر تُو مجھ سے معافی مانگے تو میں تجھے معاف کر دوں گا اور مجھے پروا نہیں۔ انسان! اگر تُو زمین بھر گناہ لے کر میرے پاس آئے اور مجھ سے ایسی حالت میں ملے کہ تُو میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو تو میں زمین کو مغفرت سے بھر کر تیرے پاس آؤں گا۔''

شرک، کفر اور نفاق کی نجاست کی نوعیت؟

سوال شرک، کفر اور نفاق کی نجاست کس نوعیت کی ہے؟ اگر کسی مشرک، کافر اور منافق سے ہاتھ لگ جائے تو کیا ہاتھ ناپاک ہو جاتا ہے؟

جواب راجح موقف یہ ہے کہ شرک و کفر اور نفاق کی نجاست حسی نہیں بلکہ حکمی اور معنوی ہے۔ مشرکین کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِنَّمَا ٱلْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُواْ ٱلْمَسْجِدَ ٱلْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَٰذَا ﴾ (۹/التوبۃ:۲۸)

''ایمان والو! مشرک تو پلید ہیں تو وہ اس برس (۹ھ) کے بعد مسجد حرام (خانہ کعبہ) کے پاس نہ آئیں۔''

منافقین کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ إِنَّهُمْ رِجْسٌ ﴾ (۹/التوبۃ:۹۵)

''یقیناً وہ ناپاک ہیں۔''

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ وَأَمَّا ٱلَّذِينَ فِى قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ وَمَاتُواْ وَهُمْ كَٰفِرُونَ ﴾ (۹/التوبۃ:۱۲۵)

''اور جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہے ان کے حق میں خبث پر خبث زیادہ کیا اور وہ مرے بھی تو کافر کے کافر۔''

منافقین نمازیں پڑھتے اور بہت سے دیگر اچھے کام بھی مسلمانوں کے ساتھ مل کر کرتے مگر مسلمان اپنا جسم ان کے ساتھ لگ جانے پر دھوتے نہیں تھے۔ کفار کے ساتھ بھی لین دین اور دیگر معاملات کر لیتے تھے۔

ایک آیت میں بتوں کو ناپاک قرار دے کر اللہ تعالیٰ نے اُن سے بچنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ ﴾ (۲۲/الحج:۳۰)

''بتوں کی پلیدی سے بچو۔''

جبکہ یہ بت لکڑی، پتھر اور مٹی وغیرہ کے بھی ہو سکتے ہیں، کوئی قبر بھی ہو سکتی ہے کیونکہ اگر کسی قبر کی پوجا کی جائے تو اس کی حیثیت بت کی ہوتی ہے۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے اللہ سے دعا کی تھی کہ اللہ! میری قبر کو بت نہ بنانا کہ اس کی پوجا کی جائے۔

(مسند احمد ۲/ ۲۴۶؛ مسند حمیدی، ح:۱۰۲۵)

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴾ (۵/المائدۃ:۹۰)

''ایمان والو! شراب، جوا، بت اور پانسے ناپاک کام، اعمالِ شیطان سے ہیں ان سے بچتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ۔''

اس آیت میں شراب، جوا، بتوں اور پانسوں کی جس نجاست کا تذکرہ ہے ظاہر ہے کہ وہ حکمی نجاست ہے نہ کہ حسی۔

﴿ إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ ﴾ (۹/التوبۃ:۲۸) کی تفسیر میں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: یہ آیت مشرکوں کے نجس ہونے کی بھی دلیل ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ مومن نجس نہیں ہوتا، باقی رہی یہ بات کہ مشرکوں کا بدن اور ذات بھی نجس ہے یا نہیں۔ جمہور کا قول تو یہ ہے کہ (ان کا جسم) نجس نہیں۔ اس لیے کہ اللہ نے اہل کتاب کا ذبیحہ حلال کیا ہے۔ بعض ظاہر یہ کہتے ہیں مشرکوں کے بدن بھی ناپاک ہیں۔ (ابن حزم کا بھی یہی قول ہے۔ محلّی ۱/ ۱۳۷) حسن

بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جو (مسلمان) ان سے مصافحہ کرے وہ ہاتھ دھوڈالے۔

(ابن کثیر ۳۴۷/۳)

یہ قول امام حسن بصری رحمۃ اللہ سے ثابت نہیں، اسے ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں یوں بیان کیا ہے: حدثنا ابن و کیع قال ثنا ابن فضیل عن اشعث عن الحسن ...... (۸۵۳/۵) ابن وکیع اور اشعث بن سوار دونوں ضعیف ہیں۔ (محمد ارشد کمال)

نوٹ: جس حدیث میں ہے کہ مومن نجس نہیں ہوتا۔ وہ بخاری میں ہے۔ ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

مجھے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ملے جبکہ مَیں جنبی تھا۔ آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، مَیں آپ کے ساتھ چلنے لگا حتی کہ آپ بیٹھ گئے تو مَیں کھسک کر گھر آیا۔ غسل کرکے آپ کے پاس آیا جبکہ آپ ابھی بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے دریافت کیا: ((أَیْنَ کُنْتَ)) ''آپ کہاں چلے گئے تھے؟'' مَیں نے آپ کو صورت حال بتائی تو آپ نے فرمایا:

((سُبْحَانَ اللّٰهِ! یَا اَبَاهُرَیْرَةَ! اِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا یَنْجُسُ))

''سبحان اللہ! ابو ہریرۃ! مومن نجس نہیں ہوتا۔''

(الغسل، الجنب یخرج و یمشی فی السوق وغیرہ، ح:۲۸۵، عرق الجنب وان المسلم لاینجس، ح:۲۸۳)

کفار و مشرکین وغیرہ کی نجاست کا حکمی اور معنوی ہونا درج ذیل دلائل سے بھی ثابت ہے:

① قرآن مجید میں مشرک والدین کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا ﴾ (۳۱/لقمٰن:۱۵)

''اگر وہ تیرے درپے ہوں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک کرے جس کا تجھے کچھ بھی علم نہیں تو ان کا کہنا نہ ماننا، ہاں دنیا (کے کاموں) میں ان کا دستور کے مطابق ساتھ دینا۔''

② شریعتِ اسلامی میں اہلِ کتاب کا ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے شادی کرنا حلال قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۭ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۠ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۡ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ﴾ (المائدۃ:۵)

''آج تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں اور اہل کتاب کا طعام (ذبیحہ) بھی تم پر حلال ہے اور تمہارا طعام ان کے لیے حلال ہے۔ اور پاک دامن مومن عورتیں اور پاکدامن اہل کتاب عورتیں بھی (حلال ہیں) جبکہ تم ان کا مہر دے دو۔''

③ جب ثقیف کے وفد کو اللہ کے رسول ﷺ نے مسجد میں ٹھہرایا تو بعض لوگوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! آپ انہیں مسجد میں ٹھہرا رہے ہیں جبکہ یہ تو پلید ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَيْسَ عَلَى الْاَرْضِ مِنْ اَنْجَاسِ الْقَوْمِ شَيْءٌ اِنَّمَا اَنْجَاسُ الْقَوْمِ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ)) (الطبقات لابن سعد ۱/ ۳۱۲، زاد المعاد/ ۳۹۹)

''ان لوگوں کا نجس ہونا زمین پر کچھ موثر نہیں بلکہ ان کا پلید ہونا خود انہیں پر ہے۔''

④ نجران کے عیسائی جب نبی اکرم ﷺ سے مذاکرات کے لیے آئے تو انہیں مسجد نبوی میں ٹھہرایا گیا تھا۔

⑤ یمامہ کے رئیس ثمامہ بن اُثال جب حالت شرک میں گرفتار ہوئے تو انہیں مسجد نبوی کے ستون کے ساتھ باندھا گیا تھا۔

(بخاری، المغازی، وفد بنی حنیفة و حدیث ثمامة بن اثال، ح:۴۳۷۲)

اگر ان کے مسجد میں آنے سے مسجد گندی ہو جاتی تو انہیں مسجد میں داخلے کی اجازت نہ ملتی یا ان کے مسجد میں داخلے کے بعد مسجد نبوی کو دھویا جاتا نیز وہ لوگ بھی ضرور اپنے ہاتھ دھویا

کرتے جو مشرک قیدیوں کو گرفتار کرتے یا انہیں پابند سلاسل کرنے پر معمور تھے۔

⑥ ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں:

لما فتحت خیبر اهدیت للنبی ﷺ شاۃ فیها سم فقال النبی ﷺ...... ((هَلْ جَعَلْتُمْ فِيْ هٰذِهِ الشَّاةِ سُمًّا؟)) قالوا: نعم ......

(بخاری، الجزیة، اذا غدر المشرکون بالمسلمین هل یعفی عنهم؟ ح: ۳۱۶۹، ۴۲۴۹، ۵۷۷۷)

''جب خیبر فتح ہوا تو (یہودی کی طرف سے) نبی ﷺ کو بکری کے گوشت کا ہدیہ پیش کیا گیا جس میں زہر تھا۔ نبی ﷺ نے دریافت کیا...... کیا تم نے اس بکری کے گوشت میں زہر ملایا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: ہاں۔''

یہ زہر آلود گوشت آپ نے اور ایک صحابی بشر بن براء رضی اللہ عنہ نے تناول کر لیا تھا۔ صحابی کی اسی زہر سے موت واقع ہو گئی تھی۔

⑦ ایک مشرکہ کے پاس پانی کے مشکیزے تھے جن میں موجود پانی کو ایک برتن میں انڈیل دیا گیا۔ پھر آپ نے لوگوں میں منادی کر دی:

((اِسْقُوْا وَاسْتَقُوْا))فسقی من سقی و استقی من شاء وکان اخر ذالک ان اعطی الذی اصابته الجنابة اناء من ماء، قال((اِذْهَبْ فَاَفْرِغْ عَلَيْكَ))

(بخاری، التیمم، الصعید الطیب وضوء المسلم یکفیه من الماء، ح: ۳۴۴)

''خود بھی سیر ہو کر پئیں اور (جانوروں وغیرہ کو بھی) پلائیں۔'' تو جس نے چاہا پانی پیا اور پلایا، آخر میں اس شخص کو ایک برتن میں پانی دے دیا گیا جسے غسل کی حاجت تھی، آپ نے اس سے فرمایا: جاؤ اس پانی سے غسل کر لو۔''

⑧ جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

کنا نغزوا مع رسول الله ﷺ فنصیب من اٰنیة المشرکین واسقیتهم فنستمتع بها فلا یعیب ذلك علیهم

(ابو داؤد، الاطعمة، فی الاکل فی انیة اهل الکتاب، ح: ۳۸۳۸؛ مسند احمد ۳/ ۳۷۹)

''ہم اللہ کے رسول ﷺ کی معیت میں جہاد پر جاتے تو ہم مشرکوں سے برتن

اور مشکیزے لے کر استعمال کر لیتے۔ آپ (ﷺ) اسے معیوب نہ سمجھتے تھے۔"

البتہ بعض احادیث سے بادی النظر میں اشکال پیدا ہوتا ہے۔ ان احادیث میں ایک روایت ابوثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! ہم اہل کتاب کے ملک میں رہتے ہیں اور ان کے برتنوں میں کھاتے ہیں، اور ہم شکار والی زمین میں رہتے ہیں، جہاں میں اپنے تیر سے شکار کرتا ہوں اور اپنے سدھائے ہوئے کتے سے شکار کرتا ہوں اور ایسے کتوں سے بھی جو سدھائے ہوئے نہیں ہوتے تو اس میں سے کیا چیز ہمارے لیے جائز ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

((اَمَّا مَاذَكَرْتَ اَنَّكَ بِاَرْضِ قَوْمِ اَهْلِ الْكِتَابِ تَاْكُلُ فِيْ اٰنِيَتِهِمْ فَاِنْ وَجَدْتُّمْ غَيْرَ اٰنِيَتِهِمْ فَلَا تَاْكُلُوْا فِيْهَا وَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاغْسِلُوْهَا ثُمَّ كُلُوْا فِيْهَا......))

(بخاری، الذبائح والصید، ماجاء فی التصید، ح:۵۴۸۸؛ مسلم، الصید والذبائح، الصید بالکلاب المعلمۃ، ح: ۱۹۳۰)

"آپ نے جو یہ کہا ہے کہ تم اہل کتاب کے ملک میں رہتے ہو اور ان کے برتنوں میں بھی کھاتے ہو تو اگر تمہیں ان کے برتنوں کے سوا دوسرے برتن مل جائیں تو ان کے برتنوں میں نہ کھاؤ، لیکن ان کے برتنوں کے سوا دوسرے برتن نہ ملیں تو انہیں دھو کر ان میں کھا لو......"

ایک روایت میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ سے مجوس کی ہانڈیوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَنْقُوْهَا غَسْلًا وَ اطْبَخُوْا فِيْهَا))

(ترمذی، السیر، ماجاء فی الانتفاع بأنیة المشرکین، ح: ۱۵۶۰)

"انہیں دھو کر صاف کر لو اور پھر ان میں پکا لو۔"

اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان ہانڈیوں میں خنزیر پکاتے تھے اور برتنوں میں شراب پیتے تھے۔ ان برتنوں کے حرام چیزوں سے آلودہ ہونے کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ نے دیگر

برتنوں کے ہوتے ہوئے ان برتنوں میں کھانے پینے کی اجازت نہ دی اور اگر دیگر برتن دستیاب نہ ہوں تو کفار ومشرکین کے برتنوں کو دھو کر استعمال کر لینے کی اجازت ہے۔
ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا کہ ہم اہل کتاب کی ہمسائیگی میں رہتے ہیں۔ وہ اپنی ہانڈیوں میں خنزیر پکاتے اور برتنوں میں شراب پیتے ہیں۔ (کیا ہم ان کے برتن استعمال کر سکتے ہیں؟) اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((إِنْ وَجَدْتُّمْ غَيْرَ هَا فَكُلُوْا فِيْهَا وَاشْرَبُوْا وَإِنْ لَّمْ تَجِدُوْا غَيْرَهَا فَارْحَضُوْهَا بِالْمَاءِ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا))

(ابو داؤد، الاطعمة، فی استعمال انية اهل الكتاب، ح: ٣٨٣٩)

''اگر تمہیں اور برتن مل جائیں تو ان میں کھاؤ پیو، اور اگر ان کے سوا اور برتن نہ ملیں تو انہیں پانی سے اچھی طرح دھو کر ان میں کھا پی لیا کرو۔''

تو معلوم ہوا کہ کفار و مشرکین وغیرہ دیگر گندگیوں پیشاب وغیرہ کی طرح پلید نہیں ہیں بلکہ ان کی نجاست حکمی اور معنوی ہے۔

شارح بلوغ المرام شیخ امیر صنعانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

حق بات یہی ہے کہ تمام اعیان (ذوات واجسام وغیرہ) بنیادی طور پر پاک ہوتے ہیں اور ان کے حرام ہونے کی وجہ سے ان کا نجس ہونا ضروری نہیں۔ مثلاً بھنگ حرام ہے لیکن پاک ہے، نشہ آور اشیاء اور زہر قاتل کے نجس ہونے کی کوئی دلیل نہیں تاہم ہر نجس شے حرام ہے مگر ہر حرام نجس نہیں ...... جیسا کہ ریشم اور سونا پہننا (مردوں کے لیے) حرام ہے لیکن بالاتفاق پاک ہے۔ (سبل السلام ۱/۲۶)

مشرک والدین کے ساتھ حسن سلوک

سوال میرے والد کافر و مشرک ہیں، مجھے اُن سے کیسا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟

جواب آپ اپنے والد کی عزت و تکریم کریں، اُن سے حسن سلوک کریں، ان کی خدمت کریں اور ان پر خرچ کریں اس کے ساتھ ساتھ ان کی خیر خواہی کریں یعنی انہیں ادب واحترام سے اسلام کی دعوت بھی دیں جیسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو دعوت دی

تھی۔ انہیں شرک کے انجام سے ڈرائیں، اسلام کی دعوت دینے میں کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں، خود بھی ان کی ہدایت کے لیے دعا کریں اور دوسرے نیک لوگوں سے بھی دعا کروائیں۔ لیکن اگر آپ کے والد آپ کو اسلام سے برگشتہ کرنا چاہیں اور شرک کرنے پر زور دیں تو اس معاملے میں جہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہے ہرگز ان کی اطاعت وفرمانبرداری نہ کریں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴾ (۳۱/لقمٰن:۱۵)

''اور اگر وہ دونوں تجھ پر اس بات کا دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ شریک کرے جس کا تجھے علم نہ ہو تو ان کا کہنا نہ ماننا، ہاں دنیا میں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا اور اس کی راہ چلنا جو میری طرف جھکا ہوا ہو تم سب کا لوٹنا میری ہی طرف ہے تم جو کچھ کرتے ہو اُس سے مَیں تمہیں خبردار کردوں گا۔''

جب ایک شخص کسی کی بات کو ماننے سے انکار کرتا ہے تو طبعی طور پر اس سے دُوری پیدا ہوتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ﴿ وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا ﴾ کے الفاظ سے والدین سے حسن سلوک اور صلہ رحمی کا حکم دیا ہے۔ البتہ کفار ومشرکین سے دلی طور پر محبت کرنا ہرگز درست نہیں خواہ والدین اور قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِنْهُ وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴾ (۵۸/المجادلۃ:۲۲)

''اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والوں کو آپ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرنے والوں سے محبت رکھتے ہوئے ہرگز نہ پائیں گے گو وہ ان کے

باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے کنبہ (قبیلے) کے عزیز ہی کیوں نہ ہوں، یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے اور جن کی تائید جبرائیل کے ذریعے سے کی ہے اور جنہیں ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں بہہ رہی ہیں جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہے اور یہ اللہ سے خوش ہیں یہ اللہ کا لشکر ہے، آگاہ رہو بیشک اللہ کی جماعت والے ہی کامیاب لوگ ہیں۔"

مسئلے کی تحقیق کے لیے والد کو کہیں لے کر جانا کیا والد کی بے ادبی ہے؟

سوال کسی مسئلے میں والدِ محترم سے میری گفتگو ہو رہی تھی کہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مَیں نے عرض کیا کہ چلو خطیب صاحب سے مسئلہ پوچھ لیتے ہیں۔ مَیں اپنے والدِ محترم کو امام صاحب کے پاس لے گیا۔ جب مَیں نے صورتِ حال امام صاحب سے بیان کی تو اُن کے پاس بیٹھے ہوا ایک شخص کہنے لگا: تم نے اپنے والد صاحب کی بے ادبی کی ہے کہ تم نے انہیں یہاں لانے پر اصرار کیا ہے۔ کیا اصرار کر کے انہیں امام کے پاس لے جانا اُن کی بے ادبی کے زمرے میں آتا ہے؟

جواب والدین کا ادب و احترام کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ ان کی خیر خواہی اور بہتری کا جذبہ ضرور دل میں موجزن ہونا چاہیے۔ والدین کو (ادب و احترام کے ساتھ) راہِ راست پر لانا بھی نیکی ہے۔

نیک نیتی کے ساتھ استفسار کی غرض سے والد کو عالِم کے پاس لے جانا اُن کی بے ادبی کے زُمرے میں نہیں آتا۔ ابو یزید معن بن یزید بن اخنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

میرے باپ یزید نے کچھ دینار صدقے کے لیے نکالے اور وہ انہیں مسجد (مسجدِ نبوی) میں ایک آدمی کے پاس رکھ آئے (تاکہ وہ کسی محتاج کو دے دے۔) مَیں مسجد میں آیا تو مَیں نے وہ دینار لے لیے (کیونکہ مَیں ضرورت مند تھا۔) اور وہ لے کر آ گیا (والدِ محترم کو معلوم ہوا) تو انہوں نے فرمایا:

واللہ! مَیں نے تجھے دینے کا ارادہ ہی نہیں کیا تھا۔ چنانچہ مَیں اپنے والد کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے

پاس لے آیا اور یہ جھگڑا آپ کے سامنے پیش کر دیا۔ آپ نے فرمایا:

((لَكَ مَا نَوَيْتَ يَا يَزِيْدُ وَ لَكَ مَا اَخَذْتَ يَا مَعْنُ))

(بخاری، الزکوۃ، اذا تصدق علی ابنه و هو لایشعر، ح:۱۴۲۲)

"یزید! تیرے لیے تیری نیت (کا ثواب) ہے، اور اے معن! تُو نے جو لیا ہے وہ تیرے لیے (جائز) ہے۔"

نوٹ: معن، اُن کے والد یزید اور دادا اخنس تینوں صحابی ہیں۔

ایک گناہ سے توبہ دوسرے گناہ کا ارتکاب! کیا توبہ قبول ہو جائے گی؟

سوال اگر کوئی شخص ایک گناہ سے توبہ کر لیتا ہے تو کیا اس کی توبہ درست ہوگی؟ جبکہ وہ کسی دوسرے گناہ کا مسلسل ارتکاب کیے جا رہا ہو؟

جواب ایک گناہ سے توبہ درست ہے اگرچہ توبہ کرنے والا کوئی دوسرا گناہ کر رہا ہو بشرطیکہ یہ دوسرا گناہ نہ تو پہلے گناہ کی نوع سے ہو اور نہ اس سے متعلق ہی ہو۔ مثلاً ایک آدمی نے سود سے تو توبہ کی مگر شراب نوشی سے نہیں کی تو اس کی سود سے توبہ درست متصور ہوگی۔ البتہ اگر ایک شخص سود کی ایک قسم سے تو توبہ کر لیتا ہے مگر دوسری قسم کا سود لیتا رہتا ہے تو اس کی توبہ قبول نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر کسی نے بھنگ اور چرس پینے سے توبہ کی مگر شراب پیتا رہا تو بھی توبہ قبول نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اس بات پر توبہ کرے کہ فلاں عورت سے بدکاری نہیں کروں گا مگر کسی دوسری سے کرتا رہے تو ایسی توبہ صحیح نہ ہوگی۔ لہٰذا ان کی کارگزاری صرف یہ ہے کہ انہوں نے گناہ کی ایک نوع کو چھوڑا تو اسی گناہ کی دوسری قسم کی طرف رخ موڑ لیا۔

(میں توبہ تو کرنا چاہتا ہوں لیکن؟ص:۵۸،۵۹)

البتہ یہ بات ہرگز نہ بھولیے کہ شرک کا ارتکاب کرنے کی صورت میں تمام اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔ دریں صورت پہلے بنیادی خرابی دُور کی جائے تو تب توبہ قبول ہوگی ورنہ توبہ درست نہ ہوگی۔ مشرکین کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ ۚ وَفِي النَّارِ هُمْ خَالِدُونَ ﴾ (۹/التوبۃ:۱۷)

"ان کے اعمال غارت و اکارت ہیں اور وہ دائمی جہنمی ہیں۔"

حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں فرمایا:

﴿ وَلَوْ أَشْرَكُوا لَحَبِطَ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴾ (٦/الانعام:٨٨)

''اگر (بالفرض) وہ بھی شرک کرتے تو جو کچھ وہ اعمال کرتے تھے وہ سب اکارت ہو جاتے۔''

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ أُوحِيَ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكَ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴾ (٣٩/الزمر:٦٥)

''اور یقیناً آپ کی طرف بھی اور آپ سے پہلے (تمام انبیاء) کی طرف بھی وحی کی گئی ہے کہ اگر آپ نے شرک کیا تو بلاشبہ آپ کا عمل ضائع ہو جائے گا اور بالیقین آپ زیاں کاروں میں سے ہو جائیں گے۔''

اسی طرح ایمانیات میں سے کسی کا انکار بھی نہ ہو اور نہ کوئی ایسا کام کیا جائے جس سے نیک اعمال بیکار ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں درج ذیل آیات زیرنظر رہیں:

① ﴿ وَمَن يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴾ (٥/المائدة:٥)

''منکرِ ایمان کے اعمال ضائع ہیں اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔''

② ﴿ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ ﴾ (٧/الاعراف:١٤٧)

''اور یہ جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو اور قیامت کے پیش آنے کو جھٹلایا اُن کے اعمال غارت گئے۔''

③ ﴿ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ۝ ذَٰلِكَ جَزَاؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوا وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَرُسُلِي هُزُوًا ﴾ (١٨/الكهف:١٠٥-١٠٦)

''یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں اور اس کی ملاقات سے

کفر کیا اس لیے ان کے اعمال غارت ہو گئے لہٰذا قیامت کے دن ہم ان کا کوئی وزن قائم نہ کریں گے۔ ان کی سزا جہنم ہے کیونکہ انہوں نے کفر کیا اور میری آیتوں اور میرے رسولوں کا مذاق اڑایا۔"

④ ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ۝﴾ (۴۷/محمد:۸۔۹)

"اور جو لوگ کافر ہوئے ان کے لیے ہلاکت ہے، اللہ نے اُن کے اعمال غارت کر دیے۔ یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی نازل کردہ چیز سے ناخوش ہوئے تو اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیے۔"

⑤ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَاۗقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى ۙ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَـيْـــًٔا ۭ وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ۝﴾

(ایضاً:۳۲)

"یقیناً جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکا اور رسول کی مخالفت کی اس کے بعد کہ ان کے لیے ہدایت واضح ہو چکی۔ یہ ہرگز اللہ کا کچھ بھی نقصان نہیں کر سکتے۔ عنقریب وہ ان کے اعمال رائیگاں کر دے گا۔"

⑥ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَاۤ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ۝﴾

(ایضاً:۲۸)

"یہ اس بنا پر ہے کہ یہ اس راہ پر چلے جس سے انہوں نے اللہ کو ناراض کر دیا اور انہوں نے اس کی رضا مندی کو بُرا جانا تو اللہ نے اُن کے اعمال ضائع کر دیے۔"

⑦ ﴿اُولٰۗىِٕكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ۭ﴾ (۳۳/الاحزاب:۱۹)

"یہ (منافق) ایمان لائے ہی نہیں لہٰذا اللہ نے ان کے اعمال نابود کر دیے ہیں۔"

⑧ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا

لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾ (۴۹/الحجرات:۲)

''ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے اونچی نہ کرو اور نہ ان سے اونچی آواز سے بات کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے سے اونچی آواز میں کرتے ہو، کہیں (ایسا نہ ہو کہ) تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔''

نبی مکرم ﷺ کی گستاخی کرنے کی صورت میں (اعاذنا اللہ منہ) کسی بھی گناہ سے توبہ قبول نہیں ہوگی تاوقتیکہ اس جرم سے توبہ کی جائے۔

درختوں سے برکت حاصل کرنا؟

سوال برصغیر پاک و ہند میں بہت سے لوگ بعض درختوں کو متبرک جانتے ہیں، برکت حاصل کرنے کے لیے ان کے ساتھ دھاگے، رسیاں، کپڑے باندھتے ہیں نیز ان میں کیل وغیرہ گاڑھتے ہیں۔ کیا درختوں سے برکت حاصل کرنا درست ہے؟

جواب درختوں سے برکت حاصل کرنے کا عمل زمانہ جاہلیت کے مشرکین کے عمل کی طرح ہے۔ قدیم گمراہ لوگ اس قسم کی حرکتیں کیا کرتے تھے۔ ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

ہم نبی ﷺ کے ساتھ حنین کی طرف نکلے اور ہم ابھی نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، راستے میں ایک جگہ بیری کا درخت آیا جسے ذاتِ انواط کہا جاتا تھا، مشرکین وہاں مجاور بن کر بیٹھتے اور اپنے ہتھیار بھی وہاں برکت حاصل کرنے کے لیے لٹکاتے تھے، ہم نے بھی ایک بیری کے پاس سے گزرتے ہوئے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! ہمارے لیے بھی ایک ذاتِ انواط بنا دیں جیسا کہ مشرکین کے لیے ہے تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((اَللّٰهُ اَكْبَرُ اِنَّهَا السُّنَنُ قُلْتُمْ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ كَمَا قَالَتْ بَنُوْا اِسْرَائِيْلَ لِمُوْسٰى: ﴿اجْعَلْ لَّنَاۤ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ﴾ (۷/الاعراف:۱۳۸) لَتَرْكَبُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ))

(مسند احمد ۵/ ۲۱۸)

’’ اللہ اکبر! یہی تو سابقہ قوموں کے راستے ہیں، قسم اس ہستی کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم نے وہی بات کہی ہے جو بنی اسرائیل نے موسیٰ سے کہی تھی: (ارشادِ الٰہی ہے) ’’ہمارے لیے ایسا ایک معبود بنا دیں جیسا اُن کے لیے ہے، آپ نے فرمایا: تم ایسی قوم ہو جو جہالت کا مظاہرہ کر رہے ہو۔‘‘ (پھر فرمایا کہ) ضرور تم اگلی امتوں کے طریقوں پر چلو گے۔‘‘

ایک اور روایت میں ہے:

اللہ کے رسول ﷺ جب حنین کی طرف نکلے تو ایک درخت کے قریب سے گزرے، اس درخت کو ذات انواط کہتے تھے، اس میں مشرک لوگ اپنے ہتھیار برکت حاصل کرنے کے لیے لٹکاتے تھے، تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اللہ کے رسول ﷺ! ہمارے لیے بھی ایک ذات انواط، جیسا کہ مشرکین کا ایک ذات انواط ہے، مقرر کر دیجیے تو نبی ﷺ نے فرمایا:

((سُبْحَانَ اللّٰهِ هٰذَا كَمَا قَالَ قَوْمُ مُوْسٰى: ﴿اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ﴾ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَتَرْكَبُنَّ سُنَّةَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ))

(ترمذی، الفتن، لترکبن سنن من کان قبلکم، ح: ۲۱۸۰)

’’اللہ پاک ہے! یہ تو ویسی بات ہوئی جیسی موسیٰ کی قوم نے کہی: ﴿اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا ...... ﴾ یعنی ہمارے لیے ایک معبود بنا دے۔ قسم ہے پروردگار کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم اپنے اگلوں کے افعال کے مرتکب ہو گے۔‘‘

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ:

① مشرکین اور جہلاء کی مشابہت ممنوع ہے۔

② جس کام پر بنی اسرائیل کی مذمت کی گئی ہے اگر ویسا ہی کام یہ امت بھی کرے تو قابل مذمت ہے۔

③ جو چیز کسی غلط عمل وعقیدے کی طرف لے جانے والی ہو اس سے اجتناب بھی ازبس ضروری ہے، (اسے سد الذرائع کا اصول بھی کہا جاتا ہے۔)

④ نبی اکرم ﷺ کی پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی، ہم دیکھتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ،

مشرکین اور جاہلوں کے طور طریقے مسلمانوں نے بھی اپنا لیے ہیں۔

⑤ شرک سے بچنے کے لیے انسان کو ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے، بسا اوقات آدمی کسی چیز کو اچھا سمجھتا ہے اور سوچتا ہے کہ یہ چیز اسے اللہ تعالیٰ کے قریب کر دے گی درآں حالیکہ وہ چیز اس کے لیے بُری ہوتی ہے، اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دُور اور اُس کی ناراضی کے قریب کر دیتی ہے۔

اہلِ حق کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو متنبہ کریں تا کہ وہ مشرکانہ عقائد و اعمال سے محفوظ رہ سکیں۔

چپ رہنے کی نذر کی شرعی حیثیت

سوال ہمارے ایک بھائی نے کسی مقبرے کے بارے میں نذر مانی کہ وہ وہاں پہنچنے تک کسی سے کوئی بات نہیں کرے گا اور اپنی زبان بالکل بند رکھے گا کیا اس طرح کی نذر ماننا جائز ہے؟

جواب نذر کے بارے میں پہلی چیز تو یہ ہے کہ نذر صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ماننی چاہیے، دوسری بات یہ ہے کہ کسی ایسی چیز کی نذر نہیں ماننی چاہیے جو شریعت میں جائز نہ ہو۔ معصیت (نافرمانی) کی نذر ماننا جائز نہیں۔ ہماری شریعت میں خاموش رہنے کی کوئی نذر ماننا جائز نہیں۔ بلکہ اسے جاہلیت کا عمل قرار دیا ہے۔ قیس بن ابو حازم بیان کرتے ہیں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ احمس قبیلے کی ایک عورت کے پاس تشریف لائے جسے زینب کہا جاتا تھا۔ تو آپ نے اسے دیکھا کہ وہ بولتی نہیں ہے، آپ نے پوچھا:

((مَالَهَا لَا تَتَكَلَّمُ؟)) فقالوا: حجت مصمتة، فقال لها: ((تَكَلَّمِي فَإِنَّ هٰذَا لَا يَحِلُّ، هٰذَا مِنْ عَمَلِ الْجَاهِلِيَّةِ)) فتكلمت

(بخاری، مناقب الانصار، ایام الجاھلیة، ح: ۳۸۳۴)

''یہ گفتگو کیوں نہیں کرتی لوگوں نے بتلایا کہ اس نے خاموش رہنے کا ارادہ کیا ہے۔ آپ نے اسے فرمایا: بات چیت کرو، اس لیے کہ یہ خاموشی جائز نہیں، یہ جاہلیت کا عمل ہے۔ تو اس نے بول چال شروع کر دی۔''

سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

حفظت عن رسول الله ﷺ:((لَا يُتْمَ بَعْدَ احْتِلَامٍ وَلَا صُمَاتَ يَوْمٍ إِلَى اللَّيْلِ)) (ابو داوٗد ، الوصايا ، ما جاء متى ينقطع اليتم ، ح:۲۸۷۳)

''میں نے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان یاد رکھا ہے کہ بالغ ہونے کے بعد یتیمی نہیں رہتی اور پورا دن خاموش رہنے کی کوئی حیثیت نہیں۔''

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ایک دفعہ نبی ﷺ خطبہ دے رہے تھے، اچانک آپ کی نظر ایک (دھوپ میں) کھڑے آدمی پر پڑی، آپ نے اس کے بارے میں پوچھا ،لوگوں نے بتایا کہ اس کا نام ابواسرائیل ہے، اس نے نذر مانی ہے کہ دھوپ میں کھڑا رہے گا، بیٹھے گا نہیں، نہ سایہ حاصل کرے گا اور نہ گفتگو ہی کرے گا اور وہ روزہ رکھے گا۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

((مُرْهُ فَلْيَتَكَلَّمْ وَلْيَسْتَظِلَّ وَلْيَقْعُدْ وَلْيُتِمَّ صَوْمَهُ))

(بخاری ، الايمان والنذور ، النذر فيما لا يملك وفى معصية ، ح:۶۷۰۴)

''اسے کہو کہ وہ گفتگو کرے، سایہ حاصل کرے اور بیٹھ جائے، البتہ اپنا روزہ پورا کرے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خاموش رہنے کی نذر ماننا جائز نہیں، نیز اگر ایسی نذر مان لی ہو تو اسے توڑ دینے کا حکم ہے اور اس کا کوئی کفارہ بھی نہیں کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے اس آدمی کو نذر توڑنے پر کفارہ ادا کرنے کا حکم نہیں دیا۔ یاد رہے کہ مقبروں کی طرف سفر کرنا ناجائز ہے، اس اعتبار سے بھی یہ نذر باطل ہوگی۔

مزاروں پر گھوڑوں کے مجسمے

میلوں اور مزارات کے حامی علماء کے لئے دعوتِ فکر؟

قبروں پر منتیں اور نذریں ماننے والے اوران پر گھوڑے شیر وغیرہ کے مجسمے چڑھانے والے اکثر مسلمانوں کے ’سنی‘ فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کسی بھی عرس پر آنے والوں سے ان کا مسلک اور فرقہ پوچھ کر اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ گھوڑے شاہ (لاہور) کے دربار پر گھوڑوں کے مجسمے چڑھانے والے بھی اکثر اسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے علماء منبر و محراب سے ان خرافات کے خلاف آواز کیوں نہیں بلند کرتے۔ گھوڑے شاہ کے مزار پر کم از کم ایک جلسہ کر کے لوگوں کو خبردار کیوں نہیں کرتے؟ حالانکہ حدیثِ نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر اللہ کی نذر ماننے والے پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے۔ یہ لوگ کم از کم اپنے ہی مفتی کا فتویٰ پڑھ کر ان حرکتوں سے باز آ جائیں:

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اولیاء کرام کے مزارات پر مٹی یا پتھر کے شیر، گھوڑے بنا کر بطورِ نذر یا منت چڑھانا جائز ہے یا نہیں؟ اور شیروں اور گھوڑوں کو ولی اللہ کی قبر پر رکھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب صورت مسئولہ میں مزاراتِ اولیاء پر مٹی پتھر وغیرہ کے شیر یا گھوڑے بطورِ منت چڑھانا حرام ہے۔ اس طرح کی منت کا شریعت مطہرہ میں کوئی ثبوت نہ ہے اور یہ چیزیں منتِ شرعی کے تحت نہیں آتیں کیونکہ نذر (منت) شرعی کی تعریف یہ ہے: حضرت علامہ علاؤالدین حصکفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”نذر (منت) ایک عبادتِ مقصودہ ہے اور عباداتِ واجبہ کی جنس سے ہے جیسے کوئی شخص روزہ، نماز، صدقہ، حج، اعتکاف، وقف یا کسی اور عبادتِ مقصودہ واجبہ کی نذر (منت) مانے۔“

(درمختار علی هامش ردالمحتار، ج:۳، ص:۹۱)

مذکورہ عبارت کا مطلب یہ ہے کہ ایسی عبادت کی نذر ماننے جو عباداتِ واجبہ کی جنس سے ہو یعنی نفل پڑھنے کی نذر مانتا ہے تو اس کی اصل فرض نماز ہے، نفلی روزہ رکھنے کی نذر مانے تو اس کی اصل فرض روزہ ہے، صدقہ کرنے کی نذر مانے تو اس کی اصل زکوٰۃ ہے اور اسی طرح نفل حج کی نذر مانے تو اس کی اصل فرض حج ہے اور جو چیز عبادتِ مقصودہ کی جنس سے نہ ہو اس کی نذر ماننا جائز نہیں۔

یہ بھی ذہن نشین رہے کہ نذر (منت شرعی) ایک امر تعبدی ہے یعنی نذر ایک عبادت ہے اور عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی جائز ہے غیر اللہ کی عبادت جائز نہیں لہٰذا غیر اللہ کی نذرِ شرعی ماننا بھی جائز نہیں...... اور ان شیروں اور گھوڑوں کے مجسموں کو اور تصویروں کو اولیاء کرام کی قبروں پر رکھنا اولیاء کرام کو ایذا (تکلیف) دینا اور ان کی توہین ہے اور ایذاء و اہانت اولیاء شرعاً حرام ہے۔ حدیث شریف میں مومن کی قبر پر بیٹھنے اور ٹیک لگانے کی ممانعت آئی ہے، چہ جائیکہ شیروں و گھوڑوں کے مجسمے بنا کر قبروں پر رکھے جائیں!...... اور جب قبر پر بیٹھنا تکیہ لگانا ان کی توہین ہے تو گھوڑے اور شیروں کے مجسمے ان پر لگانا کیونکر توہین نہ ہوگا بلکہ یہ شدید درجہ کی توہین ہے کیونکہ جانداروں کے مجسمے اور تصویریں بنانا حرام ہے اور حدیث میں سخت وعید آئی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''بے شک یہ جو تصویریں بناتے ہیں قیامت کے دن ان کو عذاب دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا یہ صورتیں جو تم نے بنائی تھیں ان میں جان ڈالو۔''

(بخاری، ج:۲، ص:۸۸۰)

مزاراتِ اولیاء پر گھوڑے، شیر چڑھانے کی منتیں ماننا شرعاً حرام ہے اور انہیں پورا کرنا جائز نہیں اور حکومتِ وقت کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ مزارات اولیاء پر ایسی خرافات کو سختی سے روکے اور اس کے لئے مناسب انتظامات کرے تاکہ مزارات اولیاء غیر شرعی خرافات سے محفوظ ہوں۔ (ماہنامہ عرفات، فروری ۲۰۱۲ء جامعہ نعیمیہ لاہور، فتویٰ از مفتی محمد عمران حنفی)

پاکستان میں اکثر مزارات مساجد سے متصل بنائے گئے ہیں۔ ان مساجد کے ائمہ و

خطباء واشگاف الفاظ میں ان کی تردید کیوں نہیں کرتے؟ حکومتِ وقت کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ ان خرافات کی تردید کرنا علماء کی بھی ذمہ داری ہے۔

نذر کا کفارہ

سوال میں نے نذر مانی تھی لیکن اب اسے پورا کرنے کی مجھ میں استطاعت نہیں، میرے لیے کیا حکم ہے؟

جواب حدیث کے مطابق نذر کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے، جو کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا، انہیں لباس پہنانا، یا غلام آزاد کرانا ہے، تینوں میں سے کوئی چیز بھی دستیاب نہ ہو تو تین دن کے روزے رکھے جائیں۔ (دیکھیے ۵/المائدۃ:۸۹)

کفارہ ادا کرنے کے بعد اس شخص پر کوئی گناہ باقی نہیں رہتا اور نہ اسے کسی پریشانی کی ضرورت ہے۔

انسان کے رب کی قسم!

سوال کیا کسی آدمی کا نام لے کر اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھانا درست ہے؟ یعنی ایک آدمی یوں کہے کہ فلاں کے رب کی قسم! یا کسی اور چیز کا نام لے کر اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھائے۔

جواب جب قسم اللہ کے نام کی اٹھائی جارہی ہو تو جائز ہے کہ کسی آدمی کا نام لے کر کہا جائے کہ فلاں آدمی کے رب کی قسم۔ چنانچہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

میرے چچا انس بن نضر بدر کی لڑائی میں حاضر نہ ہو سکے، اس لیے انہوں نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول! میں پہلی لڑائی ہی سے غائب رہا جو آپ نے مشرکین سے لڑی تھی لیکن اگر اب اللہ نے مجھے مشرکین کے خلاف کسی لڑائی میں حاضری کا موقع دیا تو اللہ دیکھ لے گا کہ میں کیا کرتا ہوں! پھر جب اُحد کی لڑائی کا موقع آیا اور (بہت سے) مسلمان بھاگ نکلے تو انس بن نضر نے کہا: اللہ! جو کچھ ان مشرکین نے کیا ہے میں اس سے بیزار ہوں۔ پھر وہ (مشرکین کی طرف) آگے بڑھے تو سعد بن معاذ سے سامنا ہوا۔ ان سے انس بن نضر نے کہا: سعد بن معاذ! میں تو جنت میں جانا چاہتا ہوں اور نضر (ان کے باپ) کے رب کی قسم! میں جنت کی خوشبو اُحد کے پہاڑ کے قریب پاتا ہوں۔ سعد نے کہا: اللہ کے رسول! جو انہوں نے کر دکھایا

اس کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔انس نے بیان کیا کہ اس کے بعد انس بن نضر کو جب ہم نے پایا تو تلوار، نیزے اور تیر کے تقریباً اسّی زخم ان کے جسم پر تھے۔وہ شہید ہو چکے تھے، مشرکوں نے ان کے اعضاء کاٹ دیے تھے اور کوئی شخص انہیں پہچان نہ سکا تھا، صرف ان کی بہن ان کی انگلیوں سے انہیں پہچان سکی تھی۔انس نے بیان کیا: ہم سمجھتے ہیں کہ یہ آیت ان کے اور ان جیسے مومنین کے بارے میں نازل ہوئی تھی:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۖ ......﴾

''مومنوں میں سے بعض لوگ وہ ہیں جنہوں نے اپنے اس وعدے کو سچا کر دکھایا جو انہوں نے اللہ سے کیا تھا......''

انہوں نے بیان کیا کہ انس بن نضر کی ایک بہن رُبیّع نے کسی خاتون کے آگے کے دانت توڑ دیے تھے اس لیے اللہ کے رسول ﷺ نے ان سے قصاص لینے کا حکم دیا۔انس بن نضر نے عرض کیا: اللہ کے رسول! اس ہستی کی قسم! جس نے آپ کو حق کے ساتھ نبی بنایا ہے (قصاص میں) ان کے دانت توڑے نہ جائیں گے۔چنانچہ مدعی تاوان لینے پر راضی ہو گئے اور قصاص کا خیال چھوڑ دیا، اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ مَنْ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ))

(بخاری، الجهاد، قول الله تعالی: ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ﴾، ح:۲۸۰۵،۲۸۰۶)

''اللہ کے کچھ بندے ہیں کہ اگر وہ اللہ کا نام لے کر قسم کھا لیں تو اللہ خود ان کی قسم پوری کر دیتا ہے۔''

انس رضی اللہ عنہ اپنے ایک خالو 'حرام' کے بارے میں فرماتے ہیں کہ انہوں نے کعبہ کے رب کی قسم کھائی۔وہ بیان فرماتے ہیں:

کچھ لوگ نبی ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہمارے ساتھ چند آدمی بھیج دیجیے جو ہمیں قرآن اور حدیث سکھلا دیں۔آپ نے ان کے ساتھ ستر انصار کو بھیج دیا جنہیں قراء کہا جاتا تھا، ان میں میرے ماموں 'حرام' بھی تھے۔وہ لوگ قرآن پڑھا کرتے تھے اور رات کو

قرآن پڑھتے پڑھاتے جبکہ دن کو پانی لا کر مسجد میں رکھتے اور لکڑیاں اکٹھی کرتے اور فروخت کر کے اصحاب صفہ اور فقراء کے لیے کھانا خریدتے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اِن لوگوں کو اُن کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ انہوں نے راستہ میں ان کا مقابلہ کیا اور انہیں قتل کر دیا۔ اپنے ٹھکانے پر پہنچنے سے پہلے انہوں نے (موت کے وقت) کہا: یا اللہ! ہمارے نبی کو یہ (اطلاع) پہنچا دے کہ ہم تجھ سے مل گئے ہیں نیز ہم تجھ سے راضی ہیں اور تو ہم سے راضی ہے۔ ایک شخص کا فروں میں سے 'حرام' کے پاس آیا اور انہیں ایسا برچھا مارا کہ پار ہو گیا۔ حرام نے کہا:

فزت و رب الکعبة

ربِ کعبہ کی قسم! مَیں مراد کو پہنچ گیا۔

اللہ کے رسول نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

((اِنَّ اِخْوَانَکُمْ قَدْ قُتِلُوْا وَ اِنَّھُمْ قَالُوْا: اَللّٰھُمَّ بَلِّغْ عَنَّا نَبِیَّنَا اِنَّا قَدْ لَقِیْنَاكَ فَرِضِیْنَا عَنْكَ وَ رَضِیْتَ عَنَّا))

''تمہارے بھائی قتل کیے گئے اور انہوں نے یہ کہا: یا اللہ! ہمارے نبی کو ہماری طرف سے یہ (اطلاع) پہنچا دے کہ ہم تجھ سے مل گئے ہیں نیز ہم تجھ سے راضی ہیں اور تُو ہم سے راضی ہے۔''

(مسلم، الامارة، ثبوت الجنة للشهيد، ح: ٦٧٧)

یہ خبر جبریل علیہ السلام نے اللہ کے رسول ﷺ کو پہنچائی اور آپ نے صحابہ کو خبر دی۔

مَیں تمہیں قسم دیتا ہوں!

سوال کیا کسی سے اپنی بات منوانے کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ تجھے قسم لگے! جسے قسم دی جائے اس پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ نیز کیا ایسی قسم واقع ہو جاتی ہے؟

جواب اگر کوئی شخص اپنے کسی دوست پر اعتماد کرتے ہوئے اسے قسم دے دے تو اس کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچانی چاہیے بلکہ اس کی قسم کی لاج رکھتے ہوئے اس کی قسم پوری کر دینی چاہیے۔ چنانچہ براء بن عازب سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں:

''اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں سات چیزوں کا حکم دیا تھا اور سات چیزوں سے ہمیں منع کیا تھا؛ آپ نے ہمیں بیمار کی عیادت کرنے، جنازے کے پیچھے چلنے، چھینکنے والے کے جواب میں یرحمك الله کہنے، دعوت کرنے والے کی دعوت قبول کرنے، سلام پھیلانے، مظلوم کی مدد کرنے اور قسم کھانے والے کی قسم پوری کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور آپ نے ہمیں سونے کی انگوٹھیوں (کے پہننے) سے، چاندی (کے برتن) میں پینے سے، میثر (زین یا کجاوہ کے اوپر ریشم کا گدا) استعمال کرنے سے اور قسی (اطراف مصر میں تیار کیا جانے والا ایک کپڑا جس میں ریشم کے دھاگے بھی استعمال ہوتے تھے) کے استعمال کرنے سے اور ریشم و دیبا اور استبرق پہننے سے منع کیا تھا۔''

(بخاری، الاشربۃ، آنیۃ الفضۃ، ح: ٥٦٣٥؛ مسلم، اللباس و الزینۃ، تحریم استعمال اناء الذھب و الفضۃ علی الرجال......، ح: ٢٠٦٦)

قسم دینے والے کی قسم پوری کرتے ہوئے اس کا جائز کام کر دینا سیرتِ نبوی سے بھی ثابت ہے۔ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی ایک بیٹی (زینب رضی اللہ عنہا) نے آپ کو بُلا بھیجا، اس وقت اللہ کے رسول ﷺ کے پاس اسامہ بن زید، سعد بن عبادہ اور ابی بن کعب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ صاحبزادی نے کہلا بھیجا کہ ان کے بچے کی موت کا وقت قریب آ گیا ہے، آپ تشریف لائیے۔ آپ نے ان کے جواب میں یوں کہلا بھیجا کہ میرا سلام کہو اور کہو:

((اِنَّ لِلّٰهِ مَا اَخَذَ وَ مَا اَعْطٰى وَ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ مُسَمًّى فَلْتَصْبِرْ وَ تَحْتَسِبْ))

''سب اللہ کا ہے جو اُس نے لے لیا اور اُس نے عنایت کیا اور ہر چیز کا اُس کے پاس وقت مقرر ہے، (بیٹی سے کہیے) وہ صبر کرے اور اللہ سے ثواب کی امید رکھے۔''

مگر وہ قسم دے کر پھر کہلا بھیجتی ہیں کہ نہیں آپ ضرور تشریف لائیے! اس وقت آپ اٹھے، ہم لوگ بھی ساتھ اٹھے۔ جب آپ صاحبزادی کے گھر پہنچے اور وہاں جا کر بیٹھے تو بچہ

اٹھا کر آپ کو دیا گیا، آپ نے اسے گود میں بٹھا لیا جبکہ وہ دم توڑ رہا تھا۔ یہ حال دیکھ کر آپ کی آنکھوں سے آنسوں بہہ نکلے۔ سعد بن عبادہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! یہ رونا کیسا ہے؟ آپ نے فرمایا:

((هٰذِهٖ رَحْمَةٌ يَّضَعُهَا اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِ مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ إِنَّمَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مِنْ عِبَادِهِ الرُّحَمَاءِ))

''یہ (رونا) ترس کی وجہ سے ہے اور اللہ اپنے جس بندے کے دل میں چاہتا ہے رحم ڈالتا ہے۔ اللہ اپنے اُن بندوں پر رحم کرے گا جو (دوسروں پر) رحم کرتے ہیں۔''

(بخاری، الأیمان و النذور، قوله تعالیٰ:﴿و اقسموا بالله جهد ایمانهم﴾، ح: ٦٦٥٥)

ایک اور فرمانِ پیغمبر ہے:

((اَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰى اَهْلِ الْجَنَّةِ ؟كُلُّ ضَعِيْفٍ مُّتَضَعَّفٍ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ،وَ اَهْلِ النَّارِ كُلُّ جَوَّاظٍ عُتُلٍّ مُّسْتَكْبِرٍ))

(بخاری، الأیمان و النذور، قوله تعالیٰ:﴿و اقسموا بالله جهد ایمانهم﴾، ح: ٦٦٥٦)

''میں تمہیں بتاؤں کہ جنتی کون لوگ ہیں؟ ہر ایک غریب ناتواں جو اگر اللہ کے بھروسے پر قسم کھا بیٹھے تو اللہ (اس کی قسم کی لاج رکھتے ہوئے) اسے سچا کر دے۔ (یعنی اس کی قسم پوری کر دے۔) اور جہنمی کون لوگ ہیں؟ ہر ایک لڑاکا، مغرور اور فسادی۔''

مگر واضح رہے کہ قسم دینے والے کی قسم کو پورا کرنا اچھے اخلاق کا ایک مظہر ہے ورنہ کسی کی قسم کو پورا کرنا کوئی فرض و واجب نہیں ہے اور نہ اس طرح قسم دینے سے قسم منعقد ہوتی ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ابوبکر نے کہا: اللہ کی قسم! اللہ کے رسول مجھ سے بیان کیجیے کہ میں نے خواب کی تعبیر دینے میں کیا غلطی کی ہے؟ آپ نے فرمایا:

((لَا تُقْسِمْ))

(بخاری، الأیمان و النذور، قوله تعالیٰ:﴿و اقسموا بالله جهد ایمانهم﴾، تعلیقا)

''قسم مت کھاؤ!''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قسم دینے سے قسم منعقد نہیں ہوتی۔ اگر اس طرح قسم منعقد ہو جاتی تو اللہ کے رسول ﷺ ضرور بیان کرتے کہ ابوبکر نے تعبیر میں فلاں فلاں غلطی کی ہے۔ اس لیے آپ ﷺ نے ابرار القسم یا ابرار المقسم کے الفاظ سے قسم کو سچا کرنے کا حکم دیا ہے۔

کیا بلال 'بھاری' نام ہے؟

سوال: میرا بیٹا بلال اکثر بیمار رہتا تھا۔ مجھے لوگوں نے کہا کہ اس کا نام تبدیل کر دیں کیونکہ بلال 'بھاری' نام ہے۔ کیا میں اس صورت میں اپنے بیٹے کا نام تبدیل کر دوں؟ اسی طرح بعض لوگ کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بھاری نام ہے یعنی ایسا نام رکھنے کی وجہ سے اس پر مشکلات آتی ہیں، کیا یہ موقف درست ہے؟

جواب: بلال اچھا نام ہے لہٰذا اسے تبدیل نہ کریں۔ بیماریاں ناموں کی وجہ سے نہیں آتیں۔ اس لیے نام بدلنا مرض کا حل نہیں۔ اگر مشکلات برداشت کرنے کی وجہ سے ایک شخص اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جائے تو اسے اور کیا چاہیے!

یہ کہنا بھی غلط ہے کہ عبدالرحمٰن بھاری نام ہے۔ ایسا نام باعثِ برکت ہوتا ہے۔ عبدالرحمٰن نام اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ فرماتے ہیں:

((تَسَمُّوْا بِاَسْمَاءِ الْاَنْبِيَاءِ وَ اَحَبُّ الْاَسْمَاءِ اِلَى اللّٰهِ عَبْدُاللّٰهِ وَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ وَ اَصْدَقُهَا حَارِثٌ وَ هَمَّامٌ وَ اَقْبَحُهَا حَرْبٌ وَ مُرَّةٌ))

(ابوداؤد، الادب، فی تغییر الاسماء، ح:۴۹۵۰، اس میں عقیل بن شبیب مجہول راوی ہے تاہم یہ حدیث معنی کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے کیونکہ دوسری حدیث میں ہے: ((ان احب اسماء کم الی اللہ عبداللہ و عبدالرحمٰن)) (مسلم، الادب، النھی عن التکنی بابی القاسم...... ح: ۲۱۳۲)

''تم انبیاء کے ناموں جیسے نام رکھو۔ اللہ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں۔ سب سے سچے نام حارث (محنت کار/کاشت کار) اور ہمام (سردار) ہیں۔ اور بدترین نام حرب (جنگ/لڑائی) اور مرہ (تلخی/کڑواہٹ) ہیں۔''

نام اگر بُرا ہو تو اسے بدل دینا چاہیے۔ ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ (کا طریقہ یہ تھا کہ) بُرے نام کو بدل دیا کرتے تھے۔

(ترمذي ، الادب ، ما جاء في تغيير الاسماء: ٢٨٣٩)

ماہِ محرم کی فضیلت کا سبب؟

سوال ماہِ محرم کی فضیلت کس بنا پر ہے؟ عام لوگ اس فضیلت کا سبب واقعہ کربلا کو قرار دیتے ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب ماہِ محرم حرمت والے چار مہینوں میں سے ایک مہینہ ہے؛ وہ چار مہینے یہ ہیں: ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب۔ ان مہینوں میں لڑائی جھگڑا کرنا اور نافرمانی کرنا دیگر مہینوں کی نسبت زیادہ سنگین جرم قرار دیا گیا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۚ فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ أَنفُسَكُمْ ﴾ (٩/التوبة:٣٦)

''اللہ کے ہاں مہینوں کی تعداد کتاب اللہ میں بارہ ہے جب سے اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ ان میں سے چار حرمت والے ہیں۔ یہی درست دین ہے۔ ان مہینوں میں تم اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ماہِ محرم کی یہ حرمت روزِ اول سے چلی آرہی ہے۔

اسی طرح نبی ﷺ کا فرمان ہے:

((أَفْضَلُ الصِّيَامِ بَعْدَ رَمَضَانَ شَهْرُ اللَّهِ الْمُحَرَّمُ))

(مسلم ، الصيام ، فضل صوم المحرم ، ح: ١١٦٣)

''رمضان کے بعد افضل روزے اللہ کے مہینے محرم کے ہیں۔''

محرم کے فضائل کا ایک سبب عاشوراء کا روزہ بھی ہے جو ایک سال کے گناہوں کا کفارہ ہے۔ دس محرم کو یہودی یومِ نجات مناتے تھے کہ اس دن اللہ تعالیٰ نے فرعون کو غرق کیا تھا۔ نبی ﷺ نے خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہم یہودیوں کی بہ نسبت موسیٰ علیہ السلام کے زیادہ قریب ہیں۔

دین کی تکمیل تو واقعہ کربلا سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ اس لیے بعد میں رونما ہونے والے کسی اتفاقی واقعہ کو محرم الحرام کی فضیلت کا سبب قرار نہیں دیا جاسکتا۔

ایمانیات

فرشتوں کے کتنے پَر ہوتے ہیں؟

سوال کیا فرشتے پَروں والی مخلوق ہیں؟ اگر ایسا ہے تو ان کے کتنے کتنے پَر ہوتے ہیں؟

جواب قرآنِ مجید میں فرشتوں کے پَروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ (تاہم ان پَروں کی حقیقت اور ماہیت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔) ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۭ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ① ﴾ (۳۵/فاطر:۱)

"اس اللہ کے لیے سب تعریف ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا اور دو دو، تین تین اور چار چار پَروں والے فرشتوں کو اپنا پیغام رساں (قاصد) بنانے والا ہے۔ مخلوق میں جو چاہے اضافہ کرتا ہے۔ اللہ یقیناً ہر چیز پر بھرپور قادر ہے۔"

﴿ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاۗءُ ﴾ (مخلوق میں جو چاہے اضافہ کرتا ہے) سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض فرشتوں کے دو دو، تین تین اور چار چار پَروں سے بھی زیادہ پَر ہوتے ہیں جیسے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں:

اللہ کے رسول ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو دیکھا تو اُن کے چھ سو پَر تھے۔

(بخاری، التفسیر، ﴿فكان قاب قوسين او ادنى﴾، ح:۴۸۵۶)

کیا روح کو مٹی سے بنایا گیا ہے؟

سوال ماہنامہ دعوۃ التوحید جلد ۳ شمارہ ۲۵ صفحہ ۱۸ پر مضمون نگار تحریر فرماتے ہیں:

"پاکیزہ روح! اللہ کی مغفرت اور رضا کی طرف چل، فرشتے اسے پہلے آسمان سے ساتویں آسمان تک لے جاتے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے: میرے بندے کا نامۂ عمل علیین میں لکھ دو اور اسے زمین کی طرف لوٹا دو کیونکہ میں نے انہیں زمین سے بنایا تھا۔"

بات روح کی ہو رہی ہے، کیا روح کو مٹی سے بنایا گیا ہے؟

جواب روح رب تعالیٰ کے امر (حکم) میں سے ہے۔ جیسے کہ قرآن مجید میں ہے

(دیکھئے ۱۷/بنی اسرائیل:۸۵) اس کی حقیقت کسی پر بھی نہیں کھل سکی۔ روح کی حقیقت اللہ ہی جانتا ہے۔ باقی روح کو جسم میں لوٹانے کا حکم ہے اور جسم مٹی سے بنایا گیا ہے نہ کہ روح۔

سوال و جواب کے بعد روح جسم میں رہتی ہے یا نکل جاتی ہے؟

سوال کیا سوال و جواب کے بعد روح اسی جسم میں رہتی ہے یا نکل جاتی ہے؟

جواب قبر میں سوال و جواب کے لیے روح جسم میں داخل کی جاتی ہے۔ سوال وجواب کے بعد روح جسم سے نکل جاتی ہے۔ قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال و جواب کے بعد روح جنت یا جہنم میں چلی جاتی ہے۔ روزِ قیامت ہی ارواح کو اُن کے اجساد کی طرف لوٹایا جائے گا کیونکہ مرنے سے قیامت تک موت کا عرصہ ہے اور موت روح اور جسم کی جدائی کا نام ہے، بوقتِ سوالات اعادہ روح ایک استثنائی صورت ہے۔

حدیث میں ہے کہ فتنہ قبر کے بعد ((يُعَادُ الْجَسَدُ لِمَا بَدَاَ مِنْهُ فَتُجْعَلُ نَسْمَتُهُ فِيْ نَسَمِ الطَّيْرِ وَ هِيَ طَيْرٌ يَعْلُقُ فِيْ شَجَرِ الْجَنَّةِ)) (ابن حبان، ح:۳۱۰۳) یعنی جسم پہلے (موت) والی حالت میں لوٹا دیا جاتا ہے اور روح نیک روحوں کے ساتھ جنت میں رہتی ہے۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ سوال وجواب کے بعد حکم ہوتا ہے:

((نَمْ كَنَوْمَةِ الْعَرُوْسِ الَّذِيْ لَا يُوْقِظُهُ اِلَّا اَحَبُّ اَهْلِهٖ اِلَيْهِ حَتّٰى يَبْعَثَهُ اللّٰهُ مِنْ مَضْجَعِهٖ ذٰلِكَ)) (ترمذی، ح:۱۰۷۱)

اسی طرح جب شہدائے احد کی ارواح نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ ہمیں ہمارے اجساد کی طرف لوٹا دیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے نفی میں جواب دیا تھا۔ کما لا یخفی علی اھل العلم۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ مومن کی روح کو قیامت کے روز ہی اس کے جسم کی طرف لوٹائے گا۔ (ابن ماجہ، ح:۴۲۷۱)

نیز یہ بھی کسی حدیث میں نہیں کہ عذاب یا ثواب کے وقت روح قبر میں رہتی ہے یا اس کا جسم کے ساتھ کوئی تعلق رہتا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہماری کتاب "المسند فی عذاب القبر" (محمد ارشد کمال)

روح دوبارہ قبر میں دنیا والے جسم میں کیسے آتی ہے؟

سوال ماہنامہ دعوۃ التوحید جلد ۳ شمارہ ۲۵ محرم ۱۴۲۳ھ مارچ ۲۰۰۲ کا مطالعہ کیا۔ جب مضمون 'موت کیا ہے؟' پر پہنچا تو ذہن میں ایک مسئلہ پیدا ہوا وہ یہ کہ آپ صفحہ ۱۸۔۱۹ پر لکھتے ہیں کہ میرے بندے کا اعمال نامہ علیین میں لکھ دو اور اسے زمین کی طرف لوٹا دو کیونکہ مَیں نے انہیں زمین سے بنایا تھا اسی میں لوٹاتا ہے اور اسی سے دوبارہ اٹھانا ہے تو اس کی روح جسم میں لوٹا دی جاتی ہے۔ جبکہ قرآن مجید ۲۳/المؤمنون: ۱۵ اور ۱۶ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''پھر تم اس کے پیچھے مرو گے اور قیامت کے دن کھڑے کیے جاؤ گے۔''

اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بندے کی روح، جو قیامت سے پہلے علیین اور سجین میں جنت اور دوزخ کا نظارہ کر رہی ہوتی ہے، قیامت برپا ہونے پر اس دنیا والے جسم میں آئے گی اور انسان قبروں سے اٹھیں گے۔ آپ سے گزارش ہے کہ وضاحت کریں کہ روح دوبارہ قبر میں دنیا والے جسم میں کیسے آتی ہے؟

جواب روح دوبارہ قبر میں دنیا والے جسم میں کیسے آتی ہے؟ کے سلسلے میں عرض یہ ہے کہ ''کیسے'' کا سوال حل کرنا انسانی علم کی دسترس سے باہر ہے۔ لہٰذا روح کے جسم میں آنے کی کیفیت کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ روح کے جسم میں آنے کی کیفیت کو بیان کرنا تو دور کی بات ہے خود روح کی کیفیت بھی بیان نہیں کی جا سکتی کہ وہ کیسی ہے؟

روح کا مشاہدہ تو ہم یہاں بھی نہیں کر سکتے۔ بچے میں روح اس وقت ڈال دی جاتی ہے جب وہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے۔ دنیا میں ہمارے سامنے کتنے انسان فوت ہوتے ہیں کیا ہم کسی کی روح نکلنے کی کیفیت دیکھ سکے یا جو لوگ اسی دنیا میں زندہ ہوئے کیا ان میں کسی نے روح داخل ہوتے ہوئے دیکھی کہ وہ کیسے آتی ہے۔ جب اجسام ہمارے سامنے بھی ہوں تو روح کی آمد و رفت کی کیفیت کو بیان نہیں کیا جا سکتا تو جب اجساد ہم سے اوجھل ہی ہو جائیں (عالم برزخ میں چلے جائیں) تو پھر ان ارواح کی آمد و رفت کی کیفیت کیسے بیان کی جا سکتی ہے؟

باقی رہا یہ مسئلہ کہ علیین، سجین اور قبر کا تعلق کیسا ہے۔ یہ بھی انسانی فہم و ادراک سے بالاتر

ہے۔ تاہم حدیث میں آتا ہے کہ قبر یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہوتی ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا، اور نبی اکرم ﷺ اکثر عذابِ قبر سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے۔ لہٰذا عالم برزخ کے معاملات کو دنیوی اُمور پر قیاس کر کے ان کی کیفیت کو معلوم نہیں کیا جا سکتا۔

روزِ قیامت جانوروں میں عدل

سوال قیامت کے دن انسانوں میں عدل وانصاف سے فیصلہ کیا جائے گا۔ کیا یہ فیصلہ حیوانات میں بھی ہوگا؟ جیسا کہ سننے میں آیا ہے سینگ والی بکری نے اگر بغیر سینگ والی بکری کو مارا ہوگا تو بدلہ دلوایا جائے گا۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب یوم الدین کے بے لاگ عدل کا دائرہ کار حیوانات تک بھی پھیل جائے گا، اگر کسی جانور نے بھی دوسرے جانور پر ظلم کیا ہوگا تو اللہ تعالیٰ مظلوم کی دادرسی کرے گا، مفسرین نے بعض آیات اور محدثین نے احادیث کی روشنی میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے۔

سورۃ النبأ کی آخری آیت: ﴿ يَوْمَ يَنظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ وَيَقُولُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِي كُنتُ تُرَابًا ﴾ (جس دن آدمی اپنے ہاتھوں کی کی ہوئی کمائی دیکھ لے گا اور کافر کہے گا: کاش میں مٹی بن جاتا!) کی تفسیر میں حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اس دن کافر آرزو کرے گا کہ کاش وہ مٹی ہوتا، پیدا ہی نہ کیا جاتا، وجود میں ہی نہ آتا، اللہ تعالیٰ کے عذابوں کو آنکھ سے دیکھ لے گا۔ اپنی بدکاریاں سامنے ہوں گی جو پاک فرشتوں کے منصف ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ تو ایک معنی تو یہ ہوا کہ دنیا میں ہی مٹی ہو جانے کی یعنی پیدا نہ ہونے کی آرزو کرے گا۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ جب جانوروں کا فیصلہ ہوگا اور ان کے قصاص دلوائے جائیں گے یہاں تک کہ اگر بغیر سینگ والی بکری کو سینگ والی بکری نے مارا ہوگا تو اس سے بھی بدلا دلوایا جائے گا، پھر ان سے کہا جائے گا مٹی ہو جاؤ چنانچہ وہ مٹی ہو جائیں گے اس وقت یہ کافر انسان بھی کہے گا کہ ہائے کاش میں بھی حیوان ہوتا اور اب مٹی بن جاتا۔''

سورۃ الانعام (آیت ۳۸) میں جانوروں کے حشر کو بیان کیا گیا ہے:

﴿ وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُم

﴿ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ إِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴾ (۶/الانعام:۳۸)

''اور جتنی قسم کے جاندار زمین پر چلنے والے ہیں اور جتنی قسم کے پرند جانور ہیں کہ اپنے دونوں بازوؤں سے اڑتے ہیں ان میں کوئی قسم ایسی نہیں جو کہ تمہاری طرح کے گروہ نہ ہوں، ہم نے لوح محفوظ میں کوئی چیز نہیں چھوڑی، پھر سب اپنے پروردگار کے پاس جمع کئے جائیں گے۔''

اس آیت سے تیز ایک دوسری آیت ﴿ وَإِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ﴾ (۸۱/التکویر:۵) سے معلوم ہوتا ہے کہ جانوروں کا قیامت کے دن حشر ہوگا، ان سے کفر وشرک اور ایمان کا محاسبہ تو نہیں ہوگا مگر جو ظلم کسی جانور نے دوسرے پر کیا ہوگا اس کا بدلا دلایا جائے گا۔

مظلوم جانوروں کے ظلم کا بدلہ دلانے کا تذکرہ احادیث میں بھی ملتا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَتُؤَدُّنَّ الْحُقُوْقَ إِلٰى أَهْلِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يُقَادَ لِلشَّاةِ الْجَلْحَاءِ مِنَ الشَّاةِ الْقَرْنَاءِ)) (مسلم ، البر ، تحریم الظلم ، ح:۲۵۸۲)

''تمہیں روز قیامت حق والوں کے حق ضرور ادا کرنے ہوں گے حتی کہ سینگ والی بکری سے بغیر سینگ والی بکری کو بدلا دلوایا جائے گا۔''

اس حدیث کی شرح میں امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''روز قیامت جانوروں کے حشر پر اس (حدیث) میں دلالت ہے۔ انہیں بھی اسی طرح اٹھایا جائے گا جیسے مکلف مخلوق انسان کو اُٹھایا جائے گا اور جس طرح بچوں، فاترالعقل لوگوں اور ان لوگوں کو جنہیں اسلام کی دعوت نہیں پہنچی ہوگی اٹھایا جائے گا۔ قرآن وسنت کے دلائل اس کی تائید میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ وَإِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ﴾ (۸۱/التکویر:۵) (اور جب وحشی جانور اکٹھے کئے جائیں گے) جب شریعت میں جانوروں کے حشر پر الفاظ وارد ہوئے ہیں اور عقل وشریعت کے سامنے انہیں ظاہر پر محمول کرنے میں رکاوٹ نہ ہو تو انہیں لازماً ظاہر پر ہی محمول کرنا چاہیے۔ علماء فرماتے ہیں:

روز قیامت حشر اور زندہ کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ بدلہ دینے اور عذاب وثواب

کے لیے ہی ایسا کیا جائے جہاں تک سینگوں والی بکری سے بے سینگ بکری کے قصاص کا معاملہ ہے تو یہ وہ قصاص نہیں جو مکلّف مخلوق (مثلاً انسان) سے لیا جاتا ہے۔ کیونکہ بکری مکلّف (شرعی احکام کی پابند) مخلوق نہیں بلکہ یہ مقابلے کا قصاص ہے۔''

نوٹ: اس حدیث میں انسانوں کے لیے بہت بڑا درسِ عبرت ہے کہ جب غیر مکلّف مخلوق جانوروں کو معاف نہیں کیا جائے گا تو مکلّف مخلوق انسان کے ظلم کو کیونکر نظر انداز کیا جائے گا؟ اگر اس نے ظلم سے توبہ کر کے اس کی تلافی نہ کی ہوگی تو اسے یقیناً اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

قرآن
اور
تفسیر القرآن

قرآن کو صرف ''قرآن'' کہنا؟

سوال قرآن کو اگر ہم صرف ''قرآن'' ہی کہیں تو ہمیں گناہ تو نہیں ملے گا؟

جواب قرآن کریم کا عزت واحترام سے نام لینا افضل ہے۔ یہ احترام دلوں کے تقویٰ کی دلیل ہوگا۔ اگرچہ صرف ''قرآن'' کہنا بھی جائز اور درست ہے۔ خود قرآن مجید میں لفظ ''قرآن'' ستر مرتبہ استعمال ہوا ہے کبھی اللہ تعالیٰ نے اسے ''قرآن'' ہی کہا ہے۔ (۸۲:۴، ۱۰۱:۵، ۱۹:۶، ۲۰۴:۷ ودیگر کئی آیات)، اور کبھی اسے صفاتی نام سے ذکر کیا ہے مثلاً ﴿قرآن مبین﴾ (۱:۱۵، ۶۹:۳۶) ﴿القرآن العظیم﴾ (۸۷:۱۵)، ﴿القرآن الحکیم﴾ (۲:۳۶) ﴿القرآن المجید﴾ (۱:۵۰)

قرآنی آیات میں تضاد؟

سوال بعض قرآنی آیات میں تعارض دکھائی دیتا ہے۔ کیا قرآنی آیات میں باہم تضاد بھی ہوتا ہے؟

جواب درحقیقت قرآنی آیات میں کوئی تعارض وتناقض نہیں ہے، اسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کے منزل من اللہ ہونے کی دلیل کے طور پر ذکر کیا ہے:

﴿ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ۝ ﴾ (۴/النساء:۸۲)

''کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے، اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یقیناً اس میں بہت اختلاف پاتے۔''

اس لیے یہ محال ہے کہ قرآن مجید کی آیات میں باہم تضاد ہو۔ بالخصوص جب آیات میں کوئی خبر بیان کی گئی ہو کیونکہ ایسی صورت میں ایک بات تو یقیناً جھوٹ ہوگی جب کہ اللہ تو ''اصدق'' (سب سے زیادہ سچا) ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا ۝ ﴾ (ایضاً:۸۷)

''اور اللہ سے زیادہ سچی بات والا اور کون ہوگا۔''

ایک دوسری آیت میں یہ الفاظ ہیں:

﴿ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيلًا ﴾ (ایضا:۱۲۲)

''اور کون ہے جو بات میں اللہ سے زیادہ سچا ہو۔''

اگر ایسی دو آیات میں بظاہر کوئی تعارض دکھائی دے جن میں کوئی حکم دیا گیا ہو تو دریں صورت دوسری آیت پہلی آیت کے حکم کی ناسخ (منسوخ کرنے والی) ہوتی ہے۔ اس طرح پہلی آیت کا حکم باقی نہیں رہتا لہٰذا وہ دوسری آیت کے حکم کے خلاف نہیں ہوتی۔ نسخ کا عمل قرآن مجید سے ثابت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا ۗ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴾ (۲/البقرۃ:۱۰۶)

''جس آیت کو ہم منسوخ کر دیں یا بھلا دیں اس سے بہتر یا اس جیسی اور لاتے ہیں، کیا آپ نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر بھرپور قادر ہے۔''

وہ آیات جو ظاہری طور پر متضاد دکھائی دیتی ہیں ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

قرآن مجید کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ هُدًى لِلْمُتَّقِينَ ﴾ (۲/البقرۃ:۲) قرآن ہی کے بارے میں ہے، دوسری آیت ہے:﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ ﴾ (ایضا:۸۵)

پہلی آیت کے مطابق قرآن مجید متقی لوگوں کے لیے ہدایت ہے جبکہ دوسری آیت کے مطابق قرآن کریم سب لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔ ان آیات میں فی الحقیقت کوئی تضاد نہیں کیونکہ ہدایت کا ایک معنی راستے پر چلانا یا اس پر چلنے کی توفیق دینا ہے جبکہ ہدایت کا دوسرا معنی راستہ بتانا (راہ نمائی کرنا) اور واضح کرنا ہے، پہلی آیت میں ہدایت کا لفظ پہلے معنی میں جبکہ دوسری آیت میں دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ بالفاظ دیگر قرآن مجید سب لوگوں کے لیے ہدایت ہے مگر اس سے ہدایت لینے اور راہنمائی حاصل کرنے کی توفیق انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو متقی ہیں۔ انہی دو آیات کی طرح اللہ تعالیٰ کے یہ دو فرامین ہیں:

﴿ إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ﴾ (۲۸/القصص:۵۱)

''آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ اللہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔''

﴿ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ (۴۲/الشوریٰ:۵۲)

''اور آپ راہِ راست کی ہدایت کرتے ہیں۔''

پہلی آیت میں ہدایت سے مراد سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق دینا ہے جبکہ دوسری آیت میں ہدایت سے مراد سیدھے راستے کی راہنمائی کرنا ہے۔

تقسیم وراثت کا حکم آنے سے پہلے مرنے والوں پر وصیت فرض تھی، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۨ الْوَصِيَّةُ ﴾

(۲/البقرۃ:۱۸۰)

''تم پر وصیت کرنا فرض کر دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کوئی فوت ہونے لگے اور مال چھوڑ جاتا ہو۔''

پھر تقسیم وراثت کا یہ حکم اترا:

﴿ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۤ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ ...... ﴾ (۴/النساء:۱۱)

''اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں حکم کرتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔''

اس آیت سے وصیت کی فرضیت منسوخ ہوگئی۔ ظاہری طور پر ان دو آیات میں تضاد نظر آتا ہے مگر حقیقت میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ مزید مثالوں کے لیے علامہ محمد امین شنقیطی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب دفع ایھام الاضطراب عن آي الكتاب کا مطالعہ کریں۔

روزِ قیامت لوگوں کے گروہوں کی تعداد؟

سوال: روزِ قیامت لوگوں کے کتنے گروہ ہوں گے؟ بعض لوگ سورۃ البلد اور سورۃ الواقعۃ کے حوالے سے دو اور تین گروہوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

جواب: قیامت کے دن لوگوں کے بہت سے گروہ ہوں گے۔ کچھ گروہ جنتیوں کے اور کچھ جہنمیوں کے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ۭ ﴾ (۳۹/الزمر:۷۱)

''اور کفار گروہ کے گروہ جہنم کی طرف ہنکائے جائیں گے۔''

اسی طرح جنتیوں کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ﴾ (۳۹/الزمر:۷۳)

''اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں ان کے گروہ کے گروہ جنت کی طرف روانہ کیے جائیں گے۔''

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر امت کے اہلِ ایمان الگ الگ اپنے اپنے نبیوں کے ساتھ ہوں گے اور ان میں سے بھی بعض انبیاء کے کئی کئی گروہ ہوں گے، چنانچہ ارشادِ نبوی ہے:

میرے سامنے امتیں پیش کی گئیں، کسی نبی کے ساتھ پوری امت گزری، کسی نبی کے ساتھ چند آدمی گزرے، کسی نبی کے ساتھ دس آدمی گزرے، کسی نبی کے ساتھ پانچ آدمی گزرے اور کوئی نبی تنہا گزرا۔ پھر مَیں نے دیکھا تو انسانوں کی ایک بہت بڑی جماعت دُور سے نظر آئی۔ مَیں نے جبریل سے پوچھا: کیا یہ میری امت ہے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں، آپ افق کی طرف دیکھیں۔ مَیں نے دیکھا تو ایک بہت بڑی جماعت دکھائی دی۔ انہوں نے کہا کہ یہ ہے آپ کی امت، اور یہ جو آگے آگے ستر ہزار کی تعداد ہے ان سے نہ حساب لیا جائے گا اور نہ ان لوگوں پر عذاب ہوگا۔ مَیں نے پوچھا کہ ایسا کیوں ہوگا؟ انہوں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ داغ لگواتے تھے نہ دم جھاڑ کرواتے تھے، وہ شگون نہیں لیتے تھے اور اپنے رب پر بھروسا کرتے تھے۔ عکاشہ بن محصن اٹھ کر آپ کی طرف آئے اور عرض کرنے لگے کہ آپ میرے لیے اللہ سے دعا کریں کہ وہ مجھے بھی ان لوگوں میں کردے۔ آپ نے دعا مانگی:

((اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ مِنْهُمْ))

''اللہ! اسے ان لوگوں میں سے کردے۔''

ان کے بعد ایک اور صحابی اٹھے اور عرض کرنے لگے: میرے لیے بھی اللہ سے دعا کریں کہ وہ مجھے ان لوگوں میں کردے۔ آپ نے فرمایا:

((سَبَقَكَ بِهَا عُكَّاشَةُ))

(بخاری، الرقاق، یدخل الجنة سبعون الفا بغیر حساب، ح: ٦٥٤١)

”عکاشہ اس میں تم سے آگے بڑھ گئے۔“

انسانوں کے مختلف گروہوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَتَفَرَّقُونَ ۝ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَهُمْ فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ ۝ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ فَأُولَٰئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُونَ ۝ ﴾ (٣٠/الروم: ١٤-١٦)

”اور جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن لوگ الگ الگ ہو جائیں گے، جو ایمان لا کر نیک اعمال کرتے رہے وہ جنت میں خوش وخرم کر دیے جائیں گے اور جنھوں نے کفر کیا تھا اور آیتوں اور آخرت کی ملاقات کو جھوٹا ٹھہرایا تھا وہ سب عذاب میں پکڑ کر حاضر رکھے جائیں گے۔“

ایک اور جگہ انسانوں کے دو گروہوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا مَرَدَّ لَهُ مِنَ اللَّهِ يَوْمَئِذٍ يَصَّدَّعُونَ ۝ مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِأَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُونَ ۝ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْ فَضْلِهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ۝ ﴾ (٣٠/الروم: ٤٣-٤٥)

”آپ اپنا رخ اس سچے اور سیدھے دین کی طرف ہی رکھیں قبل اس کے کہ وہ دن آ جائے جس کا اللہ کی طرف سے ٹلنا ہے ہی نہیں۔ اس دن سب متفرق ہو جائیں گے۔ کفر کرنے والوں پر ان کے کفر کا وبال ہوگا اور نیک کام کرنے والے اپنی ہی آرام گاہ سنوار رہے ہیں تاکہ اللہ انہیں اپنے فضل سے جزا دے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے۔ وہ (اللہ) کافروں سے محبت نہیں رکھتا ہے۔“

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ ۝ ﴾ (٤٢/الشوریٰ: ٧)

''ایک گروہ جنت میں اور ایک گروہ جہنم میں ہوگا۔''

جنتیوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انہیں ﴿ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴾ (۳۶/یٰس:۵۸) کا مژدہ سنایا جائے گا جبکہ مجرمین سے کہا جائے گا:

﴿ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴾ (۳۶/یٰس:۵۹)

''مجرمو! آج تم الگ ہو جاؤ۔''

انہی دو قسم کے لوگوں کا تذکرہ سورۃ الحاقۃ (آیات:۱۹۔۳۷)، سورۃ الانشقاق (آیات:۷۔۱۵)، البلد (۱۷۔۲۰) اور کئی دیگر سورتوں میں ہے۔ سورۃ البلد میں ہے:

﴿ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ ۝ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ۝ ﴾ (۹۰/البلد:۱۷۔۲۰)

''پھر ان لوگوں میں سے ہو گیا جو ایمان لائے اور ایک دوسرے کو صبر کی اور رحم کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں دائیں ہاتھ والے (خوش بختی والے) اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کے ساتھ کفر کیا وہ کم بختی والے ہیں۔ انہی پر آگ ہوگی جو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوگی۔''

مذکورہ بالا تمام آیات اور حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ لوگ قیامت کے دن بنیادی طور پر دو گروہوں میں تقسیم ہوں گے البتہ ان کی اندرونی تقسیم کی وجہ سے کئی اصناف ہوں گی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے سورۃ الواقعۃ میں تین گروہوں کا ذکر کیا ہے؛ ایک گروہ اصحاب الیمین کا، دوسرا اصحاب الشمال کا اور تیسرا گروہ السابقون المقربون کا ہے۔ یہاں بنیادی تقسیم کو اگر مدنظر رکھا جائے تو اصل گروہ دو ہی بنتے ہیں کیونکہ اصحاب الیمین اور السابقون اصل میں ایک ہی قسم (اصحاب الجنۃ) شمار ہوتے ہیں۔ یہ اہلِ جنت کی ذیلی تقسیم ہے۔

مکمل قرآن کی تلاوت کتنے دنوں میں کی جائے؟

سوال قرآنِ مجید کی تلاوت مکمل کرنے کے لیے کم از کم کتنا وقت صرف کرنا

چاہیے؟ کیا ایک رات یا ایک دن میں قرآنِ کریم کی تلاوت ختم کی جاسکتی ہے؟

جواب ایک دن یا ایک رات میں سارا قرآن نہیں پڑھنا چاہیے۔ نبی ﷺ نے اپنے ایک صحابی (عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما) سے فرمایا:

ہر مہینے میں (پورا) قرآن پڑھو۔ انہوں نے کہا: اللہ کے نبی! مَیں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا:

بیس دن میں قرآن (ایک بار) پڑھ لو۔ انہوں نے کہا: اللہ کے نبی! مَیں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا:

دس دنوں میں پڑھ لو۔ انہوں نے عرض کیا: اللہ کے نبی! مَیں اس سے بھی زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا:

((فَاقْرَأْهُ فِيْ سَبْعٍ وَ لَا تَزِدْ عَلٰى ذٰلِكَ فَإِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا))

(مسلم ، الصیام ، النھی عن صوم الدھر ، ح:۱۱۵۹)

''سات روز میں پڑھو، اس سے زیادہ نہ کرو۔ اس لیے کہ تم پر تمہاری بیوی کا حق بھی ہے، تم پر تمہارے ملاقاتیوں کا بھی حق ہے اور تم پر تمہارے جسم کا بھی حق ہے۔''

نبی اکرم ﷺ نے مختلف اشخاص کے احوال کے پیشِ نظر مختلف فرامین جاری کیے: نبی ﷺ نے کسی کو سات دن، کسی کو پانچ دن اور کسی کو تین دن سے کم وقت میں قرآن پڑھنے کی اجازت دی، مگر کسی بھی صورت میں تین دن سے کم وقت میں قرآن کی تلاوت مکمل نہیں کرنی چاہیے۔ ایک دن یا رات میں مکمل قرآن کی تلاوت نبی ﷺ کی سنت سے ثابت نہیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: مَیں نہیں جانتی کہ اللہ کے رسول ﷺ نے صبح تک کبھی پورا قرآن پڑھا ہو۔

(نسائی ، قیام اللیل ، الاختلاف علی عائشۃ فی احیاء اللیل ، ح:۱۶۴۲؛ ابن ماجۃ ، اقامۃ الصلوات و السنۃ فیھا ، فی کم یستحب یختم القراٰن ، ح:۱۳۴۸)

تین دن سے کم وقت میں مکمل قرآن کی تلاوت سے قرآن میں تدبر اور تفکر ممکن نہیں۔

چنانچہ سنن ابوداؤد میں ہے، عبداللہ بن عمرو نے عرض کیا: اللہ کے رسول! مَیں کتنے دنوں میں قرآن پڑھوں؟ آپ نے فرمایا:

((فِيْ شَهْرٍ)) ''ایک مہینے میں۔'' انہوں نے کہا: مَیں اس سے زیادہ (روزے رکھنے کی) طاقت رکھتا ہوں۔ ابوموسیٰ (ابن مثنیٰ) نے یہ جملہ بار بار دہرایا، یعنی انہوں نے اس مدت میں کمی چاہی حتیٰ کہ آپ نے فرمایا: ((اِقْرَأْ فِيْ سَبْعٍ)) ''سات دنوں میں پڑھ لو۔'' انہوں نے کہا: مَیں اس سے زیادہ قوت رکھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: ((لَا يَفْقَهُ مَنْ قَرَأَهُ فِيْ اَقَلَّ مِنْ ثَلَاثٍ)) ''جس نے تین دن سے کم میں قرآن پڑھا اس نے اسے سمجھا ہی نہیں۔''

(قراءۃ القرآن و تحزیبه و ترتیله، فی کم یقرأ القرآن، ح:۱۳۹۰؛ ترمذی، القراءات، ما جاء ان القرآن انزل علی سبعة احرف، ح:۲۹۴۹؛ ابن ماجة، اقامة الصلوات و السنة فیها، فی کم یستحب یختم القرآن، ح:۱۳۴۷)

تلاوت کے وقت سورتوں کی ترتیب؟

سوال کیا نماز میں سورتوں کو موجودہ ترتیب (ترتیب توقیفی) سے پڑھنا ضروری ہے یا اس کے برعکس بھی سورتوں کی تلاوت کی جاسکتی ہے؟ ایک امام صاحب نے پہلی رکعت میں سورۃ الاخلاص اور دوسری میں سورۃ الکوثر کی تلاوت کی تو بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ اس ترتیب سے سورتوں کا نماز میں پڑھنا جائز نہیں۔ کیا امام صاحب کا طرزِ عمل شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں جائز تھا؟

جواب سورتوں کو نماز میں ترتیب سے تلاوت کرنا ضروری نہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کے رازدان ابوعبداللہ حذیفہ بن یمان انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

مَیں نے ایک رات اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی اور آپ نے سورۃ البقرۃ شروع کی اور مَیں نے دل میں کہا کہ آپ شاید سو آیتوں پر رکوع کریں گے مگر آپ آگے بڑھ گئے۔ پھر مَیں نے خیال کیا کہ آپ شاید دو رکعت میں پوری سورت پڑھیں گے۔ لیکن آپ پھر آگے بڑھ گئے۔ پھر مَیں نے خیال کیا کہ آپ پوری سورت پر رکوع کریں گے۔ پھر آپ نے سورۃ النساء شروع کر دی اور یہ بھی پوری پڑھی۔ پھر آپ نے سورۃ آل عمران شروع کر

دی اور آپ ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے تھے۔ جب آپ تسبیح والی آیت پڑھتے تو سبحان اللہ کہتے اور سوال والی آیت تلاوت کرتے تو سوال کرتے۔ اور جب تعوذ کی آیت پڑھتے تو (اللہ کی) پناہ مانگتے۔ پھر آپ نے رکوع کیا اور کہا: ((سبحان ربی العظیم)) (پاک ہے میرا پروردگار بہت بڑائی والا۔) آپ کا رکوع بھی قیام کے برابر سرابر تھا۔ پھر کہا: ((سمع اللہ لمن حمدہ)) (سنا اللہ نے جس نے اس کی تعریف کی۔) پھر دیر تک رکوع کرنے کے وقت کے قریب قریب کھڑے رہے۔ پھر سجدہ کیا اور کہا: ((سبحان ربی الاعلی)) (میرا رب پاک ہے بلندی والا۔) اور آپ کا سجدہ بھی قیام کرنے کے وقت کے قریب قریب تھا۔

(مسلم، صلاۃ المسافرین، استحباب تطویل القراءۃ فی صلاۃ اللیل، ح:۷۷۲)

آپ ﷺ نے پہلے سورۃ النساء پڑھی اور پھر سورۃ آلِ عمرٰن پڑھی جبکہ ترتیبِ قرآنی میں سورۃ آلِ عمرٰن سورۃ النساء سے پہلے ہے۔

ایک حدیثِ تقریری اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ تلاوت میں سورتوں کی ترتیب میں تقدیم وتاخیر جائز ہے۔ ایک انصاری (کلثوم بن ہدم رضی اللہ عنہ) مسجدِ قبا میں امامت کرواتے تھے، وہ جب کوئی سورت شروع کرتے تو پہلے قل ھو اللہ احد (سورۃ الاخلاص) پڑھ لیتے، اسے پڑھ لینے کے بعد وہ دوسری سورت اس کے ساتھ ملا کر پڑھتے۔ وہ ہر رکعت میں ایسا ہی کرتے۔ اس کے رفقاء نے اس پر اعتراض کیا اور کہنے لگے: آپ اس سورت یعنی قل ھو اللہ احد کو شروع کرتے ہیں پھر کیا یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سورت کافی نہیں تب دوسری سورت اس کے ساتھ ملاتے ہیں، آئندہ صرف سورت قل ھو اللہ پڑھا کریں یا اسے چھوڑ کر دوسری سورت پڑھا کریں۔ اس نے کہا: میں تو قل ھو اللہ چھوڑنے والا نہیں، اگر تم راضی ہو تو میں تمہاری امامت کرواؤں گا اور ناخوش ہو تو میں امامت چھوڑ دوں گا۔ جبکہ لوگ اسے اپنے سے بہتر جانتے تھے۔ (اس کے مقابلے میں) کسی دوسرے کی امامت انہیں پسند نہ تھی۔ جب نبی ﷺ ان (اہلِ قبا) کے پاس تشریف لائے تو انہوں نے یہ صورتِ حال آپ سے عرض کی، آپ نے اس سے پوچھا:

تُو ایسا کیوں نہیں کرتا جیسے تیرے رفقاء کہتے ہیں اور کیا سبب ہے کہ تُو نے قل ھو اللہ کو

ہر سورت میں لازم کر لیا ہے؟

اس نے جواب دیا: مجھے اس سورت سے محبت ہے۔ (کیونکہ اس میں رحمٰن کی صفت بیان ہوئی ہے۔) آپ نے فرمایا:

((حُبُّكَ إِيَّاهَا أَدْخَلَكَ الْجَنَّةَ))

(بخاری، الاذان، الجمع بین السورتین، ح: ۷۷۴)

''اس سورت کی محبت نے تجھے جنت دلا دی۔''

صحابی مذکور کے مذکورہ عمل کو نبی ﷺ نے پسند کیا ہے، لہٰذا سورۃ الفاتحہ کے بعد جو بھی سورت آپ تلاوت کریں اس سے پہلے سورت اخلاص پڑھ لیں تو جائز ہوگا، ترتیب کے اعتبار سے اگر چہ وہ سورت سورۃ الاخلاص سے پہلے ہی کیوں نہ ہو۔

ایک صحابی احنف بن قیس رضی اللہ عنہ نے صبح کی پہلی رکعت میں سورۃ الکہف پڑھی اور دوسری میں سورۃ یوسف یا یونس۔ اور انہوں نے بتایا کہ انہوں نے عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ صبح کی نماز پڑھی تو انہوں نے یہی سورتیں پڑھی تھیں۔ (بخاری، الاذان، الجمع بین السورتین)

یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ نماز میں ہر شخص پہلے سورۃ الفاتحہ پڑھتا ہے اور اس کے بعد کوئی دوسری سورت یا سورتیں ملاتا ہے۔ پھر جب دوسری رکعت کا آغاز کرتا ہے تو پھر سورۃ الفاتحہ پڑھتا ہے حالانکہ سورۃ الفاتحہ کے بعد والی سورتیں وہ پہلے پڑھ چکا ہوتا ہے۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے وقت سورتوں کو ترتیب کے مطابق پڑھنا ضروری نہیں۔

ایک آدمی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہنے لگا: میں نے تو آج رات مفصل کی ساری سورتیں ایک ہی رکعت میں پڑھ ڈالیں۔ اس پر آپ نے فرمایا:

جیسے جلدی جلدی شعر پڑھتا ہے ویسے پڑھ گیا! میں ان جوڑا جوڑا سورتوں کو جانتا ہوں جو نبی ﷺ ملا کر (ایک ایک رکعت میں) پڑھا کرتے تھے۔ پھر عبداللہ نے مفصل کی بیس سورتیں بیان کیں، ہر رکعت میں دو دو سورتیں۔ (ایضاً، ح: ۷۷۵)

آپ ﷺ نے اس ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا جس ترتیب سے یہ سورتیں قرآنِ مجید میں ہیں۔ ہر

دو رکعت میں آپ ﷺ نے چار سورتیں تلاوت کیں جن کی ترتیب تلاوت یوں بنتی ہے:

پہلی دو رکعت: سورۃ الرحمن، النجم، القمر اور الحاقۃ۔

دوسری دو رکعت: الذریٰت، الطور، الواقعۃ اور القلم۔

تیسری دو رکعت: المعارج، النزعٰت، المطففین اور عبس۔

چوتھی دو رکعت: المدثر، المزمل، الدھر اور البلد۔

پانچویں دو رکعت: النبأ، المرسلٰت، التکویر اور الدخان۔

اللہ تعالیٰ نے عجیب بات فرمائی؟

سوال کیا اللہ کے فرمان کو عجیب کہہ سکتے ہیں؟ جس طرح عموماً لوگ کہہ دیتے ہیں کہ اللہ نے ایک بڑی عجیب بات فرمائی۔

جواب ''عجیب'' اور ''عجب'' کا لفظ محال کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَفَمِنْ هَٰذَا الْحَدِيثِ تَعْجَبُونَ ﴾ (۵۳/النجم:۵۹)

''تو کیا تم اس بات (قرآن) سے تعجب کرتے ہو۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَٰهًا وَاحِدًا ۖ إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ﴾ (۳۸/ص:۵)

''کیا اس نے سارے معبودوں کا ایک ہی معبود کر دیا؟ واقعی یہ بہت عجیب بات ہے۔''

عجیب کا لفظ محال کے معنی میں اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے لیے استعمال کرنا قطعاً جائز نہیں ہے۔ البتہ ''حیران کن'' اور ''انوکھے'' کے معنی میں عجیب کا لفظ اللہ تعالیٰ کی آیات (نشانیوں) کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ رب العزت کی تمام نشانیاں حیرت انگیز ہیں۔ مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيمِ كَانُوا مِنْ آيَاتِنَا عَجَبًا ﴾

(۱۸/الکھف:۹)

''کیا آپ اپنے خیال میں غار اور کتبے والوں کو ہماری نشانیوں میں سے کوئی بہت عجیب نشانی سمجھ رہے ہیں؟''

(حالانکہ ہماری ہر نشانی عجیب ہے۔)

عجب کا لفظ منفرد کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا﴾ (ایضاً:۶۳)

''اور اس (مچھلی) نے ایک انوکھے طور پر دریا میں اپنا راستہ بنا لیا۔''

منفرد اور بے مثال کے معنی میں تو اللہ تعالیٰ کا سارا قرآن ہی عجیب ہے:

﴿قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا﴾

(۷۲/الجن:۱)

''(اے نبی!) آپ کہہ دیں کہ مجھے وحی کی گئی ہے کہ جنات کی ایک جماعت نے (قرآن) سنا اور انہوں نے کہا کہ ہم نے عجیب قرآن سنا ہے۔''

ہم ان کی بدیوں کو نیکیوں میں بدل دیتے ہیں!

سوال قرآن مجید میں جو یہ ذکر ہوا ہے کہ ''ہم ان کی برائیوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔'' اس کا کیا مطلب ہے؟

جواب سورۃ الفرقان میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا﴾ (۲۵/الفرقان:۷۰)

''مگر جو لوگ توبہ کر لیں، ایمان لائیں اور نیک کام کریں۔ ایسے لوگوں کے گناہوں کو اللہ نیکیوں سے بدل دیتا ہے اور اللہ بہت بخشنے والا اور بہت مہربانی کرنے والا ہے۔''

گناہوں یا بدیوں کو نیکیوں سے بدل دینے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی حالت بدل دیتا ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں مذکورہ آیت کی تفسیر میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلام قبول کرنے سے پہلے گناہ کے کام کیے تھے۔

اسلام میں آنے کے بعد نیکیاں کیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان گناہوں کے بدلے نیکیوں کی توفیق عطا کی۔

عطاء بن ابو رباح رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا تعلق دنیوی زندگی سے ہے۔ انسان کی بری خصلت کو اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے نیک عادت سے بدل دیتا ہے۔

سعید بن جبیر رحمۃ اللہ کا بیان ہے کہ بتوں کی پرستش کے بدلے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی توفیق ملی، مومنوں سے لڑنے کی بجائے کافروں سے جہاد کرنے لگے۔ مشرکہ عورتوں کی بجائے مومنہ عورتوں سے نکاح کیے۔

حسن بصری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ گناہ کے بدلے ثواب کے کام کرنے لگے۔ شرک کے بدلے توحید و اخلاص ملا۔ بدکاری کے بدلے پاکدامنی حاصل ہوئی۔ کفر کے بدلے اسلام ملا۔

گناہوں کے نیکیوں میں بدل جانے کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ نیکیوں سے گناہ مٹ جاتے ہیں۔ اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث بھی دلیل ہے۔ جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

> ''مَیں اس آدمی کو جانتا ہوں جو سب سے آخر میں جنت میں داخل ہونے والا اور سب سے آخر میں جہنم سے نکلنے والا ہوگا۔ یہ وہ شخص ہوگا کہ قیامت کے دن اس پر اس کے چھوٹے چھوٹے گناہ پیش کیے جائیں گے۔ بڑے گناہ ایک طرف رکھ دیے جائیں گے۔ اس سے کہا جائے گا کہ تُو نے فلاں فلاں دن فلاں فلاں کام کیا تھا، وہ ہاں میں جواب دے گا۔ انکار کی ہمت نہ ہوگی۔ علاوہ ازیں وہ اس بات سے بھی ڈر رہا ہوگا کہ ابھی تو اس کے بڑے بڑے گناہ بھی پیش کیے جائیں گے۔ اتنے میں اسے کہا جائے گا کہ جا تیرے لیے ہر برائی کے بدلے ایک نیکی ہے۔ اللہ کی یہ مہربانی دیکھ کر وہ کہے گا کہ ابھی تو میرے بہت سے اعمال ایسے ہیں کہ مَیں انہیں یہاں نہیں دیکھ رہا، یہ بیان کر کے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دانت ظاہر ہوگئے۔''

(مسلم، الایمان ، ادنیٰ اھل الجنة منزلة فیھا، ح:۱۹۰)

ترمذی کی ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح کا ایک اصول بیان کرتے ہوئے ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

((اتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا))

(البر و الصلة، ما جاء فی معاشرة الناس، ح:۱۹۸۷)

''برائی کے بعد نیکی کرو وہ اسے مٹا دے گی۔''

یعنی اگر گناہ ہو جائے تو اس کے بعد نیکی کیا کرو، نیکی گناہ کو ختم کر دے گی۔ اس سلسلے میں قرآن کہتا ہے:

﴿ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ﴾ (۱۱/ہود:۱۱۴)

''بے شک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔''

اس اصول کو کئی ایک احادیث میں وضاحت سے بھی بیان کیا گیا ہے۔ نبی ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھا:

''بتاؤ! اگر تم میں سے کسی ایک کے دروازے پر بڑی نہر ہو، وہ روزانہ اس میں پانچ مرتبہ غسل کرتا ہو، کیا اس کے جسم پر میل کچیل باقی رہے گی؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اسی طرح پانچ نمازیں ہیں، ان کے ذریعے سے اللہ گناہوں اور خطاؤں کو مٹا دیتا ہے۔''

(بخاری، المواقیت، الصلوات الخمس کفارة، ح:۵۲۸؛ مسلم، المساجد، المشی الی الصلاة ..... ح:۶۶۷)

ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((الصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ وَالْجُمُعَةُ إِلَى الْجُمُعَةِ وَرَمَضَانُ إِلَى رَمَضَانَ مُكَفِّرَاتٌ مَا بَيْنَهُنَّ إِذَا اجْتُنِبَ الْكَبَائِرَ))

(مسلم، الطهارة، الصلوات الخمس و الجمعة الی الجمعة ح:۲۳۳)

''پانچوں نمازیں، جمعہ اگلے جمعہ تک اور رمضان آئندہ رمضان تک، ان کے مابین ہونے والے گناہوں کو دُور کرنے والے ہیں بشرطیکہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کیا جائے۔''

کون سا خون حرام کیا گیا ہے؟

سوال سورۃ المائدہ میں جو خون حرام کیا گیا ہے، اس سے کون سا خون مراد ہے؟

جواب: سورۃ المائدہ آیت ۳ میں خون کو حرام کہا گیا ہے۔ اس سے ہر خون مراد نہیں بلکہ اس سے مراد وہ خون ہے جو جانور کے ذبح کے وقت نکلتا اور بہتا ہے جسے دمِ مسفوح کہتے ہیں۔ سورۃ الانعام (آیت: ۱۴۵) میں ﴿دَمًا مَّسْفُوحًا﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ لہٰذا گوشت کے ساتھ جو خون لگا رہ جاتا ہے وہ حرام نہیں ہے۔

نیز کلیجی اور تلی (جو کہ خون ہیں) حدیث کی روشنی میں حلال ہیں۔

اقوال لکھے جاتے ہیں یا افعال بھی؟

سوال: کراماً کاتبین انسان کے اقوال لکھتے ہیں یا اعمال بھی؟ سورۃ ق میں انسان کے اقوال ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ ......﴾ لکھنے کا تذکرہ ہے۔

جواب: سورۃ ق میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ ۝ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ۝﴾ (۵۰/ق:۱۷۔۱۸)

''جس وقت دو لینے والے جا لیتے ہیں؛ ایک دائیں طرف اور بائیں طرف بیٹھا ہوا ہے۔ وہ (انسان) کوئی لفظ نکال نہیں پاتا مگر اس کے پاس نگہبان تیار ہے۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ ۚ بَلَىٰ وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ ۝﴾ (۴۳/الزخرف:۸۰)

''کیا ان کا یہ خیال ہے کہ ہم ان کی پوشیدہ باتوں اور سرگوشیوں کو نہیں سنتے (یقیناً ہم سنتے ہیں۔) بلکہ ہمارے بھیجے ہوئے ان کے پاس ہی لکھ رہے ہیں۔''

ان آیات میں اقوال لکھنے کا تذکرہ ہے جبکہ دیگر کئی آیات میں اقوال کے ساتھ ساتھ افعال و اعمال لکھنے کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿كِرَامًا كَاتِبِينَ ۝ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ۝﴾ (۸۲/الانفطار:۱۱۔۱۲)

''لکھنے والے مقرر ہیں، جو کچھ تم کرتے ہو وہ جانتے ہیں۔''

﴿ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ۝ ﴾ سے معلوم ہوا کہ انسان کے افعال بھی لکھے جاتے ہیں۔ پھر انہی اعمال کے مطابق انسانوں کے کامیاب اور ناکام ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اسی لیے مذکورہ آیات کے بعد نیک و بد ہر دو قسم کے لوگوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا ۭ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ۭ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ۝ ﴾

(۱۰/یونس:۲۱)

’’اور جب ہم لوگوں کو اس امر کے بعد کہ ان پر کوئی مصیبت پڑ چکی ہو، کسی نعمت کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو وہ فوراً ہی ہماری آیتوں کے بارے میں چالیں چلنے لگتے ہیں۔ کہیں کہ اللہ کی تدبیر تمہاری چالوں پر غالب ہے۔ بالیقین ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) تمہاری سب چالوں کو لکھ رہے ہیں۔‘‘

اسی طرح سورۃ الجاثیۃ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۣ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝ ﴾ (۴۵/الجاثیۃ:۲۸۔۲۹)

’’اور آپ دیکھیں گے کہ ہر امت گھٹنوں کے بل گری ہوئی ہوگی۔ ہر گروہ اپنے نامہ اعمال کی طرف بلایا جائے گا۔ آج تمہیں اپنے کیے کا بدلہ دیا جائے گا۔ یہ ہے ہماری کتاب جو تمہارے بارے میں سچ سچ بول رہی ہے۔ ہم تمہارے اعمال لکھواتے جاتے تھے۔‘‘

اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا۝ ﴾ (۱۸/الکہف:۴۹)

''اور نامہ اعمال سامنے رکھ دیا جائے گا۔ تو آپ دیکھیں گے کہ گنہگار اس کی تحریر سے خوف زدہ ہو رہے ہوں گے اور یہ کہہ رہے ہوں گے کہ ہائے ہماری خرابی! یہ کیسی کتاب ہے جس نے کوئی چھوٹا بڑا (عمل) بغیر گھیرے کے باقی ہی نہیں چھوڑا اور جو کچھ انہوں نے کیا تھا سب موجود پائیں گے اور آپ کا رب کسی پر ظلم و ستم نہ کرے گا۔''

مذکورہ بالا آیات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی ساری زندگی کا مکمل ریکارڈ تیار کیا جاتا ہے۔ اس کے سب اقوال اور اعمال و افعال ثبت کر لیے جاتے ہیں۔ روزِ قیامت ہر چیز کھل کر انسان کے سامنے آ جائے گی۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ ۖ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا ۝ اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ۝ ﴾

(۱۷/بنی اسراءیل:۱۳۔۱۴)

''ہم نے ہر انسان کی بھلائی برائی کو اس کے گلے لگا دیا ہے اور روزِ قیامت ہم اس کے سامنے اس کا نامہ اعمال نکالیں گے جسے وہ اپنے اوپر کھلا ہوا پائے گا۔ لے خود ہی اپنی کتاب پڑھ لے، آج تو تُو خود ہی اپنا حساب لینے کے لیے کافی ہے۔''

کشائش رزق کے لیے سورہ یٰس کی ہر مبین کے بعد آیۃ الکرسی یا کوئی اور سورت پڑھنا؟

سوال کشائش رزق کے لیے سورۃ یٰس میں ہر ''مبین'' کے بعد کوئی دوسری سورت پڑھی جا سکتی ہے؟ یعنی پہلی مبین کے بعد تین مرتبہ سورۃ الاخلاص دوسری مبین کے بعد تین مرتبہ آیۃ الکرسی، اسی طرح باقی ''مبین'' کے بعد کوئی نہ کوئی سورت پڑھ سکتی ہوں؟

جواب کتاب و سنت میں اس طرح سورۃ یٰس پڑھنے کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا ہر مبین کے بعد کوئی سورت پڑھنا یا مبین پر پہنچ کر دوبارہ نئے سرے سے سورۃ یٰس پڑھنا کسی حدیث سے ثابت نہیں۔ کشائش رزق کے لیے مسنون دعائیں پڑھی جائیں اور رزق اللہ

سے مانگا جائے، اس لیے کہ رزق اسی کے ہاتھ میں ہے۔

مزید برآں اگر ہر مبین کے بعد آیۃ الکرسی یا کوئی اور سورت پڑھی جائے تو آیات بے ربط ہو کر رہ جاتی ہیں۔ سورۂ یٰس میں جن آیات میں مبین کا لفظ آیا ہے اگر ان کے ماقبل اور مابعد (سیاق و سباق) کو دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ جن آیات میں مبین کا لفظ آیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

﴿ إِمَامٍ مُّبِينٍ ﴾ (آیت:۱۲)

﴿ الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ﴾ (آیت:۱۷)

﴿ ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴾ (آیت:۲۴)

﴿ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴾ (آیت:۶۰)

﴿ قُرْآنٌ مُّبِينٌ ﴾ (آیت:۶۹)

﴿ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ﴾ (آیت:۷۷)

پہلی مبین (آیت ۱۲) کے بعد جو واقعہ شروع ہوتا ہے وہ حرف ''وَ'' (اور) سے شروع ہوتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا پہلی بات سے گہرا تعلق ہے۔ دوسری مبین (آیت:۱۷) پر انبیاء علیہم السلام کے اپنی قوم سے مکالمہ کا ذکر ہے۔ جب نبیوں نے کہا کہ ہمارا کام تو کھل کر اللہ کا پیغام پہنچا دینا ہے تو قوم نے آگے سے جواب دیا...... آپ قوم کا جواب ذکر کرنے کی بجائے آیۃ الکرسی پڑھنا شروع کر دیں تو بات کتنی بے ربط ہو جائے گی نیز آیات کا مفہوم بگڑ جائے گا۔ یہی حال تیسری مبین (آیت ۲۴) کا ہے کہ وہاں اس آدمی کے کلام کا تذکرہ ہے جس نے لوگوں کو دعوت دی تھی کہ وہ رسولوں کی اتباع کریں۔ مبین پر اس کی بات ابھی نامکمل ہے یہاں مبین کے بعد اگر کوئی اور سورت پڑھی جائے تو تسلسل ختم ہو جاتا ہے۔ یہی حال باقی تمام ''مبین'' کا ہے۔ سورۂ یٰس کا مطالعہ کرنے سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے۔

سورۂ یٰس کی ۷۰ دفعہ تلاوت؟

سوال: سورۂ یٰس کو ۷۰ دفعہ پڑھنا کیسا ہے؟

جواب: کسی بھی سورت کو آپ جتنی دفعہ بھی پڑھنا چاہیں پڑھ سکتے ہیں۔ قرآن مجید کی جتنی زیادہ تلاوت کی جائے افضل ہے، مگر سورتوں کی تلاوت میں کسی عدد کو متعین کرنا، اسے مسئلہ بنانا اور لوگوں سے یہ کہنا کہ فلاں سورت کو اتنی دفعہ پڑھو۔ درست نہیں۔ ہاں اگر نبی ﷺ نے فرمایا ہو کہ سورت یٰسٓ کو (مثلاً) ستر دفعہ پڑھو تو اس کی پابندی کی جائے گی جبکہ ایسا کوئی معین عدد نبی اکرم ﷺ سے منقول نہیں۔

کیا ابراہیم علیہ السلام کا والد مشرک تھا؟

سوال: کیا یہ بات درست ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا باپ مومن تھا مشرک نہیں تھا؟

جواب: قرآن مجید کے بیان کے مطابق ابراہیم علیہ السلام کا والد بت پرست (مشرک)، شیطان کا پجاری، گمراہ، وقت کے نبی کا نافرمان اور اللہ تعالیٰ کا دشمن تھا۔ اسی وجہ سے اسے نبی اکرم ﷺ نے جہنمی قرار دیا ہے، قرآن مجید اور احادیث میں ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام آزر بیان ہوا ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام تارخ تھا، ممکن ہے ایک نام ہو اور دوسرا لقب۔ اس لیے کہ تارخ اور آزر دو الگ الگ آدمیوں کے نام نہیں ہیں۔ کچھ لوگوں کا یہ کہنا کہ آزر ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا بے بنیاد ہے۔ دراصل ایسے لوگ اپنے من گھڑت باطل نظریات کو بچانے کے لیے قرآن وحدیث کے واضح دلائل کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں، یعنی

؎ خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں۔

حالانکہ قرآن نے دوٹوک الفاظ میں آزر کا ابراہیم علیہ السلام کے والد کی حیثیت سے تذکرہ کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِذْ قَالَ إِبْرَٰهِيمُ لِأَبِيهِ ءَازَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا ءَالِهَةً ۖ إِنِّىٓ أَرَىٰكَ وَقَوْمَكَ فِى ضَلَـٰلٍ مُّبِينٍ ۝﴾ (٦/الانعام:٧٤)

''اور جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا کہ کیا آپ بتوں کو معبود قرار دیتے ہیں؟ بے شک میں آپ کو اور آپ کی قوم کو صریح گمراہی میں دیکھتا ہوں۔''

سورۂ مریم (آیات ۴۱ تا ۴۶) میں تو بار بار یابت یابت (اے ابا جان) کے الفاظ آئے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ ۚ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ۝ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنكَ شَيْئًا ۝ يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ يَا أَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ ۖ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ عَصِيًّا ۝ يَا أَبَتِ إِنِّي أَخَافُ أَن يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَانِ وَلِيًّا ۝ قَالَ أَرَاغِبٌ أَنتَ عَنْ آلِهَتِي يَا إِبْرَاهِيمُ ۖ لَئِن لَّمْ تَنتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ ۖ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا ۝﴾

''اور اس کتاب میں ابراہیم کا قصہ بیان کریں، بیشک وہ بڑی سچائی والے نبی تھے، جبکہ انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ ابو جی! آپ ان کی پوجا پاٹ کیوں کر رہے ہیں جو نہ سنیں نہ دیکھیں، نہ آپ کو کچھ فائدہ پہنچا سکیں، ابو جی! آپ دیکھیے میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس آیا ہی نہیں، تو آپ میری ہی مانیں میں بالکل سیدھی راہ کی طرف آپ کی رہبری کروں گا، ابا جان! شیطان تو رحم و کرم والے اللہ کا بڑا ہی نافرمان ہے، ابا جان! مجھے خوف لگا ہوا ہے کہ کہیں آپ پر کوئی عذاب الٰہی نہ آ پڑے کہ آپ شیطان کے رفیق بن جائیں، اس نے جواب دیا: ابراہیم! کیا تو ہمارے معبودوں سے روگردانی کر رہا ہے، سن اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے پتھروں سے مار ڈالوں گا، جا ایک مدت دراز تک مجھ سے الگ رہ۔''

قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَن مَّوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِّلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۚ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ۝﴾

(۹/التوبۃ:۱۱۴)

''اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت کرنا صرف وعدہ کے سبب سے تھا جو انہوں نے اس سے کر لیا تھا، پھر جب ان پر یہ بات ظاہر ہوگئی کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے محض بے تعلق ہو گئے، واقعی ابراہیم بڑے نرم دل اور

بردبار تھے۔"

ایک اور مقام پر ہے:

﴿ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۝ ﴾

(۲۱/الانبیاء:۵۲)

"جب انہوں نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ مورتیاں جن کے تم مجاور بنے بیٹھے ہو کیا ہیں؟"

قیامت کے دن ابراہیم علیہ السلام کے باپ کے چہرے پر سیاہی اور گرد و غبار جما ہوا ہوگا (جو کہ کفار و مشرکین کی حالت ہوگی) ارشادِ نبوی ہے:

((يَلْقٰى اِبْرَاهِيْمُ اَبَاهُ اٰزَرَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَعَلٰى وَجْهِ اٰزَرَ قَتَرَةٌ وَغَبَرَةٌ...... فَيَنْظُرُ فَاِذَا هُوَ بِذِيْخٍ مُلْتَطِخٍ فَيُؤْخَذُ بِقَوَائِمِهٖ فَيُلْقٰى فِى النَّارِ))

(بخاری، الانبیاء، قول اللہ تعالیٰ: ﴿ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴾، ح:۳۳۵۰)

"ابراہیم اپنے والد آزر کو قیامت کے دن دیکھیں گے، اس کے منہ پر سیاہی اور گرد و غبار ہوگا، ان سے کہیں گے: مَیں نے (دنیا میں) تم سے نہیں کہا تھا کہ میری نافرمانی نہ کریں (کہا مانیں۔) آزر کہے گا: آج مَیں تیری نافرمانی نہیں کروں گا (جو تُو کہے گا بجا لاؤں گا) اس وقت ابراہیم علیہ السلام (پروردگار سے) عرض کریں گے: پروردگار! تُو نے (میری یہ دعا قبول کی تھی، جو سورۃ الشعراء میں ہے) مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ قیامت کے دن تجھے ذلیل نہیں کروں گا، اس سے زیادہ کونسی ذلت ہوگی، میرا باپ ذلیل ہوا، جو تیری رحمت سے محروم ہے، اللہ فرمائے گا: مَیں نے تو کافروں پر بہشت حرام کر دی ہے، پھر ابراہیم کو تسلی دینے کے لیے کہا جائے گا: ذرا اپنے پاؤں تلے تو دیکھو! وہ دیکھیں گے تو (اُن کا والد تو نظر نہیں آئے گا البتہ) نجاست سے لتھڑا ایک بجو ہوگا، اس کے پاؤں پکڑ کر (فرشتے) اسے دوزخ میں ڈال دیں گے۔"

دابۃ الارض سے کمپیوٹر مراد ہے؟

سوال میرے ایک بھائی اس موقف پر ڈٹے ہوئے ہیں کہ قرآن میں مذکور دابۃ الارض سے مراد کمپیوٹر ہے؟ کیا یہ تفسیر درست ہے؟

جواب دابۃ الارض کا خروج قیامت کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ ﴾ (۲۷/النمل:۸۲)

''اور جب ان کے اوپر عذاب کا وعدہ ثابت ہو جائے گا، ہم زمین سے ان کے لیے ایک جانور نکالیں گے جو اُن سے باتیں کرے گا کہ لوگ ہماری آیتوں پر یقین نہیں کرتے تھے۔''

یہ جانور آخر زمانے میں سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کے وقت ظاہر ہوگا، یا سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کے بعد جلد ہی ظاہر ہو جائے گا، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ أَوَّلَ الْآيَاتِ خُرُوجًا طُلُوعُ الشَّمْسِ مِنْ مَّغْرِبِهَا وَ خُرُوجُ الدَّابَّةِ عَلَى النَّاسِ ضُحًى وَأَيُّهُمَا مَا كَانَتْ قَبْلَ صَاحِبَتِهَا فَالْأُخْرَى عَلَى أَثَرِهَا قَرِيبٌ))

(مسلم ، الفتن ، في خروج الدجال و مكثه في الارض ..... ح:۲۹۴۱)

''سب سے پہلی نشانی جو ظاہر ہوگی وہ سورج کا (مشرق کی بجائے) مغرب سے طلوع ہونا اور چاشت کے وقت (دن دہاڑے) جانور کا نکلنا ہے، ان دونوں میں سے جو پہلے ظاہر ہوگی دوسری اس کے فوراً بعد ہی ظاہر ہو جائے گی۔''

مذکورہ بالا آیت قرآنی اور حدیث نبوی سے درج ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

① زمین پر چلنے والے جاندار کو دابۃ کہا جاتا ہے، آیت میں دابۃ کا لفظ آیا ہے۔

② دابۃ الارض اس وقت نکلے گا جب لوگوں پر عذاب کا وعدہ ثابت ہو چکا ہوگا یعنی

جب نیکی کا حکم دینے والا اور برائی سے روکنے والا کوئی نہیں رہے گا۔

③ وہ جانور لوگوں سے گفتگو کرے گا (جس شخص کی جو زبان ہوگی وہ اس سے معجزانہ طور پر اسی زبان میں بات کرے گا۔)

④ تکلمھم کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ ''وہ انہیں زخمی کرے گا۔'' دوسرا معنی اوپر گزر چکا ہے کہ ''وہ ان سے بات کرے گا۔''

مفسر قرآن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ وہ جانور مومن سے کلام کرے گا اور کافر کو زخمی کرے گا۔ (تفسیر ابن کثیر)

⑤ وہ جانور لوگوں کے ایمان نہ لانے اور یقین نہ کرنے کی بات کرے گا۔

⑥ وہ جانور سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کے قریب قریب ظاہر ہوگا۔

یہ بھی واضح رہے کہ دابۃ الارض کے خروج سے پہلے امام مہدی کا ظہور، عیسی علیہ السلام کا نزول اور دجال کا خروج وغیرہ نشانیاں ظاہر ہو چکی ہوں گی۔

⑦ یہ جانور چاشت کے وقت نکلے گا۔

مذکورہ بالا حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ دابۃ الارض اور کمپیوٹر میں زمین و آسمان کا فرق ہے، کمپیوٹر نہ تو دابۃ الارض (زمین کا جانور) ہے نہ اس وقت ایجاد ہوا جب لوگوں پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا وقت آ چکا تھا۔

کیا کمپیوٹر لوگوں سے ان کی زبان میں ان سے بحث و مباحثہ کرتا ہے؟

کیا کمپیوٹر مومن اور کافر میں فرق کرتا ہے؟

کیا کمپیوٹر لوگوں کے ایمان نہ لانے کا اعلان کرنے کے لیے ایجاد ہوا ہے؟

کیا کمپیوٹر سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کے وقت ایجاد ہوا ہے؟

ایک اور پہلو سے بھی دیکھا جائے، کیا دابۃ الارض C.D بھی Drive کرے گا؟

کیا دابۃ الارض پر وائرس حملہ آور ہو کر اس کا سارا ریکارڈ خراب کر دے گا؟

کیا دابۃ الارض کے ساتھ Key Board بھی ہوگا؟

ہر لحاظ سے یہ بات غلط ہے کہ دابۃ الارض سے مراد کمپیوٹر ہے۔ قرآن حکیم کی

تعلیمات کو بگاڑنے والوں کو اللہ تعالیٰ ہدایت نصیب کرے۔

زمین وآسمان اور ما بینھما کی تخلیق کتنے دنوں میں ہوئی؟

سوال زمین وآسمان اور وما بینھما کی تخلیق کتنے دنوں میں ہوئی؟ چھ دن میں یا آٹھ دن میں؟ قرآن پاک کی روشنی میں وضاحت کر دیں۔

جواب اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان اور وما بینھما (جو کچھ ان کے درمیان ہے) کو چھ دنوں (ان دنوں کی حقیقت اللہ ہی بہتر جانتا ہے) میں پیدا کیا۔ کئی قرآنی آیات میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ﴾

(۷/الاعراف:۵۴)

''بے شک تمہارا رب اللہ ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔''

﴿ إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهِ ذٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴾ (۱۰/یونس:۳)

''بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے، جس نے سب آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا ہے، پھر (اپنی شان کے مطابق) عرش پر مستوی ہوا، وہ ہر کام کی تدبیر کرتا ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی اس کے پاس سفارش کرنے والا نہیں یہی اللہ تمہارا رب ہے لہٰذا تم اس کی عبادت کرو، کیا تم (پھر بھی) نصیحت نہیں پکڑتے!''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ﴾ (۱۱/ھود:۷)

''اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔''

ان آیات میں زمین وآسمان کا تذکرہ ہے ﴿ وَمَا بَيْنَهُمَا ﴾ کا ذکر نہیں لیکن ضمناً

﴿ وَمَا بَيْنَهُمَا ﴾ بھی اسی میں شامل ہیں اور بعض آیات میں تو ﴿ وَمَا بَيْنَهُمَا ﴾ کی صراحت بھی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ۚ الرَّحْمَٰنُ فَاسْأَلْ بِهِ خَبِيرًا ﴾ (۲۵/الفرقان:۵۹)

''وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی سب چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر عرش پر مستوی ہوا، وہ رحمٰن ہے، آپ اس کے بارے میں کسی خبر دار سے پوچھ لیں۔''

ایک اور آیت میں فرمایا:

﴿ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ۖ مَا لَكُم مِّن دُونِهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا شَفِيعٍ ۚ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ﴾ (۳۲/السجدۃ:۴)

''اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی سب چیزوں کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر عرش پر جلوہ افروز ہوا، تمہارے لیے اس کے سوا کوئی مددگار اور سفارشی نہیں، کیا (پھر بھی) تم نصیحت حاصل نہیں کرتے!''

سورہ حم السجدۃ میں ان چھ دنوں کی تفصیل بھی بیان ہوئی ہے۔ دو دن میں زمین بنائی، دو دن میں برکتیں، خزانے اور پہاڑ وغیرہ رکھے اور دو دن میں آسمان بنائے لہٰذا سب ملا کر چھ دن ہوئے۔ اس سورت کی آیت ۱۰ میں اللہ تعالیٰ نے زمین میں پہاڑوں کے گاڑنے اور اس میں برکتیں وغیرہ رکھنے کا وقت چار دن بیان کیا ہے۔ ان چار دنوں میں زمین کے پیدا کرنے کے دو دن بھی شامل ہیں۔ یہاں زمین کی تخلیق کے دو دن شامل نہ کرنے کی وجہ سے بعض لوگوں کو اشکال پیدا ہوا کہ زمین و آسمان اور ﴿ وَمَا بَيْنَهُمَا ﴾ کو آٹھ دن میں پیدا کیا گیا ہے۔ زمین و آسمان اور ان کے مابین چیزوں کی تخلیق کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَندَادًا ۚ ذَٰلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ ۞ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ

فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِلسَّائِلِينَ ۞ ثُمَّ اسْتَوَى إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ ۞ فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ وَأَوْحَى فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَحِفْظًا ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۞﴾ (۴۱/حٰم السجدۃ:۹۔۱۲)

''آپ کہہ دیجیے! کہ کیا تم اس (اللہ) کا انکار کرتے ہو اور تم اس کے شریک مقرر کرتے ہو جس نے دودن میں زمین پیدا کردی، سارے جہانوں کا پروردگار وہی ہے۔ اور اس نے زمین میں اس کے اوپر سے پہاڑ گاڑ دیے اور اس میں برکت رکھ دی اور اس میں (رہنے والوں کی) غذاؤں کی تجویز بھی صرف چار دن میں کر دی، یہ سوال کرنے والوں کے لیے پُورا جواب ہے۔ پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں (سا) تھا، اسے اور زمین سے فرمایا کہ تم دونوں خوشی سے آؤ یا ناخوشی سے۔ دونوں نے عرض کیا: ہم بخوشی حاضر ہیں۔ تو دو دن میں سات آسمان بنا دیے اور ہر آسمان میں اس کے مناسب احکام کی وحی بھیج دی اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں سے زینت دی اور نگہبانی کی یہ تدبیر اللہ خوب غالب اور بھرپُور علم والے کی ہے۔''

کیا آسمانوں اور زمین کو کُنْ فَيَكُوْنُ سے پیدا کیا گیا ہے؟

سوال اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا یا كُنْ فَيَكُوْنُ سے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ﴾

(۷/الاعراف:۵۴)

''تمہارا رب تو وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا ہے۔''

(نیز دیکھیے ۱۱/ھود:۷، ۵۷/الحدید:۴)

البتہ آسمانوں اور زمین کے درمیان جو کچھ پیدا کیا گیا ہے وہ انہی چھ دنوں کے دوران

تخلیق کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴾ (۵۰/ق:۳۸)

''یقیناً ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ اس کے درمیان ہے سب کو (صرف) چھ دن میں پیدا کر دیا اور ہمیں تکان نے چھوا تک نہیں۔''

اس کے علاوہ یہ مضمون ۲۵/الفرقان:۵۹، ۳۲/السجدۃ:۴ وغیرھا سورتوں میں بیان کیا گیا ہے۔

آسمانوں اور زمینوں کا چھ دنوں میں پیدا کرنا کُنْ فَيَكُوْنُ کے اصول کے منافی نہیں ہے۔ کُنْ فَيَكُوْنُ سے کسی چیز کا فوری اور اسی وقت ہونا ضروری نہیں ٹھہرتا۔ کُنْ فَيَكُوْنُ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسباب کا محتاج نہیں، جب کسی کام کو فوری کرنا چاہتا ہے تو فوری ہو جاتا ہے جبکہ کسی کام کے کرنے کا وقت مقرر کرے تو وہ اس مدت مقررہ میں ہو جاتا ہے کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو قرآن مجید میں کلمۃ اللہ کہا گیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے کلمہ کن سے پیدا کیا۔ حالانکہ ان کی پیدائش کے واقعہ کی تفصیل پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ولادت کا عمل کافی وقت میں مکمل ہوا۔ پہلے فرشتے نے حضرت مریم کو بیٹے کی بشارت سنائی، اس پر اس سے کافی گفتگو ہوئی۔ بعد ازاں عیسیٰ علیہ السلام کی بطنِ مادر میں پرورش شروع ہوئی۔ حضرت مریم مکاناً قصیا (دور کے مقام) پر چلی گئیں۔ وہاں انہوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو جنم دیا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے مریم:۱۶-۳۵)۔ اب دیکھیے عیسیٰ علیہ السلام اور آدم علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کیا فرماتے ہیں:

﴿ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ (۳/ آل عمران:۵۹)

''اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی مثال ہے جسے مٹی سے بنا کر کے کہہ دیا کہ ہو جا! تو وہ ہو گیا۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کام کو جیسے، جب اور جتنے وقت میں کرنا چاہے وہ

کام اللہ تعالیٰ کے ارادے اور حکمت کے مطابق ہوجاتا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿بَدِيعُ السَّمَٰوَٰتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَإِذَا قَضَىٰٓ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ﴾ (۲/البقرۃ:۱۱۷)

''وہ زمین اور آسمانوں کا پیدا کرنے والا ہے، وہ جس کام کو کرنا چاہے فرما دیتا ہے کہ ہوجا،تو وہ ہوجاتا ہے۔''

ارض وسماء میں سے کس کی تخلیق پہلے ہوئی؟

سوال ارض و سماء میں سے کس کی تخلیق پہلے ہوئی؟ ۲/البقرۃ:۲۹ اور سورۃ النازعات آیات ۲۷۔۳۰ کی روشنی میں جواب مطلوب ہے۔

جواب قرآن مجید میں جہاں بُعد زمانی کی صراحت ہے وہاں پر زمین کی پیدائش کا ذکر آسمانوں کی تخلیق کے تذکرے سے پہلے کیا گیا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُۥٓ أَندَادًا ۚ ذَٰلِكَ رَبُّ الْعَٰلَمِينَ ۝ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَٰسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَٰرَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَآ أَقْوَٰتَهَا فِيٓ أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِينَ ۝ ثُمَّ ٱسْتَوَىٰٓ إِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ٱئْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَآ أَتَيْنَا طَآئِعِينَ ۝ فَقَضَىٰهُنَّ سَبْعَ سَمَٰوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ وَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَآءٍ أَمْرَهَا ۚ وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَٰبِيحَ وَحِفْظًا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ﴾ (۴۱/حٰم السجدۃ:۹۔۱۲)

''آپ کہہ دیجیے! کہ کیا تم اس (اللہ) کا انکار کرتے ہو اور تم اس کے شریک مقرر کرتے ہو جس نے دو دن میں زمین پیدا کردی، سارے جہانوں کا پروردگار وہی ہے۔اور اس نے زمین میں اس کے اوپر سے پہاڑ گاڑ دیئے اور اس میں برکت رکھ دی اور اس میں (رہنے والوں کی) غذاؤں کی تجویز بھی اسی نے کردی (صرف) چار دن میں،ضرورت مندوں کے لیے یکساں طور پر۔ پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دُھواں (سا) تھا پس اسے اور زمین سے فرمایا

کہ تم دونوں خوشی سے آؤ یا ناخوشی سے۔ دونوں نے عرض کیا: ہم بخوشی حاضر ہیں۔ پس دو دن میں سات آسمان بنا دیئے اور ہر آسمان میں اس کے مناسب احکام کی وحی بھیج دی اور ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں سے زینت دی اور نگہبانی کی، یہ تدبیر اللہ خوب غالب اور بھرپور علم رکھنے والے کی ہے۔"

بُعدِ زمانی کی وضاحت کے بغیر قرآن میں ایک مقام پر آسمان و زمین کی تخلیق کا ذکر یوں کیا گیا:

﴿ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ﴾ (۲۰/طٰہٰ:۴)

"اس (قرآن) کا اتارنا اس کی طرف سے ہے جس نے زمین کو اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا۔"

زمانی صراحت کے بغیر زمین و آسمان کی تخلیق کے ضمن میں قرآن کے اکثر مقامات پر پہلے آسمانوں کا تذکرہ ہے۔ بہت سی آیات میں ﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ کے الفاظ موجود ہیں۔

(دیکھیے ٦/ الانعام:١، ٧٣؛ ٧/ الاعراف:٥٤؛ ١٠/ یونس:٣؛ ١١/ ھود:٧؛ ١٤/ ابراھیم:٣٢؛ ١٦/ النحل:٣؛ ١٧/ بنی اسراء یل:٩٩؛ ٢٥/ الفرقان:٥٩؛ ٢٧/ النّمل:٦٠؛ ٢٩/ العنکبوت:٤٤؛ ٣٠/ الرّوم:٨؛ ٣٢/ السّجدة:٤؛ ٣٦/ یس:٨١؛ ٣٩/ الزّمر:٥؛ ٤٣/ الزّخرف:٩؛ ٤٥/ الجاثية: ٢٢؛ ٤٦/ الاحقاف:٣٣؛ ٥٧/ الحدید:٤؛ ٦٤/ التغابن:٣؛ ٦٥/ الطلاق:١٢؛ ٢/ البقرة: ١٦٤؛ ٣/ اٰل عمرٰن: ١٩٠-١٩١؛ ٤٠/ المؤمن:٥٧؛ ٤٢/ الشورٰی:٢٩)

لیکن قرآن مجید میں کوئی ایک آیت بھی ایسی موجود نہیں ہے جو صراحت سے یہ بیان کرتی ہو کہ زمین آسمانوں کے بعد پیدا کی گئی ہے۔ البتہ ایک مقام پر قرآن مجید میں یہ تذکرہ موجود ہے کہ زمین کو آسمانوں کی تخلیق کے بعد بچھایا گیا (نہ کہ بعد میں پیدا کیا گیا)، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰهَا ۞ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۞ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ۞ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۞ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ۞ ﴾ (٧٩/النّٰزعٰت:٢٧-٣١)

''کیا تمہارا پیدا کرنا زیادہ دشوار ہے یا آسمان کا؟ اللہ نے اسے بنایا۔ اس کی بلندی اونچی کی پھر اسے ٹھیک ٹھاک کر دیا۔ اس کی رات کو تاریک بنایا اور اس کے دن کو نکالا۔ اور اس کے بعد زمین کو (ہموار) بچھا دیا۔ اس میں سے اس کا پانی اور چارہ نکالا۔''

ظاہر ہے خلق (پیدا کرنے) اور دحی (ہموار بچھانے) میں فرق ہے۔ زمین کو پیدا تو آسمانوں سے پہلے کیا گیا البتہ اسے رہائش کے قابل آسمانوں کی تخلیق کے بعد بنایا گیا جیسا کہ مذکورہ بالا مقام اور قرآن کے دیگر مقامات سے معلوم ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ۝ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ۝ ﴾ (۵۱/الذاریات: ۴۷-۴۸)

''آسمان کو ہم نے اپنی قوت سے بنایا ہے اور یقیناً ہم کشادگی کرنے والے ہیں۔ اور زمین کو ہم نے فرش بنا دیا ہے۔ پس ہم بہت ہی اچھے بچھانے والے ہیں۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا۝ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا۝ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا۝ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا۝ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا۝ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا۝ ﴾ (۷۱/نوح: ۱۵-۲۰)

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے اوپر تلے کس طرح سات آسمان پیدا کر دیے ہیں۔ اور ان میں چاند کو خوب جگمگاتا بنایا ہے اور سورج کو روشن چراغ بنایا ہے۔ اور تم کو زمین سے ایک (خاص اہتمام سے) اگایا ہے۔ (اور پیدا کیا ہے) پھر تمہیں اسی میں لوٹائے گا اور پھر (ایک خاص طریقہ سے) نکالے گا۔ اور تمہارے لیے زمین کو اللہ نے فرش بنا دیا ہے تاکہ تم اس کی کشادہ راہوں میں چلو پھرو۔''

آسمانوں کی تخلیق وتزئین کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ ۝ وَلَقَدْ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّیٰطِیْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِیْرِ ۝﴾

(۶۷/الملک:۳-۵)

”جس نے سات آسمان اوپر تلے بنائے۔ تُو (اے دیکھنے والے) اللہ رحمٰن کی تخلیق میں کوئی بے ضابطگی نہ دیکھے گا، دوبارہ (نظریں ڈال کر) دیکھ لے کیا کوئی شگاف بھی نظر آرہا ہے۔ پھر دوہرا کر دو دو بار دیکھ لے تیری نگاہ تیری طرف ذلیل (وعاجز) ہو کر تھکی ہوئی لوٹ آئے گی۔ بے شک ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں (ستاروں) سے آراستہ کیا اور انہیں شیطانوں کے مارنے کا ذریعہ بنا دیا اور شیطانوں کے لیے ہم نے (دوزخ کا) جلانے والا عذاب تیار کر دیا ہے۔“

چند آیات کے بعد زمین کے قابلِ سکونت بنانے کا ذکر اللہ تعالیٰ یوں کرتے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ ۝﴾ (۶۷/الملک:۱۵)

”وہی ہستی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو پست ومطیع کر دیا تاکہ تم اس کی راہوں میں چلتے پھرتے رہو اور اللہ کی روزیاں کھاؤ (پیو) اسی کی طرف جی کر اٹھ کھڑا ہونا ہے۔“

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک آدمی نے ﴿وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝﴾ (۷۹/النّزٰعٰت:۳۰) اور سورۃ حم السجدۃ (آیات:۹-۱۲) کی روشنی میں زمین وآسمان کی تخلیق پر اشکال ظاہر کیا تو آپ نے فرمایا: زمین کو دو دن میں پیدا کیا، اس کا مطلب ہے کہ اسے پھیلایا نہیں (صرف اس کا مادہ پیدا کیا) پھر آسمان کو پیدا کیا اور دو دن میں اسے برابر کیا (ان کے طبقات مرتب کیے) اس کے بعد زمین کو پھیلایا اور اس کا پھیلانا یہ ہے کہ اس میں سے پانی

نکالا، گھاس چارہ پیدا کیا، پہاڑ، جانور، اونٹ اور ٹیلے وغیرہ پیدا کیے۔

(بخاری، التفسیر تفسیر سورۃ حم السجدۃ)

﴿ ثُمَّ ﴾ (پھر) اور ﴿ بَعْدَ ذٰلِكَ ﴾ کا مفہوم اگر ''اس کے علاوہ'' لے لیا جائے تو ارض وسماء کی تخلیق میں پہلے بعد کا مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اسی موقف کو سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اختیار کیا ہے۔ سورۃ النازعات کی آیت ﴿ وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ﴾ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس کے بعد زمین کو بچھانے'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آسمان کی تخلیق کے بعد اللہ تعالیٰ نے زمین پیدا کی، بلکہ یہ ایسا ہی طرز بیان ہے جیسے ہم ایک بات کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں'' پھر یہ بات غور طلب ہے۔'' اس سے مقصود ان دونوں باتوں کے درمیان واقعاتی ترتیب بیان کرنا نہیں ہوتا کہ پہلے یہ بات ہوئی اور اس کے بعد دوسری بات، بلکہ مقصود ایک بات کے بعد دوسری بات کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے اگرچہ دونوں ایک ساتھ پائی جاتی ہوں۔ اس طرز بیان کی متعدد نظیریں خود قرآن میں موجود ہیں۔ مثلاً سورۃ قلم میں فرمایا:

﴿ عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ﴾ (۶۸/القلم:۱۳)

''جفا کار ہے اور اس کے بعد بداصل۔''

اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے وہ جفا کار بنا اور اس کے بعد بداصل ہوا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جفا کار ہے اور اس پر مزید یہ کہ بداصل بھی ہے۔

اسی طرح سورۃ البلد میں فرمایا:

﴿ فَكُّ رَقَبَةٍ ...... ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾

''غلام آزاد کرے...... پھر ایمان لانے والوں میں سے ہوا۔''

اس کا بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے وہ نیک اعمال کرے، پھر ایمان لائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان نیک اعمال کے ساتھ ساتھ اس میں مومن ہونے کی صفت بھی ہو۔ اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن میں کہیں زمین کی پیدائش کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اور آسمانوں کی پیدائش کا ذکر بعد میں، جیسے سورۃ بقرۃ آیت ۲۹ میں ہے، اور کسی جگہ آسمان کی پیدائش کا

ذکر پہلے اور زمین کی پیدائش کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے، جیسے ان آیات میں ہم دیکھ رہے ہیں، یہ دراصل تضاد نہیں ہے۔ ان مقامات میں سے کسی جگہ بھی مقصود کلام یہ بتانا نہیں ہے کہ کسے پہلے بنایا گیا اور کسے بعد میں، بلکہ جہاں موقع ومحل یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کمالات کو نمایاں کیا جائے وہاں آسمانوں کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اور زمین کا بعد میں، اور جہاں سلسلہ کلام اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ لوگوں کو اُن نعمتوں کا احساس دلایا جائے جو انہیں زمین پر حاصل ہو رہی ہیں وہاں زمین کے ذکر کو آسمانوں کے ذکر پر مقدم رکھا گیا ہے۔

(تفہیم القرآن ۲۴۴/۶، ۲۴۵)

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں!

سوال کیا قرآن پاک کی آیت (وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ) کا وہی مطلب ہے جو درج ذیل منظوم کلام میں مراد لیا گیا ہے:

پیر کامل علی حسینی وسیلہ جس نے بنا لیا ہے
وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ کے حکم کو بے شک بجا لیا ہے

جواب ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ﴾ سے علی حسینی کا وسیلہ مراد لینا قطعی غلط ہے بلکہ یہ قرآن پاک کی معنوی تحریف کے زمرے میں آتا ہے۔ سب سے پہلے ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ﴾ کا حکم ان لوگوں کے لیے ہے جو قرآن مجید کے اولین مخاطب ہیں۔ انہوں نے بھی قرآن کی اس آیت پر عمل کیا جبکہ اس وقت علی حسینی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ آج بھی لوگ (چند لوگوں کو چھوڑ کر) ان کے نام تک سے واقف نہیں ہیں۔ کیا یہ سب لوگ قرآن کریم کی حکم عدولی کرتے ہیں۔ مزید برآں ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ﴾ کا حکم تو خود علی حسینی کے لیے بھی ہے۔ لہٰذا حبل اللہ (اللہ کی رسی) اور ہے اور علی حسینی شے دیگر۔ فافهم و تدبر!

اللہ کی رسی سے مراد اس کا دین ہے اور اسے رسی سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہی وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اہل ایمان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم کرتا ہے اور دوسری طرف تمام ایمان لانے والوں کو باہم ملا کر ایک جماعت بناتا ہے۔ اس رسی کو مضبوط پکڑنے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں اصل اہمیت دین کی ہو، اسی سے انہیں دلچسپی ہو، اسی کی اقامت

میں وہ کوشاں رہیں اور اسی کی خدمت کے لیے آپس میں تعاون کرتے رہیں۔ جہاں دین کی اساسی تعلیمات اور اس کی اقامت کے نصب العین سے مسلمان ہٹے اور ان کی توجہات اور دلچسپیاں جزئیات و فروع کی طرف منعطف ہوئیں۔ پھر ان میں لازماً وہی تفرقہ و اختلاف رونما ہوا جو اس سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی امتوں کو اُن کے اصل مقصدِ حیات سے منحرف کر کے دنیا اور آخرت کی رسوائیوں میں مبتلا کر چکا ہے۔ (تفہیم۔۳/آل عمران:۱۰۲)

تفسیر بالرأی مذموم کی ایک مثال

سوال ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ ۝ ﴾ (۲/البقرۃ:۸) کی وضاحت میں ایک اردو تفسیر میں لکھا ہے: "مِنَ النَّاسِ فرمانے میں لطیف رمز یہ ہے کہ یہ گروہ بہتر صفات و انسانی کمالات سے ایسا عاری ہے کہ اس کا ذکر کسی وصف اور خوبی کے ساتھ نہیں کیا جاتا، یوں کہا جاتا ہے کہ وہ بھی آدمی ہیں۔ مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ کسی کو بشر کہنے میں اس کے فضائل و کمالات کے انکار کا پہلو نکلتا ہے۔ اس لیے قرآن پاک میں جا بجا انبیاء کرام کو بشر کہنے والوں کو کافر فرمایا گیا اور درحقیقت انبیاء کی شان میں ایسا لفظ ادب سے دور اور کفار کا دستور ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا: مِنَ النَّاسِ سامعین کو تعجب دلانے کے لیے فرمایا گیا کہ ایسے فریبی مکار اور ایسے احمق بھی آدمیوں میں ہیں۔" (خزائن العرفان)

اس تفسیر کی روشنی میں درج ذیل سوال بنتے ہیں:

① آدمی کا آدمی کہہ کر تذکرہ کرنے سے کیا اس کی بہتر صفات کی نفی ہوتی ہے؟ یا کیا کسی کو بشر کہنے میں اس کے فضائل و کمالات کے انکار کا پہلو نکلتا ہے؟

② کیا قرآن نے انبیائے کرام کو بشر کہنے والوں کو کافر کہا ہے؟

③ کیا انبیاء علیہم السلام کو بشر کہنا بے ادبی ہے؟

④ کیا انبیاء علیہم السلام کو بشر کہنا کفار کا دستور ہے؟

⑤ کیا من الناس میں تعجب کا پہلو موجود ہے؟

جواب ان اشکالات کی علیحدہ علیحدہ تفصیل درج ذیل ہے:

① کیا آدمی کو آدمی کہہ کر تذکرہ کرنے سے اس کی بہتر صفات کی نفی ہوتی ہے؟ کیا کسی کو بشر کہنے میں اس کے فضائل و کمالات کے انکار کا پہلو نکلتا ہے؟ تو واضح رہنا چاہیے کہ من الناس کے الفاظ اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ ان میں کوئی خوبی نہیں پائی جاتی اور ان سے بہتر صفات کی نفی لازم ہے۔ انسانوں کا ذکر انسان کے الفاظ سے نہ کیا جاتا تو انہیں کیا کہہ کر پکارا جاتا؟ کسی نہ کسی نام سے تو آخر ان کا تذکرہ کیا جانا ہی تھا، ان کے مومن نہ ہونے کی بات تو بعد میں کی گئی ہے۔ اسی بنیاد پر ان کی صفات زیرِ بحث آتی ہیں۔ جب تک الناس کی وضاحت نہ کی جائے تو یہ غیر معین ہی رہتے ہیں۔ اگر اس سے بہتر صفات کی نفی ہوتی ہو تو اس جیسی دیگر آیات میں بھی صفات کی نفی کی جائے گی۔ جبکہ بہت سی ایسی آیات میں صفات کی نفی محض اس بنیاد پر نہیں کی جاسکتی کہ صرف الناس یا الرجال کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ درج ذیل آیات پر اگر غور کیا جائے تو پہلا سوال حل ہو جاتا ہے:

﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ ﴾ (۲/البقرۃ:۱۳) میں الناس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے ایمان کو معیار قرار دیا گیا۔ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت تھی۔ تو کیا الناس کے لفظ سے یہ کہا جائے گا کہ وہ بہتر صفات سے عاری تھے؟

اسی طرح ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ ﴾ (ایضا:۲۰۷) میں الناس پر ہی حکم نہیں لگایا جائے گا بلکہ اس کے سیاق کی روشنی میں صفات کا اثبات کیا جائے گا۔

﴿ إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۝ ﴾ (۱۱۰/النصر:۱۔۲) میں بھی الناس کی صفات کا تعین سیاق و سباق سے کیا جائے گا ورنہ صرف الناس کے لفظ سے انہیں صفات سے عاری یا صفات سے متصف قرار نہیں دیا جا سکتا۔

﴿ اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ ﴾ (۲۲/الحج:۷۵) میں الناس کو بغیر صفات کے بیان کیا ہے البتہ یصطفی اور رسلا کے قرینے سے یہ الناس اچھی صفات کے حامل قرار پائیں گے۔

بعض آیات میں تو انبیاء علیہم السلام اور دیگر اچھے افراد کے لیے رجل، رجال، بشر اور انسان

وغیرہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اگر ان الفاظ سے کمالات کی نفی نکلتی ہوتی تو ایسے الفاظ صالحین کے لیے استعمال نہ کیے جاتے۔ اس سلسلے کی چند آیات درج ذیل ہیں:

نبی اکرم ﷺ کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ ﴾ (۱۰/ یونس:۲)

یہاں رجل کا لفظ نکرہ استعمال کیا گیا ہے جس کی وجہ سے صفات کے بیان سے خالی ہے مگر او حینا سیاق سے رجل کو بہتر صفات سے معرّیٰ ماننا درست نہیں ہوگا۔

اسی قسم کے الفاظ بعض دیگر پیغمبروں کے بارے میں استعمال کیے گئے ہیں۔ نوح اور ھود علیہما السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ ﴾

(۷/الاعراف:۶۳، ۶۹)

''اور کیا تم اس بات پر تعجب کرتے ہو کہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس ایک ایسے آدمی کی معرفت، جو تمہاری ہی جنس کا ہے، کوئی نصیحت کی بات آ گئی۔''

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۭ﴾

(۱۲/ یوسف:۱۰۹)

''آپ سے پہلے ہم نے بستیوں والوں میں جتنے رسول بھیجے ہیں سب مرد ہی تھے جن کی طرف ہم وحی نازل کرتے رہے۔''

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْــَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (۲۱/الانبیاء:۷)

''آپ سے پہلے جتنے پیغمبر ہم نے بھیجے سبھی مرد تھے جن کی طرف ہم وحی اتارتے تھے، پس تم اہلِ کتاب سے پوچھ لو اگر خود تم نہیں جانتے ہو۔''

موسیٰ علیہ السلام کے ایک بہی خواہ کے لیے بھی رجل کا لفظ (صفات سے خالی) استعمال ہوا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى ؗ قَالَ يٰمُوْسٰۤى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ﴾

(۲۸/القصص:۲۰)

''شہر کے پرلے کنارے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا: موسیٰ! یہاں کے سردار آپ کے قتل کا مشورہ کر رہے ہیں، لہٰذا آپ جلدی سے نکل جائیں، مَیں آپ کے خیرخواہوں میں سے ہوں۔''

اسی طرح کے ایک اور خیرخواہ کا ذکر قرآن نے یوں کیا ہے:

﴿وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ﴾

(۳۶/یس:۲۰)

''اور ایک آدمی شہر کے آخری حصے سے بھاگتا ہوا آیا اور کہنے لگا: میری قوم! ان رسولوں کی پیروی کرو۔''

جب ملائکہ سے اللہ تعالیٰ نے تخلیق آدم علیہ السلام کا تذکرہ کیا تو محض بشر کہہ کر کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا﴾ (۱۵/الحجر:۲۸)

''اور جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا: مَیں ایک بشر (انسان) کو پیدا کرنے والا ہوں۔''

انسانوں کے اچھے برے انجام کی خبر دینے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انسان کو محض انسان کہہ کر مخاطب کیا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ﴾ (۸۴/الانشقاق:۶)

''انسان! تو اپنے رب سے ملاقات تک کوشش، تمام کام اور محنت کر کے اس سے ملاقات کرنے والا ہے۔''

﴿فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْۤ اَكْرَمَنِ ؕ وَاَمَّاۤ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْۤ اَهَانَنِ﴾

(۸۹/الفجر: ۱۵۔۱۶)

''انسان (کا یہ حال ہے کہ) جب اسے اس کا رب آزماتا ہے اور عزت و نعمت دیتا ہے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنایا۔ اور جب وہ اسے آزماتا ہے، اس کی روزی تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے میری اہانت کی (مجھے ذلیل کیا۔)''

لفظ الانسان کے سیاق کو جب تک ملاحظہ نہ کیا جائے تب تک اس کے صاحبِ صفات و کمالات یا بالعکس کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

② کیا قرآن نے انبیاء کرام کو بشر کہنے والوں کو کافر کہا ہے؟

قرآن مجید میں کوئی بھی صریح دلیل نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو جن لوگوں نے بشر کہا وہ بشر کہنے کی وجہ سے کافر ہوئے تھے۔ بلکہ وہ کافر اس بنیاد پر ٹھہرے تھے کہ وہ بشر کو رسول نہیں مانتے تھے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۡ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۡ فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ ﴾

(۶۴/التغابن: ۵۔۶)

''کیا تمہارے پاس اس سے پہلے کے کافروں کی خبر نہیں پہنچی؟ جنہوں نے اپنے اعمال کا وبال چکھ لیا اور جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔ یہ اس لیے کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل لے کر آئے تو انہوں نے کہہ دیا کہ کیا بشر ہماری راہنمائی کریں گے؟ لہٰذا اُنہوں نے انکار کر دیا اور منہ پھیر لیا اور اللہ نے بھی بے نیازی کی، اور اللہ تو ہے ہی بہت بے نیاز سب خوبیوں والا۔''

﴿ اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ﴾ پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بشر کو ہادی ماننے کے لیے تیار نہیں تھے جیسا کہ اَبَشَرٌ میں ھمزہ استفہامِ انکاری سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ اسی وجہ سے کافر ہوئے تھے نیز انہوں نے اعراض کیا تھا۔ ہر زمانے میں جن لوگوں نے پیغمبروں کو تسلیم نہیں کیا

اس کا سبب یہ تھا کہ وہ کہتے کہ بشر رسول نہیں ہونا چاہیے:

﴿ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝ ﴾ (۱۷/بنی اسراءیل:۹۴۔۹۵)

''لوگوں کے پاس ہدایت پہنچ چکنے کے بعد ایمان سے روکنے والی صرف یہی چیز رہی کہ انہوں نے کہا: کیا اللہ نے ایک بشر کو ہی رسول بنا کر بھیجا؟ آپ کہہ دیجیے کہ اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے اور رہتے بستے ہوتے تو ہم بھی ان کے پاس کسی آسمانی فرشتے ہی کو رسول بنا کر بھیجتے۔''

حقیقت یہی ہے کہ بشر ہی بشر کی راہنمائی کے لیے مقام نبوت و رسالت پر سرفراز ہوئے ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ ﴾ (۳/آل عمران:۷۹)

''کسی بشر کو، جسے اللہ کتاب وحکمت اور نبوت دے، یہ لائق نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ، بلکہ وہ تو کہے گا کہ تم اپنے کتاب سکھانے اور پڑھنے کے سبب رب کے ہو جاؤ۔''

اگر صرف بشر کہنے کی وجہ سے قرآن نے لوگوں کو کافر کہا تھا تو پھر انبیاء علیہم السلام نے ان کی اس بات کی تغلیط کر کے یہ کیوں نہیں کہا کہ ہم بشر نہیں ہیں بلکہ الٹا وہ کفار کی اس بات کو تاکیداً تسلیم کرتے رہے۔ کفار نے رسولوں سے کہا:

﴿ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۭ ﴾ (۱۴/ابراہیم:۱۰)

''تم تو ہمارے جیسے ہی بشر ہو۔''

اس کے جواب میں پیغمبروں نے یہ نہیں کہا کہ تم غلط کہتے ہو بلکہ:

﴿ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾ (ایضاً:۱۱)

"ان سے ان کے رسولوں نے کہا: بلاشبہ ہم تمہارے جیسے ہی بشر ہیں۔"

جہاں تک صفات وکمالات کی بات ہے تو کوئی دو انسان بھی اس اعتبار سے برابر نہیں ہوتے چہ جائیکہ نبی اور غیر نبی برابر ہو۔

نبی اکرم ﷺ نے بھی اپنے بشر ہونے کا ہی جا بجا اعلان کیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ إِنَّمَآ أَنَا۠ بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾ (١٨/الکھف: ١١٠؛ ٤١/فصلت: ٦)

"کہیے کہ میں تو تمہارے جیسا ہی بشر ہوں۔"

﴿ هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا ۝ ﴾ (١٧/بنی اسراءیل: ٩٣)

"میں تو بشر رسول ہی ہوں۔"

بشر پر وحی کے نزول کو تسلیم نہ کرنا، جیسا کہ کفار کا شیوہ تھا، اللہ تعالیٰ کی بھی ناقدری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا قَدَرُوا۟ ٱللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِۦٓ إِذْ قَالُوا۟ مَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ عَلَىٰ بَشَرٍ مِّن شَىْءٍ ۗ قُلْ مَنْ أَنزَلَ ٱلْكِتَـٰبَ ٱلَّذِى جَآءَ بِهِۦ مُوسَىٰ ﴾ (٦/الانعام: ٩١)

"اور ان لوگوں نے اللہ کی جیسی قدر کرنا واجب تھی ویسی قدر نہ کی جب کہ یوں کہہ دیا کہ اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نازل نہیں کی۔ آپ یہ کہیے کہ وہ کتاب کس نے نازل کی ہے جسے موسیٰ لائے تھے۔"

اس آیت سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ وحی بشر پر ہی نازل ہوتی رہی ہے وہاں پر یہ بھی معلوم ہوا کہ جلیل القدر پیغمبر موسیٰ علیہ السلام بھی بشر ہی تھے۔

③ کیا انبیاء علیہم السلام کو بشر کہنا بے ادبی ہے؟

انبیاء کرام کو بشر کہنا ہرگز بے ادبی نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو بشر نہ کہتے اور نہ پیغمبر ہی اپنے آپ کو بشر تسلیم کرتے (جیسا کہ مذکورہ بالا آیات سے ظاہر ہوتا ہے۔)

④ کیا انبیاء کرام کو بشر کہنا کفار کا دستور ہے؟

کفار انبیاء ورسل علیہم السلام کو یقیناً بشر کہتے تھے مگر انہیں ایسا کہنے میں غلط نہیں کہا گیا۔ ان کا پیغمبروں کو بشر کہنا اس لیے تھا کہ وہ بشریت کے لیے نبوت کو محال سمجھتے تھے (جیسا کہ پیچھے مدلل

ثابت کیا جا چکا ہے۔) اس سلسلے کی دیگر آیات سے، جن میں کفار نے انبیاء کو بشر کہا، بھی ثابت ہوتا ہے کہ کفار اس بات کو محال سمجھتے تھے کہ کوئی ان جیسا بشر رسول ہو کر ان پر فوقیت حاصل کر سکتا ہے۔ اگر ان آیات کے سیاق و سباق پر غور کیا جائے تو حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ چند آیات درج ذیل ہیں:

نوح علیہ السلام کو لوگوں نے ان کے بشر ہونے کی وجہ سے نبی تسلیم نہیں کیا تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ وَمَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا مِن فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ ﴾ (۱۱/ھود:۲۷)

''اس کی قوم کے کافر سرداروں نے جواب دیا کہ ہم تو تجھے اپنے جیسا بشر ہی دیکھتے ہیں اور تیرے تابعداروں کو بھی ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ واضح طور پر سوائے نیچ لوگوں کے اور کوئی نہیں، جو سطحی سوچ والے ہیں (جو تمہاری پیروی کر رہے ہیں) ہم تو تمہاری کسی قسم کی برتری اپنے اوپر نہیں دیکھ رہے، بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھ رہے ہیں۔''

﴿ فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيدُ أَن يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً مَّا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ ﴾ (۲۳/المؤمنون:۲۴۔۲۵)

''اس کی قوم کے کافر سرداروں نے صاف کہہ دیا کہ یہ تو تم جیسا ہی بشر ہے، یہ تم پر فضیلت اور بڑائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اگر اللہ کو منظور ہوتا تو کسی فرشتے کو اتارتا، ہم نے تو اسے اپنے اگلے باپ دادوں کے زمانے میں سنا ہی نہیں۔''

ثمود نے صالح علیہ السلام سے کیا کہا تھا، ملاحظہ کریں:

﴿ فَقَالُوا أَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهُ إِنَّا إِذًا لَّفِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ ﴾

(۵۴/القمر:۲۴)

"تو وہ کہنے لگے: کیا ہم اپنے میں سے ایک بشر کی پیروی کرنے لگ جائیں تب تو ہم گمراہی اور دیوانگی میں ہوں گے۔"

نیز دیکھیے ان کا ﴿ مَآ أَنتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ﴾ کہنا۔ (۲۶/الشعراء:۱۵۴)

شعیب علیہ السلام کو بھی انہوں نے پیغمبر کی بجائے جادوگر کہہ کر اپنے جیسا قرار دیا:

﴿ وَمَآ أَنتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَإِن نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ ﴾ (ایضا:۱۸۶)

اصحاب القریہ کی طرف کئی رسول بھیجنے کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلًا أَصْحَابَ الْقَرْيَةِ إِذْ جَاءَهَا الْمُرْسَلُونَ ۝ إِذْ أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوا إِنَّا إِلَيْكُم مُّرْسَلُونَ ۝ قَالُوا مَا أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَمَا أَنزَلَ الرَّحْمَٰنُ مِن شَيْءٍ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا تَكْذِبُونَ ۝ قَالُوا رَبُّنَا يَعْلَمُ إِنَّا إِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُونَ ﴾ (۳۶/یس:۱۳-۱۶)

"اور آپ ان کے سامنے ایک مثال بستی والوں کی مثال بیان کیجیے جبکہ اس بستی میں (کئی) رسول آئے۔ جب ہم نے ان کے پاس دو کو بھیجا، تو اُن لوگوں نے دونوں کو جھٹلایا، تو ہم نے تیسرے سے تائید کی تو ان تینوں نے کہا کہ ہم تمہارے پاس بھیجے گئے ہیں۔ ان لوگوں نے کہا کہ تم تو ہماری طرح معمولی آدمی ہو اور رحمٰن نے کوئی چیز نازل نہیں کی۔ تم نرا جھوٹ بولتے ہو۔ انہوں نے کہا: ہمارا پروردگار جانتا ہے کہ بے شک ہم تمہارے پاس بھیجے گئے ہیں۔"

فرعونیوں نے موسیٰ اور ھارون علیہما السلام کے بارے میں کیا کہا تھا، ملاحظہ کیجیے:

﴿ فَقَالُوا أَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُونَ ﴾ (۲۳/المومنون:۴۷)

"وہ کہنے لگے: کیا ہم اپنے جیسے دو آدمیوں پر ایمان لائیں؟ حالانکہ خود ان کی قوم ہمارے ماتحت ہے۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی بجائے کفار آپ کی تعلیم کو جادو کہتے:

﴿ هَلْ هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۖ أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ ﴾

(۲۱/الانبیاء:۳)

''یہ تم ہی جیسا بشر ہے پھر کیا وجہ ہے جو تم آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی جادو میں آ جاتے ہو۔''

کفار صرف پیغمبروں کو بشر ہی نہیں کہتے تھے بلکہ انہیں اور بھی کئی صفات سے متصف قرار دیتے تھے اور ان کی وجہ سے نبوت و رسالت کے منکر ہوتے تھے۔ جیسا کہ ایک پیغمبر کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَالَ الْمَلَأُ مِن قَوْمِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِلِقَاءِ الْآخِرَةِ وَأَتْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ ۝ وَلَئِنْ أَطَعْتُم بَشَرًا مِّثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذًا لَّخَاسِرُونَ ۝﴾

(۲۳/المؤمنون:۳۳۔۳۴)

''اور قوم کے سرداروں نے جواب دیا، جو کفر کرتے تھے اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلاتے تھے اور ہم نے انہیں دنیوی زندگی میں خوشحال کر رکھا تھا، کہ یہ تو تم جیسا ہی بشر ہے، تمہاری خوراک جیسی ہی خوراک کھاتا ہے اور تمہارے پینے کا پانی ہی یہ پیتا ہے، اگر تم نے اپنے جیسے ہی انسان کی تابعداری کی تو بے شک تم سخت خسارے والے ہو گے۔''

کفار نے پیغمبر کے لیے يَأْكُلُ (وہ کھاتا ہے) اور وَيَشْرَبُ (وہ پیتا ہے) کے الفاظ استعمال کیے تو کیا ہم اسے کفار کا دستور کہہ کر مسترد کر دیں گے۔

اسی طرح لوگوں نے نبی اکرم ﷺ کے بارے میں یہ کہا:

﴿مَالِ هَٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ﴾ (۲۵/ الفرقان:۷)

''یہ کیسا رسول ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔''

ان کا خیال تھا کہ رسول کو نہ تو کھانا کھانے کی حاجت ہونی چاہیے اور نہ کاروبار زندگی کی۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم اسے کفار کا دستور قرار دے کر یہ کہیں گے کہ نبی اکرم ﷺ کھانا نہیں کھاتے تھے اور نہ کوئی کاروبار کرتے تھے؟ فافہم و تدبر

بلکہ اس چیز کو بشریت کی طرح تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کے لیے ثابت کیا گیا۔ ارشاد

باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَآ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ إِلَّآ إِنَّهُمْ لَيَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَيَمْشُونَ فِى الْأَسْوَاقِ ﴾ (ایضاً:۲۰)

''ہم نے آپ سے پہلے جتنے رسول بھیجے سب کے سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے تھے۔''

یعنی باقی انسانوں کی طرح ضروریاتِ زندگی کے محتاج تھے۔

ایک اور مقام پر انبیاء و رسل علیہم السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَا جَعَلْنَٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوا۟ خَٰلِدِينَ ﴾

(۲۱/الانبیاء:۸)

''ہم نے ان کے ایسے جسم نہیں بنائے تھے کہ وہ کھانا نہ کھائیں اور نہ وہ ہمیشہ رہنے والے ہی تھے۔''

عیسیٰ علیہ السلام کی بشریت سے چونکہ نصاریٰ منکر تھے، اس لیے صراحت سے ان کے کھانا کھانے کا تذکرہ کیا گیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَّا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ انظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَٰتِ ثُمَّ انظُرْ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴾ (۵/المائدۃ:۷۵)

''مسیح ابن مریم سوا پیغمبر ہونے کے اور کچھ بھی نہیں، ان سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر ہو چکے ہیں۔ ان کی والدہ ایک راست باز عورت تھیں، دونوں (ماں بیٹا) کھانا کھایا کرتے تھے، آپ دیکھیے کہ کس طرح ہم ان کے سامنے دلیلیں رکھتے ہیں، پھر غور کیجیے کہ کس طرح وہ پھرے جاتے ہیں۔''

⑤ کیا من الناس میں تعجب کا پہلو موجود ہے؟

من الناس میں تعجب کا دُور دُور تک کوئی اشارہ تک موجود نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ جس کا اشارہ تک نہیں اسے یہاں سے برآمد کیا جا رہا ہے!

۳۳۳۳ ہاتھ لمبا انسان؟؟

سوال ایک عالم دین قرآن کی تفسیر کے حوالے سے بتا رہے تھے کہ موسی علیہ السلام کے زمانے میں ایک شخص کا قد اتنا لمبا تھا کہ اس کا ہاتھ سورج تک پہنچ جاتا تھا نیز وہ سمندر کے پیندے سے مچھلیاں پکڑ لیا کرتا تھا۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب بعض مفسرین نے اپنی تفاسیر میں عوج الاعنق کا نام ذکر کیا ہے۔ اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ان جبارین سے تھا جن کے خلاف موسی علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو جنگ کرنے کا حکم دیا تھا، ارشاد باری تعالی ہے:

﴿يَٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ فَتَنقَلِبُوا خَاسِرِينَ ۝ قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ وَإِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا حَتَّىٰ يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِن يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دَاخِلُونَ ۝﴾

(۵/المائدۃ:۲۱۔۲۲)

”میری قوم والو! اس مقدس زمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے نام لکھ دی ہے اور اپنی پشت کے بل روگردانی نہ کرو کہ پھر نقصان میں جا پڑو، انہوں نے جواب دیا: موسیٰ! وہاں تو زورآور سرکش لوگ ہیں اور جب تک وہ وہاں سے نہ نکل جائیں ہم تو ہرگز وہاں نہ جائیں گے، ہاں اگر وہ وہاں سے نکل جائیں پھر تو ہم (بخوشی) چلے جائیں گے۔“

بعض اسرائیلی روایات میں جبارین کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں، علامہ قرطبی مذکورہ بالا آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”ان سب لوگوں کے قد (اوسطاً) ساڑھے چھ ہاتھ تھے جیسے کہ مقاتل نے کہا ہے۔

کلبی کہتے ہیں:

ہر آدمی اسی ہاتھ لمبا تھا۔ یہ لوگ کون تھے؟ ان کے بارے میں آگے چل کر علامہ قرطبی لکھتے ہیں کہ یہ قوم عاد کے باقی ماندہ لوگ تھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ عیصو بن اسحاق کی قوم سے تھے اور وہ روم سے تھے اور ان میں عوج الاعنق بھی تھا جو کہ ۳۳۳۳ ہاتھ لمبا تھا۔ یہ ابن عمر

نے کہا ہے، وہ بادلوں کو اپنی لاٹھی سے ہانکتا اور بادلوں سے ہی پانی پیتا تھا۔ وہ سمندر کے پیندے سے مچھلی پکڑتا اور اسے سورج کے قریب کر کے بھون کر کھا لیتا۔ جب طوفانِ نوح آیا وہ اس کے گھٹنوں سے اوپر نہ گیا تھا اور اس کی عمر ۳۶۰۰ سال تھی۔ اس نے موسیٰ علیہ السلام کے لشکر کو کچلنے کے لیے ایک بڑا پتھر اٹھا رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک پرندہ بھیجا جس نے پتھر کو چونچ ماری تو پتھر اس کی گردن پر آ گرا لہٰذا وہ (عوج) گر پڑا۔ موسیٰ علیہ السلام اس پر حملہ آور ہوئے۔ آپ کا قد دس ہاتھ تھا۔ آپ کی لاٹھی بھی دس ہاتھ تھی اور آپ دس ہاتھ اوپر چڑھے مگر اس کے ٹخنے تک ہی پہنچ سکے تھے، وہ گرا ہوا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اسے قتل کر دیا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس کے ٹخنے کے نیچے والی رگ پر مار کر گرا دیا اور وہ مر گیا اور دریائے نیل پر گر پڑا تو لوگ اسے ایک سال تک پل کے طور پر استعمال کرتے رہے..... کلبی کہتے ہیں:

عوج ہاروت و ماروت کی اولاد میں سے ہے کہ ان دونوں کے ایک عورت سے ملاپ کے نتیجے میں پیدا ہوا۔"

ان روایات میں بہت سے تضادات پائے جاتے ہیں۔ نیز بعض باتیں کتاب وسنت کی تعلیمات کے صریحاً منافی ہیں۔ چند ایک کی نشاندہی ذیل میں کی جاتی ہے:

① پہلے یہ کہا گیا کہ یہ لوگ قوم عاد کے بچے ہوئے لوگ تھے۔ جب کہ آگے چل کر کہا گیا کہ عوج بن اعنق نوح علیہ السلام کی قوم پر طوفان کے وقت بھی موجود تھا۔

② ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عوج سرکش اور نافرمان شخص تھا جب کہ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم میں سے صرف ایمان والے ہی محفوظ رہے تھے اور انہی کے بچانے کا اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا۔ یہ بات قرآن سے معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَكَذَّبُوهُ فَأَنجَيْنَاهُ وَالَّذِينَ مَعَهُ فِي الْفُلْكِ وَأَغْرَقْنَا الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا عَمِينَ﴾ (۷/الاعراف:۶۴)

"وہ لوگ ان کی تکذیب ہی کرتے رہے تو ہم نے ان (نوح علیہ السلام) کو اور انہیں جو ان کے ساتھ کشتی میں تھے، بچا لیا اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا انہیں ہم نے غرق کر دیا۔ بے شک وہ لوگ اندھے ہو رہے تھے۔"

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ۝﴾ (۱۱/ھود:۴۰)

''یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ پہنچا اور تنورا بلنے لگا، ہم نے کہا کہ اس کشتی میں ہر قسم کے (جانداروں میں سے) جوڑے (یعنی) دو (جانور، ایک نر اور ایک مادہ) سوار کرا لے اور اپنے گھر کے لوگوں کو بھی، سوائے ان کے جن پر پہلے سے بات پڑ چکی ہے اور سب ایمان والوں کو بھی، اس کے ساتھ ایمان لانے والے بہت ہی کم تھے۔''

اسی طرح فرمایا:

﴿وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ۝﴾ (ایضاً:۴۴)

''اور فرما دیا گیا کہ اے زمین! اپنے پانی کو نگل جا اور اے آسمان بس کر تھم جا۔ اسی وقت پانی خشک کر دیا گیا اور کام پورا کر دیا گیا اور کشتی ''جودی'' پہاڑ پر جا لگی اور فرما دیا گیا کہ ظالم لوگوں پر لعنت نازل ہو۔''

لہٰذا معلوم ہوا کہ کشتی میں سوار ہونے والے ہی محفوظ رہے تھے۔ ﴿واغرقنا بعد الباقین﴾

③ ۳۳۳۳ ہاتھ لمبائی کسی بھی صورت میں سورج تک نہیں پہنچتی۔

④ پہلے کہا کہ وہ گردن پر پتھر لگنے سے گرا اور بعد میں کہا کہ اسے موسیٰ علیہ السلام نے مار کر گرایا تھا۔

⑤ انسانی جسم پل کے طور پر استعمال ہی نہیں ہو سکتا اور وہ بھی ایک سال تک کہ اس کے جسم میں کوئی تغیر نہ آیا۔

⑥ عوج کو انسانوں کی اولاد سے بتایا گیا اور بعد ازاں کہا کہ وہ ہاروت و ماروت کی اولاد

میں سے تھا، حالانکہ قرآن کے بیان کے مطابق ہاروت اور ماروت فرشتے تھے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ ﴾ (۲/البقرۃ:۱۰۲)

''اور وہ اس چیز کے پیچھے لگ گئے جسے شیاطین سلیمان کی حکومت میں پڑھتے تھے۔ سلیمان نے تو کفر نہ کیا تھا، بلکہ یہ کفر شیطانوں کا تھا، وہ لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے، اور وہ جو بابل میں ہاروت ماروت دو فرشتوں پر اُتارا گیا تھا۔''

اور فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کر ہی نہیں سکتے، وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی پابندی کرتے ہیں، کیونکہ ان کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾ (۲۱/الانبیاء:۲۷)

''کسی بات میں اللہ پر پیش دستی نہیں کرتے بلکہ اس کے فرمان پر کاربند رہتے ہیں۔''

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ ﴾

(۶۶/التحریم:۶ نیز دیکھیے ۱۶/النحل:۵۰)

''جنہیں جو حکم اللہ دیتا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے بلکہ جو حکم دیا جائے بجا لاتے ہیں۔''

نیز اللہ نے فرشتوں میں جنسی خواہش رکھی ہی نہیں۔ اسی لیے جب جبریل علیہ السلام مریم کے پاس آئے تو وہ ڈر گئیں تو جبریل نے فرمایا:

﴿ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ ﴾ (۱۹/مریم:۱۹)

''میں تو آپ کے رب کا بھیجا ہوا ہوں۔''

⑦ کسی انسان کی ایک ہزار سال سے زیادہ عمر ثابت نہیں۔ نوح علیہ السلام کی عمر بھی ہزار سال

کے لگ بھگ تھی، ساڑھے نو سو سال تو انہوں نے تبلیغ اور دعوت دین دی تھی۔ ۶۰۰-۳ سال عمر کو باقی تمام انسانوں کی عمروں سے کوئی نسبت تک نہیں۔

شب برات کی شرعی حیثیت

سوال: شعبان کی پندرھویں شب کے نوافل کے عنوان سے درج ذیل تحریر کسی بھائی نے بھیجی ہے اور کہا ہے کہ اس کے متعلق وضاحت کریں:

① شعبان کی پندرھویں شب کو غسل کریں اگر غسل والے پانی میں ۷ عدد بیری کے پتے ڈال کر گرم کر لیں پھر غسل کریں تو پورا سال بیماریوں سے ان شاء اللہ بچے رہیں گے، اگر کسی وجہ سے غسل نہ کر سکیں تو صرف وضو کر کے دو رکعت تحیۃ الوضو پڑھیں، ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد آیۃ الکرسی ایک دفعہ اور سورۃ اخلاص ۳،۳ مرتبہ پڑھنی ہے، یہ نماز بہت فضیلت رکھتی ہے۔

② شعبان کی پندرھویں شب جو کوئی ۶ رکعات نماز ۲،۲ رکعت کر کے بعد نماز مغرب پڑھے کہ ہر ۲ رکعت کے بعد سورۃ یٰسٓ ایک مرتبہ یا سورۃ اخلاص ۲۱،۲۱ مرتبہ پڑھے اس کے بعد دعا نصف شعبان المعظم پڑھے۔

③ شعبان کی پندرھویں شب جو کوئی ۲ رکعت نماز اس طرح پڑھے کہ ہر رکعت میں ایک مرتبہ آیۃ الکرسی اور ۱۵،۱۵ مرتبہ سورۃ اخلاص بعد سورۃ فاتحہ پڑھے اور سلام کے بعد ایک ۱۰۰ مرتبہ درود پڑھ کر ترقی رزق کی دعا کرے، ان شاء اللہ تعالیٰ اس نماز کی برکت سے رزق میں ترقی ہو گی۔

④ شعبان کی پندرھویں شب جو کوئی ۸ رکعات نماز ۲،۲ کر کے پڑھے ہر رکعت میں سورۃ قدر ایک مرتبہ اور سورۃ اخلاص ۲۵ مرتبہ پڑھے، واسطے بخشش گناہ یہ نماز بہت افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ پڑھنے والے کی بخشش فرمائے گا۔

⑤ شعبان کی پندرھویں شب جو کوئی ۸ رکعات نماز ۴،۴ کر کے پڑھے اس طرح کہ ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد ۱۰،۱۰ مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھے۔ اللہ تعالیٰ اس نماز کے پڑھنے والے کے لیے بے شمار فرشتے مقرر کرے گا جو اُسے عذاب قبر سے نجات اور

جنت میں داخل ہونے کی خوش خبری سنائیں گے۔

⑥ شعبان کی چودہ تاریخ کو بعد نماز عصر آفتاب غروب ہونے کے وقت باوضو چالیس مرتبہ درج ذیل کلمات پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس دعا کے پڑھنے والے کے چالیس سال کے گناہ معاف فرمائے گا۔ کلمات یہ ہیں: لا حول و لا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

مدنی التجا: اپنی تمام دعاؤں میں سرکار ﷺ کی پوری امت کو شامل رکھیں۔

جواب تحریر میں دیے جانے والے فضائل اور اعمال خود ساختہ ہیں اور شریعت سازی کے مترادف ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فضائل اعمال ضعیف احادیث سے بھی ثابت ہوں تو ان پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں حالانکہ یہ بات درست نہیں کیونکہ اعمال کی فضیلت صرف اور صرف وحی الٰہی سے معلوم ہوسکتی ہے اس میں اجتہاد کو بھی کوئی دخل نہیں۔ یہ توقیفی معاملہ ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے ہماری کتاب شوقِ عمل۔)

تحریر میں دیے گئے طریقے اور فضائل تو ضعیف احادیث سے بھی ثابت نہیں ہیں تحریر کے مندرجات پر سرسری نظر ڈال کر بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے مندرجات درست نہیں ہیں:

① یہ جولکھا ہے کہ شعبان کی پندرھویں شب کو غسل کریں یہ کس نے حکم دیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے یا اللہ کے رسول ﷺ نے؟ پھر بیری کے پتے پانی میں ڈال کر غسل کرنے سے سارا سال بیماریوں سے محفوظ رہنے کی بات بھی غلط ہے، تحیۃ الوضوء کی فضیلت تو مسلّم ہے مگر اس میں سورتوں اور ان کی تعداد متعین کرنا درست نہیں۔

② ہر دو رکعت کے بعد سورۃ یٰسٓ اور ۲۱،۲۱ مرتبہ سورۃ اخلاص کی تحریر بھی درست نہیں۔ اور لکھا ہے کہ اس کے بعد دعائے نصف شعبان المعظم پڑھی جائے جو کہ تحریر کی پشت پر دی گئی ہے۔ یہ دعا دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود ساختہ ہے، اس دعا کی عربی بھی غیر معیاری ہے۔ مثلاً الٰھی بالتجلی الاعظم فی لیلۃ النصف من شھر شعبان المکرم۔

مزید برآں وہ آیات جو لیلۃ القدر کے بارے میں ہیں انہیں شعبان کی پندرھویں

رات پر چسپاں کیا گیا ہے، جیسے دعائے نصف شعبان کے الفاظ التی یفرق فیھا کل امر حکیم سے ظاہر ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ بات اس رات کے بارے میں ہے جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔ اور وہ رمضان المبارک میں ہے نہ کہ شعبان میں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ (۲/البقرۃ:۱۸۵)

رمضان المبارک کی وہ رات جس میں قرآن نازل ہوا ہے اسے سورۃ القدر میں لیلۃ القدر اور سورۃ الدخان میں "لیلۃ مبارکۃ" کہا گیا ہے۔ اور اس سورت یعنی سورۃ الدخان کی ابتدائی آیات میں ﴿فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ﴾ والی فضیلت شعبان کی پندرھویں رات پر چسپاں کی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿حٰمٓ ۚ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۙ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۙ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ۭ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۝﴾

(۴۴/الدخان:۱۔۵)

"حم۔ قسم ہے اس وضاحت کرنے والی کتاب کی۔ یقیناً ہم نے اسے بابرکت رات میں اتارا ہے، بے شک ہم ڈرانے والے ہیں۔ اسی رات میں ہر ایک مضبوط کام کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ ہمارے پاس سے حکم ہو کر، ہم ہی ہیں رسول بنا کر بھیجنے والے۔"

③ اس نماز کا طریقہ اور فضیلت بھی کتاب وسنت سے ثابت نہیں۔

④ شعبان کی پندرھویں شب کی نماز کی یہ فضیلت اور طریقہ بھی خود ساختہ ہے، یہ جو کہا گیا ہے کہ واسطے بخشش گناہ یہ نماز بہت افضل ہے۔ قطعاً ثابت نہیں۔ نیز ہر رکعت میں سورۃ "القدر" کی تلاوت سے یہ تاثر ملتا ہے کہ لیلۃ القدر جو رمضان المبارک میں ہے وہ پندرھویں شعبان ہے۔

⑤ یہ خاص طریقے کی نماز پڑھنے والے کے لیے بے شمار فرشتے مقرر کرنے کی بات کہ وہ اسے عذاب قبر سے نجات اور جنت میں داخلے کی خوش خبری سنائیں گے، ثابت نہیں ہے۔

⑥ شعبان کی چودہ تاریخ کو بعد نماز عصر غروب آفتاب کے وقت چالیس مرتبہ لاحول

ولا قوة الا بالله العلی العظیم کی یہ فضیلت کہ اس سے چالیس سال کے گناہ معاف ہوں گے غلو فی الدین کے مترادف ہے۔نیز شعبان کی چودہ تاریخ کا شعبان کی پندرھویں رات سے کوئی تعلق نہیں جس کی فضیلت ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کیونکہ رات کا آغاز غروبِ آفتاب سے پہلے نہیں ہوتا۔

آیت قرآنی میں تحریف

سوال پنجاب یونیورسٹی کی جامع مسجد کے نزدیک ایک سائن بورڈ پر اِعْمَلُوْا شُکْرًا لکھا ہوا ہے اور ان الفاظ کے مطابق ان کا ترجمہ ''تم سب شکریہ میں نیک کام کرو۔'' لکھا ہوا ہے، حوالے میں صرف ''القرآن'' لکھا ہوا ہے۔میں نے اس کے بارے میں کچھ لوگوں سے پوچھا ہے کہ کیا یہ واقعی قرآن کی آیت ہے تو انہوں نے اس کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔بعض نے کہا قرآن کی آیت ہے مگر غلط لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔آپ اس کے بارے میں میری راہنمائی کریں۔

جواب اِعْمَلُوْا شُکْرًا قرآن کی کوئی آیت نہیں اور نہ کسی آیت کا حصہ ہے، البتہ قرآن کی ایک آیت کے آخری الفاظ یوں ہیں:

﴿ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۭ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ۝ ﴾ (۳۴/سبا:۱۳)

پوری آیت یوں ہے:

﴿ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَاۗءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ۭ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۭ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ۝ ﴾

''جو کچھ وہ (سلیمان) چاہتے وہ جنات تیار کر دیتے مثلاً قلعے اور مجسمے اور حوضوں کے برابر لگن اور چولہوں پر جمی ہوئی مضبوط دیگیں، اے آل داؤد! اس کے شکر میں نیک عمل کرو، میرے بندوں میں سے شکر گزار بندے کم ہی ہوتے ہیں۔''

لہٰذا قرآنی آیت ﴿ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ﴾ کو اِعْمَلُوْا شُکْرًا لکھنا قرآن مجید میں تحریف کے مترادف ہے، خصوصاً جب محذوف الفاظ کی کسی نشان سے نشاندہی بھی نہ کی گئی ہو۔ترجمہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابت کی غلطی نہیں ہے۔بلکہ ایسا عمداً کیا گیا

ہے۔البتہ یہ بات درست ہے کہ شکر کا یہ حکم صرف آل داؤد کے لیے ہی نہیں بلکہ اس حکم کے عموم میں سب لوگ شامل ہیں۔مگر کسی آیت کے حکم کے عموم کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ اس آیت کے الفاظ و ترجمہ میں تبدیلی پیدا کر دی جائے ،لہٰذا مذکورہ سائن بورڈ پر مکتوب آیت میں جو تحریف کی گئی ہے اس کی فوری طور پر تصحیح ہونی چاہیے اور تحریف کرنے والوں کو رب تعالیٰ سے اپنی غلطی کی معافی بھی مانگنی چاہیے۔

نوٹ: ماہنامہ دعوۃ التوحید میں جب یہ جواب شائع ہوا تو پنجاب یونیورسٹی نے مذکورہ بالا غلطی کی اصلاح کر لی۔و للہ الحمد

نائن الیون کے واقعہ کی پیش گوئی قرآن میں

سوال میں نے ایک عالم سے سنا جو کہہ رہے تھے کہ نائن الیون کے واقعہ کا ذکر قرآن مجید میں ہے، انہوں نے دلیل یہ پیش کی کہ سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۱۰ میں اس کی پیش گوئی کی گئی ہے۔اس سورت کا نمبر ۹ ہے اور پارہ ۱۱ میں ہے چونکہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی ۱۱۰ منزلیں ہیں، لہٰذا آیت، سورت اور پارہ کی اس واقعہ سے مناسبت پائی جاتی ہے۔کیا یہ تفسیر درست ہے؟

جواب یہ تفسیر درست نہیں کیونکہ جس آیت سے دلیل پیش کی گئی ہے وہ آیت اُس مسجد کے بارے میں ہے جو منافقین نے بنائی تھی جو کہ مسجد ضرار کے نام سے مشہور ہے۔ ٹریڈ سنٹر اور مسجد میں کوئی مناسبت نہیں۔اس سلسلے کی تمام آیات دیکھنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مذکورہ بالا تفسیر غلط ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ۝ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ۭ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَي التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۭ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ۝ اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰي تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰي شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۝ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ

بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ إِلَّا أَن تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾

(۹/التوبۃ:۱۰۷۔۱۱۰)

''اور بعض ایسے ہیں جنھوں نے ان اغراض کے لیے مسجد بنائی ہے کہ ضرر پہنچائیں اور کفر کی باتیں کریں اور ایمانداروں میں تفریق ڈالیں اور اس شخص کے قیام کا سامان کریں جو اس سے پہلے ہی سے اللہ اور رسول کا مخالف ہے، اور وہ قسمیں کھا جائیں گے کہ بجز بھلائی کے ہماری کچھ اور نیت نہیں، اور اللہ گواہ ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں، آپ اس میں کبھی کھڑے نہ ہوں، البتہ جس مسجد کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں، اس میں ایسے آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں، اور اللہ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے، پھر آیا ایسا شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ سے ڈرنے پر اور اللہ کی خوشنودی پر رکھی ہو، یا وہ شخص، کہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد کسی گھاٹی کے کنارے پر، جو کہ گرنے ہی کو ہو، رکھی ہو، پھر وہ اسے لے کر آتشِ دوزخ میں گر پڑے، اور اللہ ایسے ظالموں کو سمجھ ہی نہیں دیتا۔ ان کی یہ عمارت، جو انہوں نے بنائی ہے، ہمیشہ ان کے دلوں میں شک کی بنیاد پر (کانٹا بن کر) کھٹکتی رہے گی، ہاں مگر ان کے دل ہی اگر پاش پاش ہو جائیں تو خیر، اور اللہ بڑا علم والا اور بڑی حکمت والا ہے۔''

یہ بھی واضح رہے کہ شریعت اسلامی میں بیان ہونے والی پیش گوئیاں اور دیگر احکام قمری سال کی بنیاد پر ہیں نہ کہ شمسی سال کی بنیاد پر۔

یہ بھی معلوم رہنا چاہیے کہ پاروں کی تقسیم اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی طرف سے نہیں۔ سہولت کے لیے ایسا کیا گیا ہے۔ لہٰذا ان کی بنیاد پر تفسیری نکات بیان کرنا غلط ہوگا۔

اگر اس طرح قرآن کی تفسیر کی جائے تو اکثر اوقات ایسی تفسیر قرآن و حدیث اور حقائق کے صریحاً منافی ہوتی ہے۔ مثلاً اگر ایک شخص مذکورہ اندازِ تفسیر کے مطابق آیت: ﴿إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا ......﴾ کی تفسیر یوں بیان کرے کہ آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے درمیان

تین صدیوں کا فاصلہ ہے، ہر صدی میں تین تین نسلیں پیدا ہوئیں۔ اور ہر نسل میں سے ۳۳،۳۳ خاندان بنے کیونکہ یہ آیت پارہ ۳ سورۃ آل عمران میں ہے اور سورت کا نمبر ۳ ہے جبکہ آیت کا نمبر ۳۳ ہے۔ تو یہ تفسیر خلافِ حقیقت ہوگی۔ تفسیر کرنے کا یہ انداز قطعی طور پر غلط ہے۔

کیا سورۃ فاتحہ قرآن مجید میں شامل نہیں؟

سوال ایک مستشرق آرتھر جعفری نے کہا ہے کہ سورۃ الفاتحہ قرآن میں شامل نہیں کیونکہ اس سورت میں انسان اللہ تعالیٰ سے باتیں کرتا ہے جبکہ باقی سورتوں میں اللہ انسانوں سے مخاطب ہوتا ہے۔ اس اشکال کا کیا جواب ہوسکتا ہے؟

جواب کفار و مشرکین اور مستشرقین پینترے بدل بدل کر قرآن حکیم پر حملہ آور ہوتے رہتے ہیں مگر قرآن اپنی صداقت کا لوہا منوا چکا ہے۔ باطل کے ایوانوں پر لرزہ طاری ہے یہود و نصاریٰ کی نیندیں حرام ہوگئی ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ﴿لَّا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ﴾ (۴۱/حم السجدۃ:۴۲) قرآن پر ان کے اشکالات ان کی حماقتوں کا منہ بولتا ثبوت اور ﴿ظُلُمَٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ (۲۴/النور:۴۰) کا مصداق ہیں۔

آرتھر جیفری (Arthor Jeffery) (جو کہ جعفری نہیں جیفری ہے) کا اشکال بھی اس کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے کیونکہ بہت سی سورتیں ایسی ہیں جن میں یہ انداز اختیار کیا گیا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہوتا ہے۔ (وہ سب مقامات قرآن کا ہی حصہ ہیں)۔

قرآن مجید کے وہ سب مقامات جہاں انبیاء علیہم السلام، صحابہ کرام اور دیگر صالحین کی ادعیہ ذکر کی گئی ہیں یہ دعائیں جو ربنا، اللھم- رب اور دیگر الفاظ سے شروع ہوتی ہیں وہ سب انسان کے اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہونے کی مثالیں ہیں۔

انسان کے اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہونے کے باوجود وہ سب مقامات اللہ تعالیٰ کا کلام ہی ہیں۔ بطور مثال درج ذیل دو مقامات ملاحظہ کریں:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ إِن نَّسِينَآ أَوْ أَخْطَأْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ إِصْرًا كَمَا

حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۗ وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا ۗ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ (۲/البقرۃ:۲۸۶)

''ہمارے رب! اگر ہم بھول گئے ہوں یا خطا کی ہو تو ہمارا مؤاخذہ نہ کرنا، ہمارے رب! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا، ہمارے رب! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کی ہمیں طاقت نہ ہو اور ہمیں معاف کر دے! اور ہماری مغفرت کر دے اور ہم پر رحم کر! تُو ہی ہمارا مالک ہے، ہمیں کافروں کی قوم پر غلبہ عطا کر دے۔''

دوسرے مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝ ﴾ (۳/آل عمران:۸۔۹)

''ہمارے رب! ہمیں ہدایت دینے کے بعد ہمارے دل ٹیڑھے نہ کرنا اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا کر، یقیناً تُو ہی بہت بڑی عطا دینے والا (داتا) ہے، ہمارے رب! تُو یقیناً لوگوں کو ایک دن جمع کرنے والا ہے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں، یقیناً اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔''

نیز قرآن کے اور کئی مقامات بھی ہیں جہاں انسان اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہوتا ہے۔

(مثلاً ۳/آل عمران: ۳۵، ۳۶، ۳۸، ۴۰، ۴۱، ۴۷، ۱۹۱، ۱۹۴؛ ۵/المائدۃ:۱۱۴ تمام قرآنی دعاؤں کے لیے دیکھیے ہماری شائع کردہ کتاب غسل، وضو اور نماز کا طریقہ)

ان کے علاوہ بھی قرآن پاک میں دیگر سیکڑوں مقامات ہیں جہاں انسان اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہوتا ہے۔ جیسے وہ مقامات اللہ تعالیٰ کا کلام ہیں ایسے ہی سورۃ الفاتحہ بھی اللہ تعالیٰ کا کلام اور قرآن کا حصہ ہے۔

﴿قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا﴾ کی تفسیر

سوال سورۃ الکھف (آیت: ۲۱) ﴿فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا﴾ .... ﴿قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا﴾ سے کچھ لوگ قبروں پر بلڈنگ اور مسجد بنانے کی دلیل لیتے ہیں۔ وہ کون لوگ تھے جنھوں نے اصحاب کہف پر عمارت اور مسجد بنانے کی بات کی تھی؟ اگر مسجد بنانے والے مسلمان ہوں تو کیا ان کے اس عمل سے استدلال کیا جا سکتا ہے؟

جواب جن لوگوں نے اصحاب کہف پر مسجد بنانے کا اعلان کیا تھا ان کے شریعت کے پابند ہونے کا کوئی واضح ثبوت موجود نہیں اور نہ ان کے صالح ہونے کی ہی کوئی دلیل ہے۔ بلکہ اس کے برعکس قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اپنی طاقت کے بل بوتے پر یہ کام کرنا چاہتے تھے۔ قرآن نے ﴿غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ﴾ کے الفاظ سے اسے اہلِ غلبہ و اقتدار کا فعل قرار دیا ہے۔ جو کہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس اقدام کے لیے شریعت کے کسی حکم کی سند اُن کے پاس نہیں تھی بلکہ محض اثر و رسوخ کی بنیاد پر یہ کام کرنا چاہتے تھے۔ ان لوگوں کے اس عمل کی کوئی تعریف یا تحسین نہیں کی گئی اور نہ ان کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ اہلِ کتاب کی شریعت میں بھی قبروں پر عبادت گاہ تعمیر کرنا جائز نہ تھا ورنہ نبی اکرم ﷺ انہیں اس حرکت پر ملعون قرار نہ دیتے۔

اصحاب کہف پر عمارت بنانے والے اور عبادت گاہ تعمیر کرنے والے کون تھے؟ ان کے اس عمل کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ ان باتوں کی تفصیلات جاننے کے لیے چند مشہور مفسرین کا موقف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

امام ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اسی بستی والوں کا ارادہ ہوا کہ ان (اصحاب کہف) کے غار کا منہ بند کر دیا جائے اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ جنہیں کام کا غلبہ حاصل تھا، انہوں نے ارادہ کیا کہ ہم تو ان کے ارد گرد مسجد بنالیں گے۔ امام ابن جریر نے ان لوگوں کے بارے میں دو قول نقل کیے ہیں: ایک یہ کہ ان میں سے مسلمانوں نے یہ کہا تھا۔ دوسرے یہ کہ یہ قول کفار کا تھا۔ واللہ اعلم۔

اِس میں چھپائے رکھنے کا تہیہ کیا۔(تفسیر القرطبی)

جلال الدین سیوطی کے نزدیک مسجد بنانے کی بات بادشاہ نے کی تھی۔ لکھتے ہیں:

بادشاہ نے کہا: میں نیک لوگوں کے پاس ضرور ایک مسجد (معبد) بناؤں گا اور تا دمِ اخیر اس میں اللہ کی عبادت کروں گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی مطلب ہے:

﴿قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا﴾

امام عبدالرزاق اور ابن ابی حاتم نے قتادہ سے بیان کیا ہے کہ ﴿قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ﴾ سے مراد امراء یا سلاطین ہیں۔(الدر المنثور فی التفسیر الماثور)

امام رازی نے اس سلسلے میں کئی اقوال ذکر کیے ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا کہ بہتر یہ ہے کہ غار کا دروازہ (راستہ) بند کر دیا جائے تاکہ نہ تو کوئی ان کے پاس جا سکے اور نہ کوئی انسان ان کے حالات سے واقف ہو جبکہ دوسرے لوگوں نے کہا کہ غار میں داخل ہونے والے راستے پر عبادت خانہ بنا دیا جائے۔ اس قول کی روشنی میں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی پہچان رکھتے تھے۔ عبادت اور نماز کو بھی مانتے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ کافر لوگوں نے کہا تھا کہ اصحاب کہف ہمارے دین پر تھے ہم ان پر عمارت تعمیر کریں گے۔ مسلمانوں نے کہا کہ وہ ہمارے دین پر تھے ہم ان پر عبادت گاہ بنائیں گے...... ﴿قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ﴾ کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد مسلمان بادشاہ ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اصحاب کہف کے ورثاء تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ شہر کے سردار اور حکمران تھے۔(التفسیر الکبیر)

علامہ آلوسی نے بھی امام رازی سے ملتے جلتے اقوال نقل کیے ہیں۔ نیز لکھتے ہیں:

آیت زیر بحث سے صالحین کی قبروں پر عمارت بنانے، ان پر مسجد تعمیر کرنے اور اس میں نماز پڑھنے کے جواز کا بھی بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے۔

علامہ آلوسی کے نزدیک یہ استدلال درست نہیں، وہ فرماتے ہیں:

وھو قول باطل عاطل فاسد کاسد

''یہ قول (استدلال) بالکل باطل، بے دلیل، فاسد اور مردود ہے۔''(روح المعانی)

اِس میں چھپائے رکھنے کا تہیہ کیا۔ (تفسیر القرطبی)

جلال الدین سیوطی کے نزدیک مسجد بنانے کی بات بادشاہ نے کی تھی۔ لکھتے ہیں:

بادشاہ نے کہا: میں نیک لوگوں کے پاس ضرور ایک مسجد (معبد) بناؤں گا اور تادمِ اخیر اس میں اللہ کی عبادت کروں گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی مطلب ہے:

﴿ قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِم مَّسْجِدًا ﴾

امام عبدالرزاق اور ابن ابی حاتم نے قتادہ سے بیان کیا ہے کہ ﴿ قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ ﴾ سے مراد امراء یا سلاطین ہیں۔ (الدر المنثور فی التفسیر الماثور)

امام رازی نے اس سلسلے میں کئی اقوال ذکر کیے ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا کہ بہتر یہ ہے کہ غار کا دروازہ (راستہ) بند کر دیا جائے تا کہ نہ تو کوئی ان کے پاس جا سکے اور نہ کوئی انسان ان کے حالات سے واقف ہو جبکہ دوسرے لوگوں نے کہا کہ غار میں داخل ہونے والے راستے پر عبادت خانہ بنا دیا جائے۔ اس قول کی روشنی میں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی پہچان رکھتے تھے۔ عبادت اور نماز کو بھی مانتے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ کافر لوگوں نے کہا تھا کہ اصحاب کہف ہمارے دین پر تھے ہم ان پر عمارت تعمیر کریں گے۔ مسلمانوں نے کہا کہ وہ ہمارے دین پر تھے ہم ان پر عبادت گاہ بنائیں گے...... ﴿ قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ ﴾ کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد مسلمان بادشاہ ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اصحاب کہف کے ورثاء تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ شہر کے سردار اور حکمران تھے۔ (التفسیر الکبیر)

علامہ آلوسی نے بھی امام رازی سے ملتے جلتے اقوال نقل کیے ہیں۔ نیز لکھتے ہیں:

آیت زیر بحث سے صالحین کی قبروں پر عمارت بنانے، ان پر مسجد تعمیر کرنے اور اس میں نماز پڑھنے کے جواز کا بھی بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے۔

علامہ آلوسی کے نزدیک یہ استدلال درست نہیں، وہ فرماتے ہیں:

وھو قول باطل عاطل فاسد کاسد

''یہ قول (استدلال) بالکل باطل، بے دلیل، فاسد اور مردود ہے۔'' (روح المعانی)

سید احمد حسن محدث دہلوی لکھتے ہیں:

جو لوگ اس قصہ سے پہلے حشر کے منکر تھے ان جوانوں کا حال دیکھ کر اتنے قائل ہوئے کہ اس غار پر عمارت بنانے کو تیار ہو گئے اور جب حشر کے ماننے والے لوگوں نے وہاں عبادت خانہ بنانے کا قصد کیا تو ان سے جھگڑنے لگے، آخر بادشاہ کے حکم سے وہاں عبادت خانہ بنایا گیا...... صحیح بخاری میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے رُوبرُو یہود و نصاریٰ کے عبادت خانوں کا ذکر آیا، آپ نے مذمت کے طور پر فرمایا: ان لوگوں میں دستور ہے کہ جب کوئی نیک آدمی ان میں فوت ہو جاتا ہے تو اس کی قبر کے پاس عبادت خانہ بنا کر اس میں اس نیک آدمی کی تصویر بھی بنا دیتے ہیں۔

(بخاری، الصلاۃ، الصلاۃ فی البیعۃ، ح:٤٣٤)

اس حدیث کو آیت کے ساتھ ملانے سے یہ مطلب ہوا کہ جس دستور کے موافق اس غار کے پاس عبادت خانہ بنایا گیا ہے اللہ کو خوب معلوم ہے کہ اس سے اصحاب کہف ناخوش ہیں کیونکہ اس طرح کے عبادت خانہ کی بنیاد بت پرستی کی بنیاد ہے۔ اور اصحابِ کہف بت پرستی سے ہی بیزار ہو کر اس غار میں آ کر چھپے ہیں۔ (احسن التفاسیر)

سید قطب شہید رقمطراز ہیں:

''کچھ لوگوں نے کہا کہ اصحاب کہف کی غار پر ایک عمارت بنا دو تا کہ ان کی یادگار تو قائم رہے مگر یہ معلوم نہ ہو کہ ان کا دین کیا تھا؟ اس وقت کے اربابِ اقتدار نے کہا کہ نہیں، ہم تو ان پر یہود و نصاریٰ کے طریقے کے مطابق ایک معبد بنائیں گے، اسلام نے اس کی صریح ممانعت کر دی ہے، کیونکہ اس سے قبروں اور اصحاب قبور کی پرستش کا رواج چل پڑتا ہے، جاہل عوام حدود کے اندر نہیں رہتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ معبد ان اصحاب قبور کی عبادت کے لیے ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے یہود و نصاریٰ پر لعنت کی جنھوں نے اپنے نبیوں اور ولیوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا ڈالا تھا۔ آج کل ان یہود و نصاریٰ کی پیروی کرنے والے مسلمان بھی یہی کام کرتے ہیں۔'' (فی ظلال القرآن)

سید مودودی نے سورۃ الکھف کی زیر بحث آیت کی تفسیر میں بہت واضح موقف

اختیار کیا ہے، لکھتے ہیں:

اس سے مراد رومی سلطنت کے ارباب اقتدار اور مسیحی کلیسا کے مذہبی پیشوا ہیں جن کے مقابلے میں صالح العقیدہ عیسائیوں کی بات نہ چلتی تھی، پانچویں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے عام عیسائیوں میں اور خصوصاً رومن کیتھولک کلیسا میں شرک، اولیاء پرستی اور قبر پرستی کا پورا زور ہو چکا تھا، بزرگوں کے آستانے پوجے جارہے تھے۔ اور مسیح علیہ السلام، مریم علیہا السلام اور حواریوں کے مجسمے گرجوں میں رکھے جارہے تھے۔ اصحاب کہف کے بعث سے چند ہی سال پہلے چار سو اکتیس عیسوی میں پوری عیسائی دنیا کے مذہبی پیشواؤں کی ایک کونسل اسی افسس کے مقام پر منعقد ہو چکی تھی جس میں مسیح صلی اللہ علیہ وسلم کی اُلوہیت اور مریم علیہا السلام کے ''مادرِ خدا'' ہونے کا عقیدہ چرچ کا سرکاری عقیدہ قرار پایا تھا۔ اس تاریخ کو نگاہ میں رکھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ﴿قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓي اَمْرِهِمْ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو سچے پیروانِ مسیح کے مقابلے میں اس وقت عیسائی عوام کے راہنما اور سربراہ کار بنے ہوئے تھے اور مذہبی و سیاسی امور کی باگیں جن کے ہاتھوں میں تھیں۔ یہی لوگ دراصل شرک کے علمبردار تھے اور انہوں نے ہی فیصلہ کیا کہ اصحاب کہف کا مقبرہ بنا کر اسے عبادت گاہ بنایا جائے۔ مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے قرآنِ مجید کی اس آیت کا بالکل الٹا مفہوم لیا ہے۔ وہ اسے دلیل بنا کر مقابرِ صلحاء پر عمارتیں اور مسجدیں بنانے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہاں قرآن ان کی اس گمراہی کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جو نشانی ان ظالموں کو بعث بعد الموت اور امکان آخرت کا یقین دلانے کے لیے دکھائی گئی تھی اسے انہوں نے ارتکاب شرک کے لیے ایک خداداد موقع سمجھا اور خیال کیا کہ چلو کچھ اور ولی پوجا پاٹ کے لیے ہاتھ آ گئے۔ پھر آخر اس آیت سے قبورِ صالحین پر مسجدیں بنانے کے لیے کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات اس کی نفی میں موجود ہیں۔

اس کے بعد سید مودودی نے چار احادیث نقل کی ہیں جن میں قبر پر عبادت بنانے سے منع کیا گیا ہے، ان لوگوں پر لعنت کی گئی ہے جنہوں نے ایسا عمل کیا ہے نیز اس قسم کے لوگوں کو شِرَارُ الْخَلْقِ (بدترین مخلوق) قرار دیا گیا ہے۔ مولانا موصوف لکھتے ہیں:

نبی ﷺ کی ان تصریحات کی موجودگی میں کون خداترس آدمی یہ جرأت کرسکتا ہے کہ قرآن مجید میں عیسائی پادریوں اور رومی حکمرانوں کے جس فعل کا حکایۃً ذکر کیا گیا ہے اسے ٹھیک وہی فعل کرنے کے لیے دلیل و حجت ٹھہرائے؟ (تفہیم القرآن)

مولانا ابوالکلام آزاد نے آیت کے ترجمہ میں ہی اپنا موقف واضح کردیا ہے:

''ان لوگوں نے کہ معاملات پر غالب آگئے تھے، کہا: ٹھیک ہے ہم ضرور ان کے مرقد پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے۔''

تفسیر میں مولانا لکھتے ہیں:

جس قوم کے ظلم سے عاجز آکر انہوں نے غار میں پناہ لی تھی وہی ان کی اس درجہ معتقد ہوئی کہ ان کے مرقد پر ایک ہیکل تعمیر کیا گیا۔ (ترجمان القرآن)

قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی نے اس سلسلے میں تاویل سے کام لیا ہے البتہ اس بات پر وہ بھی متفق ہیں کہ احادیث سے قبروں کو پختہ کرنے، اونچا کرنے اور ان کے اوپر عمارت بنانے کی ممانعت ثابت ہورہی ہے۔ انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے کہا: ہم یہاں مسجد بنائیں گے، یہ لوگ ہمارے ہم مذہب تھے۔ غیر مسلموں نے کہا: ہم یہاں عمارتیں بنائیں گے، بستی آباد کریں گے جہاں لوگ رہیں گے یا غار کے دروازے پر ایسی عمارت بنائیں گے کہ لوگوں کا اندر جانا بند ہوجائے۔ (تفسیر مظہری)

عبدالماجد دریا آبادی لکھتے ہیں:

﴿ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ ﴾ یعنی جب لوگوں میں اس امر پر گفتگو ہورہی تھی کہ ان بزرگوں کی نعشوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ ہوا یہ کہ جب لوگ ان کی زیارت کو جوق در جوق آنے لگے، اور غار کے دروازہ پر میلہ سا لگنے لگا تو ان حضرات کو وفات دے دی گئی۔ اور اب یہ گفتگو ہونے لگی کہ ان مقدس جسموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ اَبْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ط میں عَلَيْهِمْ سے مراد ہے ان کے غار کے اوپر۔ ان کے غار کے دروازے پر۔ (مدارک)

﴿ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا۝ ﴾ کی تفسیر میں مولانا موصوف لکھتے ہیں: (تاکہ اس امر کی علامت قائم رہے کہ یہ لوگ عابد واہلِ توحید تھے۔ کوئی انہیں معبود نہ بنالے) جو غار

اصحاب کہف کی جانب منسوب ہے اس کے دہانہ پر ایک مسیحی خانقاہ اب بھی موجود ہے۔ ملاحظہ ہو انگریزی تفسیر القرآن۔ ﴿الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ﴾ سے مراد حکام وقت ہیں۔ (بحر، کبیر) مَّسْجِدًا۝ مسجد یہاں معبد یا پرستش گاہ کے عام معنی میں ہے۔ اسلامی مسجد کے اصطلاحی معنی میں نہیں۔ ﴿لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا۝﴾ کی تفسیر میں مفسر تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے فقہاء مفسرین نے لکھا ہے کہ اگر کسی زمانہ میں مسجد کے بنانے سے بجائے مصالح کے مفاسد کا ظہور ہونے لگے تو مسجد بنانا جائز نہ رہے گا۔ مرشد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس مسجد سے وہ قصد نہ تھا، جو جاہلوں کا قبور کے پاس مسجد بنانے سے ہوتا ہے، اس لیے قبر پرستوں کو کوئی حجت ونظیر اس سے نہیں مل سکتی۔ (تفسیر ماجدی)

علامہ ناصر الدین البانی نے اس مسئلہ پر مکمل بحث کرنے کے بعد خلاصہ یوں تحریر کیا:

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر مسجد بنانے والوں کو ملعون قرار دیا ہے...... پھر یہ آیت ﴿لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا۝﴾ ان آیات کی طرح نہیں ہے جن سے ائمہ نے بعض مسائل میں استدلال کیا ہے۔ اس آیت میں بس ایک فریق کے اصحاب کہف کی قبروں پر مسجد تعمیر کرنے کے قول اور عزم کو حکایۃً بیان کیا گیا ہے۔ اس میں اس فریق کی مدح وتحسین کا پہلو ہے نہ ان کی اقتدا کرنے کی ترغیب۔ اس لیے جب تک یہ نہ ثابت ہو کہ ان میں کوئی معصوم بھی تھا اس وقت تک ان کا کسی کام کا عزم وارادہ تو کجا اسے عملی جامہ پہنا دینا بھی اس کام کی مشروعیت کی دلیل نہیں ہوسکتا، نیز ان کے فعل کے قابل توجہ نہ ہونے کا ایک قوی سبب یہ بھی ہے کہ وہ جیسا قتادہ دیگر سے مروی ہے۔ امراء وحکام تھے جو مذہب کی پابندی سے کم اور دنیاوی نام ونمود کے کاموں سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ بہر حال اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ اصحاب کہف کے بارے میں پہلی جماعت مومنین کی جماعت تھی جو قبروں پر عبادت گاہ بنانے کی حرمت سے واقف تھی اس لیے اس نے غار کے دروازے پر دیوار چن دینے اور دروازے کو بند کردینے اور اصحاب کہف سے کوئی تعرض نہ کرنے کا مشورہ دیا مگر دوسری جماعت نے، جو امراء وحکام پر مشتمل تھی، مشورہ کو قبول نہیں کیا بلکہ اور جوش میں آ گئی اور قسم کھا کر کہنے لگی کہ ہم اصحابِ کہف کی قبروں پر ضرور مسجد تعمیر کریں گے۔

(تحذیر الساجد من اتخاذ القبور مساجد اردو ترجمہ: قبروں پر مساجد اور اسلام از مولانا محفوظ الرحمٰن فیضی۔ ط:۱، دارارقم، فیصل آباد)

وہ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے اقتدار کو طول دے سکیں اور اپنے شرکیہ عقائد کو مزید رواج دے سکیں۔ جس سے ان کی شہرت اور زیادہ ہو جائے ایسا اصحاب کہف کو اپنے زمرے میں شامل کر کے ہی ممکن تھا۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ﴿ هٰذَا رَبِّي ﴾ کے الفاظ کس لیے استعمال کیے؟

سوال سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ستارے، چاند اور سورج کے لیے ﴿ هٰذَا رَبِّي ﴾ کے الفاظ استعمال کیے۔ یہ الفاظ غور وفکر کے لیے کہے گئے یا قوم کو سمجھانے کے لیے؟

جواب ابراہیم علیہ السلام کی قوم چاند، سورج اور ستاروں کی پوجا کرتی تھی، آپ علیہ السلام نے ان معبودانِ باطلہ سے حکیمانہ انداز میں بیزاری کا اعلان کیا اور مناظرانہ اسلوب میں ان کے عقیدے کی خامی واضح کی ورنہ ابراہیم علیہ السلام کو تو اپنے معبودِ حقیقی میں کوئی شک نہ تھا۔ انھیں تو اللہ نے پہلے سے ہی رشد و ہدایت عطا کی تھی، ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَلَقَدْ آتَيْنَآ إِبْرٰهِيمَ رُشْدَهٗ مِن قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِينَ ۝ ﴾ (۲۱/الانبیاء:۵۱)

یہ رشد اور دانائی ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم کو شرک سے روکنے اور توحید الٰہی منوانے کے لیے بروئے کار لاتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کو جو معرفت الٰہی حاصل تھی اس کی بنیاد پر وہ نہ صرف قوم کو گمراہ سمجھتے تھے بلکہ وہ دو ٹوک الفاظ میں مشرکین کی تردید بھی کرتے تھے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ لِأَبِيهِ آزَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا آلِهَةً ۚ إِنِّيٓ أَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ ۝ ﴾ (۶/الانعام:۷۴)

''اور ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا کہ کیا آپ بتوں کو معبود بناتے ہیں یقیناً مَیں آپ کو اور آپ کی قوم کو صریح گمراہی میں دیکھتا ہوں۔''

ابراہیم علیہ السلام کا ہدایت یافتہ ہونا اوپر بیان ہوا ہے اور ہدایت یافتہ وہی ہو سکتا ہے جو ایمان کے ساتھ ظلم (شرک) کی ملاوٹ نہ کرے۔ (دیکھیے ۶/الانعام:۸۲)

مزید برآں مذکورہ بالا بیانات کے بطور مناظرہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ

اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا:

﴿وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ﴾ (۶/الانعام:۸۳)

''یہ دلیل ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابل سمجھائی تھی۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا اپنی قوم سے بحث و جدال کی غرض سے تھا نہ کہ اپنی ذات کے لیے تلاش حق کا۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو واقعتاً رب کہنا صریح شرک ہے، قرآن مجید نے ابراہیم علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام سے دو ٹوک انداز میں ارتکاب شرک کی نفی کی ہے، ابراہیم علیہ السلام سمیت اٹھارہ انبیاء علیہم السلام اور دیگر ہدایت یافتہ لوگوں کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (۶/الانعام:۸۸)

''یہ اللہ کی ہدایت تھی، اللہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے ہدایت کرتا ہے اور اگر یہ (انبیاء و رسل) بھی شرک کرتے تو ان کا کیا کرایا سب اکارت جاتا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ردِ شرک اور اثباتِ توحید کی خاطر اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو دلیل عطا کی تھی، جس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے اعتقاد کے مطابق یہ میرا رب ہے؟ امام قرطبی رحمہ اللہ اس کی مثال قرآن سے پیش کرتے ہیں:

﴿اَيْنَ شُرَكَآءِيَ﴾ (۱۶/النحل:۲۷)

''کہاں ہیں میرے شریک؟''

یعنی جنہیں میرا شریک کہتے تھے وہ کہاں ہیں؟ (القرطبی)

(مزید مثالوں کے لیے دیکھیے ۱۸/الکھف: ۵۲ ، ۲۸/ القصص: ۶۲ ، ۷۴ ، ۴۱/ حٰم السجدة: ۴۷)

ابراہیم علیہ السلام نے جو ﴿هٰذَا رَبِّيْ﴾ کہا تھا، اس کے بارے میں امام رازی فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے:

هذا ربي في زعمكم واعتقادكم

''یہ تمہارے دعوے اور اعتقاد کے مطابق میرا رب ہے۔''

اس کی نظیر کے طور پر امام رازی نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو پیش کیا ہے:

﴿وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا﴾ (۲۰/طٰہٰ:۹۷)

''(سامری!) تو اپنے معبود کی طرف دیکھ جس پر تو جما رہا ہے۔''

اس سے مراد یہی ہے کہ جسے تو معبود سمجھتا ہے ورنہ درحقیقت اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

﴿اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ﴾ سے کون سا دن مراد ہے؟

سوال ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ﴾ (۶/الانعام:۹۳)

اس آیت میں ﴿اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ﴾ میں اَلْيَوْمَ سے کون سا دن مراد ہے؟ عذاب قبر کے بعض منکرین کا خیال ہے کہ اس اَلْيَوْمَ سے روزِ قیامت مراد ہے کیونکہ یہ لفظ قرآن میں متعدد مقامات پر حشر کے دن کے لیے استعمال ہوا ہے۔

جواب سورۃ الانعام میں آنے والے لفظ اَلْيَوْمَ سے مراد انسان کا یوم وفات ہے۔ اسی دن سے انسان کے عالم برزخ میں عذاب و ثواب کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بہت سے ائمہ دین اور مفسرین نے ﴿اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ﴾ کو عذاب قبر کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے۔ اکثر معروف تفاسیر میں یہ استدلال موجود ہے۔

محترم بھائی محمد ارشد کمال منکرین عذاب قبر کے اشکال کی تردید میں لفظ اَلْيَوْمَ کے متعدد قرآنی استعمالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یاد رہے کہ اَلْيَوْمَ سے مراد قیامت کا دن ہے۔ جیسا کہ سورۃ المعارج (آیت:۴۴) اور النبأ (آیت:۳۹) میں قرینہ موجود ہے جو اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ یہاں اَلْيَوْمَ سے مراد قیامت ہی کا دن ہے۔

مگر جہاں کوئی ایسا قرینہ نہ پایا جائے تو وہاں اَلْيَوْمَ سے وہی دن مراد ہوگا جس کی بات ہو رہی ہے۔

اگر معترضین ہمارے بیان کردہ جواب کو تسلیم نہیں کرتے ہیں، تو پھر ذرا بتائیں کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی اَلْيَوْمَ کا لفظ آیا ہے، کیا اس سے مراد صرف حشر اور قیامت ہی کا دن ہے؟

ہر جگہ اَلْيَوْمَ سے قیامت کا دن مراد لینا سراسر جہالت ہے، مثلاً:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (۵/المائدۃ:۳)

''آج میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا، اور تم پر اپنا انعام بھرپور کر دیا اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کیا۔''

عذابِ قبر کے منکرین بتائیں کہ کیا یہاں اَلْيَوْمَ سے مراد قیامت کا دن ہے؟ اگر آپ کا جواب ہاں میں ہے تو پھر مطلب یہ ہوا کہ تمہارا دین اسلام اب نامکمل اور ناقص ہے، یعنی اس میں کمی بیشی ہو سکتی ہے، یہ قیامت کے دن ہی مکمل ہوگا۔ فیا للعجب

قیامت کے دن مکمل کرنے کا فائدہ۔ اور اگر آپ کا جواب نفی میں ہے تو ماننا پڑے گا کہ سورۃ الانعام میں اَلْيَوْمَ سے مراد دنیا سے رخصت ہونے کا دن ہے۔

ایسے ہی ایک اور مثال۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ﴾ (۵/المائدۃ:۵)

''آج کے دن پاکیزہ چیزیں تمہارے لیے حلال کر دی گئی ہیں۔''

بتائیے کہ یہاں اَلْيَوْمَ سے کون سا دن مراد ہے؟

معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں جہاں اَلْيَوْمَ سے مراد قیامت کا دن ہے، وہاں اس کے ساتھ کوئی قرینہ موجود ہے۔ لیکن جہاں اَلْيَوْمَ کا لفظ مطلق ہو، وہاں اس سے ''آج کا دن'' (جس دن کی بات ہو رہی ہے) ہی مراد ہے۔ (عذابِ قبر،ص:۸۲۔۸۳)

سجدۂ تلاوت
کے
احکام ومسائل

سجدۂ تلاوت کا شرعی حکم؟

قصد وارادہ سے آیاتِ سجدہ کی سماعت اور سجدۂ تلاوت؟

سوال سجدۂ تلاوت کا شرعی حکم کیا ہے؟ کیا سجدۂ تلاوت فرض و واجب ہے؟ اگر کوئی شخص یہ سجدہ نہ کرے تو کیا وہ گناہ گار ہوگا؟

جواب سجدۂ تلاوت کی مشروعیت پر ائمہ دین کا اجماع اور تمام مکاتب فکر کا اتفاق ہے۔قرآن میں بھی تلاوت سننے پر سجدہ کرنے کا اشارہ موجود ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ﴾ (۸۴/الانشقاق:۲۱)

''اور جب ان (کفار) کے پاس قرآن پڑھا جاتا ہے تو وہ سجدہ نہیں کرتے۔''

اس آیت میں ان لوگوں کو مذمت کی گئی ہے جو سجدہ کی عظمت کا انکار کرتے ہوئے سجدہ نہیں کرتے اور نہ اس کی مشروعیت کے قائل ہیں۔(دیکھیے المغنی ۲/۱۷۸)

احادیث میں سجدۂ تلاوت کی اہمیت وفضیلت بھی بیان ہوئی ہے۔اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں:

''جب ابن آدم سجدہ کی آیت پڑھ کر سجدہ کرتا ہے تو شیطان ایک طرف ہوکر رونے لگتا ہے:ہائے افسوس!انسان کو سجدہ کا حکم دیا گیا،اس نے سجدہ کرلیا،اس کے لیے تو جنت ہے۔جبکہ مجھے سجدے کا حکم ہوا تو میں نے (سجدہ کرنے سے) انکار کردیا،لہٰذا میرے لیے جہنم ہے۔''

(مسلم، الایمان، بیان اطلاق اسم الکفر علی من ترک الصلوۃ، ح: ۸۱؛ ابن ماجۃ، اقامۃالصلوات والسنۃ فیھا، ح: ۱۰۵۲)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سجدۂ تلاوت کتنے ذوق وشوق سے کرتے تھے،اس بات کا اندازہ درجِ ذیل حدیث سے لگایا جاسکتا ہے:

ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: نبی ہماری موجودگی میں سجدہ والی سورت تلاوت کرتے

(آیت سجدہ پر) آپ ﷺ سجدہ کرتے اور ہم بھی سجدہ کرتے حتیٰ کہ (ہجوم کی وجہ سے) پیشانی رکھنے کی جگہ بھی نہ ملتی تھی جس پر ہم سجدہ کرتے۔

(بخاری ، سجود القرآن، من سجد بسجود القاریء، ح:۱۰۷۵؛مسلم: ۵۷۵؛ابو داؤد: ۱۴۱۲)

اس حدیث اور دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ تلاوت سنت ہے۔ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: اللہ کے رسول ﷺ ہم پر قرآن پڑھتے۔ جب سجدے کی آیت تلاوت کرتے تو اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کرتے اور ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ سجدہ کرتے۔

(ابو داؤد، سجود القرآن، فی الرجل یسمع السجدۃ وھو راکب او فی غیر صلوٰۃ، ح:۱۴۱۳)

آیاتِ سجدہ پڑھنے پر آپ ﷺ سجدۂ تلاوت کرتے تھے، جس سے اس سجدے کا سنت ہونا ثابت ہوتا ہے۔ جمہور ائمہ کے نزدیک سجدہ تلاوت پڑھنے اور سننے والے دونوں افراد کے لیے سنت ہے۔ ائمہ اربعہ میں سے امام ابو حنیفہ سجدۂ تلاوت کے واجب ہونے، جبکہ ائمہ ثلاثہ امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ سنت ہونے کے قائل ہیں۔ امام اوزاعی، امام بخاری، حافظ ابن حجر عسقلانی، امام نووی، امام شوکانی اور عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہم اللہ سجدہ تلاوت کو سنت کہتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بخاری، سجود القرآن میں ماجاء فی سجود القرآن وسنتھا کا باب قائم کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے سجدہ تلاوت کے عدم وجوب پر درج ذیل حدیث کو قوی ترین دلیل قرار دیا ہے:

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے دن منبر پر سورۃ النحل پڑھی، جب سجدہ کے مقام ﴿ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴾......۱۶/النحل:۴۹' پر پہنچے تو منبر سے اترے اور سجدہ کیا اور لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا۔ دوسرے جمعے کو پھر یہی سورت پڑھی۔ جب سجدہ کی آیت پر پہنچے تو فرمانے لگے:

"لوگو! ہم آیت سجدہ تلاوت کرتے ہیں تو جو شخص سجدہ کرلے اس نے درست اور اچھا عمل کیا اور جس نے سجدہ تلاوت نہیں کیا اس پر کوئی گناہ نہیں۔ نافع نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ اللہ نے سجدہ تلاوت فرض نہیں کیا بلکہ ہماری خوشی پر رکھا۔"

(بخاری، سجود القرآن، من رأی ان اللہ عزوجل لم یوجب السجود، ح:۱۰۷۷)

ایک اور روایت میں ہے کہ عمر بن خطاب نے جمعہ کے دن بر سرِ منبر آیت سجدہ تلاوت کی، آپ نے منبر سے اتر کر سجدہ کیا، لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا۔ آئندہ جمعے میں بھی آپ نے آیت سجدہ تلاوت کی، لوگ سجدہ کرنے کے لیے تیار ہوئے تو آپ نے فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكْتُبْهَا عَلَيْنَا......

''اللہ نے ہم پر سجدۂ تلاوت فرض نہیں کیا، البتہ اگر ہم چاہیں تو کر لیں۔''

(اس دن) آپ نے سجدہ نہ کیا اور لوگوں کو بھی سجدہ کرنے سے روک دیا۔

(مؤطا، القرآن، ماجاء في سجود القرآن، ح:٣٨٢)

یہ واقعہ بہت بڑے مجمع کے سامنے پیش آیا اور کسی نے بھی اس پر تعجب کا اظہار نہیں کیا اور نہ کسی سے اس کے خلاف منقول ہے۔ (المغنی ۲/۱۷۸)

امام ابن قدامہ نے اس واقعہ کی بنا پر سجدہ کے واجب نہ ہونے پر استدلال کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس پر صحابہ کا اجماع ہے۔ (ایضاً)

لہٰذا اگر کوئی قرآن پڑھنے یا سننے والا کبھی سجدہ نہ کرے تو وہ گناہ گار نہیں ہوگا۔ تاہم شیطان کو ذلیل ورُسوا کرنے اور اسے رلانے کے لیے سجدہ کرنا ہی افضل ہے۔

بعض علماء نے ایک اور حدیث سے بھی سجدہ تلاوت کے عدمِ وجوب پر استدلال کیا ہے۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

مَیں نے اللہ کے رسول کے سامنے سورۃ النجم کی تلاوت کی، مگر آپ نے اس میں سجدہ نہیں کیا۔

(بخاری، سجود القرآن، من قرأ السجدة ولم يسجد، ح: ١٠٧٢؛ مسلم: ٥٧٣؛ ابوداوٗد: ١٤٠٣؛ ترمذی: ٥٧٦)

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

بعض علماء کا کہنا ہے کہ اگر سجدہ تلاوت واجب ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے سجدہ کرواتے اور خود بھی کرتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ترک سجدہ بھی جائز ہے۔ بعض نے یہ کہا کہ اگر پڑھنے والا سجدہ نہ کرے تو سامع پر بھی واجب نہیں۔ (ترمذی ۱/۲۲۸)

مولانا محمد داوٗد راز رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

آپ کے اس وقت سجدہ نہ کرنے کی کئی وجوہات ہیں: علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ آپ نے سجدہ اس لیے نہیں کیا کہ اس کا ترک بھی جائز ہے۔ اسی تاویل کو ترجیح حاصل ہے۔ امام شافعی کا یہی خیال ہے۔ (شرح بخاری ۲/۲۰۸)

مولانا موصوف یہ بھی لکھتے ہیں کہ ممکن ہے کہ آپ نے بعد میں سجدہ کرلیا ہو۔ (ایضاً)

لہٰذا سستی اور غفلت کو سجدۂ تلاوت نہ کرنے میں عادت نہیں بنالینا چاہیے۔

سجدہ کروانے کے لیے آیت سجدہ پڑھنا؟

سوال ہم ایک مدرسے میں قرآن حفظ کر رہے ہیں۔ بعض طلباء ایک دوسرے کے سامنے سجدہ والی آیت پڑھ دیتے ہیں تاکہ اسے بھی سجدہ کرنا پڑے۔ کیا اس طرح آیت سنوائے جانے پر بھی سننے والوں کو سجدہ کرنا چاہیے؟

جواب تلاوت کرنے اور سننے والے دونوں کو سجدہ کرنا چاہیے۔ سجدہ تلاوت کی اکثر روایات میں تلاوت کرنے والے کے ساتھ ساتھ سننے والے کے سجدہ کرنے کا بھی تذکرہ ہے۔ (مثلاً دیکھیے بخاری: ۱۰۷۵؛ ابوداؤد: ۱۴۱۳)

البتہ سجدہ تلاوت نہ کرنا گناہ نہیں۔ اگر کوئی شخص کسی کو آیت سجدہ اس لیے سنائے تاکہ اسے سجدہ کرنا پڑے، جبکہ سننے والے کا قصد نہ ہو تو بعض صحابہ ایسی حالت میں سجدہ نہیں کرتے تھے۔

عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے ایک ایسے شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جو آیت سنتا ہے مگر وہ سننے کی نیت سے نہیں بیٹھا تھا، تو کیا اس پر سجدہ واجب ہے؟ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا:

اگر وہ اس نیت سے بیٹھا بھی ہو تو کیا! (گویا انہوں نے سجدہ تلاوت کو واجب نہیں سمجھا) سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

ہم سجدہ تلاوت کے لیے نہیں آئے۔

(بخاری، سجود القرآن، من رأى ان الله عزوجل لم يوجب السجود)

عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

سجدہ تلاوت تو اس کے ذمے ہے جس نے آیت سجدہ قصد سے سنی ہو۔ سائب بن زید

قصہ خوانوں کے سجدہ کرنے پر سجدہ نہیں کرتے تھے۔ (بخاری، ایضاً)

آیت سجدہ قصداً سے نہ سنی ہو تو ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک بھی اس پر سجدہ کرنا مستحب نہیں۔ امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ کا بھی یہی موقف ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ دریں صورت سجدہ تلاوت کرنے کی تاکید نہیں کرتے اور اگر کوئی سجدہ کر لے تو اچھا ہے۔

(المغنی: ۲/۱۷۸/۱۷۹)

تاہم اصحاب الرائے کہتے ہیں کہ بلا قصد سننے والے پر بھی سجدہ لاگو ہوتا ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما نخعی، سعید بن جبیر، نافع اور اسحاق سے بھی یہی مروی ہے۔ (ایضاً)

نماز کے علاوہ سجدۂ تلاوت؟

سوال سجدۂ تلاوت صرف حالتِ نماز میں کرنا چاہیے یا نماز کے علاوہ بھی سجدۂ تلاوت ثابت ہے؟

جواب نماز اور غیر نماز دونوں حالتوں میں سجدۂ تلاوت مشروع ہے۔ الفتح الربانی (۴/۱۶۳) میں ہے کہ جمہور ائمہ کے نزدیک آدمی جب تنہا نماز پڑھ رہا ہو یا جب وہ امامت کروا رہا ہو تو اس کے لیے نماز میں، خواہ وہ جہری ہو یا سری، فرض ہو یا نفل، سجدہ تلاوت کرنا مستحب ہے۔

ابو رافع بیان کرتے ہیں: مَیں نے ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی۔ آپ نے ﴿إِذَا السَّمَآءُ انشَقَّتْ﴾ (سورۃ الانشقاق) کی تلاوت کی تو سجدۂ تلاوت کیا۔ مَیں نے پوچھا: یہ کیسا سجدہ ہے؟ انہوں نے فرمایا:

مَیں نے ابو القاسم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیچھے یہ سجدہ کیا ہے۔ مَیں یہ سجدہ کرتا رہوں گا یہاں تک کہ آپ سے جا ملوں۔

(بخاری، سجود القرآن، من قرأ السجدة فی الصلوٰة فسجد بها، ح: ۱۰۷۸؛ مسلم: ۵۷۸؛ ابوداؤد: ۱۴۰۸)

بہت سی احادیث سے خارج از نماز بھی سجدہ تلاوت کا ثبوت ملتا ہے۔ چند احادیث ملاحظہ کریں:

① عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کبھی قرآن پڑھتے، آیت سجدہ تلاوت کرتے تو ہمارے ساتھ سجدہ کرتے یہاں تک کہ ہجوم کی وجہ سے ہم میں سے کسی کو سجدہ کی جگہ نہ ملتی اور یہ نماز کے برابر ہوتا۔

(بخاری:۱۰۷۵۔۱۰۷۶؛ مسلم: المساجد، سجود التلاوۃ، ح:۵۷۵؛ ابوداؤد:۱۴۱۲)

مسلم میں فی غیر الصلوۃ اور ابوداؤد میں فی غیر صلاۃ کے الفاظ ہیں۔

② اللہ کے رسول ﷺ نے منبر پر سورۃ "صٓ" کی تلاوت کی اور جب آیت سجدہ تلاوت کی تو منبر سے اتر کر آپ ﷺ نے سجدہ تلاوت کیا۔ آپ کے ساتھ لوگوں نے بھی سجدہ کیا۔

(ابوداؤد: ۱۴۱۰؛ دارمی: ۱۴۷۴؛ حاکم ۱/ ۲۸۴۔۲۸۵)

③ عمر رضی اللہ عنہ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے، سورۃ النحل کی آیتِ سجدہ آئی، آپ نے منبر سے اتر کر سجدہ کیا اور باقی لوگوں نے بھی سجدہ کیا۔ (بخاری:۱۰۷۷)

④ فتح مکہ کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے آیت سجدہ تلاوت کی تو سب لوگوں نے سجدہ کیا ان میں سے کچھ سواریوں پر تھے اور کچھ زمین پر سجدہ کرنے والے تھے۔ سوار لوگوں نے اپنے اپنے ہاتھوں پر سجدہ کیا۔ (ابوداؤد:۱۴۱۱؛ حاکم ۱/ ۲۱۹)

⑤ نبی ﷺ نے مکہ میں سورۃ النجم کی تلاوت کی تو ایک بوڑھے (امیہ بن خلف) کے علاوہ سب لوگوں نے سجدہ کیا۔ مسلمانوں، مشرکوں، جنوں اور انسانوں نے بھی سجدہ کیا۔

(بخاری: ۱۰۶۷،۱۰۷۱؛ مسلم: ۵۷۶؛ ابوداؤد: ۱۴۰۶)

آیات سجدہ دیکھنے پر سجدۂ تلاوت؟

سوال جب مطلوبہ سورت کی تلاوت کے لیے قرآن کھولتا ہوں تو بعض اوقات آیت سجدہ پر نظر پڑ جاتی ہے، تو کیا آیت پر نظر پڑنے سے بھی سجدۂ تلاوت کرنا چاہیے؟

جواب آیاتِ قرآنی اور احادیث نبوی میں قرآن سننے اور پڑھنے پر سجدہ تلاوت کرنا چاہیے۔ محض آیاتِ سجدہ دیکھنے سے سجدہ تلاوت نہیں ہے۔ آیات دیکھ کر سجدہ تلاوت کرنا نہ تو نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے۔

آیات سجدہ کا ترجمہ پڑھنے پر سجدۂ تلاوت؟

سوال قرآن کا صرف ترجمہ پڑھتے یا سنتے وقت سجدہ تلاوت کرنا چاہیے یا نہیں؟

جواب ترجمہ پڑھنا تلاوت قرآن نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے پڑھنے یا سننے پر سجدۂ تلاوت نہیں ہوتا۔

کیا سجدۂ تلاوت کے لیے باوضو اور قبلہ رخ ہونا ضروری ہے؟

سوال کیا سجدۂ تلاوت کرنے کے لیے باوضو اور قبلہ رخ ہونا ضروری ہے؟

جواب سجدۂ تلاوت کے لیے باوضو اور قبلہ رخ ہونا ضروری نہیں۔ باوضو اور قبلہ رخ ہونا نماز کی شرائط میں سے ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

سجدۂ تلاوت چونکہ نماز نہیں ہے، لہٰذا اس کے لیے نماز کی شرائط مقرر نہیں کی جائیں گی بلکہ یہ وضو کے بغیر بھی جائز ہے۔ (مجموع فتاویٰ ۲۳/۱۶۵)

امام شوکانی رحمہ اللہ نے نیل الاوطار (۲/۳۴۰) میں اسی کو ترجیح دی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے سورۃ النجم کی تلاوت کے وقت سجدہ کیا تو مسلمانوں، مشرکوں اور جن وانس سب نے آپ کے ساتھ سجدہ کیا۔

(بخاري، سجود القران، سجود المسلمين مع المشركين والمشرك نجس ليس له وضوء، ح: ۱۰۷۱)

ظاہر ہے کہ اس وقت سب مسلمان باوضو نہ ہوں گے اور مشرکوں کے وضو کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ مشرک تو ناپاک ہیں، ان کا وضو کیونکر ہوسکتا ہے!

نبی ﷺ لوگوں کی موجودگی میں سجدہ والی آیت پڑھتے اور سجدہ کرتے تو ہم بھی آپ کے ساتھ اس طرح سجدہ کرتے کہ پیشانی رکھنے کی جگہ بھی نہ ملتی جس پر سجدہ کرتے۔ (ایضا: ۱۰۷۵)

اس قدر ہجوم میں اکٹھے سجدہ کرتے وقت نہ تو ہر شخص باوضو ہوتا ہے اور نہ قبلہ رخ۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سجدہ تلاوت بغیر وضو کے ہی کر لیتے تھے۔

(بخاري، سجود القران، سجود المسلمين ......)

امام شعبی رحمہ اللہ کا موقف ہے کہ جو بے وضو شخص آیت سجدہ سنے وہ سجدہ کرے، خواہ جس سمت بھی اس کا چہرہ ہو۔ (المغنی ۲/۱۷۵)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

جب وضو کرنا مشکل ہو تو اس روایت سے بغیر وضو کے سجدہ تلاوت کرنے کے جواز پر استدلال کیا گیا ہے۔(فتح الباری)

اس سے معلوم ہوتا ہے اگر وضو کرنے میں مشقت نہ ہو تو سجدہ تلاوت کے لیے وضو کرنا افضل ہے۔ بلکہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

سجدہ تلاوت کے لیے وہی شرط عائد کی جائے جو نفل نماز کے لیے لگائی جاتی ہے۔یعنی حدث اور نجاست سے طہارت، ستر ڈھانپنا، قبلہ رخ ہونا اور نیت کرنا۔ اس میں ہمیں کسی اختلاف کا علم نہیں سوائے اس روایت کے جو عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حائضہ اگر آیتِ سجدہ سنے تو (صرف) اپنے سر سے اشارہ کر دے۔(المغنی ۲/۱۷۵)

مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ بھی سجدہ تلاوت کے لیے انہی شرائط کے قائل ہیں۔
(تحفۃ الاحوذی ۲/۲۱۹)

امام زہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

سجدہ تلاوت کے لیے طہارت ضروری ہے۔ اگر کوئی سفر کی حالت میں نہ ہو بلکہ گھر پر ہو تو سجدہ قبلہ رو ہو کر کیا جائے اور سواری پر قبلہ رخ ہونا ضروری نہیں۔ جدھر بھی رخ ہو سجدہ کر لینا چاہیے۔(بخاری ، سجود القرآن ، من رأى ان الله عزو جل لم يوجب السجود)

خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ سجدہ تلاوت کے لیے باوضو اور قبلہ رُو ہونا ضروری نہیں تاہم باوضو اور قبلہ رُو ہو کر سجدہ تلاوت کرنا افضل ہے۔ امام مسجدِ نبوی ابوبکر جابر جزائری لکھتے ہیں:

اس میں زیادہ ثواب ہے کہ سجدہ کرنے والا باوضو ہو اور قبلہ رخ ہو کر سجدہ کرے۔
(منهاج المسلم ، ص: ۳۸۵)

سجدۂ تلاوت کرتے وقت تکبیر پڑھنی چاہیے یا نہیں؟

سوال سجدہ تلاوت کرتے وقت تکبیر پڑھنی چاہیے یا نہیں؟

جواب نماز میں سجدہ کرتے اور اٹھتے وقت نبی اکرم ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ ﷺ جھکتے وقت اور اوپر اٹھتے وقت اللہ اکبر کہتے تھے، جب سجدہ سے سر اٹھاتے تو بھی تکبیر

کہتے تھے۔ (ترمذی ، الصلوۃ، ما جاء فی التکبیر عند الرکوع و السجود، ح:۲۵۳)
بعض روایات میں سجدۂ تلاوت کرتے وقت تکبیر کہنے کی بھی صراحت ہے، ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں قرآن سناتے۔ جب آپ آیت سجدہ کے پاس سے گزرتے تو اللہ اکبر کہتے، اور سجدے میں جاتے اور ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سجدہ کرتے تھے۔(ابوداؤد، سجود القرآن، ح:۱۴۱۳)

سجدۂ تلاوت کے لیے ہاتھ باندھنا

سوال بعض لوگ سجدۂ تلاوت کرتے وقت پہلے دونوں ہاتھ اٹھا کر باندھ لیتے ہیں اور پھر سجدہ کرتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے؟

جواب سجدہ تلاوت سے پہلے ہاتھ باندھنے کا ثبوت نہ تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا ہے اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ہی۔

سجدۂ تلاوت اور رفع الیدین

سوال کیا سجدہ تلاوت سے پہلے رفع الیدین کرنا چاہیے؟

جواب شریعتِ اسلامی میں سجدہ تلاوت سے پہلے رفع الیدین کا کوئی ثبوت نہیں۔
بعض علماء نے سجدہ تلاوت سے پہلے کی جانے والی تکبیر کو تکبیر تحریمہ کے قائم مقام قرار دے کر اس موقع پر رفع الیدین کرنے کا موقف اختیار کیا ہے مگر یہ درست نہیں، کیونکہ اگر سجدہ تلاوت کو نماز کے سجدہ پر بھی قیاس کیا جائے تو بھی سجدہ تلاوت سے پہلے رفع الیدین نہیں کرنی چاہیے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سجدوں میں رفع الیدین نہیں کرتے تھے۔ (بخاری:۷۳۸)

سجدۂ تلاوت کی دعائیں

سوال اکثر عوام الناس سجدۂ تلاوت میں سبحان ربی الاعلی پڑھتے ہیں۔ کیا سجدۂ تلاوت میں یہی تسبیح تین بار پڑھی جائے یا سجدہ تلاوت کی مخصوص دعا پڑھی جائے؟

جواب سجدہ تلاوت کی مخصوص دعائیں اگر یاد نہ ہوں تو سجدہ تلاوت کو سجدہ نماز پر

قیاس کرتے ہوئے سبحان ربی الاعلی پڑھا جاسکتا ہے۔مگر سجدہ تلاوت کی دعا کے بارے میں ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم رات کو سجدۂ تلاوت میں یہ دعا تکرار سے پڑھا کرتے تھے:

((سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ خَلَقَهُ، وَشَقَّ سَمْعَهُ، وَ بَصَرَهُ، بِحَوْلِهِ وَ قُوَّتِهِ))

(ابوداوٗد، سجود القرآن، ما یقول اذا سجد، ح:۱۴۱۴؛ صحیح ابوداوٗد از علامہ البانی: ۱۲۵۵؛ ترمذی، السفر، مایقول فی سجود القرآن، ح:۵۸۰)

”میرا چہرہ اس ہستی کے لیے سجدہ ریز ہے جس نے اسے پیدا کیا اور اپنی طاقت و قوت سے اس کے کان اور آنکھیں بنائیں۔“

بعض احادیث میں اس دعا کے بعد ((فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ))(حاکم ۲۲۰/۱) کے الفاظ بھی ہیں۔ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

”اللہ جو بہترین تخلیق کرنے والا ہے بہت بابرکت ہے۔“

سجدۂ تلاوت کی ایک اور دعا بھی احادیث سے ملتی ہے۔ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر آپ سے عرض کرتا ہے: مَیں نے رات کو خواب دیکھا گویا مَیں ایک درخت کی طرف منہ کرکے نماز پڑھ رہا ہوں۔مَیں نے جب سجدہ تلاوت کیا تو درخت نے بھی میرے سجدے کے ساتھ سجدہ کیا۔مَیں نے سنا کہ وہ درخت یہ پڑھ رہا تھا:

((اَللّٰهُمَّ اكْتُبْ لِيْ بِهَا عِنْدَكَ اَجْراً وَضَعْ عَنِّيْ بِهَا وِزْراً وَاجْعَلْهَا عِنْدَكَ ذُخْراً وَ تَقَبَّلْهَا مِنِّيْ كَمَا تَقَبَّلْتَهَا مِنْ عَبْدِكَ دَاوٗدَ))

”اللہ! اس سجدہ کی وجہ سے (میرے لیے) اپنے پاس اجر لکھ دے اور اس کے سبب مجھ سے گناہوں کا بوجھ اتار دے، اس (سجدے) کو میرے لیے اپنے پاس ذخیرہ بنادے۔اس سجدے کو میری طرف سے قبول کرلے جیسے تُو نے اپنے بندے داؤد سے قبول کیا۔“

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب آیت سجدۂ تلاوت کی تو مَیں نے آپ کو سجدہ میں وہی دعا پڑھتے سنا جو اُس شخص (ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ) نے درخت کی کہی ہوئی

بیان کی تھی۔

(ترمذی، السفر، ما جاء مایقول فی سجود القران، ح:۵۷۹؛ ابن ماجة:۱۰۵۳، ابن ماجہ میں الفاظ مختصر اور قدرے مختلف ہیں۔)

اس دعا کو چونکہ اللہ کے رسول ﷺ نے بھی پڑھا تھا لہٰذا اس کا مسنون ہونا ثابت ہوا۔

نوٹ: اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جمادات (درخت وغیرہ) بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہم اس تسبیح کا احساس نہیں رکھتے اور نہ ہم اس تسبیح کو سمجھتے ہیں۔

(دیکھیے ۱۷/بنی اسراء یل: ۴۴؛ ۲۲/الحج: ۱۸؛ ۵۷/الحدید:۱؛ ۵۹/الحشر:۱؛ ۶۱/الصف:۱؛ ۶۲/الجمعة:۱؛ ۶۴/التغابن:۱)

سجدۂ تلاوت کے بعد سلام

سوال سجدۂ تلاوت کرنے کے بعد بعض لوگ دونوں طرف سلام پھیرتے ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب حالت نماز میں اگر آیت سجدہ تلاوت کی گئی ہو تو اس وقت سلام پھیرنا جائز نہیں کیونکہ اس سے نماز منقطع ہو جاتی ہے۔ خارج از نماز سجدہ تلاوت کرنے کے بعد بھی سلام پھیرنا ثابت نہیں۔ (البتہ حنبلیہ اور شافعیہ کے نزدیک سجدہ کے بعد بیٹھ کر سلام پھیرنا مستحب ہے۔) (الفقه علی مذاهب الاربعة ۱/ ۴۶۸)

تمام سجدے جمع کر کے ادا کرنا؟

سوال مَیں نے اعتکاف کے دوران میں مکمل قرآن مجید کی تلاوت کی ہے، مگر کوئی بھی سجدۂ تلاوت نہیں کیا۔ کیا اب تمام سجدے اکٹھے کر سکتی ہوں؟

جواب سجدۂ تلاوت حالت نماز میں تو اسی وقت ادا کیا جانا مسنون ہے۔ تاہم خارج از نماز سجدۂ تلاوت کو مؤخر کیا جا سکتا ہے۔ نبی ﷺ کے بعض مواقع سجدہ تلاوت نہ کرنے کو بعض علماء نے اس کے عدم وجوب اور بعض نے اسے مؤخر کرنے پر محمول کیا ہے۔ مگر تمام سجدوں کو جمع کر لینا خلافِ سنت ہے۔

نمازِ فجر اور نمازِ عصر کے بعد سجدۂ تلاوت؟

سوال کیا نمازِ فجر اور نمازِ عصر کے بعد سجدۂ تلاوت کرنا جائز ہے؟

جواب سورج کے طلوع وغروب اور زوال کے وقت کسی قسم کا سجدہ کرنا یا نماز شروع کرنا درست نہیں۔ان اوقات کے علاوہ کسی بھی وقت سجدۂ تلاوت کیا جاسکتا ہے۔نمازِ فجر کے بعد فجر کی سنتیں ادا کرنے کا ثبوت حدیث تقریری سے ملتا ہے۔عصر کی نماز کے بعد قضا نماز ادا کی جاسکتی ہے۔اسی طرح سببی نمازیں مثلاً تحیۃ المسجد،تحیۃ الوضوء،نمازِ جنازہ،سورج گرہن، چاند گرہن کی نماز وغیرہ ادا کی جاسکتی ہے۔اسی بنا پر سجدۂ تلاوت بعد از نمازِ فجر اور بعد از نمازِ عصر بھی کیا جاسکتا ہے۔تاہم سببی نمازوں اور قضا نمازوں کے علاوہ ان اوقات میں نفل نماز پڑھنا ممنوع ہے۔

دورانِ خطبہ سجدۂ تلاوت؟

سوال رمضان المبارک کی انتیسویں رات کو ایک خطیب نے وعظ کرتے ہوئے سورۃ الانشقاق کی آیت سجدہ تلاوت کی اور انہوں نے منبر سے اتر کر سجدہ کیا۔کیا تقریر منقطع کرکے اس طرح سجدہ تلاوت کرنا درست ہے جبکہ سامعین اس کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں ہوتے؟

جواب خطیب صاحب کا عمل سنت کے عین مطابق ہے۔سامعین کے ذہنی طور پر تیار ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ابوسعید خدری سے روایت ہے،انہوں نے بیان کیا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے منبر پر سورۃ صٓ کی تلاوت کی،جب آیتِ سجدہ پر پہنچے تو نیچے اتر کر سجدہ کیا اور آپ کے ساتھ لوگوں نے بھی سجدہ کیا۔پھر ایک دوسرا موقع آیا اور آپ نے اسی کی تلاوت کی،جب آپ سجدے کی آیت پر پہنچے تو لوگ سجدے کے لیے تیار ہوگئے تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

"یہ ایک نبی (داؤد علیہ السلام) کی توبہ کا ذکر ہے لیکن میں نے تمہیں دیکھا ہے کہ تم سجدہ کرنا چاہتے ہو۔چنانچہ آپ نے اتر کر سجدہ کیا اور لوگوں نے بھی سجدہ کیا۔"

(ابوداؤد، سجود القرآن، السجود فی ص، ح:۱۴۱۰؛دارمی،ح: ١٤٧٤؛حاکم ۱/ ۲۸۴ - ۲۸۵)

دوسرے خلیفہ راشد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بھی خطبۂ جمعہ کے دوران منبر سے اتر کر سجدہ کیا۔

ربیعہ بیان کرتے ہیں:

''عمر رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے دن منبر پر سورۂ نحل پڑھی جب سجدہ کی آیت ﴿ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ...... ﴾ ۱۶/النحل: ۴۹۔۵۰) تک پہنچے تو منبر سے اترے اور سجدہ کیا تو لوگوں نے بھی ان کے ساتھ سجدہ کیا۔ دوسرے جمعہ کو پھر یہی سورت پڑھی، جب سجدہ کی آیت پر پہنچے تو فرمانے لگے:

لوگو! ہم سجدہ کی آیت پڑھتے چلے جاتے ہیں پھر جو کوئی سجدہ کرے اس نے اچھا کیا اور جو کوئی نہ کرے تو اس پر کچھ گناہ نہیں اور عمر رضی اللہ عنہ نے سجدہ نہیں کیا اور نافع نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ اللہ نے سجدۂ تلاوت فرض نہیں کیا، ہماری خوشی پر رکھا۔''

(بخاری، سجود القرآن، من رأی ان اللہ عزوجل لم یوجب السجود، ح: ۱۰۷۷)

معلوم ہوا کہ دوران خطبہ سجدہ تلاوت کرنے اور نہ کرنے کا اختیار ہے۔

مقتدی اگر سجدہ والی آیت تلاوت کرے تو؟

سوال اگر امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہوئے مَیں سجدے والی سورت تلاوت کروں تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟

جواب آپ سجدہ نہ کریں کیونکہ امام کی متابعت واجب ہے جبکہ سجدہ تلاوت مسنون ہے۔ مقتدی کے لیے جائز نہیں کہ وہ (اس صورتِ حال میں) سجدہ کرے۔ اگر اس نے یہ جانتے ہوئے کہ ایسا کرنا جائز نہیں، سجدہ کیا تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی۔

جب امام کی پیروی کی وجہ سے مقتدی سے ایک واجب عمل ساقط ہو جاتا ہے تو سنت تو بدرجہ اولیٰ ساقط ہو جاتی ہے۔ جو واجب امام کی پیروی میں مقتدی سے ساقط ہو جاتا ہے وہ پہلا تشہد ہے جب امام اسے بھول کر چھوڑ دے...... (فتویٰ از عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز، مفتی اعظم سعودی عرب، الدعوۃ، سعودی عرب، مارچ ۱۹۹۵ء)

سجدۂ تلاوت کا متبادل؟

سوال جن سورتوں کے آخر میں سجدۂ تلاوت ہے ان کی تلاوت کے وقت

سجدۂ تلاوت کب کیا جائے؟ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ رکوع ہی سجدۂ تلاوت کا قائم مقام ہو جائے گا۔لہٰذا رکوع سے قبل سجدہ نہ کیا جائے، بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ رکوع میں جاتے وقت سجدۂ تلاوت کی نیت کر لی جائے اور رکوع کے بعد نماز کے سجدے میں بھی سجدۂ تلاوت ادا ہو جاتا ہے اور اس صورت میں علیحدہ سجدۂ تلاوت کی ضرورت نہیں! کیا اس طرح سجدۂ تلاوت ادا ہو جاتا ہے؟

جواب سجدۂ تلاوت کا شریعت میں کوئی متبادل عمل نہیں بتایا گیا نہ رکوع اور نہ سجدۂ نماز۔ حالت نماز میں آیت سجدہ کی تلاوت کے وقت رکوع میں جانے کی بجائے سجدہ تلاوت کرنا سنت ہے۔ سجدۂ نماز میں کسی اور سجدے کی نیت کرنا درست نہیں کیونکہ اس کی نیت تو پہلے ہو چکی ہے۔ مزید برآں اگر ایک سجدے کو سجدۂ تلاوت قرار دے دیا جائے تو ایک رکعت میں ایک سجدہ کرنے سے نماز نہیں ہوگی۔ یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رکھنی چاہیے کہ نماز کے سجدے اور تلاوت کے سجدے کی تسبیح و دعا میں بھی فرق ہے۔

سجدۂ نماز ہمیشہ رکوع کے بعد جبکہ سجدۂ تلاوت ہمیشہ رکوع سے پہلے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس کرنا سنت مطہرہ کے خلاف ہے۔

سجدہ تلاوت کرنے کے بعد واپس قیام والی حالت میں آ جائیں اور پھر رکوع کریں۔ یا حالت قیام میں پہنچ کر کسی سورت کی کچھ آیات تلاوت کرنے کے بعد رکوع کر لیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سورۃ النجم کی تلاوت کی (جس کے آخر میں سجدہ ہے۔) آپ نے سجدہ کیا پھر کھڑے ہو گئے، انہوں نے ایک اور سورت پڑھی (اور پھر رکوع کیا۔)

(مؤطا، القرآن، ماجاء فی سجود القرآن، ح:٤٨١)

آیت سجدہ کی تلاوت چھوڑ دینا تا کہ سجدہ نہ کرنا پڑے؟

سوال بعض لوگ آیت سجدہ کی تلاوت چھوڑ دیتے ہیں تا کہ سجدہ نہ کرنا پڑے، کیا یہ درست ہے؟

جواب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ، تابعین اور ائمہ دین سے ایسا کرنا منقول نہیں۔ لہٰذا

ایسا کرنا مسلمانوں کے طریقے کے خلاف ہے۔ اسی لیے بہت سے اسلاف نے ایسا کرنے کو ناپسند کیا ہے۔

اسی طرح صرف آیات سجدہ کی تلاوت کرنا تاکہ سجدہ کیا جائے، یہ بھی سلف صالحین کے طریقے کے خلاف ہے۔ المغنی ویلیہ الشرح الکبیر (۳۵۶/۲) میں فصل : ویکرہ اختصار السجود ملاحظہ کرلیں۔

سری نمازوں میں امام کا سجدہ تلاوت؟

سوال سری نمازوں، ظہر وعصر، میں کیا امام کے لیے آیات سجدہ کی تلاوت کرنا جائز ہے؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے مقتدیوں کو مغالطہ لگ سکتا ہے، جن لوگوں کی نظر امام پر نہیں پڑتی ہوگی وہ رکوع میں جبکہ امام سجدے میں چلا جائے گا۔ کچھ علماء کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر امام آیتِ سجدہ سری نماز میں تلاوت کرے تو وہ سجدہ تلاوت نہ کرے!

جواب سری نمازوں میں قرآن مجید کی کوئی بھی سورت تلاوت کی جاسکتی ہے اور اگر دورانِ تلاوت سجدہ آجائے تو امام سجدہ کرے۔ مقتدیوں نے اگرچہ آیت نہیں سنی ہوتی تاہم امام کی اقتدا میں وہ بھی سجدہ تلاوت کریں گے۔ بعض احادیث کے عمومی حکم سے یہی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ جب امام سجدہ کرے تم بھی سجدہ کرو۔ حالت نماز میں آیت سجدہ پڑھنے پر سجدہ تلاوت نہ کرنا نبی اکرم ﷺ سے ثابت نہیں۔ نماز خواہ جہری ہو یا سری سجدۂ تلاوت کا حکم مختلف نہیں ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ظہر کی نماز میں سجدہ تلاوت کیا، پھر کھڑے ہوگئے، پھر رکوع کیا تو ہمیں معلوم ہوا کہ آپ نے تنزیل السجدۃ (سورۃ السجدۃ) تلاوت کی تھی۔

(ابو داوٗد، الصلاۃ، قدر القراءۃ فی صلاۃ الظھر و العصر، ح: ۸۰۷؛ مسند احمد ۲/ ۸۳)

ملحوظہ: اس حدیث کی سند کو کئی علماء نے ضعیف قرار دیا ہے تاہم امام حاکم رحمہ اللہ (۲۲۱/۱) نے اسے شیخین (بخاری و مسلم رحمہما اللہ) کی شرائط پر صحیح قرار دیا ہے اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے امام حاکم سے موافقت کی ہے۔

ظہر وعصر میں نبی ﷺ کی قراءت کی مقدار کے اندازے کو اِسی سورت کے حوالے

سے بتایا گیا ہے، ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ ہم ظہر و عصر میں اللہ کے رسول ﷺ کے قیام کا اندازہ کرتے تھے تو معلوم ہوا کہ آپ ظہر کی پہلی دو رکعت میں اتنی دیر قیام کرتے جتنی دیر الم تنزیل السجدۃ پڑھی جائے اور پچھلی دو رکعت میں اس کا آدھا اور عصر کی پہلی دو رکعت میں ظہر کی پچھلی دو رکعت کے برابر اور عصر کی پچھلی دو رکعت میں اس کا آدھا۔

(مسلم، الصلاۃ، القراء ۃ فی الظھر و العصر، ح:۴۵۲؛ابو داؤد، الصلاۃ، تخفیف الاٰخریین، ح:۸۰۴)

یہ اشکال کہ مقتدیوں کو رکوع کا مغالطہ لگ سکتا ہے کیونکہ انہوں نے آیت سجدہ کی تلاوت نہیں سنی ہوتی، کوئی حیثیت نہیں رکھتا، کیونکہ یہ مغالطہ تو جہری نمازوں میں بھی لگ سکتا ہے، اسی لیے تو عجمیوں کو بالخصوص پہلے بتانا پڑتا ہے کہ فلاں رکعت میں سجدۂ تلاوت ہوگا!

مزید برآں سری نمازوں میں بھی نبی ﷺ کوئی کوئی آیت بلند آواز سے پڑھ لیتے تھے۔ ابو قتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ ظہر و عصر کی پہلی دو رکعت میں سورۃ الفاتحہ اور کوئی اور سورت پڑھتے تھے، کبھی کبھی آپ کوئی آیت ہمیں سنا بھی دیا کرتے تھے۔

(بخاری، الاذان، اذا اسمع الامام الآیۃ، ح: ۷۷۸)

یہ ظاہر ہے کہ بلند آواز سے پڑھی جانے والی آیت سجدۂ تلاوت والی آیت بھی ہوسکتی ہے۔

سجدہ تلاوت دوسرے شخص کی طرف سے ادا کرنا؟

سوال سجدۂ تلاوت کسی دوسرے شخص کی طرف سے ادا کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

جواب سجدۂ تلاوت ان لوگوں کی ذمہ داری ہوتی ہے جو خود قرآن کی تلاوت کرتے یا سنتے ہیں، کوئی دوسرا شخص کسی کی جگہ سجدۂ تلاوت ادا نہیں کرسکتا۔ نماز اور رکوع و سجود وغیرہ میں نیابت ثابت نہیں۔

سجودِ تلاوت کی تعداد اور مقامات؟

سوال قرآن مجید میں تلاوت کے کتنے سجدے ہیں؟ کچھ لوگ ۱۴ جبکہ بعض ۱۵ سجدوں کے قائل ہیں۔

جواب صحیح موقف کے مطابق سجودِ تلاوت کی کل تعداد پندرہ ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا بھی یہی موقف ہے۔ عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے انہیں قرآن میں پندرہ سجدے پڑھائے، جن میں سے تین مفصل سورتوں میں جبکہ دو سجدے سورۃ الحج میں ہیں۔

(ابو داوٗد، سجود القرآن، تفریع ابواب السجود و کم سجدة فی القرآن، ح:۱۴۰۱؛ ابن ماجة، اقامة الصلوات، عدد سجود القرآن، ح:۱۰۵۷)

نوٹ: مفصل سورتوں سے مراد سورۃ الحجرات سے لے کر سورۃ الناس تک کی سورتیں ہیں۔ ان میں سورۃ النجم، الانشقاق اور العلق میں سجدۂ تلاوت ہے۔

بعض محققین نے اس حدیث کو ضعیف جبکہ امام نووی اور منذری نے حسن قرار دیا ہے۔

احناف کے نزدیک سجودِ تلاوت کی تعداد چودہ ہے۔ وہ سورۃ الحج کے دوسرے سجدے کے قائل نہیں۔ جبکہ عقبہ بن عامر فرماتے ہیں: میں نے اللہ کے رسول سے پوچھا: اللہ کے رسول ﷺ! کیا سورۃ الحج میں دو سجدے ہیں؟ آپ نے فرمایا:

((نَعَمْ، وَمَنْ لَّمْ یَسْجُدْهُمَا فَلَایَقْرَأْهُمَا))

''ہاں! جو یہ دو سجدے نہ کرے وہ ان کی تلاوت ہی نہ کرے۔''

(ابو داوٗد، سجود القرآن، تفریع ابواب السجود و کم سجدة فی القرآن، ح:۱۴۰۲؛ ترمذی، الصلاة، ماجاء فی السجدة فی الحج، ح:۵۷۸)

یہ حدیث حسن درجے کی ہے۔ شیخ البانی رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کو تعلیقات المشکاۃ (الصلاۃ، ح:۱۰۳۰) میں صحیح قرار دیا ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ سورۃ الحج (آیت:۱۸) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث قوی ہیں لیکن امام صاحب رحمہ اللہ کا یہ قول قابلِ غور ہے کیونکہ اس کے راوی ابن لہیعہ رحمہ اللہ نے اپنی سماعت کی اس میں تصریح کر دی ہے اور اُن پر بڑی جرح کی گئی ہے۔ جو اِس سے اٹھ جاتی ہے۔ ابوداؤد میں نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ سورۃ الحج کو قرآن کی اور سورتوں پر یہ فضیلت دی گئی ہے کہ اس میں دو سجدے ہیں۔ امام ابوداؤد رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس سند سے تو یہ حدیث مستند نہیں لیکن اور سند سے یہ مسند

بھی بیان کی گئی ہے مگر صحیح نہیں۔ مروی ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے حدیبیہ میں اس سورت کی تلاوت کی اور دو بار سجدہ کیا اور فرمایا: اسے ان دو سجدوں سے فضیلت دی گئی ہے۔ (ابو بکر بن عدی) عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے قرآن میں پندرہ سجدے پڑھائے، تین مفصل سورتوں میں دو سورۃ الحج میں۔ (ابن ماجۃ ودیگر) پس یہ سب روایتیں اس بات کو پوری طرح مضبوط کر دیتی ہیں۔'' (تفسیر ابن کثیر)

صحابہ کے عمل سے بھی سورۃ الحج میں دو سجدوں کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔ ایک مصری آدمی نے بتایا کہ عمر بن خطاب نے سورۃ الحج کی تلاوت کی تو اس میں دو سجدے کیے، پھر فرمایا: اس سورت کو دو سجدوں سے فضیلت عطا کی گئی ہے۔

(مؤطا، القرآن، ماجاء فی سجود القرآن، ح:۴۷۹)

عبداللہ بن دینار فرماتے ہیں: میں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ سورۃ الحج میں دو سجدے کرتے تھے۔ (ایضا، ح:۴۸۰)

ان دلائل کے ہوتے ہوئے بعض لوگوں کا یہ کہنا کوئی حیثیت نہیں رکھتا کہ سورۃ الحج (آیت:۷۷) میں خاص طور پر سجدہ کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ عام نیکیوں کا حکم دیا گیا ہے، نیکیوں میں ایک نیکی سجدہ بھی ہے۔ نیز یہ استدلال بھی حقیقت سے دُور ہے کہ سورۃ الحج میں دوسرا سجدہ سجدہ تلاوت نہیں کیونکہ اس آیت میں رکوع اور سجدہ دونوں کا حکم دیا گیا ہے، اس لیے آیت میں گویا نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

سجدہ یقیناً نیکی ہے مگر سجدہ تلاوت کر لینے سے اس نیکی پر کیا حرف آتا ہے؟ اسی طرح اگر بالفرض نماز پڑھنے کا ہی حکم دیا گیا ہے تو اس سے سجدۂ تلاوت کی نفی کیسے نکل آئی؟ سورۃ الحج کے دوسرے سجدے کے منکرین کی مذکورہ بالا قیاس آرائیاں بالکل قابل توجہ نہیں ہیں۔ اس لیے کہ جوبات سورۃ الحج کے دوسرے مقام سجدہ تلاوت کے بارے میں کہی گئی ہے وہی سورۃ الاعراف (آیت:۲۰۶) اور سورۃ النجم (آیت:۶۲) کے مقاماتِ سجدہ کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ کیونکہ ان مقامات پر بھی سجدہ کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس سب کچھ کے باوجود احناف سورۃ ص کے سجدے کے قائل ہیں۔ آخر سورۃ الحج کا

دوسرا سجدہ تسلیم کرنے میں کیا امر مانع ہے؟

شوافع کے نزدیک بھی قرآن مجید میں چودہ سجدے ہیں۔ وہ سورۃ الحج کے دوسجدوں کے تو قائل ہیں مگر سورۃ صٓ کے سجدے کے قائل نہیں حالانکہ سورت صٓ کی تلاوت کے دوران نبی اکرم ﷺ نے یہاں سجدہ تلاوت کیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

سورۃ صٓ کا سجدہ تاکیدی سجدوں میں سے نہیں ہے البتہ میں نے نبی ﷺ کو اس میں سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ (بخاری، سجود القرآن، السجود فی ص، ح: ۱۰۶۹)

''تاکیدی سجدوں میں نہیں ہے'' کا مفہوم یہ ہے یہاں آیت سجدہ میں سجدہ کرنے کی تلقین نہیں ہے بلکہ یہاں داؤد علیہ السلام کی توبہ کا تذکرہ ہے۔ اللہ نے ان کی توبہ قبول کی۔ انہی کی سنت پر چلتے ہوئے ہم بھی شکر کے لیے یہ سجدہ کرتے ہیں۔ جب نبی آخر الزمان ﷺ نے یہ سجدہ کیا تو آپ کی اتباع میں ہمارے لیے بھی یہ سجدہ کرنا مسنون قرار پایا۔ ایک لمبی حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے برسر منبر سورۃ صٓ کی تلاوت کی، آیت سجدہ پر پہنچے تو آپ نے منبر سے اتر کر سجدہ تلاوت ادا کیا۔

(ابوداوٗد، ایضاً، ح:۱۴۱۰؛ ابن خزیمۃ، ح: ۱۴۵۵، ۱۷۹۵)

مالکیہ کے نزدیک سورۃ النجم، الانشقاق اور العلق کے سجدے منسوخ ہیں، اس طرح ان کے نزدیک سجودِ تلاوت کی تعداد گیارہ رہ جاتی ہے مگر یہ موقف درست نہیں کیونکہ اس کی بنیاد ایک ضعیف روایت پر رکھی گئی ہے۔ (دیکھیے ابوداؤد:۱۴۰۳)

نیز صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے ان سورتوں میں تلاوت کے سجدے کئے ہیں۔ (مسلم، ح:۵۷۶؛ ابوداوٗد: ۱۴۰۷)

سورۃ النجم کے سجدے کے بارے میں عبداللہ (بن مسعود) رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''نبی ﷺ نے النجم کی تلاوت کی اور اس میں سجدہ کیا۔ اس وقت قوم کا کوئی فرد (مسلمان یا کافر) بھی ایسا نہ تھا جس نے سجدہ نہ کیا ہو۔ البتہ ایک شخص نے ہاتھ میں کنکری یا مٹی لے کر اپنے چہرہ تک اٹھائی اور کہا کہ میرے لیے یہی کافی ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بعد میں میں نے دیکھا کہ وہ کفر کی حالت ہی میں قتل ہوا۔ (یہ امیہ بن خلف تھا۔)

(بخاری، سجود القرآن، سجدة النجم، ح:۱۰۷۰؛ مسلم، المساجد، سجود التلاوة، ح: ۵۷۶، ابوداؤد، سجود القرآن، من رأى فيها سجودا، ح:۱۴۰۶)

سورۃ الانشقاق کے سجدے کے بارے میں ابورافع بیان کرتے ہیں:

''مَیں نے ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ کے ساتھ نمازِ عشاء پڑھی۔ آپ نے ﴿ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ﴾ کی تلاوت کی اور سجدہ کیا۔ مَیں نے عرض کیا کہ آپ نے یہ کیا کیا؟ انہوں نے اس کا جواب دیا: مَیں نے اس میں ابوالقاسم ﷺ کی اقتداء میں سجدہ کیا تھا اور ہمیشہ سجدہ کرتا رہوں گا تاآنکہ آپ سے جاملوں۔''

(بخاری، سجود القرآن، من قرأ السجدة فی الصلاة فسجد بها، ح:۱۰۷۸، نیز دیکھیے: ح: ۱۰۷۴؛ مسلم، ایضاً، ح:۵۷۸؛ ابوداؤد، سجود القرآن، سجود فی اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ، واِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ، ح: ۱۴۰۸؛ ترمذی، السفر، فی السجدة فی اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ و اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ، ح:۵۷۳؛ نسائی: ۹۶۵؛ ابن ماجة، ح:۱۰۵۸)

بعض احادیث میں سورۃ الانشقاق کے سجدے کے ساتھ سورۃ العلق کے سجدے کا بھی تذکرہ ہوا ہے۔ ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

ہم نے اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ سورۃ ﴿ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ﴾ اور ﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ﴾ میں سجدہ کیا۔

(مسلم، المساجد، سجود التلاوة، ح: ۵۷۸؛ ابوداؤد، ح:۱۴۰۷؛ ترمذی، ح: ۵۷۳؛ نسائی، ح:۹۶۶؛ ابن ماجة، ح: ۱۰۵۸)

یہ احادیث ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں اور ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ فتح خیبر کے موقع پر ۷ھ میں مسلمان ہوئے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نبی ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے آخری زمانے کا عمل ہے۔ ان سجدوں کو منسوخ کہنا درست نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ احادیث سے تلاوت کے پندرہ سجدوں کا ثبوت ملتا ہے۔

ان پندرہ سجدوں کے مقامات درج ذیل ہیں:

① ﴿ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ۩ ﴾ (۷/الاعراف:۲۰۶، آخری آیت)

② ﴿ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۩ ﴾ (۱۳/الرعد:۱۵)

③ ﴿ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ﴾ (۱۶/النحل:۵۰)

④ ﴿ وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا ﴾ (۱۷/بنی اسرائیل:۱۰۹)

⑤ ﴿ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا ﴾ (۱۹/مریم:۵۸)

⑥ ﴿ إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ ﴾ (۲۲/الحج:۱۸)

⑦ ﴿ وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴾ (۲۲/الحج:۷۷)

⑧ ﴿ أَنَسْجُدُ لِمَا تَأْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُورًا ﴾ (۲۵/الفرقان:۶۰)

⑨ ﴿ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴾ (۲۷/النمل:۲۶)

⑩ ﴿ خَرُّوا سُجَّدًا وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ﴾ (۳۲/السجدۃ:۱۵)

⑪ ﴿ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهُ وَخَرَّ رَاكِعًا وَأَنَابَ ﴾ (۳۸/ص:۲۴)

⑫ ﴿ وَهُمْ لَا يَسْأَمُونَ ﴾ (۴۱/حم السجدۃ:۳۸)

⑬ ﴿ فَاسْجُدُوا لِلَّهِ وَاعْبُدُوا ﴾ (۵۳/النجم:۶۲، آخری آیت)

⑭ ﴿ وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ ﴾ (۸۴/الانشقاق:۲۱)

⑮ ﴿ كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴾ (۹۶/العلق:۱۹، آخری آیت)

ان آیات میں جب درج ذیل الفاظ پڑھ لیے جائیں تو سجدہ لاگو ہو جاتا ہے:

﴿ وَلَهُ يَسْجُدُونَ ﴾ (الاعراف) ﴿ وَلِلَّهِ يَسْجُدُ ﴾ (الرعد) ﴿ وَلِلَّهِ يَسْجُدُ ﴾ (النحل) ﴿ وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ ﴾ (بنی اسرائیل) ﴿ خَرُّوا سُجَّدًا ﴾ (مریم) ﴿ يَسْجُدُ لَهُ ﴾ (الحج) ﴿ وَاسْجُدُوا ﴾ (الحج) ﴿ اسْجُدُوا لِلرَّحْمَٰنِ ﴾ (الفرقان) ﴿ أَلَّا يَسْجُدُوا لِلَّهِ ﴾ (النمل) ﴿ وَهُمْ لَا يَسْأَمُونَ ﴾ (السجدۃ) ﴿ وَخَرَّ رَاكِعًا وَأَنَابَ ﴾ (ص)، ﴿ خَرُّوا سُجَّدًا ﴾ (حم السجدۃ)، ﴿ فَاسْجُدُوا لِلَّهِ ﴾ (النجم)، ﴿ لَا يَسْجُدُونَ ﴾ (الانشقاق) اور ﴿ اسْجُدْ ﴾ (العلق)

سجدۂ شکر کی شرعی حیثیت؟

سوال نماز پڑھنے کے بعد میں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ ہمارے ایک دوست کہنے لگے کہ ایسا کرنا خلافِ سنت ہے۔ کیا ہمارے دوست کی بات درست ہے؟ اگر درست نہیں تو سجدۂ شکر کی شرعی بنیاد کیا ہے؟ اگر سجدۂ شکر کرنا ہو تو اس کا طریقہ کیا ہے؟ نیز یہ بتائیں کہ سجدۂ شکر کے لیے وضو ضروری ہے یا نہیں؟

جواب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا دل سے اعتراف قلبی شکر، زبان سے اظہار واقرار لسانی شکر اور عمل سے اپنے شکر گزار ہونے کا ثبوت فراہم کرنا عملی شکر کہلاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ تمام طریقوں سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کیا کرتے تھے۔ قلبی اور لسانی شکر کے بارے میں أَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ (آپ کی نعمتیں جو مجھ پر ہیں مَیں ان کا آپ کے سامنے اعتراف کرتا ہوں) اور الحمد للہ جیسے الفاظ ماثور دعاؤں میں بکثرت ملتے ہیں۔

عملی شکر کے بارے میں بھی نبی اکرم ﷺ کے کئی فرامین موجود ہیں۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، نبی ﷺ رات کو اس قدر قیام کرتے کہ آپ کے پاؤں پر ورم پڑ جاتے، دریافت کرنے پر فرمایا:

((أَفَلَا أَكُوْنَ عَبْدًا شَكُوْرًا))

(بخاری، التفسیر، تفسیر سورۃ الفتح، ح:۴۸۳۶؛ مسلم، المنافقین، اکثار الاعمال والاجتهاد فی العبادة، ح:۲۸۱۹)

''کیا مَیں (اللہ کا) شکر گزار بندہ نہ بنوں۔''

دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

((أَفَلَا أُحِبَّ أَنْ أَكُوْنَ عَبْدًا شَكُوْرًا))

''کیا مَیں اس بات کو پسند نہ کروں کہ مَیں شکر گزار بندہ بنوں۔''

اپنے آپ کو ((عَبْدًا شَكُوْرًا)) ظاہر کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جب کوئی نعمت حاصل ہو، خوشخبری ملے یا کوئی مصیبت ٹل جائے تو انسان شکر کے طور پر سجدہ کرے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

ان النبی ﷺ اذا اتاہ امر یسرہ او یسربہ خر ساجدا شکرا لله تبارك و تعالی

(ترمذی، السیر، ما جاء فی سجدۃ الشکر، ح:۱۵۷۸؛ ابوداؤد، ح:۲۷۷۴؛ ابن ماجۃ، ح: ۱۳۹۴)

''جب نبی ﷺ کو کوئی خوشی حاصل ہوتی یا کوئی خوشخبری ملتی تو آپ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے سجدے میں گر پڑتے۔''

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے جب نبی اکرم ﷺ کو ہمذان کے داخلِ اسلام ہونے کی خبر بھیجی تو آپ سجدے میں گر گئے، پھر اپنا سر اٹھایا اور فرمایا:

((سَلَامٌ عَلٰی هَمْذَانَ سَلَامٌ عَلٰی هَمْذَانَ))

''ہمذان پر سلام ہو، ہمذان پر سلام ہو۔''

(السنن الکبریٰ از بیہقی ۲/۳۶۹، سند اضعیف ہے۔)

عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: اللہ کے رسول ﷺ باہر نکلے، مَیں بھی آپ کے پیچھے چل پڑا، یہاں تک کہ آپ ایک باغ میں داخل ہو گئے۔ آپ نے اتنا لمبا سجدہ کیا کہ مَیں ڈر گیا کہ کہیں اللہ نے آپ کو فوت ہی نہ کر دیا ہو۔ مَیں آپ کو دیکھنے کے لیے آگے آیا تو آپ نے اپنا سر اٹھا کر فرمایا: عبدالرحمٰن کیا بات ہے؟ تو مَیں نے آپ کو سارے معاملے کے بارے میں بتایا تو آپ نے فرمایا: جبریل علیہ السلام نے مجھے کہا کہ مَیں آپ کو اس بات کی خوشخبری نہ سناؤں کہ اللہ عزوجل نے آپ کے لیے فرمایا ہے:

((مَنْ صَلّٰی عَلَيْكَ صَلَّيْتُ عَلَيْهِ وَمَنْ سَلَّمَ عَلَيْكَ سَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَسَجَدْتُ لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ شُكْرًا)) (مسند احمد ۱/۱۹۱، اس کی سند ضعیف ہے۔)

''جو آپ پر درود پڑھے مَیں اس پر رحمتیں نازل کروں گا اور جو آپ پر سلام پڑھے مَیں اس پر سلامتی بھیجوں گا تو (یہ بات سن کر) مَیں نے بطورِ شکر سجدہ کیا۔''

امام نووی رحمہ اللہ نے ریاض الصالحین میں ایک باب یوں قائم کیا ہے:

باب استحباب سجود الشکر عند حصول نعمة ظاهرة اواندفاع بلية

ظاھرۃ (کسی ظاہری نعمت کے حاصل ہونے یا کسی ظاہری مصیبت کے ٹلنے کے وقت سجدۂ شکر کے مستحب ہونے کا بیان۔)

اس باب کے تحت انہوں نے ایک ضعیف حدیث بیان کی ہے۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکے سے مدینے جانے کی نیت سے نکلے۔ جب ہم عزوراء (جگہ) کے قریب پہنچے تو آپ اپنی سواری سے نیچے اترے اور دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ سے دعا کی پھر آپ سجدے میں گر گئے اور کافی دیر تک سجدے میں رہے پھر کھڑے ہوئے اور اپنے ہاتھ اٹھا کر کچھ دیر دعا کی اور پھر سجدے میں گر پڑے۔ اس طرح آپ نے تین مرتبہ کیا اور فرمایا:

((اِنِّیْ سَاَلْتُ رَبِّیْ وَشَفَعْتُ لِاُمَّتِیْ فَاَعْطَانِیْ ثُلُثَ اُمَّتِیْ فَخَرَرْتُ سَاجِدًا لِرَبِّیْ شُکْرًا، ثُمَّ رَفَعْتُ رَاْسِیْ فَسَاَلْتُ رَبِّیْ لِاُمَّتِیْ فَاَعْطَانِیْ ثُلُثَ اُمَّتِیْ فَخَرَرْتُ سَاجِدًا لِرَبِّیْ شُکْرًا، ثُمَّ رَفَعْتُ رَاْسِیْ فَسَاَلْتُ رَبِّیْ لِاُمَّتِیْ فَاَعْطَانِیْ الثُّلُثَ الْاٰخَرَ فَخَرَرْتُ سَاجِدًا لِرَبِّیْ))

(ابوداؤد، الجہاد، سجود الشکر، ح:۲۷۷۵)

"مَیں نے اپنے رب سے سوال کیا اور اپنی امت کے لیے شفاعت کی تو اللہ نے مجھے میری امت کا تہائی حصہ عطا کیا تو مَیں شکر کے طور پر اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔ پھر مَیں نے اپنا سر اٹھایا اور اپنے رب سے اپنی امت کے لیے سوال کیا تو میرے رب نے میری امت کا ایک تہائی عطا کیا۔ مَیں پھر شکر کے طور پر اپنے رب کے لیے سجدہ میں گر پڑا۔ پھر مَیں نے اپنا سر اٹھایا اور اپنے رب سے اپنی امت کے لیے سوال کیا تو مجھے آخری تہائی بھی عطا کر دیا تو مَیں اپنے رب کے لیے سجدہ ریز ہو گیا۔"

سجدۂ شکر کا ثبوت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی ملتا ہے۔ سعید بن منصور نے ذکر کیا ہے جب ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مسیلمہ (کذاب) کے قتل کی خبر ملی تو انہوں نے سجدہ کیا۔

(السنن الکبری از بیہقی ۲/ ۳۷۱، سند ضعیف ہے۔)

جب علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کے مقتولین میں ذوالثدیۃ (خارجی) کو بھی پایا تو سجدہ ادا

کیا۔ (مسند احمد ۱/ ۱۰۸)

اسی طرح کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا واقعہ صحیحین میں موجود ہے کہ جب ان کی توبہ قبول ہوئی تو وہ خوشخبری سن کر سجدے میں گر پڑے۔

(بخاري، المغازي، حديث كعب بن مالك، ح:۴۴۱۸؛ مسلم، التوبة، توبة كعب بن مالك رضی اللہ عنہ، ح:۲۷۶۹)

سجدۂ شکر سے متعلقہ احادیث دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لیے کوئی الگ خاص طریقہ بیان نہیں کیا گیا۔ سجدۂ شکر کی ہیئت بھی عام سجدے جیسی ہی ہوتی ہے۔ البتہ اس کے لیے باوضو ہونا ضروری نہیں کیونکہ سجدۂ شکر پر نماز کے احکام لاگو نہیں ہوتے۔ فضیلۃ الشیخ عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن جبرین سے سوال کیا گیا کہ کیا سجدۂ شکر کے لیے خاص دعا کرنی چاہیے اور کیا اس کے لیے وضو کرنا ضروری ہے؟ تو انہوں نے فرمایا:

سجدۂ شکر شریعت سے ثابت ہے جب انسان کو اُس کی مطلوب چیز مل جائے جس کی وہ تمنا کرتا تھا اور اس کے لیے اللہ جل وعلا سے دعا کرتا تھا تو اللہ تعالیٰ کے شکر اور (اُس کی) حمد کے لیے وہ سجدہ کرے گا کیونکہ اس پر اللہ تعالیٰ نے احسان کیا اور اسے خیر عطا کی اور بندہ کی طرف سے اس بات کا اقرار ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور فضل ہوا ہے۔ سجدہ میں سبحان ربی العظیم پڑھنے کے بعد یہ کلمات پڑھے:

((اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا يَنْبَغِيْ لِجَلَالِ وَجْهِكَ وَعَظِيْمِ سُلْطَانِكَ))

سجدۂ شکر کے لیے وضو شرط نہیں کیونکہ اس کے لیے احکام نماز نہیں ہیں۔

(مجلّہ الفرقان، کویت، عدد: ۳۶۲، ۲۶ ستمبر ۲۰۰۵ء)

امام شوکانی فرماتے ہیں:

سجدۂ شکر نماز سے الگ سجدہ ہے، نماز کے اندر صحیح نہیں ہے۔ (نیل الاوطار)

سجدۂ شکر معمول کا سجدہ نہیں۔ اس کے لیے کوئی وقت مقرر کرنا بھی درست نہیں۔

احناف کے نزدیک نماز کے فوراً بعد سجدۂ شکر کرنا بھی پسندیدہ نہیں ہے کیونکہ اس سے یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ یہ سجدہ نماز کا ہی حصہ ہے۔ (الفقه على المذاهب الاربعة ۱/ ۴۷۱)

نیز ہر نماز کے بعد سجدۂ شکر کرنا سنت نبوی سے ثابت نہیں۔

اوپر مت دیکھیں بلکہ نیچے دیکھیں

سوال حدیث نبوی کی روشنی میں اپنے سے اوپر والے (دنیوی لحاظ سے) کی طرف نظر نہیں رکھنی چاہیے بلکہ اپنے سے کمتر (دنیوی اعتبار سے) کی طرف دیکھنا چاہیے۔اس حدیث کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟اگر چند طلبہ مثلاً شعبہ کیمیکل میں اچھے نمبر حاصل کرتے ہیں تو باقی طلبہ اپنے سے زیادہ نمبر لینے والے طلباء کی طرف نظر رکھیں یا اپنے سے کم نمبر حاصل کرنے والے طلبہ کی طرف؟مذکورہ حدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب اس حدیث میں صبر،شکر اور قناعت کی زندگی بسر کرنے کا ایک سنہری اصول بیان کیا گیا ہے۔اس حدیث کا مکمل متن یہ ہے:

((اُنْظُرُوْا اِلٰی مَنْ هُوَ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَاتَنْظُرُوْا اِلٰی مَنْ هُوَ فَوْقَكُمْ فَهُوَ اَجْدَرُ اَنْ لَّاتَزْدَرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ))

(مسلم ، الزهد ، الدنیا سجن المؤمن ...... ح:۲۹۶۳)

”اس آدمی کی طرف دیکھو جو تم سے کمتر ہے اور اس شخص کی طرف نہ دیکھو جو تم سے اونچا ہے۔یہ اس لحاظ سے زیادہ مناسب ہے کہ تم پر جو اللہ کی نعمت ہے، اسے حقیر نہ جانو۔“

ایک اور حدیث میں ہے:

((اِذَا نَظَرَ اَحَدُكُمْ اِلٰی مَنْ فَضَّلَ عَلَيْهِ فِى الْمَالِ اَوِالْخَلْقِ فَلْيَنْظُرْ اِلٰی مَنْ هُوَ اَسْفَلَ مِنْهُ مِمَّنْ فَضَّلَ عَلَيْهِ))

(مسلم ، الزهد ، الدنیا سجن المؤمن...... ح:۲۹۶۳)

”جب تم میں سے کسی آدمی کی اپنے سے زیادہ صاحب مال اور اولاد (یا جسم میں بہتر) پر نظر پڑے تو اسے چاہیے کہ اپنے سے کم تر مقام و مرتبے والے کو بھی دیکھے۔“

اگر ایک شخص للچائی ہوئی نظر سے ان لوگوں کی طرف دیکھے جنہیں دنیوی نعمتیں (مال و دولت، باغات و جائداد کی فراوانی، محلات، اعلیٰ درجے کی گاڑیاں وغیرہ) زیادہ دی گئی ہیں تو

اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس کے دل میں منعم حقیقی کا شکوہ اور احساسِ محرومی پیدا ہو جائے یا اصحاب دولت وثروت کے خلاف حسد جنم لے یا پھر اللہ کی عبادت سے غافل ہو جائے اور دن رات انہی سہولیات، بلند تر رتبوں کی خواہش اور تلاش کی تگ ودو میں لگ کر دنیا ہی کا بندہ بن کر رہ جائے۔ خالق ومالک کا شکوہ، احساسِ محرومی، لوگوں پر حسد اور دولت دنیا کا غلام بن کر رہ جانا نیکیوں کو تباہ اور دلی آرام وسکون کا ستیاناس کر دیتا ہے۔ مال ودولت کی کثرت بسا اوقات انسان کے لیے عذاب کی صورت بھی اختیار کر سکتی ہے، جس کی وجہ سے وہ خالق کی نافرمانی اور بغاوت پر اتر آتا ہے۔

مگر جب انسان اپنے سے کم تر حیثیت کے لوگوں پر نظر دوڑائے گا تو اسے شکر، صبر اور قناعت کی دولت حاصل ہوگی۔ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو حقیر نہیں جانے گا۔ حقیقت یہ ہے ایک غریب سے غریب انسان پر بھی اللہ تعالیٰ کے بہت سے انعامات ہوتے ہیں۔ کیا ایمان کی نعمت کوئی معمولی نعمت ہے!

اسی طرح صحت وتندرستی اور قرض سے محفوظ ہونا اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نعمتیں ہیں۔ اگر ایک شخص کسی ہسپتال بالخصوص اس کے سرجیکل وارڈ کا مشاہدہ ومعائنہ کرے تو اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کے بے پایاں احسانات دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھے گا:

تنگدستی گر چہ ہو غالب تندرستی ہزار نعمت ہے

البتہ اچھائی اور نیکی کے کاموں میں جو لوگ ہم سے بڑھ کر ہیں ان کی طرف دیکھ کر امورِ خیر میں دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ﴾ (۸۳/المطففين:۲۶)

”اور اسی (جنت) میں ہی ایک دوسرے سے بڑھ کر رغبت کریں وہ لوگ جو ایک دوسرے کے مقابلے میں کسی چیز میں رغبت کرتے ہیں۔“

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ﴾ (۲/البقرۃ:۱۴۸؛ ۵/المائدۃ:۴۸)

”نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو۔“

اللہ تعالیٰ نے اچھے کاموں میں سبقت کرنے والوں کی تعریف کی ہے، اُن پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے:

﴿ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ ﴾

(۳۵/فاطر:۳۲)

علم حاصل کرنا دینِ اسلام کا مطالبہ ہے۔ جو آدمی حصولِ علم کے راستے پر چل پڑتا ہے اس کے لیے اللہ تعالیٰ جنت کا راستہ آسان کر دیتے ہیں۔ علم کے بغیر اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل نہیں کیا جا سکتا، مثلاً کفار کے مقابلے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو قوت تیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ اس جدید دور میں جدید ٹیکنالوجی کے بغیر کافروں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہتھیار تیار نہیں کیے جا سکتے۔ لہٰذا جدید علوم (سائنسی علوم) ضروریاتِ دین میں سے ہیں۔ ان کا حاصل کرنا نہ صرف کارِ خیر بلکہ فرض کفایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان مبادی کو سامنے رکھتے ہوئے (حسنِ نیت کے ساتھ) جو لوگ ان علوم میں زیادہ ماہر ہوں انہیں دیکھ کر آگے بڑھنا چاہیے۔ جن طلبہ نے خوب محنت کر کے اچھے نمبر حاصل کیے ہوں انہیں دیکھ کر اچھے نمبر (Marks) لینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ البتہ اسلام کی خدمت کا پہلو ضرور مدِنظر ہونا چاہیے، تب ان علوم کو سیکھنا بھی باعث ثواب ہوگا۔

کیا فرات سے نکلنے والے سونے سے مراد عراق کا تیل ہے؟

سوال امریکہ عراق جنگ کے تناظر میں بعض لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ دریائے فرات سے سونے کا پہاڑ نکلے گا، جس کی وجہ سے بہت خونریزی ہوگی حتیٰ کہ ہر سَو میں سے ننانوے آدمی قتل ہو جائیں گے۔ کیا اس طرح کی کوئی حدیث ہے؟ کیا اس سے عراق کا تیل مراد لینا درست ہے جیسا کہ بعض لوگ مراد لیتے ہیں؟

جواب قیامت سے پہلے دریائے فرات سے اس کا پانی خشک ہونے کی وجہ سے سونے کا ایک خزانہ پہاڑ کی شکل میں ظاہر ہوگا جسے حاصل کرنے کے لیے لوگوں میں لڑائی ہوگی جس کی وجہ سے ننانوے فیصد لوگ موت کے گھاٹ اتر جائیں گے۔ وہی لوگ محفوظ رہیں گے جنہیں اس سونے کے پہاڑ سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔ یہ بات تو درست ہے مگر اس سونے

کے پہاڑ سے تیل مراد لینا درست نہیں کیونکہ اس سلسلے میں وارد احادیث نبویہ سے یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

((يُوْشِكُ الْفُرَاتُ اَنْ يَّحْسِرَ عَنْ كَنْزٍ مِّنْ ذَهَبٍ فَمَنْ حَضَرَهُ فَلَا يَاْخُذْ مِنْهُ شَيْئًا))

(بخاری، الفتن، خروج النار، ح:۷۱۱۹؛ مسلم، الفتن، لا تقوم الساعة حتی یحسر الفرات عن جبل من ذهب، ح:۲۸۹۴)

”قریب ہے کہ دریائے فرات (خشک ہوکر) سونے کے خزانے کو ظاہر کردے تو جو شخص اس وقت موجود ہو اُس میں سے کچھ نہ لے۔“

ایک اور حدیث میں ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَحْسِرَ الْفُرَاتُ عَنْ جَبَلٍ مِنْ ذَهَبٍ يَقْتَتِلُ النَّاسُ عَلَيْهِ فَيُقْتَلُ مِنْ كُلِّ مِئَةٍ تِسْعَةٌ وَّ تِسْعُوْنَ وَيَقُوْلُ كُلُّ رَجُلٍ مِّنْهُمْ لَعَلِّيْ اَكُوْنُ اَنَا الَّذِيْ اَنْجُوْ)) (ایضًا)

”اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک کہ دریائے فرات خشک ہوکر اس سے سونے کا پہاڑ نہ نکل آئے، اس پر لوگ لڑیں گے، ہر سو میں سے ننانوے آدمی مارے جائیں گے، ان میں سے ہر ایک کا خیال ہوگا کہ شاید میں اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔“

مذکورہ بالا احادیث میں مذکور سونے کے خزانے اور پہاڑ سے عراق کا تیل مراد لینا لوگوں کا تکلف ہے۔ کتاب و سنت کے واضح دلائل کی اس طرح تاویلات کرنے سے دین بازیچہ اطفال بن جائے گا اور اس کا حلیہ ہی بگڑ جائے گا۔ بعض لوگوں کو یہ جنون ہوتا ہے کہ جب بھی کوئی نیا واقعہ رونما ہوتا تو اس پر فوراً کوئی نہ کوئی حدیث چسپاں کر دیں، پھر جب اس طرح نہیں ہوتا تو اپنا سا منہ لے کر بیٹھ جاتے ہیں، نیز اس طرح احادیث میں تشکیک بھی پیدا ہوتی ہے۔ اگر اللہ کے نبی ﷺ نے سونے کا پہاڑ کہا ہے تو اس سے مراد سونے کا پہاڑ ہی ہے نہ کہ کچھ اور۔ مزید براں عراق کا تیل دریا سے نہیں نکلتا!

جنت میں نبی ﷺ کا ساتھ کن لوگوں کو حاصل ہوگا؟

سوال کیا یہ صحیح ہے کہ ایک صحابی کو آپ ﷺ نے اپنی رفاقت دینے کا وعدہ کیا تھا؟

جواب سوال میں جس صحابی کی طرف اشارہ ہے وہ ربیعہ بن کعب اسلمی رضی اللہ عنہ ہیں، ربیعہ فرماتے ہیں:

كنت ابيت مع رسول اللهﷺ فأتيته بوضوئه وحاجته فقال لي: ((سَلْ)) فقلت اسالك مرافقتك في الجنة قال:((او غير ذلك ؟)) قلت هوذاك قال: ((فَاَعِنِّیْ عَلٰی نَفْسِكَ بِكَثْرَةِ السُّجُوْدِ))

(مسلم ، الصلاة ، فضل السجود والحث عليه ، ح:٤٨٩)

''مَیں رسول اللہ ﷺ کے پڑوس میں رات گزارتا تھا،مَیں آپ کے پاس وضو کا پانی اور دیگر ضرورت کی چیزیں (مسواک وغیرہ) لے کر حاضر ہوتا۔(ایک رات خوش ہوکر) آپ نے فرمایا: کچھ فرمائش کرو،مَیں نے عرض کی:مَیں جنت میں آپ کی رفاقت کا سوال کرتا ہوں۔آپ نے فرمایا:اس کے علاوہ کوئی اور چیز؟مَیں نے کہا:بس یہی ایک فرمائش ہے۔آپ نے فرمایا:سجدوں کی کثرت سے اپنی ذات کے لیے میری مدد کرو۔''

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے ربیعہ اسلمی رضی اللہ عنہ کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کا ارادہ کیا۔نہ کہ رفاقت عطا کرنے کا۔اگر رفاقت عطا کرنے کا آپ نے وعدہ کیا ہوتا تو آپ ﷺ ربیعہ رضی اللہ عنہ سے یہ نہ فرماتے:

((فَاَعِنِّیْ عَلٰی نَفْسِكَ بِكَثْرَةِ السُّجُوْدِ))

''(اس آرزو کو پورا کروانے میں)بہت زیادہ سجدے کر کے میرا تعاون کرو۔''

مطلب یہ تھا بہت زیادہ سجدے کرنے کی وجہ سے ربیعہ رضی اللہ عنہ کی فرمائش پوری ہونے میں سہولت پیدا ہو جائے گی۔یہ بھی واضح رہے کہ نبی اکرم ﷺ کی رفاقت انہی لوگوں کو حاصل ہوگی جو آپ ﷺ کی اطاعت بجالاتے ہیں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ

النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ أُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾

(۴/النساء:۶۹)

’’اور جو بھی اللہ کی اور رسول کی فرمانبرداری کرے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام کیا ہے، جیسے نبی، صدیق، شہید اور نیک لوگ ہیں، یہ بہترین رفیق ہیں۔‘‘

جس سے محبت ہو اُسے بتانے کی شرعی حیثیت؟

سوال اللہ کے لیے محبت سے کیا مراد ہے؟ اس کی کیا فضیلت ہے؟ کیا یہ بات درست ہے کہ آدمی جس سے محبت کرتا ہو اسے بتا بھی دے؟ بتانے میں کیا حکمت ہے؟

جواب دوسروں کے بارے میں خیر خواہی کے پاکیزہ جذبات کا نام محبت ہے۔ جن لوگوں سے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ محبت کی جائے، ان سے اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لیے محبت کی جانی چاہیے۔ البتہ جن لوگوں سے نفرت کرنے کو اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں ان سے نفرت کرنا ضروری ہے۔ یہ الحب للہ والبغض فی اللہ کا اصول احادیث میں بیان ہوا ہے۔ مسلمان بھائی سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے محبت کرنا حلاوت ایمان کا سبب ہے۔ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی ﷺ نے فرمایا:

((ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيْمَانِ اَنْ يَكُوْنَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَاَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهُ اِلَّا لِلّٰهِ وَاَنْ يَكْرَهَ اَنْ يَعُوْدَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ اَنْ يُقْذَفَ فِي النَّارِ))

(بخاری، الایمان، حلاوۃ الایمان، ح:۱۶؛ مسلم، الایمان، بیان خصال من اتصف بھن وجد حلاوۃ الایمان، ح:۴۳)

’’تین خصلتیں ایسی ہیں، جن میں وہ ہوں گی وہ ایمان کی لذت اور مٹھاس محسوس کرے گا: (۱) یہ کہ اللہ اور اس کا رسول اسے ان کے ماسوا ہر چیز (پوری کائنات) سے زیادہ محبوب ہو۔ (۲) اور یہ کہ وہ کسی آدمی سے صرف اللہ کے لیے محبت رکھے۔ (۳) اور یہ کہ وہ دوبارہ کفر میں لوٹنے کو اسی طرح برا سمجھے،

جیسے آگ میں ڈالے جانے کو بُرا سمجھتا ہے۔"

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ایک آدمی کسی دوسری بستی کی طرف اپنے کسی بھائی کی زیارت کے لیے نکلا تو اللہ نے اس کے راستے میں اس کی حفاظت کے لیے ایک فرشتہ بٹھا دیا، جو اُس کا انتظار کرتا رہا، جب وہ شخص اُن کے پاس سے گزرا تو فرشتے نے پوچھا: تم کہاں جا رہے ہو؟ اس نے جواب دیا: اس بستی میں میرا بھائی رہتا ہے اس کے پاس جا رہا ہوں۔ فرشتے نے پوچھا: کیا اس کا تم پر کوئی احسان ہے جس کی وجہ سے تم یہ تکلیف اٹھا رہے ہو اور اس کا بدلا اتارنے جا رہے ہو؟ اس نے کہا: نہیں۔ صرف اس لیے جا رہا ہوں کہ

((اَنِّیْ اَحْبَبْتُهٗ فِی اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ قَالَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكَ بِاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَبَّكَ كَمَا اَحْبَبْتَهٗ فِیْهِ))

(مسلم، البر والصلة، فضل الحب فی الله، ح:٢٥٦٧)

"مَیں اس سے اللہ کے لیے محبت کرتا ہوں۔ فرشتے نے کہا: مَیں تیری طرف اللہ کا فرستادہ ہوں۔ اللہ بھی تجھ سے محبت کرتا ہے جیسے تُو اس سے صرف اللہ کے لیے محبت کرتا ہے۔"

اللہ کے لیے اپنے مسلمان بھائیوں سے محبت کرنے والے قیامت کی مشکلات سے بھی محفوظ رہیں گے، ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے عرش کا سایہ نصیب کریں گے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((سَبْعَةٌ یُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظِلِّهٖ یَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلُّهُ الْاِمَامُ الْعَادِلُ وَشَابٌّ نَشَأَ فِیْ عِبَادَةِ رَبِّهٖ وَرَجُلٌ قَلْبُهٗ مُعَلَّقٌ فِی الْمَسَاجِدِ وَرَجُلَانِ تَحَابَّا فِی اللّٰهِ اجْتَمَعَا ذٰلِكَ وَتَفَرَّقَا عَلَیْهِ وَرَجُلٌ طَلَبَتْهُ امْرَاَةٌ ذَاتُ مَنْصَبٍ وَّجَمَالٍ فَقَالَ اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰهَ وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ فَاَخْفٰی حَتّٰی لَا تَعْلَمَ شِمَالُهٗ مَا تُنْفِقُ یَمِیْنُهٗ وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللّٰهَ خَالِیًا فَفَاضَتْ عَیْنَاهُ))

(بخاری، الاذان، من جلس فی المسجد ینتظر الصلاة، ح:٦٦٠؛ مسلم، الزکوة، فضل اخفاء الصدقة، ح:١٠٣١)

"سات (قسم کے) آدمی ایسے ہیں کہ اللہ انہیں اس (قیامت کے) دن جب اس کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا، اپنے (عرش کے) سائے میں جگہ دے گا:

① انصاف کرنے والا حکمران۔
② وہ نوجوان جو اپنے رب کی عبادت میں پروان چڑھے۔
③ وہ آدمی جس کا دل مسجد کے ساتھ اٹکا ہوا ہو (مسجد کی خاص محبت اس کے دل میں ہو۔ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار میں مسجد کے لیے بے قرار ہو۔)
④ وہ دو آدمی جو ایک دوسرے سے صرف اللہ کے لیے محبت کرتے ہیں۔ اسی پر وہ باہم جمع ہوتے اور اسی پر ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔
⑤ وہ آدمی جسے کوئی حسین وجمیل عورت گناہ کی دعوت دے، لیکن وہ اس کے جواب میں کہے کہ میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں۔
⑥ وہ آدمی جس نے کوئی صدقہ کیا اور اسے چھپایا حتی کہ اس کے بائیں ہاتھ کو علم نہیں کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔
⑦ وہ آدمی جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور (اس کے خوف سے) اس کی آنکھیں بہہ پڑیں۔"

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک اور حدیث میں ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَيْنَ الْمُتَحَابُّوْنَ بِجَلَالِي الْيَوْمَ أُظِلُّهُمْ فِي ظِلِّي يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلِّي))

(مسلم، البر والصلة، فضل الحب فی الله، ح:۲۵۶۶)

"اللہ قیامت والے دن فرمائے گا: میری عظمت وجلالت کے لیے باہم محبت کرنے والے کہاں ہیں؟ آج میں انہیں اپنے سائے میں جگہ دوں گا، جس دن میرے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا۔"

حدیث میں الحب فی اللہ کو جنت میں جانے کا ذریعہ بھی بتایا گیا ہے:

((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَا تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ حَتّٰی تُؤْمِنُوْا وَلَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰی تَحَابُّوْا اَوَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰی شَیْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ؟ اَفْشُوا السَّلَامَ بَیْنَكُمْ))

(مسلم ، الایمان ، بیان انه لا یدخل الجنة الا المؤمنون ، ح:۵۴)

''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم اس وقت تک جنت میں نہیں جاؤ گے۔ جب تک ایمان نہیں لاؤ گے، اور تم مومن نہیں ہو سکتے جب تک تم ایک دوسرے سے (صرف اللہ کے لیے) محبت نہیں کرو گے۔ کیا مَیں تمہیں ایسی چیز نہ بتلاؤں کہ جب تم اسے اختیار کرو گے تو باہم محبت کرنے لگ جاؤ گے؟ (وہ یہ کہ) تم آپس میں سلام عام کرو۔''

مسلمان اگر اپنے مسلمان بھائی سے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر محبت کرتا ہو تو وہ اپنے بھائی کو بتلا دے کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ تاکہ دوسرا شخص بھی آگاہ ہو جائے اور وہ بھی محبت و تعاون کا ہاتھ بڑھائے، اس طرح محبت دوطرفہ ہو جائے گی۔ ابوکریمہ مقداد بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِذَا اَحَبَّ الرَّجُلُ اَخَاهُ فَلْیُخْبِرْهُ اَنَّهٗ یُحِبُّهٗ))

(ابو داوٗد، الادب، اخبار الرجل الرجل بمحبته ایاه، ح:۵۱۲۴)

''جب آدمی اپنے بھائی سے محبت کرے تو اسے چاہیے کہ اسے بتلا دے کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔''

دوسری حدیث میں ہے، انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک اور آدمی وہاں سے گزرا، آپ کے پاس بیٹھے ہوئے شخص نے کہا: اللہ کے رسول! مَیں یقیناً اس گزرنے والے شخص سے محبت کرتا ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا: کیا تُو نے اسے بتایا ہے؟ اس نے کہا: نہیں، آپ نے فرمایا: اسے بتا دو، چنانچہ وہ شخص (تیزی سے) اس کے پاس گیا اور اس سے کہا:

انی احبك فی الله ، فقال: احبك الذی احببتنی له

(ابو داوٗد ، الادب ، اخبار الرجل الرجل بمحبته ایاه ، ح:۵۱۲۵)

”مَیں تجھ سے اللہ کے لیے محبت کرتا ہوں۔ اس نے جواب میں کہا: اللہ تجھ سے محبت کرے جس کے لیے تُو نے مجھ سے محبت کی۔“

ابوادریس خولانی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں:

مَیں دمشق کی مسجد میں گیا (تو دیکھا) کہ ایک جوان آدمی، جس کے اگلے دانت خوب چمکیلے ہیں، کے پاس لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ جب وہ آپس میں کسی چیز کی بابت اختلاف کرتے ہیں تو اس کے (حل کے) لیے اس سے سوال کرتے ہیں اور اپنی رائے سے رجوع کر کے اس کی رائے کو قبول کرتے ہیں، چنانچہ مَیں نے اس جوان کی بابت پوچھا (کہ یہ کون ہے؟) تو مجھے بتلایا گیا کہ یہ (صحابی) معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں۔ جب اگلا دن ہوا تو مَیں صبح سویرے ہی مسجد میں آ گیا، لیکن مَیں نے دیکھا کہ جلدی آنے میں بھی وہ مجھ سے سبقت لے گئے ہیں اور مَیں نے انہیں (وہاں) نماز پڑھتے ہوئے پایا۔ پس مَیں ان کا انتظار کرتا رہا، یہاں تک کہ وہ اپنی نماز سے فارغ ہو گئے۔ مَیں ان کے سامنے کی طرف سے ان کے پاس آیا، انہیں سلام عرض کیا اور پھر کہا:

والله انی لأحبك لله فقال:آلله؟فقلت:آلله فقال آلله فقلت آلله فاخذني بحبوة ردائي فجبذني اليه و قال:ابشر فاني سمعت رسول الله ﷺ يقول:((قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى وَجَبَتْ مَحَبَّتِيْ لِلْمُتَحَابِّيْنَ فِيَّ وَ الْمُتَجَالِسِيْنَ فِيَّ وَالْمُتَزَاوِرِيْنَ فِيَّ وَالْمُتَبَاذِلِيْنَ فِيَّ))

(موطا امام مالك، الشعر، ماجاء في المتحابين في الله، ح: ١٧٧٩)

”اللہ کی قسم! مَیں آپ سے اللہ کے لیے محبت کرتا ہوں، انہوں نے کہا: کیا واقعی؟ مَیں نے کہا: ہاں اللہ کی قسم! انہوں نے کہا: کیا واقعی؟ مَیں نے کہا: واقعی اللہ کی قسم! پس انہوں نے مجھے میری چادر کی گوٹ (کنارے) سے پکڑا اور مجھے اپنی طرف کھینچا اور فرمایا: خوش ہو جاؤ، کیونکہ مَیں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: میری محبت واجب ہو گئی ہے ان کے لیے جو میرے لیے آپس میں محبت کرتے ہیں اور میرے لیے ایک

دوسرے کی ہم نشینی کرتے ہیں اور میرے لیے ایک دوسرے سے ملاقاتیں کرتے ہیں اور میرے لیے ایک دوسرے پر خرچ کرتے ہیں۔''

قولی احادیث کے علاوہ فعلی حدیث یعنی نبی اکرم ﷺ کے عمل سے بھی ایسا کرنا ثابت ہے۔ معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: معاذ! اللہ کی قسم! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ معاذ! تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ ہر نماز کے بعد یہ کلمات کہنا ہرگز نہ چھوڑنا:

((اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِكَ وَشُکْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ))

(ابوداؤد، الوتر، فی الاستغفار، ح:۱۵۲۲؛ نسائی، ح:۱۳۰۴)

''اللہ! میری مدد کر اس پر کہ میں تیرا ذکر، شکر اور تیری اچھی عبادت کروں۔''

بغیر حساب کے جنت میں جانے والے کیسے لوگ ہوں گے؟

سوال وہ کون سے تین قسم کے لوگ ہیں جو بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے؟

جواب جنت میں جانے والوں کی بنیادی طور پر چار اقسام بنتی ہیں:

پہلی قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جو بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے۔ احادیث میں ان کی تعداد ستر ہزار بتائی گئی ہے۔

دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو حساب دینے کے بعد جنت میں داخل ہوں گے۔

تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جنہیں جہنم میں داخل تو نہیں کیا جائے گا البتہ ایک وقت تک کے لیے جنت میں جانے سے روک دیا جائے گا۔ یہ اصحاب الاعراف ہیں۔ جن کا تذکرہ سورۃ الاعراف میں بالتفصیل موجود ہے۔

چوتھی قسم ان اہل ایمان کی ہے جو گناہوں کی کثرت کی وجہ سے جہنم میں داخل ہوں گے اور بالآخر اپنے اعمال کی سزا بھگت کر اپنے ایمان کی وجہ سے جنت میں داخل کیے جائیں گے۔

وہ ستر ہزار لوگ جو بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے وہ کن اوصاف کے حامل اہلِ ایمان ہوں گے۔ آیئے احادیث کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، بیان کرتے ہیں:

اللہ کے رسول ﷺ ایک دن ہمارے پاس باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ (خواب میں) مجھ پر تمام امتیں پیش کی گئیں۔ بعض نبی گزرتے اور ان کے ساتھ (ان کی اتباع کرنے والا) صرف ایک آدمی ہوتا۔ بعض گزرتے اور ان کے ساتھ دو ہوتے بعض کے ساتھ پوری جماعت ہوتی اور بعض کے ساتھ کوئی بھی نہ ہوتا۔ پھر میں نے ایک بڑی جماعت دیکھی جس سے آسمان کا کنارہ ڈھک گیا تھا میں سمجھا کہ یہ میری ہی امت ہو گی لیکن مجھ سے کہا گیا کہ یہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کی امت کے لوگ ہیں۔ پھر مجھ سے کہا کہ دیکھو، میں نے ایک بہت بڑی جماعت دیکھی جس نے آسمانوں کا کنارہ ڈھانپ لیا ہے۔ پھر مجھ سے کہا گیا کہ ادھر دیکھو، ادھر دیکھو، میں نے دیکھا کہ بہت سی جماعتیں ہیں جو تمام افق پر محیط تھیں۔ کہا گیا کہ یہ تمہاری امت ہے اور اس میں سے ستر ہزار لوگ وہ ہوں گے جو بغیر حساب کے جنت میں داخل کیے جائیں گے۔

پھر صحابہ رضی اللہ عنہم مختلف جگہوں میں اٹھ کر چلے گئے اور نبی ﷺ نے اس کی وضاحت نہیں کی کہ یہ ستر ہزار کون لوگ ہوں گے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپس میں اس کے متعلق مذاکرہ کیا اور کہا کہ ہماری پیدائش شرک میں ہوئی تھی البتہ بعد میں ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئے لیکن یہ ستر ہزار ہمارے بیٹے ہوں گے جو پیدائشی مسلمان ہیں۔ جب اللہ کے رسول ﷺ کو یہ بات پہنچی تو آپ نے فرمایا:

((هُمُ الَّذِيْنَ لَا يَتَطَيَّرُوْنَ وَلَا يَكْتَوُوْنَ وَلَا يَسْتَرْقُوْنَ وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ))

''یہ ستر ہزار وہ لوگ ہوں گے جو بدفالی نہیں کرتے، نہ منتر سے جھاڑ پھونک کراتے ہیں اور نہ داغ لگاتے ہیں بلکہ اپنے رب پر ہی بھروسہ کرتے ہیں۔''

یہ سن کر عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! کیا میں بھی ان میں سے ہوں؟ فرمایا: ہاں۔ ایک دوسرے صاحب (سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ) نے کھڑے ہو کر عرض کیا: میں بھی ان میں سے ہوں؟ نبی ﷺ نے فرمایا:

((سَبَقَكَ بِهَا عُكَّاشَةُ))

(بخاری، الطب، من لم یرق، ح:۵۷۵۲، ح:۳۴۱۰)

"عکاشہ تم سے بازی لے گئے۔(تم سے پہلے عکاشہ کے لیے جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔)"

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

((یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ مِنْ أُمَّتِی زُمْرَۃٌ ھُمْ سَبْعُوْنَ اَلْفًا تُضِیءُ وُجُوْھُھُمْ إِضَاءَۃَ الْقَمَرِ لَیْلَۃَ الْبَدْرِ))

(مسلم، الایمان، الدلیل علی دخول طوائف من المسلمین الجنۃ بغیر حساب، ح:۲۱۶)

"میری امت میں سے ستر ہزار کا ایک گروہ جنت میں داخل ہوگا جن کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن ہوں گے۔"

عمران بن حصین بیان کرتے ہیں، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ مِنْ أُمَّتِی سَبْعُوْنَ اَلْفًا بِغَیْرِ حِسَابٍ))

"میری امت کے ستر ہزار لوگ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے۔"

لوگوں نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ! وہ کیسے لوگ ہوں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((ھُمُ الَّذِیْنَ لَا یَسْتَرْقُوْنَ وَ لَا یَتَطَیَّرُوْنَ وَلَا یَکْتَوُوْنَ وَعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ)) (ایضاً، ح:۲۱۸)

"یہ وہ لوگ ہوں گے جو دم نہیں کرواتے ہوں گے، بدشگونی نہیں لیتے ہوں گے اور نہ داغ لگواتے ہوں گے (یعنی داغ لگوا کر علاج نہیں کرواتے ہوں گے) اور اپنے رب پر ہی بھروسہ کرتے ہوں گے۔"

ایک اور حدیث میں ہے:

ستر ہزار لوگ ((بِغَیْرِ حِسَابٍ وَّلَاعَذَابٍ)) یعنی بغیر حساب اور بغیر عذاب کے جنت میں داخل ہوں گے۔(ایضاً، ح:۲۲۰)

مسند احمد (۱/۳۰۳) میں ہے:

((ھُمُ الَّذِیْنَ لَا یَکْتَوُوْنَ وَلَا یَسْتَرْقُوْنَ وَ لَا یَتَطَیَّرُوْنَ وَعَلٰی رَبِّھِمْ

یَتَوَکَّلُوْنَ))

ایک حدیث میں الفاظ یوں ہیں:

((هُمُ الَّذِيْنَ لَا يَسْتَرْقُوْنَ وَ لَا يَتَطَيَّرُوْنَ وَلَا يَكْتَوُوْنَ وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ))(مسند احمد ۱/ ۳۵۴)

مذکورہ بالا احادیث مبارکہ سے معلوم ہوا کہ تین قسم کے اہل ایمان ہوں گے جو بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے جو کہ درج ذیل ہیں:

① بدشگونی نہ لینے والے

② داغ لگوا کر علاج نہ کروانے والے

③ دم جھاڑ نہ کروانے والے

البتہ یہ اشکال ذہن میں پیدا ہوسکتا ہے کہ علاج کروانا اور دم کروانا تو جائز ہے اور یہ امور نبی ﷺ سے بھی ثابت ہیں! اس کے جواب میں کچھ وضاحت کی ضرورت ہے۔ جہاں تک بدشگونی کا تعلق ہے تو نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

((لَا طِيَرَةَ وَخَيْرُهَا الْفَالُ))

''بدشگونی کی کوئی اصل نہیں البتہ نیک فال لینا بہتر ہے۔ (کچھ بُرا نہیں ہے۔)''

صحابہ نے عرض کیا نیک فال کیا چیز ہے؟ فرمایا:

((اَلْكَلِمَةُ الصَّالِحَةُ يَسْمَعُهَا اَحَدُكُمْ)) (بخاری ، الطب ، الطیرۃ ، ح:۵۷۵۴)

''کوئی اچھی بات جو تم میں سے کوئی سنتا ہے۔''

مولانا محمد داؤد راز رحمہ اللہ اس کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

مثلاً بیمار آدمی سلامتی تندرستی کا سن پائے یا لڑائی پر جانے والا شخص راستے میں کسی ایسے شخص سے ملے جس کا نام فتح خاں ہو اُس سے فال نیک لی جاسکتی ہے کہ لڑائی میں فتح ہماری ہو گی۔ان شاء اللہ تعالٰی۔

((وَلَا يَكْتَوُوْنَ)) کے بارے میں شارحین کے مختلف اقوال ہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ

نے شرح مسلم میں ان اقوال کو ذکر کیا ہے۔ بعض علماء نے کیّ (داغ لگا کر علاج کرنے) کو خاص کیا ہے۔ جن احادیث میں ستر ہزار اہل ایمان کا بغیر حساب کے جنت میں داخل ہونے کا بیان ہے ان میں ہر علاج مراد نہیں بلکہ داغ لگا کر علاج کروانے کا تذکرہ ہے۔ داغ لگا کر علاج کروانا یہ آخری علاج تھا۔ عرب میں یہ علاج اکثر مروّج رہا ہے بالخصوص طاعون کی بیماری میں۔ جب کسی دوا وغیرہ سے افاقہ نہ ہوتا تو یہ علاج کرواتے تھے۔ ایک حدیث میں ہے:

((اَلشِّفَاءُ فِيْ ثَلَاثَةٍ فِيْ شَرْطَةِ مِحْجَمٍ اَوْشَرْبَةِ عَسَلٍ اَوْكَيَّةٍ بِنَارٍ وَاَنْهٰى اُمَّتِيْ عَنِ الْكَيِّ)) (بخاری، الطب، الشفاء فی ثلاث، ح:۵۶۸۱)

"شفا تین چیزوں میں ہے: پچھنا لگوانے میں، شہد پینے میں اور آگ سے داغنے میں۔ مگر میں اپنی امت کو آگ کے ساتھ داغنے سے روکتا ہوں۔"

ایک اور حدیث میں ہے:

((اِنْ كَانَ فِيْ شَيْءٍ مِّنْ اَدْوِيَتِكُمْ اَوْ يَكُوْنُ فِيْ شَيْءٍ مِّنْ اَدْوِيَتِكُمْ خَيْرٌ فَفِيْ شَرْطَةِ مِحْجَمٍ، اَوْشَرْبَةِ عَسَلٍ، اَوْ لَذْعَةٍ بِنَارٍ، تُوَافِقُ الدَّاءَ وَمَا اُحِبُّ اَنْ اَكْتَوِيَ)) (ایضاً، الدواء بالعسل، ح:۵۶۸۳)

"اگر تمہاری دواؤں میں کسی میں بھلائی ہے یا یہ فرمایا کہ تمہاری (ان) دواؤں میں بھلائی ہے تو پچھنا لگوانے یا شہد پینے اور آگ سے داغنے میں ہے اگر وہ مرض کے مطابق ہو اور میں آگ سے داغنے کو پسند نہیں کرتا۔"

علاج کروانا اگرچہ توکل کے منافی نہیں۔ البتہ علاج نہ کروانا اور اپنے آپ کو مکمل طور اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا اور مرض پر صبر کرنا بہتر ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے جو علاج کروایا تو جواز بتانے کے لیے۔ (دیکھیے شرح نووی)

ایک حدیث میں ہے کہ عطاء بن ابورباح کہتے ہیں: مجھ سے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کیا میں تجھے جنتی عورت نہ دکھلاؤں؟ میں نے کہا: کیوں نہیں۔ انہوں نے فرمایا: یہ سیاہ فام عورت نبی ﷺ کے پاس آئی اور اس نے کہا: مجھے مرگی کا دورہ پڑتا ہے جس سے میرا جسم

برہنہ ہو جاتا ہے، آپ میرے لیے اللہ سے دعا کریں (کہ اس بیماری سے نجات عطا کرے۔) آپ ﷺ نے فرمایا:

((إِنْ شِئْتِ صَبَرْتِ وَلَكِ الْجَنَّةُ وَإِنْ شِئْتِ دَعَوْتُ اللّٰهَ تَعَالَى أَنْ يُعَافِيَكِ))

''اگر آپ چاہیں تو اس تکلیف پر صبر کریں، اس کے بدلے آپ کے لیے جنت ہے اور اگر آپ چاہیں تو میں اللہ تعالیٰ سے دعا کر دیتا ہوں کہ وہ آپ کو عافیت دے دے۔''

اس نے کہا: میں صبر ہی اختیار کرتی ہوں، تاہم (بیماری کے وقت) میرا جسم کھل جاتا ہے آپ اللہ سے دعا کر دیں کہ میرے بدن کا کپڑا نہ کھلے چنانچہ آپ ﷺ نے اُس کے لیے یہ دعا کر دی۔

(بخاري، المرضى، فضل من يصرع من الريح، ح:٥٦٥٢؛ مسلم، البر و الصلة، ثواب المؤمن فيما يصيبه من مرض أو ....ح:٢٥٧٦)

اسی طرح علاج نہ کروانے کا مسئلہ ہے۔ مولانا محمد داؤد راز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: خالص اللہ پر توکل رکھنا اور اسی عقیدہ کے تحت جائز علاج کروانا توکل کے منافی نہیں ہے۔ پھر جو لوگ خالص توکل پر قائم رہ کر کوئی جائز علاج بھی نہ کروائیں وہ یقیناً اس فضیلت کے مستحق ہیں یعنی بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے۔

اسی طرح جائز دم کرنا اور کروانا یقیناً شریعت کی نظر میں درست ہے۔ جواز کی بہت سی احادیث ہیں۔ البتہ دم نہ کروانا باعث فضیلت ہے۔

سو سال کے بعد کوئی زندہ نہیں رہے گا؟

سوال ((لَا يَبْقَى عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ بَعْدَ مِائَةِ سَنَةٍ نَفْسٌ مَنْفُوسَةٌ)) کا صحیح مطلب کیا ہے؟ کیا اس حدیث سے یہ مراد لینا کہ ''دنیا سو سال بعد ختم ہو جائے گی'' درست ہے؟

جواب اس حدیث کا صحیح مطلب یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے دور کے

انسانوں کے بارے میں فرمایا تھا کہ جو اس وقت موجود ہیں ان میں سے سو سال بعد کوئی بھی زندہ نہیں رہے گا۔ یہ حدیث معتبر کتب حدیث میں موجود ہے۔ انکارِ حدیث کی روش پر رواں دواں مصر کے ایک سکالر احمد امین نے اس حدیث کا صحیح مطلب نہ سمجھتے ہوئے اسے موضوع قرار دیا کیونکہ بقول ان کے مشاہدہ اس حدیث کے خلاف نکلا ہے۔ اس حدیث کا صحیح مطلب بیان کرتے اور احمد امین مصری کی تردید کرتے ہوئے دمشق کے علامہ ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم لکھتے ہیں:

اس حدیث کو امام بخاری و مسلم اور دیگر محدثین نے روایت کیا ہے۔

(بخاری، مواقیت الصلاۃ، السمر فی الفقہ و الخیر بعد العشاء، ح: ۶۰۱؛ مسلم، ح:۲۵۳۷، ترمذی، ح:۲۲۵۱؛ ابوداؤد، ح:۴۳۴۸)

احمد امین نے حدیث کا یہ مطلب سمجھا ہے کہ دنیا سو سال کے بعد ختم ہو جائے گی۔ اسی لیے اس نے روایت زیر تبصرہ کو موضوع ٹھہرایا ہے کہ یہ تاریخی حقائق اور حس و مشاہدہ کے خلاف ہے۔

درحقیقت مذکورہ صدر روایت طویل حدیث کا ایک جزو ہے جسے امام بخاری نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری دور میں عشاء کی نماز پڑھی اور پھر کھڑے ہو کر فرمایا:

''آج جو لوگ کائنات ارضی پر بقید حیات ہیں جب یہ صدی ختم ہوگی تو ان میں سے کوئی بھی اس وقت زندہ نہ ہوگا۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی میں سے لوگوں کے ذہن میں صرف صدی کا مفہوم باقی رہ گیا۔ حالانکہ آپ نے فرمایا یہ تھا کہ ''جو لوگ آج پشت زمین پر زندہ ہیں''

آپ کا مقصد یہ تھا کہ اس صدی والوں میں سے اس وقت کوئی بھی زندہ نہ ہوگا۔ بلکہ سب موت سے ہمکنار ہو جائیں گے۔

یہ ہے حدیث کی اصل عبارت، جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ خبر آپ نے صحابہ کو اپنی زندگی کے آخری دور میں دی تھی۔ جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے ایک ماہ پہلے فرمایا:

''جو شخص ''آج جب کہ میں یہ الفاظ کہہ رہا ہوں'' زمین کی پشت پر زندہ ہے وہ سو سال سے زیادہ عمر نہیں پائے گا۔''

بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے اس حصے ''آج جو زمین کی پشت پر زندہ ہے'' کی جانب توجہ نہ دی۔ اس لیے انہوں نے ارشادِ گرامی کا مطلب یہ سمجھا کہ دنیا سو سال کے بعد ختم ہو جائے گی۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد سمجھایا اور آگاہ کیا کہ آپ کے ارشاد میں ''آج کے بعد زندہ'' کا تذکرہ ہے۔

طبرانی کی روایت کے مطابق علی رضی اللہ عنہ نے بھی صحابہ کو سمجھایا تھا۔

(طبرانی کبیر ۱۷/ ۱۷۰، ح:۴۹۳؛ مسند احمد ۱/ ۹۳)

علماء کی تحقیق کے مطابق سب سے آخری صحابی ابوطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ تھے۔ جن کی وفات ۱۱۰ھ میں۔ یعنی فرمان رسول کے پورے ایک سو سال بعد ہوئی۔ بنا بریں یہ حدیث معجزاتِ رسول میں سے ایک عظیم معجزہ پر مشتمل ہے۔ آپ نے ایک غیبی امر کی اطلاع دی اور آپ کی اطلاع کے مطابق ظہور پذیر ہوا ہے اس حدیث کا اصل معنی و مفہوم!

اب اس ضمن میں شارحین حدیث کے ارشادات ملاحظہ کیجیے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں فرماتے ہیں:

''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی کا مطلب واضح کر دیا تھا کہ جب آپ نے یہ الفاظ فرمائے اس وقت سے لے کر ایک صدی گزرنے پر موجودہ لوگوں میں سے کوئی بھی زندہ نہ رہے گا۔ اور اسی طرح ہوا بھی تھا۔ صحابہ میں سے جس کی موت سب کے بعد واقع ہوئی وہ ابوطفیل عامر بن واثلہ تھے۔ اس پر تمام محدثین کا اجماع ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ ابوطفیل رضی اللہ عنہ نے ۱۱۰ھ میں وفات پائی تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی تو ۱۰ھ کا واقعہ ہے۔ اس لیے ۱۰ھ سے لے کر صدی کا اختتام ۱۱۰ھ ہی پر ہوتا ہے۔''

امام مسلم نے یہ حدیث متعدد طرق سے روایت کی ہے۔ ایک روایت جابر سے منقول ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں:

((مَا مِنْ نَفْسٍ مَنْفُوسَةٍ الْيَوْمَ تَأْتِي عَلَيْهَا مِائَةُ سَنَةٍ وَهِيَ حَيَّةٌ يَوْمَئِذٍ))

(مسلم، فضائل الصحابة، بیان معنی قوله ﷺ علی رأس مائة سنة ..... ح:٢٥٣٨)

"کوئی جاندار" آج" ایسا موجود نہیں کہ اس پر سو سال گزرے اور وہ اس وقت زندہ ہو۔"

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"یہ حدیثیں باہم ایک دوسرے کے معنی ومفہوم پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ان میں آپ کی رسالت کی ایک عظیم علامت پائی جاتی ہے۔ ان سے مراد ومقصود یہ ہے کہ آج کی رات جو جاندار کرۂ ارض پر موجود ہے۔ وہ اس کے بعد ایک سو سال سے زیادہ زندگی نہیں پائے گا۔ خواہ اس سے پہلے اس کی عمر کم ہو یا تھوڑی۔ جو آج کی رات کے بعد پیدا ہوا اِس حدیث میں اس کا کوئی ذکر نہیں کہ وہ سو سال سے زیادہ زندہ نہیں رہے گا۔"

شارح کرمانی نے محدث ابن بطال کا قول نقل کیا ہے، فرماتے ہیں:

"سرور کائنات ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ ایک صدی کی مدت میں یہ نسل ختم ہو جائے گی۔ جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اس امت کی عمریں سابقہ امم واقوام کی طرح طویل نہیں ہیں۔ اس لیے عبادت کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرنا چاہیے۔"

صحابی ابوطفیل کی وفات کے بارے میں محدث ابن الصلاح 'مقدمہ' میں لکھتے ہیں:

"ابوطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ نے بالاتفاق تمام صحابہ کے آخر میں ١٠٠ھ میں وفات پائی۔" (مقدمہ علوم الحدیث، ص:١٥)

اسد الغابہ میں مرقوم ہے:

"ابوطفیل رضی اللہ عنہ نے ١٠٠ھ میں اور دوسرے قول کے مطابق ١١٠ھ میں وفات پائی۔ ان کی وفات سب صحابہ کے بعد ہوئی۔"

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ الاصابہ میں لکھتے ہیں:

"دوسری شرط معاصرت ہے جس کا اندازہ ١١٠ھ کے گزر جانے سے لگایا جاتا ہے اس لیے کہ نبی ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں صحابہ کو مخاطب کر کے

فرمایا تھا کہ ''آج جو جاندار روئے زمین پر زندہ ہیں ایک سو سال گزرنے کے بعد ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہے گا۔'' بخاری و مسلم نے یہ حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ مسلم نے بروایت جابر رضی اللہ عنہ یہ اضافہ کیا ہے کہ آپ نے یہ الفاظ اپنی وفات سے ایک ماہ پہلے فرمائے۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے ۱۱۰ھ کے بعد صحابی ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ محدثین نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ رتن ہندی بھی صحابیت کا دعویٰ کرنے والوں میں سے ایک ہیں۔'' (الاصابۃ ۸/۱)

حیرت کی بات ہے کہ جو حدیث نبوت کے ایک عظیم معجزہ پر مشتمل تھی، احمد امین کی تنقید جدید کی نذر ہو کر جھوٹی اور من گھڑت قرار پائی۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

استاذ احمد امین نے اس حدیث کی تکذیب کے سلسلہ میں جو موقف اختیار کیا ہے وہ بے حد عبرت ناک ہے۔ محدث ابن قتیبہ نے اپنی کتاب ''تاویل مختلف الحدیث'' میں نظام اور دیگر معتزلہ کے وارد کردہ اعتراضات ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ محدثین ایسی احادیث روایت کرتے ہیں جو خلافِ واقع ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے مذکورہ صدر حدیث کا ذکر بھی کیا ہے۔ محدث ابن قتیبہ نے معتزلہ کے اس اعتراض کا تقریباً وہی جواب دیا ہے جو ہم قبل ازیں ذکر کر چکے ہیں۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ استاذ احمد امین کے سامنے صرف ایک ہی نصب العین ہے کہ نقدِ جدید کی آڑ لے کر کسی نہ کسی طرح محدثین کو ہدف تنقید بنایا جائے اور ان کی 'خامیوں' کو منظر عام پر لایا جائے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص حدیث نبوی پر قدماء میں سے نظام و دیگر معتزلہ اور متاخرین میں سے مستشرقین کے اعتراضات سن کر اظہار مسرت کرتا ہوا سے محدثین کی جانب سے ابن قتیبہ کا دفاع کیسے پسند آئے گا؟

شارحین نے اس حدیث کی شرح میں جو کچھ لکھا ہے احمد امین نے مطلقاً اس کی طرف توجہ مبذول نہیں کی۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی تشریحات کو بھی نظر انداز کر دیا جو خود صحیح بخاری میں مذکور ہیں۔ صحیح مسلم میں منقول جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کو بھی ناقابل التفات قرار دیا۔ ان کے لیے حدیث کا صرف وہ ٹکڑا جاذب توجہ ثابت ہوا ہے جو صحیح بخاری کتاب العلم میں مذکور ہے۔

امام بخاری اس ضمن میں اس لیے معذور ہیں کہ وہ ایک ہی حدیث کے مختلف اجزاء کو متعدد ابواب میں ذکر کرنے کے عادی ہیں۔ مگر استاذ احمد امین کی اس فروگزاشت کے لیے کوئی وجہ جواز موجود نہیں کہ انہوں نے شارحین حدیث کے افکار ونظریات کو ذکر نہیں کیا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ صحیح بخاری کتاب العلم کی حدیث کے اس جزو کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ”حدیث کے اس ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ آج جو لوگ پشت زمین پر بقید حیات ہیں وہ سو سال کے بعد زندہ نہیں رہیں گے۔ دوسری روایات میں یہ تفصیل موجود بھی ہے جیسا کہ شعیب کی امام زہری سے منقول روایت جو کتاب الصلوٰۃ میں آگے آرہی ہے۔“

اس کے بعد ابن حجر نے ابن بطال اور امام نووی کی وہ عبارتیں نقل کی ہیں جو ہم قبل ازیں ذکر کر چکے ہیں۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ استاذ احمد امین نے فجر الاسلام کے آخر میں جہاں اہم مصادر و مآخذ کی فہرست پیش کی ہے وہاں فتح الباری شرح بخاری، قسطلانی علی البخاری اور شرح مسلم از نووی کا نام سرفہرست لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ امام بخاری نے یہ حدیث دو مقامات پر ذکر کی ہے۔ جہاں مختصر حدیث لکھی ہے وہاں شارحین نے مکمل روایت بیان کر دی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ احمد امین نے اگر اس حدیث کی مختلف روایات اور شارحین کے اقوال کو دیکھا تھا تو اس حدیث کو جھوٹ کیوں قرار دیا؟ اور اگر وہ شارحین کے ان اقوال سے آگاہ نہیں ہیں تو ان شروح کو مراجع و مآخذ میں کیوں شمار کیا بلکہ اس سے بڑھ کر ہم یہ پوچھتے ہیں کہ شروح حدیث کو دیکھے بغیر انہوں نے اس حدیث پر گفتگو کرنے کی جسارت کیوں کی؟

(حدیث رسول ﷺ کا تشریعی مقام، ص: ۳۴۸۔۳۵۲، ترجمہ: غلام احمد حریری)

اسی طرح کی اور بھی بہت سی صحیح احادیث ایسی ہیں جنہیں نا سمجھنے اور جہالت کی وجہ سے بعض نادان غلط قرار دیتے ہیں۔ ھداھم اللہ تعالیٰ!

رسالت
اور
سیرۃ النبی ﷺ

کیا شریف الطبع اہل کتاب جنت میں جا سکتے ہیں؟

سوال وہ لوگ جو اہل کتاب (یہودی، عیسائی) ہیں مگر نبی اکرم ﷺ اور قرآن پر ایمان نہیں رکھتے۔ کیا وہ جنت میں جائیں گے؟ کیونکہ قرآن مجید میں بعض مقامات پر کہا گیا ہے کہ جو بھی اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لائے بے شک وہ یہودی اور عیسائی وغیرہ ہو تو ان کے اعمال کو قبول کیا جائے گا یعنی وہ جنت میں داخل ہوں گے جیسا کہ سورۃ البقرۃ (آیت ۶۲) میں بتایا گیا ہے۔ کیا ان آیات کا یہی مطلب ہے؟

جواب جنت میں جانے کے لیے تمام ایمانیات پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ایمانیات میں یہ بات بھی ہے کہ تمام انبیاء و رسل علیہم السلام اور سماوی کتب پر ایمان لایا جائے۔ جو لوگ بعض رسولوں پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں انہیں قرآن حکیم میں پکے کافر کہا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا ۝ ﴾

(۴/النساء:۱۵۰۔۱۵۱)

”جو لوگ اللہ کے ساتھ اور اس کے پیغمبروں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق رکھیں اور جو کہتے ہیں کہ بعض نبیوں پر تو ہمارا ایمان ہے اور بعض پر نہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے اور اس کے بین بین کوئی راہ نکالیں۔ یقین مانو کہ یہ سب لوگ پکے کافر ہیں، اور کافروں کے لیے ہم نے اہانت آمیز سزا تیار کر رکھی ہے۔“

سب انبیاء و رسل علیہم السلام پر ایمان لانے کو ضروری قرار دیتے ہوئے ان آیات سے اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝ ﴾ (۴/النساء:۱۵۲)

''اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان لاتے ہیں اور ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے، یہ ہیں جنہیں اللہ پورا ثواب دے گا اور اللہ بڑی مغفرت والا، بڑی رحمت والا ہے۔''

﴿ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ ﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت میں اعمال کا صلہ انہیں لوگوں کو ملے گا جو سب رسولوں پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ اہل کتاب بھی اس وقت حق پر تھے جب اپنے اپنے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم پر عمل پیرا تھے۔ انہیں جیسا ایمان لانے کا کہا گیا تھا ویسا ایمان لائے۔ نہ یہ کہ کسی خاص خاندان، نسل اور گروہ سے تعلق کی وجہ سے ان کی نجات ہو جائے گی۔ سورۃ البقرۃ (اور اسی طرح ۵/المائدۃ:۶۹ اور ۲۲/الحج:۱۷) میں اسی مسئلہ کو بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴾ (۲/البقرۃ:۶۲)

''مسلمان، یہودی، نصاریٰ یا صابی ہوں، جو کوئی بھی اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے ان کے اجر اُن کے رب کے پاس ہیں اور ان پر نہ تو کوئی خوف ہے اور نہ اداسی۔''

یہ آیت ایمانیات کی تفصیل بتانے کے لیے نازل نہیں ہوئی بلکہ یہ بتانے کے لیے نازل ہوئی ہے کہ کامیابی کسی خاص گروہ سے تعلق کی وجہ سے نہیں بلکہ ایمان اور عمل صالح کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ سورۃ البقرہ کا بنیادی موضوع ہی نبی اکرم ﷺ اور قرآن پر ایمان لانے کی دعوت ہے، یہ دعوت اہل کتاب کے سامنے پیش کی گئی ہے۔ مثلاً درج ذیل آیات میں ایسے لوگوں کو صریحاً کافر کہا ہے جو قرآن پر ایمان نہیں لاتے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ۝ وَآمِنُوا بِمَا أَنزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا

تَكُونُوٓا أَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهِۦ ۖ وَلَا تَشۡتَرُوا بِـَٔايَٰتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَإِيَّٰيَ فَٱتَّقُونِ﴾

(۲/البقرۃ:۴۰۔۴۱)

''بنی اسرائیل! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کی اور میرے عہد کو پورا کرو میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا اور مجھی سے ڈرو۔ اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جو میں نے تمہاری کتابوں کی تصدیق میں نازل کی ہے اور اس کے ساتھ تم ہی پہلے کافر نہ بنو اور میری آیتوں کو تھوڑی تھوڑی قیمت پر نہ فروخت کرو اور مجھی سے ڈرو۔''

یہ بھی ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے بغیر قرآن پر ایمان نہیں لایا جا سکتا۔ جب یہاں قرآن اور نبی اکرم ﷺ پر ایمان نہ لانے کو کفر قرار دیا تو چند آیات کے بعد اس طرح کی آیت کیسے آسکتی تھی جس کا مفہوم یہ ہو کہ قرآن مجید یا نبی اکرم ﷺ پر ایمان لائے بغیر اہل کتاب کی نجات ہو سکتی ہے۔ ﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ ٱلۡقُرۡءَانَ ۚ وَلَوۡ كَانَ مِنۡ عِندِ غَيۡرِ ٱللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ ٱخۡتِلَٰفًا كَثِيرًا﴾ (۴/النساء:۸۲)

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو قرآن پر ایمان لانے کا حکم دیا اور ایمان نہ لانے کی صورت میں سخت وعید سنائی، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ أُوتُوا ٱلۡكِتَٰبَ ءَامِنُوا بِمَا نَزَّلۡنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُم مِّن قَبۡلِ أَن نَّطۡمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا عَلَىٰٓ أَدۡبَارِهَآ أَوۡ نَلۡعَنَهُمۡ كَمَا لَعَنَّآ أَصۡحَٰبَ ٱلسَّبۡتِ ۚ وَكَانَ أَمۡرُ ٱللَّهِ مَفۡعُولًا﴾ (۴/النساء:۴۷)

''اہل کتاب! جو کچھ ہم نے نازل کیا ہے جو اس کی بھی تصدیق کرنے والا ہے جو تمہارے پاس ہے، اس پر ایمان لاؤ اس سے پہلے کہ ہم چہرے بگاڑ دیں اور انہیں لوٹا کر پیٹھ کی طرف کر دیں، یا ان پر لعنت بھیجیں جیسے ہم نے ہفتے کے دن والوں پر لعنت کی اور ہے اللہ کا کام کیا گیا۔''

سورۃ البقرۃ کی آیت ۶۲ سے ملتی جلتی آیت سورۃ المائدۃ میں بھی ہے۔ وہاں سیاق وسباق دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اہل کتاب قرآن پر ایمان نہ لائیں تو وہ کافر ہیں۔ قرآن پر

ایمان لائے بغیر اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی کوئی بنیاد نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴾

(۵/المائدۃ:۶۹)

''مسلمان، یہودی، ستارہ پرست اور نصرانی کوئی بھی ہوں، جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لائیں اور نیک عمل کریں تو اُن پر کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے۔''

اس آیت سے پہلی آیت میں فرمایا:

﴿ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ ۗ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۖ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴾ (۵/المائدۃ:۶۸)

''آپ کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب! تم دراصل کسی چیز پر نہیں جب تک کہ تورات وانجیل کو اور جو کچھ تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے اترا ہے اسے قائم نہ رکھو اور جو کچھ آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے وہ ان میں سے بہت سوں کو شرارت اور انکار میں اور بھی بڑھائے گا۔ تو آپ ان کافروں پر غمگین نہ ہوں۔''

تورات اور انجیل کے بعد جو ﴿ مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ ﴾ فرمایا گیا اس سے مراد قرآن مجید ہے۔ (نیز دیکھیے ۵/المائدۃ:۶۶)

یہاں تورات اور انجیل کو قائم کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ قرآن مجید اور محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لاؤ کیونکہ ان پر ایمان لانے سے ہی وہ عہد پورا ہوگا جو اُن کتابوں میں نبی اکرم ﷺ کے بارے میں ان سے لیا گیا ہے۔

﴿ يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ ﴾ (۷/الاعراف:۱۵۷)

سورۃ البقرۃ آیت ۶۲ کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اپنے وقت میں جو نبی ہوئے ان

پر ایمان لانے والے خواہ کسی گروہ اور قوم سے ہوں وہ جنت میں جائیں گے۔ جنت کسی خاص قوم کے لیے مخصوص نہیں جیسا کہ یہود و نصاریٰ سوچتے تھے اور ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ (۵/المائدۃ:۱۸) کی صدا لگاتے تھے۔ جو بھی ایمان لائے اور نیک عمل کرے اسے جنت کی بشارت ہے۔ نبی آخر الزمان ﷺ کی بعثت کے بعد آپ پر ایمان لازم ہے اور آپ ﷺ کا پیش کردہ دین ہی قابل قبول ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ (۳/آل عمران:۸۵)

”جو شخص اسلام کے سوا اور دین تلاش کرے اس کا دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں ہوگا۔“

ارشاد نبوی ہے:

((وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَا يَسْمَعُ بِيْ اَحَدٌ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ يَهُوْدِيٌّ وَلَا نَصْرَانِيٌّ ثُمَّ يَمُوْتُ وَ لَمْ يُؤْمِنْ بِالَّذِيْ اُرْسِلْتُ بِهٖ اِلَّا كَانَ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ))

(مسلم، الایمان، وجوب الایمان برسالۃ نبینا محمد ﷺ، ح:۱۵۳)

”قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے! میری اس امت میں جو بھی میری بابت سن لے، وہ یہودی ہو یا عیسائی، پھر وہ اس چیز پر ایمان نہ لائے جو میں دے کر بھیجا گیا ہوں اور اس کی (اسی حالت میں) موت واقع ہو جائے تو وہ جہنم والوں میں سے ہوگا۔“

یہود و نصاریٰ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں واضح طور پر کافر و مشرک قرار دیا ہے۔
(دیکھیے ۹/التوبۃ:۳۰۔۳۱ اور ۵/المائدۃ:۷۲۔۷۳)

قرآن مجید میں یہ بات بھی واضح طور پر بیان کی گئی ہے نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے بعد وہی لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مستحق ہوں گے جو نبی آخر الزمان اور قرآن پر ایمان لائیں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ

قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ۖ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ۖ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ۖ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ۝ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ۖ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۖ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ (۷/الاعراف:۱۵۵۔۱۵۶)

’’اور موسیٰ نے ستر آدمی اپنی قوم میں سے ہمارے وقتِ معین کے لیے منتخب کئے تو جب انہیں زلزلے نے آپکڑا تو موسیٰ عرض کرنے لگے کہ اے میرے پروردگار! اگر تجھے یہ منظور ہوتا تو اس سے قبل ہی انہیں اور مجھے ہلاک کر دیتا۔ کیا تو ہم میں سے چند بے وقوفوں کی حرکت پر ہم سب کو ہلاک کر دے گا؟ یہ واقعہ محض تیری طرف سے ایک امتحان ہے، ایسے امتحانات سے جسے تو چاہے گمراہی میں ڈال دے اور جسے چاہے ہدایت پر قائم رکھے۔ تُو ہی تو ہمارا کارساز ہے پس ہماری مغفرت کر اور ہم پر رحمت نازل کر اور تُو سب معافی دینے والوں سے زیادہ اچھا ہے۔ اور ہم لوگوں کے نام دنیا میں بھی بھلائی لکھ دے اور آخرت میں بھی، ہم تیری طرف رجوع کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا: مَیں اپنا عذاب اسی پر واقع کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں اور میری رحمت تمام اشیاء پر محیط ہے۔ لہٰذا وہ رحمت ان لوگوں کے نام ضرور لکھوں گا جو (اللہ سے) ڈرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔‘‘

مزید برآں نبی اکرم ﷺ کی عالمگیر دعوت کے کئی دلائل ہیں۔ اچھے برے سب لوگوں کے لیے آپ پر ایمان لانا ضروری ہے۔ کسی کے اچھے ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آخری پیغمبر پر ایمان لائے بغیر اس کی نجات ہو سکتی ہے۔ ہاں یہ حقیقت ہے کہ حق پسندی اور تقویٰ کی وجہ سے اچھے لوگوں کا رویہ اسلام کے ساتھ اچھا تھا۔ اسی اچھائی کی وجہ سے اس قسم کے سب لوگ خاتم المرسلین ﷺ پر ایمان لے آئے تھے۔ ان کے اسی رویہ کی وجہ سے قرآن

نے ان کی تعریف کی ہے۔ اہل کتاب کے لیے بھی (اچھے ہوں یا برے) ضروری ہے کہ وہ آپ ﷺ پر ایمان لے آئیں۔ اس لیے کہ آپ کی بعثت تمام دنیا کے لوگوں کے لیے ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰۗىِٕثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ (۷/الاعراف:۱۵۷)

''جو لوگ ایسے رسول نبی امی کی اتباع کرتے ہیں جنہیں وہ لوگ اپنے پاس تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں وہ انہیں نیک باتوں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں اور پاکیزہ چیزوں کو حلال بتاتے ہیں اور گندی چیزوں کو اُن پر حرام کرتے ہیں اور ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے انہیں دُور کرتے ہیں۔ سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور اس نُور کی پیروی کرتے ہیں جو اُن کے ساتھ بھیجا گیا ہے، ایسے لوگ ہی فلاح پانے والے ہیں۔''

(اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ فلاح پانے کے لیے نبی کی حمایت کرنا ہی کافی نہیں بلکہ ایمان لانے کے بعد آپ کی حمایت ونصرت کی جائے تو فلاح ونجات حاصل ہوتی ہے جیسے ابوطالب کی مثال ہے جس نے حمایت تو کی مگر ایمان قبول نہ کیا۔)

ایک اور مقام پر ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۗفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (۳۴/سبا:۲۸)

''ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے خوشخبریاں سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے مگر لوگوں کی اکثریت بے علم ہے۔''

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۙ ﴾

(۲۵/الفرقان:۱)

''بہت بابرکت ہے وہ اللہ جس نے اپنے بندے پر فرقان اتارا تاکہ وہ تمام لوگوں کے لیے آگاہ کرنے والا بن جائے۔''

﴿ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ﴾ سے آپ ﷺ کی عالمگیر بعثت ثابت ہوتی ہے۔علاوہ ازیں ارشادِ نبوی ہے:

((اُعْطِيْتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ اَحَدٌ قَبْلِيْ نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيْرَةَ شَهْرٍ وَجُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُوْرًا فَاَيُّمَا رَجُلٍ مِنْ اُمَّتِيْ اَدْرَكَتْهُ الصَّلَاةُ فَلْيُصَلِّ وَاُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ وَلَمْ تَحِلَّ لِاَحَدٍ قَبْلِيْ وَاُعْطِيْتُ الشَّفَاعَةَ وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً)) (بخاری،التیمم،ح:۳۳۵)

''مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئی تھیں؛ایک مہینہ کی مسافت سے رعب کے ذریعہ میری مدد کی گئی ہے اور تمام زمین میرے لیے سجدہ گاہ اور پاکی کے لائق بنائی گئی۔لہٰذا میری امت کے جس آدمی کو (جہاں بھی) نماز (کا وقت) پالے اسے وہاں نماز ادا کرلینی چاہیے۔اور میرے لیے غنیمت کا مال حلال کیا گیا ہے۔اور مجھ سے پہلے یہ کسی کے لیے بھی حلال نہ تھا۔اور مجھے شفاعت عطا کی گئی۔اور تمام انبیاء اپنی اپنی قوم کے لیے مبعوث ہوتے تھے لیکن میں تمام انسانوں کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔''

جبریل علیہ السلام دحیہ کلبی کی شکل میں کیوں آتے تھے؟

سوال دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کون تھے؟ ان کی کیا خصوصیت تھی کہ جبریل علیہ السلام ان کی شکل میں آتے تھے؟

جواب دحیہ بن خلیفہ بن فروہ بن فضالہ مشہور صحابی ہیں۔مالدار تاجر تھے،نبی ﷺ

کی خدمت میں تحائف بھیجا کرتے تھے۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: پہلا غزوہ جس میں وہ شریک ہوئے غزوہ خندق ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ سب سے پہلے غزوہ احد میں شریک ہوئے تھے البتہ بدر میں شریک نہیں تھے۔ (الاصابة فی تمییز الصحابة، حرف الدال ، د ح:۲۳۹۰)

دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ نے اور بھی کئی غزوات میں شرکت کی۔ غزوہ یرموک میں فوج کے ایک دستے کی کمان بھی آپ کے ہاتھ میں تھی۔ آپ غزوہ خیبر میں بھی شریک تھے۔

جب غزوہ خیبر کے قیدی تقسیم کیے گئے تو صفیہ بنت حیی بن اخطب (جو کہ یہودی سردار کی بیٹی تھیں) دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کے حصے میں آئیں۔ صفیہ رضی اللہ عنہا بہت حسین وجمیل تھیں۔

(دیکھیے بخاری، المغازی، غزوۂ خیبر، ح:۴۲۱۱)

مگر دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کے صفیہ رضی اللہ عنہا کو حاصل کر لینے کے وقت اختلاف ہوگیا۔ لوگوں نے کہا کہ صفیہ بنوقریظہ اور بنونضیر کی سیدہ یعنی سردار کی بیٹی ہیں اور ایسی عورت بہتر ہے کہ نبی اکرم ﷺ اپنے لیے مختص کر لیں۔ گویا ان صحابہ کے نزدیک شاہ دو عالم ﷺ کا گھر ہی خیبر کی اس شہزادی کے شایانِ شان تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے انہیں آزاد کر کے خود ان سے نکاح کر لیا۔ (رحمۃ للعالمین ۲/۱۷۹)

یوں صفیہ رضی اللہ عنہا کو ام المومنین ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

۵ھ میں دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کو ہرقل کے پاس نبی اکرم ﷺ کا خط پہنچانے کا کام سپرد کیا گیا، جس میں ہرقل کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ (دیکھیے مسند احمد ۱/۲۶۳)

اس موقع پر دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ نے اپنا منصب بیان کرنے کے لیے اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کا پیغام رساں اور ایلچی (رسولُ رسولِ اللّٰہ) قرار دیا۔

(دیکھیے سیر اعلام النبلاء از امام ذہبی ۲/ ۳۹۷)

ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

ہمارے نزدیک دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی مرویات کی تعداد چھ تک ہے۔

(الاصابة، رقم:۲۳۹۰)

آپ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت تک زندہ رہے۔ (ایضاً)

دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کو یہ بھی شرف حاصل ہے کہ جبریل علیہ السلام اکثر ان کی شکل میں تشریف

لاتے تھے۔ (کبھی کبھی اجنبی آدمی کی شکل میں بھی آجایا کرتے تھے جیسا کہ مسلم، الایمان میں 'حدیثِ جبریل' ہے)۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

كان جبريل ياتى النبى ﷺ فى صورة دحية الكلبى

(مسند احمد ۲/ ۱۰۷)

دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ بہت حسین و جمیل تھے۔ مدینہ میں ان کے حسن و جمال کے چرچے تھے۔ عجلی نے اپنی تاریخ میں عوانہ بن حکم سے روایت کی ہے اور کہا:

دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ اجمل الناس (لوگوں سے زیادہ حسین) تھے۔ (الاصابۃ، حرف: د)

ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

خوبصورتی میں دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ ضرب المثل تھے۔ (ایضاً)

خود نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

((كَانَ جِبْرِيْلُ يَاْتِيْنِىْ عَلٰى صُوْرَةِ دِحْيَةَ الْكَلْبِىْ وَكَانَ دِحْيَةُ رَجُلًا جَمِيْلًا))

''جبریل میرے پاس دحیہ کلبی کی صورت میں آتے ہیں اور دحیہ خوبصورت آدمی ہیں۔''

(اس روایت کو طبرانی نے روایت کیا ہے۔ ایضاً، نوٹ: طبرانی کبیر، ح: ۷۵۸؛ اوسط، ح: ۷۔ اس کی سند میں قتادہ مدلس اور عفیر بن معدان ضعیف راوی ہیں۔ محمد ارشد کمال)

مذکورہ بالا روایات اور حالات و واقعات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کے حسن و جمال کی وجہ سے ہی جبریل علیہ السلام ان کی صورت اختیار کر کے نبی ﷺ کے پاس آیا کرتے تھے۔ طبرانی کی روایت کے الفاظ ((كَانَ جِبْرِيْلُ يَاْتِيْنِىْ عَلٰى صُوْرَةِ دِحْيَةَ الْكَلْبِىْ وَكَانَ دِحْيَةُ رَجُلًا جَمِيْلًا)) بھی اس کی ایک دلیل ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

نبی ﷺ اپنے پیچھے کھڑے نمازیوں کو دیکھتے تھے؟

سوال میں نے ایک مولوی صاحب کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ حضرت محمد ﷺ جب حالتِ نماز میں ہوتے تو اپنے پیچھے کھڑے نمازیوں کو اُن کی طرف چہرہ مبارک کیے بغیر دیکھ لیا

کرتے تھے، کیا اس طرح کی کوئی بات قرآن وحدیث سے ثابت ہے؟ اگر ہے تو اس کا صحیح مطلب بھی واضح کر دیجیے۔

جواب حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((اَقِيْمُوْا صُفُوْفَكُمْ فَاِنِّيْ اَرَاكُمْ مِّنْ وَّرَاءِ ظَهْرِيْ)) و كان احدنا يلزق منكبه بمنكب صاحبه و قدمه بقدمه

(بخاری ، الاذان ، الزاق المنكب بالمنكب والقدم بالقدم فی الصف، ح:۷۲۵)

''صفوں کو سیدھا کیا کرو، میں تمہیں پس پشت بھی دیکھتا ہوں۔ (انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ) ہم میں سے ہر شخص (صفوں میں) اپنا کندھا دوسرے کے کندھے اور اپنا قدم دوسرے کے قدم سے ملا دیتا تھا۔''

اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ کے معجزے کا ذکر ہے۔ معجزہ یا کرامت کی حقیقت سمجھنے کے لیے درج ذیل نکات قابل غور ہیں:

① انسان کا وجود، اس کی عقل، طاقت، جملہ عادات، خصائل اور خوبیاں سب اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہوتی ہیں۔

② انسانی عادت اور روٹین ہے کہ جس کام میں بھی کسی آدمی کی عقل اور طاقت صرف ہوتی ہے وہ کام کتنا ہی انوکھا کیوں نہ ہو دوسرے آدمی بھی محنت و مشق کر کے وہ کام کر ہی لیتے ہیں۔

③ لیکن جس کسی آدمی سے ایسا کام صادر ہو جو عام قانون قدرت سے ہٹا ہوا ہو اُس میں کسی علم یا فن کا عمل دخل نہ ہو اور اسباب و وسائل کو بھی استعمال میں نہ لایا گیا ہو نیز ہر خاص و عام اس کے مقابلے سے یا تو سرے سے ہی عاجز ہو یا اسباب و وسائل کے بغیر عاجز ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس آدمی سے یہ کارنامہ سرزد ہوا ہے اس میں محض اس کی عقل اور طاقت کام نہیں کر رہی بلکہ اسے کسی غیبی طاقت کی ''اَن دیکھی مدد'' حاصل ہے۔

④ اگر ایسا کام کسی نبی اور رسول سے صادر ہو تو اسے معجزہ کہتے ہیں اور اگر کسی صحیح العقیدہ (اور صالح) عالم دین اور متبع سنت (ولی اللہ) سے صادر ہو تو اسے کرامت کہتے ہیں۔

⑤ لوگوں سے انبیاء ورسل کی صداقت منوانے کے لیے اللہ تعالیٰ انہیں عموماً دو چیزوں سے

نوازتے ہیں: (أ) دلیل و برھان کی طاقت۔ (ب) مختلف معجزات کا صادر ہونا۔

⑥ یہ تو ہوسکتا ہے کہ کسی نبی کو معجزہ نہ ملے مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اسے دلیل و برھان کی طاقت سے محروم رکھا گیا ہو۔

⑦ جس نبی کو بھی معجزہ ملا اس نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اسباب و وسائل کو اِستعمال میں لائے بغیر ہر قسم کا کارنامہ دکھانا میری طاقت میں ہے یا میرے کارِ منصبی میں داخل ہے اور نہ ان کے صحابہ نے ہی یہ عقیدہ رکھا کہ وہ ان معجزات کی بنیاد پر اسباب عادیہ کے بغیر دوسرے انسانوں کے حاجت روا اور مشکل کشا ہیں۔

⑧ کسی بھی عام آدمی کی دعوت (عقیدہ و عمل) کی سچائی (ا) قرآن مجید (ب) مقبول احادیث (ج) صحابہ کرام کے مجموعی فہم و عمل اور (د) اجماع امت سے پرکھی جائے گی، اگر اس کی دعوت اور طرزِ عمل اس معیار پر پورا اُترتا ہے تو اس سے ظاہر ہونے والا خلافِ عادت کام ''کرامت'' ہوگا، ورنہ نہیں۔

⑨ اگر بدعقیدہ اور بدعمل ہونے کے باوجود اس سے امورِ عجیبہ ظاہر ہوتے ہیں تو اس کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں:

(أ) اللہ تعالیٰ نے اس کی رسی دراز کر دی ہے تا کہ وہ اور اس کے پیروکار زیادہ سے زیادہ عذابِ آخرت کے مستحق بنیں۔

(ب) اس نے مختلف شرکیہ ''عمل'' کر کے جنوں اور شیاطین کا قرب حاصل کیا ہوا ہے جو اُس کے ساتھ نظر نہ آنے والا تعاون کرتے اور اسے پیشگی خبریں پہنچاتے ہیں۔

⑩ الغرض معجزہ اور سچی کرامت اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد، طاقت اور حکم سے رونما ہوتی ہے جبکہ جھوٹی کرامتوں میں شیاطین کی ان دیکھی مدد کام کر رہی ہوتی ہے۔ بندہ اپنی طاقت سے ایسے امورِ عجیبہ کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔

⑪ حالت نماز میں قبلہ رخ ہونے کے باوجود پیچھے کھڑے نمازیوں پر نظر رکھنا واقعی نبی اکرم ﷺ کا معجزہ تھا، مگر یہ کیفیت ہر وقت نہیں ہوتی تھی بلکہ جب اللہ تعالیٰ چاہتا تھا ایسے ہوتا تھا۔ اور جب نہیں چاہتا تھا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ صحیح حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نماز

پڑھا رہے تھے جب ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ)) کہا تو پیچھے سے ایک آدمی نے یہ دعا پڑھی: ((رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيرًا......)) تو سلام پھیرنے کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ((مَنِ الْمُتَكَلِّمُ؟)) ''دعا کس نے پڑھی تھی؟'' (بخاری، الاذان، ح:۷۹۹)

⑫ ایک رات نبی اکرم ﷺ اپنے بستر سے اٹھ کر باہر چلے گئے، عائشہ رضی اللہ عنہا بھی آپ کے پیچھے باہر نکل گئیں۔ آپ ﷺ نے بقیع غرقد (مدینہ منورہ کا قبرستان) پہنچ کر دعائے مغفرت کی اور واپس آ گئے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ سے پہلے بستر پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئیں۔ لیکن سانس پھولی ہوئی تھی، نبی ﷺ نے وجہ دریافت کی، عائشہ رضی اللہ عنہا نے ٹالنا چاہا، آپ ﷺ نے فرمایا:

''عائشہ بتا دیں ورنہ اللہ مجھے بتا دے گا۔''

اس پر ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے ساری بات بتا دی۔

(مسلم ، الجنائز ، ما يقال عند دخول القبور والدعاء لأهلها ، ح: ۹۷۴)

اس سے معلوم ہوا کہ گھر سے نکلتے وقت عائشہ رضی اللہ عنہا کو معلوم نہ تھا کہ نبی اکرم ﷺ کدھر اور کیوں جا رہے ہیں اور نبی اکرم ﷺ کو بھی معلوم نہ ہوا کہ عائشہ (رضی اللہ عنہا) میرے پیچھے گئی تھی۔ (نماز نبوی ص:۱۲۶، ۱۲۷)

صفوں پر نبی ﷺ کا نام گرامی ''محمد'' (ﷺ)

سوال لاہور کے ایک مشہور مدرسہ کی طرف سے جاری ہونے والا ایک فتویٰ کاپی در کاپی ہو کر آج کل عام گردش کر رہا ہے۔ جس پر کئی مفتیان کے دستخط ہیں۔ جس کی روشنی میں عوام الناس کافی پریشان ہیں اور صحیح صورت معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ وہ اس فتویٰ سے مطمئن نہیں ہیں۔ اس فتویٰ میں کہا گیا ہے کہ بعض پلاسٹک کی بنی ہوئی صفوں کے اوپر نبی ﷺ کا نام گرامی ''محمد'' کندہ ہے۔ (فتویٰ کی کاپی حاضر خدمت ہے۔) اگر آپ نے یہ صفیں دیکھی ہوں تو بتائیں کہ کیا یہ فتویٰ درست ہے؟ اگر یہ فتویٰ درست ہو تو ایسی صفوں کا استعمال کیا ہونا چاہیے؟ نیز یہ بھی بتائیے کہ ایسی صفیں بنانے والوں کے بارے میں شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب یہ مسئلہ اس سے پہلے بھی کئی لوگوں نے مجھ سے دریافت کیا ہے۔ نیز یہ صفیں

دیکھنے کا مجھے کئی بار اتفاق ہوا ہے۔ یہ صفیں اکثر وبیشتر مساجد میں دستیاب ہوں گی۔ مَیں جس مسجد میں خطبہ دیتا ہوں وہاں بھی بعض لوگوں نے میری توجہ اس جانب مبذول کروائی۔ نیز دینی مدرسے کی طرف سے جاری ہونے والا فتویٰ بھی مجھے کئی لوگوں نے دکھایا ہے۔ جس کی ایک کاپی آپ نے بھی ارسال کی ہے۔

صفوں کو بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فتویٰ درست نہیں کیونکہ جن لکیروں کو ملا کر نبی ﷺ کا نام قرار دیا گیا ہے ان سے کسی بھی صورت میں آپ کا نام ''محمد'' ﷺ نہیں بنتا۔ ان لکیروں سے ''م'' بنتی ہے نہ ''ح'' نہ ''د'' ان لکیروں کو نبی ﷺ کا نام قرار دینا اور پھر ان صفوں کے بنانے والوں کو توہینِ رسالت کا مرتکب قرار دینا غلط ہے۔ اس طرح بے دلیل اور بے بنیاد اشتعال انگیز فتوے دینے سے اسلام اور علمائے کرام کا وقار بھی مجروح ہوتا ہے۔

کسی مسلمان سے اس قسم کا کوئی تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ نبی ﷺ کے نام کے ساتھ ایسی قبیح حرکت کرسکتا ہے۔

صفیں بنانے والوں کے نام پیغام

سوال یہ ہے کہ اس طرح کے سوالات آئے روز کیوں اٹھتے رہتے ہیں؟ مَیں سمجھتا ہوں کہ صف اور جائے نماز کے اوپر بنائے جانے والے نقش ونگار اور شبیہات اس کا واحد سبب ہیں۔ صفیں اور جائے نماز بنانے والوں سے میری گزارش ہے کہ وہ انہیں سادہ رکھیں جو کہ اسلام کی روح کے قریب ہے کیونکہ بصورت دیگر نماز میں ان کی طرف توجہ مبذول ہوسکتی ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ کسی کو اِس قسم کی فتویٰ بازی کا بھی موقع نہیں ملے گا۔ کیونکہ صفوں پر نقش ونگار ہونے کی صورت میں کوئی نہ کوئی لفظ بن سکتا ہے۔ اگر کوئی سیدھا دیکھے تو اور لفظ، الٹا دیکھے تو دوسرا اور اگر ترچھا دیکھے تو کوئی تیسرا لفظ دکھائی دے سکتا ہے۔ جائے نماز اور صفوں کو سادہ رکھنے سے ان تمام شکوک وشبہات اور اشکالات سے بچا جاسکتا ہے۔

صحن کی ٹائل پر پیغمبر کا نام ''محمد'' (ﷺ)

سوال مسجد کے صحن میں ایک ٹائل پر لفظ ''محمد'' لکھا ہوا ہے۔ مسجد کی انتظامیہ نے اُس کے گرد دُرکاوٹ لگا کر محفوظ کر رکھا ہے تاکہ بے ادبی نہ ہو لیکن نماز کی صف ٹوٹ جاتی

ہے۔اہلِ مسجد کا یہ عمل کیسا ہے اور اس کا صحیح حل کیا ہے؟

جواب لفظ محمد (ﷺ) کو مسجد کے صحن میں لگانا ہی بے ادبی ہے۔اسے کسی مناسب اور اونچی جگہ منتقل کیا جائے تاکہ بے ادبی بھی نہ ہو نیز صفوں میں خلل بھی واقع نہ ہو۔کیونکہ صفوں کو برابر اور پورا کرنا نماز کا حصہ ہے۔(جواب از پروفیسر عنایت اللہ مدنی)

گستاخِ رسول کی دنیوی سزا؟

سوال ایک اعلیٰ سطحی اجلاس میں چند پروفیسر حضرات نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ ڈنمارک، ناروے اور دیگر ممالک کے حکمرانوں سے کہیں کہ وہ توہین آمیز خاکے بنانے اور چھاپنے والوں کو اپنے ملکی قوانین کے مطابق سزا دیں۔کچھ نے کہا کہ انہیں سخت سزا دی جائے جبکہ بعض شرکائے مجلس نے کہا کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق گستاخانِ رسول کی سزا قتل ہے۔لہٰذا متعلقہ ممالک سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ توہینِ رسالت کے مرتکب افراد کو ہمارے حوالے کریں تاکہ ان کے سر قلم کیے جائیں۔کیا توہینِ رسالت کے مرتکب کی سزا قتل ہی ہے خواہ وہ مسلم ہی کیوں نہ ہو؟

جواب شانِ رسالت میں گستاخی کرنے والوں کی سزا قتل ہے۔اس میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں۔عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں توہینِ رسالت کے مرتکب افراد کو قتل کیا جاتا تھا۔

نبی اکرم ﷺ نے ایک دفعہ فرمایا:

((مَنْ لِكَعْبِ بْنِ الْاَشْرَفِ فَإِنَّهُ قَدْ اٰذَى اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ))

(بخاری، المغازی، قتل کعب بن الاشرف، ح:۴۰۳۷)

''کعب بن اشرف کا کون کام تمام کرے گا؟ کیونکہ اُس نے اللہ اور اس کے رسول کو بہت اذیت پہنچائی ہے۔''

آپ کا یہ فرمان سن کر محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا:

يا رسول الله! اتحب ان اقتله؟ فقال: ((نَعَمْ))

''اللہ کے رسول! کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اسے قتل کر آؤں؟ آپ نے فرمایا: ہاں (میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے قتل کر دیں۔)''

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے بڑی حکمت اور دانائی کے ساتھ اپنے ساتھیوں سمیت اس تک رسائی حاصل کی۔

فلما استمكن منه قال دونكم فقتلوه ثم اتوا النبى ﷺ فاخبروه (ایضاً)

''جب محمد بن مسلمہ نے اسے پوری طرح قابو میں کرلیا تو اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا کہ تیار ہو جاؤ تو انہوں نے اسے قتل کر دیا اور نبی ﷺ کے پاس آکر اس کی اطلاع دی۔''

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کعب بن اشرف کے بارے میں فرماتے ہیں:

كان شاعرا يهجو رسول الله ﷺ (فتح الباری)

''وہ شاعر بھی تھا اور رسول اللہ ﷺ کی ہجو کرتا تھا۔''

حدیث کے الفاظ ((فَإِنَّهُ قَدْ آذَى اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ)) بھی اس پر دلالت کناں ہیں۔

ایک یہودی ابورافع کے بارے میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

وكان ابو رافع يؤذى رسول الله ﷺ ويعين عليه

(بخاری ، المغازی ، قتل ابی رافع عبداللہ بن ابی الحقیق ، ح:۴۰۳۹)

''ابو رافع رسول اللہ ﷺ کو ایذا دیا کرتا تھا اور آپ کے خلاف آپ کے دشمنوں کی مدد کیا کرتا تھا۔''

نبی اکرم ﷺ نے عبداللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ کی سرپرستی میں پانچ آدمیوں کو گستاخ یہودی کے قتل پر مامور کیا۔ عبداللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ نے اس کے قلعے میں گھس کر بڑی تسلی سے اس کا کام تمام کیا اور لوگوں سے کہا:

انطلقوا فبشروا رسول الله ﷺ (ایضاً، ح:۴۰۴۰)

''تم لوگ جاؤ اور رسول اللہ ﷺ کو خوشخبری سناؤ۔''

بعد ازاں ان لوگوں کے پہنچنے سے پہلے ہی عبداللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کے پاس پہنچ گئے، فرماتے ہیں:

فبشرته (ایضاً)

''مَیں نے آپ کو خوشخبری سنائی۔''

اس روایت میں آنے والے الفاظ فبشروا اور بشرته سے معلوم ہوتا ہے کہ گستاخِ رسول کے قتل کی خبر کو خوشخبری کہا گیا ہے۔

معاذ بن عفراء اور معوذ بن عفراء رضی اللہ عنہما دو نوجوان تھے۔ ان نوجوانوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ ابوجہل ہمارے پیغمبر کو گالیاں دیتا ہے ہم اس کا کام تمام کر کے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا عزم پورا کر دیا۔ گستاخِ رسول کے قلع قمع کی کہانی عبداللہ بن عوف رضی اللہ عنہ کی زبانی سنیے، فرماتے ہیں:

بدر کی لڑائی کے موقع پر مَیں صف میں کھڑا ہوا تھا۔ مَیں نے مڑ کر دیکھا تو میری دائیں اور بائیں طرف دو نوجوان کھڑے تھے۔ ابھی مَیں ان کے متعلق کوئی فیصلہ بھی نہ کر پایا تھا کہ ایک نے مجھ سے چپکے سے پوچھا تا کہ اس کا رفیق سننے نہ پائے، چچا! مجھے ابوجہل تو دِکھا دیں۔ مَیں نے کہا: بھتیجے! تم اسے دیکھ کر کیا کرو گے؟ اس نے کہا: مَیں نے اللہ کے سامنے یہ عہد کیا ہے کہ اگر مَیں نے اسے دیکھ لیا تو اسے قتل کر کے رہوں گا یا پھر خود اپنی جان دے دوں گا۔ دوسرے نوجوان نے بھی اپنے ساتھی سے چھپاتے ہوئے مجھ سے یہی بات پوچھی۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت ان دونوں نوجوانوں کے درمیان میں کھڑے ہو کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ مَیں نے اشارے سے انہیں ابوجہل دکھا دیا۔ جسے دیکھتے ہی وہ دونوں باز کی طرح اس پر جھپٹے اور فوراً ہی اسے مار گرایا۔ یہ دونوں عفراء کے بیٹے تھے۔

(بخاری، فرض الخمس، من لم یخمس الاسلاب، ح:۳۱۴۱)

بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر شاتم رسول کو کوئی قتل کر دے تو قاتل سے کوئی قصاص یا دیت نہیں لی جائے گی اور گستاخِ رسول مقتول کا خون رائگاں جائے گا۔ ایک نابینا صحابی کی ام ولد نبی ﷺ کو سب وشتم کرتی تھی۔ صحابی نے اپنی رفیقہ حیات کو قتل کر دیا اور بعد ازاں وہ صحابی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا:

((اَلَا اِشْهَدُوْا اِنَّ دَمَهَا هَدَرٌ))

(ابوداؤد، الحدود، الحکم فیمن سب رسول اللہ ﷺ، ح:۴۳۶۱)

''لوگو! گواہ ہو جاؤ اس کا خون رائگاں گیا۔''

عمیر بن امیہ کی ایک بہن تھی، جب یہ نبی ﷺ کے پاس جانے کے لیے نکلتے تو یہ انہیں تکلیف دیتی اور نبی ﷺ کو گالی دیتی، وہ مشرک تھی۔ ایک دن عمیر نے اس کے لیے تلوار لپیٹ کر ساتھ اٹھالی اور اس کے پاس آئے اور اس سے اسے قتل کر دیا۔ اس عورت کے بیٹے کھڑے ہوگئے اور چیخنے لگے، ہمیں معلوم ہے، اسے کس نے قتل کیا؟ یہ کیسے ہوا کہ ہماری ماں قتل کر دی گئی جبکہ ان لوگوں کے ماں باپ بھی مشرک ہیں؟ جب عمیر کو خطرہ لاحق ہوا کہ وہ کہیں اس کے قاتل کے علاوہ کسی دوسرے کو قتل نہ کر دیں تو وہ نبی ﷺ کے پاس آئے اور سارے معاملے کی خبر دی، آپ نے فرمایا:

''کیا تُو نے اپنی بہن کو قتل کر دیا ہے؟''

انہوں نے کہا: ہاں!

نبی ﷺ نے پوچھا: ''تُو نے اسے کیوں قتل کیا ہے؟''

عمیر نے جواب دیا: وہ آپ کو بُرا بھلا کہہ کر مجھے تکلیف دیتی تھی۔

آپ نے اس عورت کے بیٹوں کی طرف پیغام بھیج کر ان قاتلوں کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے کسی اور کا نام لیا۔ آپ نے انہیں صحیح قاتل کے بارے میں بتایا اور اس عورت کا خون رائگاں قرار دیا۔ (طبرانی کبیر ۱۷/۶۴، ح:۱۲۴)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی گستاخِ رسول کو قتل کرنے کے قائل تھے۔ ایک آدمی نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بدتمیزی کرنے والے کو قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو اس پر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

لا واللہ ما کانت لبشر بعد محمد ﷺ

(ابوداؤد، الحدود، الحکم فیمن سب رسول اللہ ﷺ، ح:۴۳۶۳)

''نہیں محمد ﷺ کے بعد کسی بھی بشر کو یہ حق حاصل نہیں کہ اس کی گستاخی پر قتل کی سزا دی جائے۔''

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

اس آیت (البقرۃ کی آیت ۱۰۴ جس میں راعنا کہنے سے منع کیا گیا) کے بعد اہلِ ایمان

نے کہا:

من سمعتموه يقولها فاضربوا عنقه (فتح القدیر ۱/۱۲۵)

''جسے یہ کلمہ (راعنا) کہتے ہوئے سنو اُس کی گردن اڑادو۔''

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

كل من شتم النبى اوتنقصه مسلما كان او كافرا فعليه القتل

(الصارم المسلول ۵۲۵)

''ہر وہ آدمی جو نبی کو سب وشتم کرے یا آپ کی تنقیص وتحقیر کرے ایسا شخص مسلمان ہو یا کافر اسے قتل کیا جائے گا۔''

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

من سب رسول الله صلى الله عليه وسلم اوشتمه او عابه او تنقصه قتل، مسلما كان او كافرا (ایضا)

''جس نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر دشنام طرازی کی یا آپ کی طرف عیب منسوب کیا یا اس نے آپ کی تنقیص کی، خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر، اسے قتل کیا جائے گا۔''

مختلف ائمہ دین کے اقوال کی روشنی میں امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

تمام مکاتب کے علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ان التنقص له كفر مبيح للدم

''آپ کی تنقیص کرنے والا کافر اور مباح الدم ہے۔'' (ایضا)

ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا موقف تو ان کی کتاب کے نام سے ہی ظاہر ہے۔ الصارم المسلول علی شاتم الرسول (شاتمِ رسول کی گردن پر لہراتی ہوئی تلوار۔)

غازی علم دین شہید نے ۱۹۲۹ء میں گستاخِ رسول راج پال ملعون کو قتل کر کے مسلمانوں کی راہنمائی کے لیے تازہ مثال قائم کی۔

احادیث، اقوالِ صحابہ اور ائمہ دین کے فتاویٰ سے معلوم ہوا کہ توہینِ رسالت کا مرتکب واجب القتل ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر (یہودی، عیسائی، ہندو وغیرہ۔)

آزادیٔ صحافت اور ڈنمارک کا آئین

سوال حالیہ توہین آمیز خاکوں کو یورپی میڈیا آزادیٔ صحافت پر محمول کرتا ہے اور ان کے خلاف اقدام کو اظہار خیال کی آزادی کے منافی سمجھتا ہے۔ کیا یورپی ممالک کے آئین ایسی حرکات کی اجازت دیتے ہیں؟

جواب آزادیٔ صحافت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسے دوسروں کی دل آزاری کا ذریعہ بنا لیا جائے اور انہیں اشتعال دلایا جائے۔ فریڈم آف پریس کے بھی کچھ ضابطے ہیں جن کی پاسداری ضروری ہے۔ ماہر صحافیوں نے بھی حالیہ گستاخانہ خاکوں کی اشاعت کو آزادیٔ صحافت کا غلط استعمال قرار دیا ہے۔ APNS (آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی) کی ایگزیکٹو کمیٹی کے اجلاس میں اعلان کیا گیا کہ یہ بے بنیاد اور مجرمانہ تصویر کشی قابل مذمت ہے۔ اے پی این ایس نے اس حرکت کو آزادیٔ صحافت اور آزادیٔ اظہار کے ایک ناجائز استعمال کے مترادف قرار دیا، نیز یہ کہا کہ اس حق کی فطری سرحدیں اور حدود ہیں۔ اسے احساس ذمہ داری کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔ اسے ان مقدس شخصیات کے خلاف بہتان تراشی اور اشتعال انگیزی کے لیے نقاب کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا جو دنیا بھر کی مذہبی برادری میں انتہائی عزت واحترام کے مقام پر فائز ہیں۔ (نوائے وقت ۱۹ فروری ۲۰۰۶ء)

اگر ایک آدمی بش اور اوبامہ وغیرہ یا پھر اہل کتاب کی مقدس شخصیات کو ننگی اور گندی گالیاں دینے لگے تو آزادیٔ اظہار کے 'علمبردار' اسے جائز قرار نہیں دیں گے۔

روز نامہ نوائے وقت ۱۹ مارچ ۲۰۰۶ء ایک سرخی یوں قائم کرتا ہے:

بش کی ''شان میں گستاخی'' کرنے والا گیارہویں جماعت کا طالب علم گرفتار۔ نارتھ کیرولینا (آن لائن) امریکہ کی خفیہ ایجنسی نے صدر بش کے خلاف نظم لکھنے کے الزام میں گیارہویں جماعت کے طالب علم کو گرفتار کر لیا۔ تفصیلات کے مطابق حکام نے بتایا کہ نارتھ کیرولینا کے طالب علم ٹم ویلیز کو صدر بش کے خلاف گستاخانہ اشعار لکھنے اور انہیں مائی سپیس نامی ویب سائٹ پر چڑھانے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا ہے جب کہ اس کا کمپیوٹر بھی قبضے میں لے لیا گیا ہے۔ اس ضمن میں گرفتار ہونے والے طالب علم ٹم ویلیز کا کہنا ہے کہ اس کا

مقصد کسی کو تکلیف دینا نہیں تھا مگر وہ صدر بش کی شخصیت سے کچھ زیادہ متاثر بھی نہیں ہے۔

برطانیہ کے اخبار نے ایک کارٹون اسرائیل کے یہودی وزیر اعظم شیرون کے بارے میں شائع کیا۔ وہ فلسطین کے ایک بچے کا سر کھا رہا ہے اور کہتا ہے کہ کبھی تم نے ایسی مزیدار چیز نہیں چکھی ہوگی اور کون ہے وہ جو بچوں سے پیار کرنا پسند نہیں کرتا۔ ۲۷ مارچ ۲۰۰۳ء کو یہ کارٹون شائع ہوا تو پوری دنیا کے یہودیوں نے اس پر واویلا کیا اور آخر برطانیہ کے اس اخبار کو معافی مانگنی پڑی اور یہ اسی سال ۱۶ فروری کی بات ہے۔

امریکہ کی ٦ لاشیں الجزیرہ ٹی وی پر دکھائی گئیں تو بش سمیت سارے امریکہ نے اس پر واویلا کیا تھا اور کہا تھا کہ یہ بہیمیت ہے۔ یہ درندگی ہے کہ تم ہماری لاشیں ٹی وی پر دکھاتے ہو۔ انہوں نے الجزیرہ پر حملہ کی دھمکی بھی دی۔

اگر یورپ اظہار رائے کا اتنا ہی احترام کرتا ہے تو یہودیوں کے قتل عام کی فرضی داستانوں پر آزادانہ مکالمے کی اجازت کیوں نہیں دیتا۔ بلکہ ان کے ہاں یہ صورت حال بھی ہے کہ ایک برٹش تاریخ دان نے یہودیوں کے قتل عام کو مفروضہ قرار دیا تو اسے تین سال قید کر دیا گیا۔ جس کے بارے میں ۲۱ فروری ۲۰۰۶ء کو روزنامہ جنگ میں خبر شائع ہوئی:

> ''ویانا (مانیٹرنگ سیل) آسٹریلیا کی عدالت نے یہودیوں کے خلاف مظالم کو مفروضہ قرار دینے پر برطانوی تاریخ دان کو ۳ سال قید کا حکم سنایا ہے۔ ڈیوڈ ارونگ آسٹریلیا کے دارالحکومت ویانا کی عدالت میں پیش ہوئے ہیں جہاں ان پر یہودیوں کے قتل عام کو جھٹلانے کا الزام ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ہٹلر کے دورِ اقتدار میں یہودیوں کی نسل کشی کی گئی۔ پولینڈ کے شہر آشوئز میں بنائے گئے گیس چیمبرز میں ٦٠ لاکھ یہودیوں کی ہلاکت کو انگریزی لفظ ہولوکاسٹ سے جانا جاتا ہے۔''

یورپی اخبارات اور حکومتوں کا توہین آمیز خاکوں کو آزادئ صحافت یا آزادئ رائے کا مسئلہ قرار دینا بہت ہی عجیب اور بے بنیاد ہے۔ 'جنگ' کے کالم نگار جاوید چوہدری لکھتے ہیں:

> ''یہ محض آزادئ رائے یا آزادئ صحافت کا مسئلہ ہے اور ان کے اخبارات میں

ہر قسم کا مواد شائع ہوتا رہتا ہے۔"

یہ موقف مکمل طور پر غلط اور جھوٹ پر مبنی ہے، ڈنمارک کے اسی اخبار "یولاند پوسٹن" کے ایک کارٹونسٹ "کرسٹوفر زیلر" نے اپریل ۲۰۰۳ء میں (نعوذ باللہ) عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں چند خاکے بنائے تھے، اس نے جب یہ خاکے اخبار کو بھجوائے تو سنڈے میگزین کے ایڈیٹر "جینز کیسر" نے یہ خاکے شائع کرنے سے انکار کر دیا تھا، ایڈیٹر کا کہنا تھا:

"ان خاکوں سے قارئین کے ایک حلقہ کی دل آزاری ہوگی، وہ اس پر مشتعل بھی ہو سکتے ہیں۔"

یہ انکار اور یہ جواب ثابت کرتا ہے "یولاند پوسٹن" کی انتظامیہ اتنی سادہ اور بے وقوف نہیں، وہ عوامی ردعمل سے اچھی طرح واقف ہے اور اسے یہ بھی معلوم ہے ان کی آزادی کہاں سے شروع ہوتی اور کہاں پہنچ کر اس کی سرحدیں ختم ہو جاتی ہیں، اگر یہ محض آزادئ صحافت کا مسئلہ ہوتا تو "یولاند پوسٹن" عیسیٰ علیہ السلام کے خاکے بھی شائع کر دیتا، دوسرا اگر یورپ کے اخبارات اتنے ہی آزاد ہیں تو انہوں نے آج تک یہودیوں کے خلاف کوئی خبر، کوئی مضمون اور کوئی خاکہ کیوں شائع نہیں کیا؟ یورپ کے اخبارات یہودیوں سے اتنے ڈرتے ہیں کہ وہاں جب بھی کسی داڑھی والے کا کارٹون یا خاکہ بنایا جاتا ہے تو اس پر مسلم لکھ دیا جاتا ہے تاکہ کوئی قاری اسے غلطی سے یہودی نہ سمجھ بیٹھے، پچھلے پچاس برسوں سے یورپ کے کسی اخبار میں یہودیوں کے قتل عام (Holo Caust) کے خلاف ایک سطر شائع نہیں ہوئی، لہٰذا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہودیوں پر پہنچ کر یورپ کی آزادئ صحافت دم کیوں توڑ دیتی ہے؟ آج تک کسی نے ان سے یہ نہیں پوچھا اور نہ ان لوگوں نے آج تک اس سوال کا کوئی جواب ہی دیا، میرا خیال ہے یورپ کی آزادئ صحافت مسلمانوں سے شروع ہوتی ہے اور مسلمانوں پر آ کر ختم ہو جاتی ہے۔"

ان کی حالت تو یہ ہے کہ مسلمان اگر اسلام کے شعائر پر عمل پیرا ہوں تو ان کی "آزادی" کو یہ بھی برداشت نہیں۔ گزشتہ ماہ اخبارات میں یہ خبر بھی شائع ہوئی کہ کینیڈا کی ٹورنٹو یونیورسٹی میں حجاب والی مسلمان طالبات پر گندے انڈے پھینکے جاتے ہیں۔ (نوائے وقت ۱۹ مارچ ۲۰۰۶ء)

کہاں ہے یہود ونصاریٰ کی آزادی؟

Human rights (انسانی حقوق) کا ڈھنڈورا پیٹنے والے کیا نہیں جانتے کہ کسی قوم یا مذہب کا مذاق اڑانا یا توہین کرنا انسانی حقوق کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔

دنیا کے تمام ممالک کا یہ قانون ہے کہ اگر کوئی شخص حکومت کے خلاف بغاوت کرے تو ایسے شخص کو تختۂ دار پر لٹکایا جائے گا تو کیا یہ قوانین آزادیٔ اظہار اور حریت فکر کے منافی نہیں؟ یہود ونصاریٰ آزادیٔ رائے کے نام پر بغاوت کی اجازت کیوں نہیں دیتے؟

مزید برآں برطانیہ کے آئین کے مطابق ملکہ کی توہین جرم کیوں ہے؟ اسی طرح روس میں لینن کو گالی دینا قابل تعزیر جرم ہے۔

ڈنمارک کے آئین کے سیکشن ۷۷ کے تحت کسی بھی شخص کو غلط چیز شائع کرنے پر عدالت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ یورپین کنونشن آف ہیومن رائٹس کے تحت بھی ڈنمارک بین الاقوامی قوانین پر عمل کرنے کا پابند ہے۔ ڈینش پینل کوڈ کا سیکشن ۱۴۰ بھی توہین آمیز اشاعت سے بحث کرتا ہے۔ سیکشن ۲۶۶b بھی رنگ ونسل یا مذہبی جذبات کے خلاف اقدامات سے باز رکھتا ہے۔

اہل مغرب مذہب کو انسان کا پرائیویٹ (ذاتی) معاملہ سمجھتے ہیں اگر یہ درست ہے تو انہیں اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ دوسروں کے ذاتی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے۔

گستاخِ رسول کی اخروی سزا؟

سوال توہینِ رسالت کے مرتکب کو آخرت میں کیا سزا دی جائے گی؟

جواب دنیا میں گستاخ رسول کی سزا قتل ہے۔ ایسا شخص دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، اس جرم کے ارتکاب سے مسلمان کا اسلام کالعدم ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخانہ کلمات کہنے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ ۚ قُلْ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ ۝ لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ ۚ إِنْ نَعْفُ عَنْ طَائِفَةٍ مِنْكُمْ نُعَذِّبْ طَائِفَةً بِأَنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ ۝﴾

(۹/التوبۃ:٦٥۔٦٦)

''اگر آپ ان سے پوچھیں تو صاف کہہ دیں گے کہ ہم تو یونہی آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ کہہ دیجئے کہ اللہ، اس کی آیتیں اور اس کا رسول ہی تمہاری ہنسی مذاق کے لیے رہ گئے ہیں؟ بہانے نہ بناؤ یقیناً تم اپنے ایمان کے بعد بے ایمان ہو گئے، اگر ہم تم میں سے کچھ لوگوں سے درگزر بھی کر لیں تو کچھ لوگوں کو سنگین سزا بھی دیں گے کیونکہ وہ جرم کرنے والے ہیں۔''

منافقین جس ایمان کا اظہار کرتے تھے نبی ﷺ سے استہزاء کرنے کی وجہ سے وہ بھی غیر معتبر ہو گیا۔ مذکورہ بالا آیت کے الفاظ ﴿قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ﴾ اس کا بیّن ثبوت ہیں۔ نیز ایسے لوگوں کو اللہ نے کفار کی صفوں میں کھڑا کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوا ۗ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (۲/البقرۃ:۱۰۴)

''ایمان والو! تم (نبی کو) ''راعنا'' نہ کہا کرو، بلکہ ''انظرنا'' کہو یعنی ہماری طرف دیکھیے، اور سنتے رہا کرو اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

کچھ یہودی راعنا اور دیگر بے ادبی کے الفاظ پیغمبر کے لیے استعمال کرتے تھے، اللہ نے ان کے بارے میں فرمایا:

﴿وَلَٰكِنْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ﴾ (۴/النساء:٤٦)

''اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کی ہے۔''

نبی ﷺ کو ایذا پہنچانے والوں کے لیے اللہ نے دردناک عذاب کا اعلان کیا ہے:

﴿وَمِنْهُمُ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ ۚ قُلْ أُذُنُ خَيْرٍ لَكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ وَرَحْمَةٌ لِلَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ ۚ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (۹/التوبۃ:٦١)

''ان میں سے وہ بھی ہیں جو پیغمبر کو ایذا دیتے ہیں اور وہ کہتے ہیں: کان کا کچا ہے، آپ کہہ دیجیے کہ وہ کان تمہارے بھلے کے لیے ہے وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے

اور مومنوں کی طرح بات کا یقین کرتا ہے اور تم میں سے جو اہلِ ایمان ہیں یہ ان کے لیے رحمت ہے، اللہ کے رسول کو جو لوگ ایذا دیتے ہیں ان کے لیے دکھ کی مار ہے۔''

جو لوگ بے ادبی سے اپنی آوازوں کو نبی اکرم ﷺ کی آواز سے اونچا کرتے ہیں، ان کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں جبکہ انہیں خبر تک نہیں ہوتی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴾ (۴۹/الحجرات:۲)

''ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے اوپر نہ کرو اور نہ ان سے اونچی آواز سے بات کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو، کہیں (ایسا نہ ہو کہ) تمہارے اعمال اکارت جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔''

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں، نبی ﷺ بطحا کی طرف تشریف لے گئے۔ اور پہاڑی پر چڑھ کر پکارا: ''یاصباحاہ!''

قریش اس آواز پر آپ کے پاس جمع ہو گئے۔ نبی ﷺ نے ان سے پوچھا: تمہارا کیا خیال ہے اگر میں تمہیں بتاؤں کہ دشمن تم پر صبح کے وقت یا شام کے وقت حملہ کرنے والا ہے تو کیا تم میری تصدیق نہیں کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ ہاں ضرور آپ کی تصدیق کریں گے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: میں تمہیں سخت عذاب سے ڈراتا ہوں جو تمہارے سامنے آ رہا ہے۔ ابولہب بولا: تم تباہ ہو جاؤ، کیا تم نے ہمیں اسی لیے جمع کیا تھا؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمان نازل کیا:

﴿ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ ﴾ آخر تک۔

(بخاری، التفسیر، تفسیر سورۃ لھب، ح:۴۹۷۲)

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝ سَيَصْلٰى نَارًا

لَهَبٍ ۚ وَّامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۚ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۧ﴾

(۱۱۱/اللھب:۱۔۵)

’’ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ (خود) ہلاک ہوگیا۔ نہ تو اس کا مال اس کے کام آیا اور نہ اس کی کمائی۔ وہ عنقریب بھڑ کنے والی آگ میں جائے گا۔ اور اس کی بیوی بھی (جائے گی) جو لکڑیاں ڈھونے والی ہے۔ اس کی گردن میں پوست کھجور کی بٹی ہوئی رسی ہوگی۔‘‘

ابولہب کی بیوی کے بارے میں مولانا محمد داؤد راز رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

یہ عورت نبی ﷺ کی بڑی دشمن تھی، مردود فساد کراتی پھرتی، آپ کی چغلیاں کھاتی، لوگوں میں لڑائی ڈلواتی، آخر اس کا انجام یہ ہوا کہ لکڑی کا گٹھا سر پر لادے لا رہی تھی کہ راستے میں تھک کر ایک پتھر پر بیٹھی۔ فرشتے نے آن کر وہ رسی جس سے گٹھا باندھتی تھی اور اس کی گردن میں پڑی تھی پیچھے سے زور سے کھینچی، کم بخت دم گھٹ کر مرگئی۔

امیہ بن خلف کا وطیرہ تھا کہ جب وہ اللہ کے رسول ﷺ کو دیکھتا تو لعن طعن کرتا، اسی کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۙ﴾ (۱۰۴/الھمزۃ:۱)

’’ہر لعن طعن اور برائیاں کرنے والے کے لیے تباہی ہے۔‘‘ (ابن ہشام ۱/۳۶۱)

بعض اوقات اللہ تعالیٰ گستاخِ رسول کی موت کو دنیا والوں کے لیے تازیانہ عبرت بنا دیتا ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ایک دفعہ رسول کریم ﷺ کعبہ کے نزدیک نماز پڑھ رہے تھے، ابوجہل اور اس کے ساتھی بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے تو ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ تم میں سے کوئی شخص ہے جو قبیلے کی ذبح شدہ اونٹنی کی اوجھڑی اٹھالائے اور جب محمد سجدہ میں جائیں تو لا کر ان کی پیٹھ پر رکھ دے۔ یہ سن کر ان میں سے ایک سب سے زیادہ بدبخت آدمی اٹھا اور وہ اوجھڑی لے کر آیا اور دیکھتا رہا، جب آپ نے سجدہ کیا تو اس نے اس اوجھڑی کو آپ کے دونوں کندھوں کے درمیان رکھ دیا (عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں) میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر کچھ نہ کرسکتا تھا۔ کاش! اس وقت مجھے روکنے کی

طاقت ہوتی۔عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ ہنسنے لگے اور ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہونے لگے اور اللہ کے رسول ﷺ سجدہ میں تھے (بوجھ کی وجہ سے) اپنا سر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ یہاں تک کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں اور وہ بوجھ آپ کی پشت پر سے اتار کر پھینکا، تب آپ نے سر اٹھایا پھر تین بار فرمایا: یااللہ! قریش کو پکڑ لے، یہ بات ان کافروں پر بہت بھاری ہوئی کہ آپ نے انہیں بد دعا دی۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ سمجھتے تھے کہ اس شہر (مکہ) میں جو دعا کی جائے وہ ضرور قبول ہوتی ہے پھر آپ نے ان میں سے ہر ایک کا (جُدا جُدا) نام لیا کہ اے اللہ! ان ظالموں کو ضرور ہلاک کر دے۔ ابوجہل، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، امیہ بن خلف اور عقبہ بن ابی معیط کو۔ ساتویں (آدمی) کا نام (بھی) لیا مگر مجھے یاد نہیں رہا۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ جن لوگوں کے آپ نے نام لیے تھے، مَیں نے ان (کی لاشوں) کو بدر کے کنویں میں پڑا ہوا دیکھا۔"

(بخاری ، الوضوء ، اذا القی علی ظهر المصلی قذر او جیفة لم تفسد علیه صلاته ، ح: ۲۴۰)

بعض احادیث میں ہے کہ جب انہیں گھسیٹ کر بدر کے کنویں میں پھینک دیا گیا تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((وَاُتْبِعَ اَصْحَابُ الْقَلِیْبِ لَعْنَةً))

(ایضاً ، الصلاة ، المرأة تطرح عن المصلی شیئا من الاذی ، ح: ۵۲۰)

"کنویں والے اللہ کی رحمت سے دُور کر دیے گئے۔"

انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

ایک شخص پہلے عیسائی تھا، پھر وہ اسلام میں داخل ہو گیا تھا۔ اس نے سورۃ البقرۃ اور اٰل عمرٰن پڑھ لی تھی اور وہ نبی ﷺ کا کاتب بن گیا لیکن پھر وہ شخص مرتد ہو کر عیسائی ہو گیا اور کہنے لگا کہ محمد کے لیے جو کچھ مَیں نے لکھ دیا ہے اس کے سوا اُسے اور کچھ بھی معلوم نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی موت واقع ہو گئی اور اس کے آدمیوں نے اسے دفن کر دیا۔ جب صبح ہوئی تو انہوں نے دیکھا کہ اس کی لاش قبر سے نکل کر زمین کے اوپر پڑی ہے۔ عیسائی لوگوں نے کہا کہ یہ محمد (ﷺ) اور اس کے ساتھیوں کا کام ہے۔ چونکہ ان کا دین اس

نے چھوڑ دیا تھا اس لیے انہوں نے اس کی قبر کھودی ہے اور اس کی لاش کو باہر نکال کر پھینک دیا ہے۔ چنانچہ دوسری قبر انہوں نے کھودی جو بہت زیادہ گہری تھی۔ لیکن جب صبح ہوئی تو پھر لاش باہر تھی۔ اس مرتبہ بھی انہوں نے یہی کہا کہ یہ محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں کا کام ہے چونکہ ان کا دین اس نے چھوڑ دیا تھا اس لیے اس کی قبر کھود کر انہوں نے لاش باہر پھینک دی ہے۔ پھر انہوں نے قبر اتنی گہری کھودی جتنی گہری ان کے بس میں تھی، اسے اس کے اندر ڈال دیا لیکن صبح ہوئی تو پھر لاش باہر تھی۔ اب انہیں یقین ہوگیا کہ یہ کسی انسان کا کام نہیں۔ (بلکہ یہ میت عذابِ الٰہی میں گرفتار ہے) چنانچہ انہوں نے اسے یونہی (زمین پر) ڈال دیا۔

(بخاری ، المناقب ، علامات النبوۃ فی الاسلام، ح:۳۶۱۷)

یہ اس کے ارتداد کی سزا تھی اور توہین رسالت کی کہ زمین نے اس کے بدترین لاشہ کو بحکم خدا باہر پھینک دیا، آج بھی گستاخانِ رسول کو ایسی ہی سزائیں ملتی رہتی ہیں۔ لو کانوا یعلمون (حاشیہ از مولانا محمد داؤد راز رحمہ اللہ)

نبی اکرم ﷺ کے توہین آمیز خاکے بنانے والے عصرِ حاضر کے گستاخانِ پیغمبر بھی عبرت کا نشان بن جائیں گے۔ ان شاء اللہ

گستاخِ رسول کی معافی؟

سوال کیا سیرۃ النبی سے کوئی ایسا واقعہ ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے گستاخ کو معاف کیا ہو؟ اگر اللہ کے رسول ﷺ کے اسوہ سے کوئی ایسی مثال ملتی ہو تو کیا اس کی روشنی میں ان بارہ بدبخت کارٹونسٹ افراد کو معافی دی جاسکتی ہے جنہوں نے رحمۃ للعالمین ﷺ کے توہین آمیز خاکے بنائے؟

جواب شاتمان اور گستاخانِ رسول کو نبی اکرم ﷺ قتل کروایا کرتے تھے البتہ چند ایسے بے ادب لوگ جو بظاہر مسلمان تھے، نمازیں اور دیگر شرعی احکام کی پابندی بھی کرتے تھے، بعض دفعہ نبی اکرم ﷺ نے وقتی طور پر ان کے قتل سے روک دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو لوگ اسلام قبول کر چکے تھے، یا قبول کرنا چاہتے تھے وہ یہ نہ کہیں کہ محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں

کو قتل کرواتے ہیں۔

مگر حقیقت یہی ہے کہ ایسے لوگ دین سے ایسے نکل جاتے ہیں جیسے تیر کمان سے۔

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

ہم اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں موجود تھے اور آپ غزوہ حنین کا مالِ غنیمت تقسیم کر رہے تھے؛ اتنے میں بنی تمیم کا ایک شخص ذوالخویصرہ آیا اور کہنے لگا: اللہ کے رسول! انصاف سے کام لیجئے! یہ سن کر نبی ﷺ نے فرمایا: افسوس! اگر میں ہی انصاف نہ کروں تو دنیا میں پھر کون انصاف کرے گا۔ اگر میں ظالم ہو جاؤں تب تو میری بھی تباہی اور بربادی ہو جائے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! اس کے بارے میں مجھے اجازت دیں میں اس کی گردن مار دوں۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو۔ اس جیسے کچھ لوگ پیدا ہوں گے کہ تم اپنی نماز کو اُن کی نماز کے مقابلے میں حقیر سمجھو گے۔ وہ قرآن کی تلاوت کریں گے لیکن وہ ان کے حلق کے نیچے نہیں اترے گا۔ یہ لوگ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے زوردار تیر جانور سے پار ہو جاتا ہے۔ اس تیر کا پھل اگر دیکھا جائے تو اس میں کوئی چیز (خون وغیرہ) نظر نہ آئے گی، پھر اس کے پٹھے کو اگر دیکھا جائے تو چھڑ میں اس کے پھل کے داخل ہونے کی جگہ سے اوپر جو لگایا جاتا ہے تو وہاں بھی کچھ نہ ملے گا، اس کے نضی (تیر میں لگائی جانے والی لکڑی) کو دیکھا جائے تو وہاں بھی کچھ نشان نہیں ملے گا۔ اسی طرح اگر اس کے پر کو دیکھا جائے تو اس میں بھی کچھ نہیں ملے گا۔ حالانکہ گندگی اور خون سے وہ تیر گزرا ہے۔

(بخاری ، المناقب ، علامات النبوۃ فی الاسلام، ح:۳۶۱۰)

اس حدیث کی شرح میں مولانا محمد داؤد راز علیہ السلام فرماتے ہیں:

جس طرح ایک تیر کمان سے نکلنے کے بعد شکار کو چیرتا ہوا گزر جانے پر بھی بالکل صاف شفاف نظر آتا ہے حالانکہ اس سے شکار زخمی ہو کر خاک و خون میں تڑپ رہا ہے۔ چونکہ نہایت تیزی کے ساتھ اس نے اپنا فاصلہ طے کیا ہے اس لیے خون وغیرہ کا کوئی اثر اس کے کسی حصے پر دکھائی نہیں دیتا۔ اسی طرح وہ لوگ بھی دین سے بہت دُور ہوں گے لیکن بظاہر بے دینی کے اثرات ان میں کہیں نظر نہ آئیں گے۔ یہ مردود خارجی تھے جو علی رضی اللہ عنہ اور مسلمانوں کے خلاف

اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ظاہر میں اہل کوفہ کی طرح بڑے نمازی، پرہیزگار، ادنیٰ ادنیٰ بات پر مسلمانوں کو کافر بنانا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا، علی رضی اللہ عنہ نے ان مردودوں کو مارا، ان میں ایک بھی زندہ نہ چھوڑا۔ (حاشیہ صحیح بخاری)

ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے ان کے قتل کا ارادہ بھی ظاہر کیا:

مال غنیمت کی تقسیم پر ایک آدمی نے نبی ﷺ سے کہا:

اللہ سے ڈر، اے محمد! اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

اگر میں نافرمانی کروں گا تو پھر اللہ کی کون اطاعت کرے گا (معلوم ہوا کہ نبی ﷺ سے بڑھ کر کسی کا درجہ نہیں) اور اللہ نے مجھے زمین والوں پر امانتدار مقرر کیا اور تم لوگ مجھے امانتدار نہیں سمجھتے پھر وہ آدمی پیٹھ موڑ کر چلا گیا اور لوگوں میں سے اس کے قتل کی ایک شخص نے اجازت مانگی۔ لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تھے اور اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ مِنْ ضِئْضِیِٔ هٰذَا قَوْمًا يَقْرَءُوْنَ الْقُرْاٰنَ لَا يُجَاوِزُ حَنَاجِرَهُمْ يَقْتُلُوْنَ اَهْلَ الْاِسْلَامِ وَيَدَعُوْنَ اَهْلَ الْاَوْثَانِ يَمْرُقُوْنَ مِنَ الْاِسْلَامِ كَمَا يَمْرُقُ السَّهْمُ مِنَ الرَّمِيَّةِ لَئِنْ اَدْرَكْتُهُمْ لَاَقْتُلَنَّهُمْ قَتْلَ عَادٍ))

(مسلم، الزکوۃ، ذکر الخوارج و صفاتهم، ح: ۱۰۶۴)

''بے شک اس کی نسل میں سے ایک قوم ہے کہ وہ لوگ قرآن پڑھیں گے اور ان کے گلوں سے نیچے نہیں اترے گا اور وہ اہل اسلام کو قتل کریں گے اور بت پرستوں کو چھوڑ دیں گے (اہل بدعت کا یہی حال دیکھنے میں آتا ہے کہ پنجہ پرست، شبیہ پرست، تعزیہ پرست، گورو پرستوں کے یار، بے نمازیوں، ہیجڑوں، بھڑووں، رنڈیوں، زانیوں کے دوستدار، وفادار، فاسقوں، فاجروں، شاربان خمر، بالعان مسکرات ومغنیات کے جویان رہتے ہیں۔) اسلام سے ایسا نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے، اگر میں انہیں پاتا تو ایسا قتل کرتا جیسے عاد قتل ہوئے ہیں۔''

ایک اور حدیث میں یہ الفاظ ہیں: ایک آدمی نے کہا:

اللہ کے رسول! اللہ سے ڈریئے۔ آپ نے فرمایا: افسوس تجھ پر، کیا میں اس روئے زمین پر اللہ سے ڈرنے کا سب سے زیادہ مستحق نہیں ہوں۔ راوی نے بیان کیا: پھر وہ شخص چلا گیا۔ خالد بن ولید نے عرض کیا: اللہ کے رسول! میں کیوں نہ اس شخص کی گردن مار دوں؟ آپ نے فرمایا: نہیں، شاید وہ نماز پڑھتا ہو۔ اس پر خالد نے عرض کیا کہ بہت سے نماز پڑھنے والے ایسے ہیں جو زبان سے اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں اور ان کے دل میں وہ نہیں ہوتا! اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((اِنِّي لَمْ اُوْمَرْ اَنْ اُنَقِّبَ قُلُوْبَ النَّاسِ وَلَا اَشُقَّ بُطُوْنَهُمْ)) قال: ثم نظر اليه وهو مقفى و قال: ((اِنَّهُ يَخْرُجُ مِنْ ضِئْضِئِ هٰذَا قَوْمٌ يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ رَطْبًا لَا يُجَاوِزُ حَنَاجِرَهُمْ يَمْرُقُوْنَ مِنَ الدِّيْنِ كَمَا يَمْرُقُ السَّهْمُ مِنَ الرَّمِيَّةِ)) واظنه قال ((لَئِنْ اَدْرَكْتُهُمْ لَاَقْتُلَنَّهُمْ قَتْلَ ثَمُوْدَ))

(بخاری، المغازی، بعث علی بن ابی طالب و خالد بن الولید رضی اللہ عنہما الی الیمن قبل حجۃ الوداع، ح:۴۳۵۱)

مجھے اس کا حکم نہیں ہوا ہے کہ لوگوں کے دلوں کی کھوج لگاؤں اور نہ اس کا حکم ہوا ہے کہ ان کے پیٹ چاک کروں۔ راوی نے کہا: پھر نبی ﷺ نے اس (منافق) کی طرف دیکھا تو وہ پیٹھ پھیر کر جا رہا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اس کی نسل سے ایک ایسی قوم نکلے گی جو کتاب اللہ کی تلاوت بڑی خوش الحانی کے ساتھ کرے گی لیکن وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ دین سے وہ لوگ اس طرح نکل چکے ہوں گے جیسے تیر شکار کے پار نکل جاتا ہے، اور میرا خیال ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا: اگر میں ان کے دور میں ہوا تو قوم ثمود کی طرح انہیں بالکل قتل کر ڈالوں گا۔"

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ گستاخ رسول کے قتل کا ارادہ عمر رضی اللہ عنہ نے بھی ظاہر کیا اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے بھی، بظاہر فرق یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے

قتل کے لیے نبی ﷺ سے اجازت چاہی اور جب وہ واپس چل دیا تو خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کرنے کی نبی ﷺ سے اجازت طلب کی۔

مذکورہ بالا احادیث سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اگر آپ ﷺ نے بعض ایسے بے ادب لوگوں کے قتل کا ارادہ موقوف کیا تو اس کی علت اور سبب موجود تھا۔ نیز آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اختیار ملا ہوا تھا کہ آپ چاہیں تو اپنے گستاخ کو سزا دیں یا معاف کر دیں (درگزر سے کام لیں) مگر گستاخِ رسول کو معاف کرنے کا اختیار کسی امتی کو حاصل نہیں ہے خواہ وہ صاحبِ اقتدار ہی کیوں نہ ہو۔

مزید برآں آپ ﷺ کی زندگی میں ایسے لمحات بھی آئے ہیں کہ آپ نے اپنے گستاخوں کو قتل کروایا جیسا کہ کئی ایک واقعات احادیث میں مذکور ہیں۔

تردید کے لیے گستاخانہ کلمات کا استعمال

سوال: ہماری مسجد میں توہین رسالت کے موضوع پر درس قرآن کا اعلان ہوا۔ تو ایک آدمی کہنے لگا کہ آپ خواہ مخواہ نبی پاک ﷺ کے توہین آمیز خاکوں کی تشہیر کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے آپ ﷺ کی بے ادبی ہوتی ہے۔ لہٰذا آپ خاکوں کا تذکرہ بھی نہ کریں۔ اس سلسلے میں ہماری کتاب وسنت سے راہنمائی کریں کہ کیا ایسا کرنا واقعی بے ادبی کے زُمرے میں آتا ہے؟

جواب: بعض دفعہ نقلِ کفر کفر نہ باشد کے تحت کسی کے کفریہ کلمات اور گستاخانہ الفاظ کو نقل کرنا بطور دلیل ضروری ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ کی کفریہ اور شرکیہ باتوں کا تذکرہ کر کے ان کی تردید کی ہے۔ کفار نبی اکرم ﷺ کو تکلیف پہنچانے کے لیے اُذُنٌ کہا کرتے تھے جن کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ۭ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۭ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ (۹/التوبۃ:۶۱)

''ان میں سے وہ بھی ہیں جو نبی کو ایذا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کان کا کچا

ہے، آپ کہہ دیجیے کہ وہ کان تمہارے بھلے کے لیے ہے وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور مسلمانوں کی طرح بات کا یقین کرتا ہے اور تم میں سے جو اہلِ ایمان ہیں یہ ان کے لیے رحمت ہے، اللہ کے رسول کو جو لوگ ایذا دیتے ہیں ان کے لیے دُکھ کی مار ہے۔"

مشرکین نبی اکرم ﷺ کو معاذ اللہ مجنون بھی کہا کرتے تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَيَقُولُونَ أَئِنَّا لَتَارِكُوا آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٍ﴾ (۳۷/الصّٰفّٰت: ۳۶)

"اور کہتے تھے کہ کیا ہم اپنے معبودوں کو ایک دیوانے شاعر کی بات پر چھوڑ دیں۔"

﴿ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوا مُعَلَّمٌ مَّجْنُونٌ﴾ (۴۴/الدخان: ۱۴)

"پھر انہوں نے ان سے منہ پھیرا اور کہہ دیا کہ سکھایا پڑھایا ہوا مجنون ہے۔"

﴿وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ﴾ (۱۵/الحجر: ۶)

"انہوں نے کہا: اے وہ شخص جس پر قرآن اتارا گیا ہے یقیناً تو تو کوئی دیوانہ ہے۔"

﴿وَإِن يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ﴾ (۶۸/القلم: ۵۱)

"اور قریب ہے کہ کافر اپنی تیز نگاہوں سے آپ کو پھسلا دیں، جب کبھی قرآن سنتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں یہ تو ضرور دیوانہ ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ن ۚ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ۝ مَا أَنتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ﴾ (۶۸/القلم: ۱-۲)

"ن، قسم ہے قلم کی! اور اس کی جو کچھ کہ وہ (فرشتے) لکھتے ہیں۔ آپ اپنے رب کے فضل سے دیوانے نہیں ہیں۔"

﴿فَذَكِّرْ فَمَا أَنتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَلَا مَجْنُونٍ﴾ (۵۲/الطور: ۲۹)

"آپ سمجھاتے رہیں کیونکہ آپ اپنے رب کے فضل سے نہ تو کاہن ہیں نہ دیوانہ۔"

﴿وَمَا صَاحِبُكُم بِمَجْنُونٍ﴾ (۸۱/التکویر: ۲۲)

"اور تمہارا ساتھی دیوانہ نہیں ہے۔"

کفار قرآن کریم کو سحر (جادو) اور آپ ﷺ کو ساحر (جادوگر) کہا کرتے تھے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ﴾ (۱۰/ یونس:۲)

''کیا ان لوگوں کو اِس بات سے تعجب ہوا کہ ہم نے ان میں سے ایک شخص کے پاس وحی بھیج دی کہ سب آدمیوں کو ڈرایئے اور جو ایمان لے آئے انہیں یہ خوشخبری سنایئے کہ ان کے رب کے پاس انہیں پورا اجر و مرتبہ ملے گا۔ کافروں نے کہا: یہ شخص تو بلاشبہ صریح جادوگر ہے۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَاۗءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۡ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ﴾ (۳۸/ص:۴)

''اور انہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ ان ہی میں سے ایک انہیں ڈرانے والا آ گیا اور کافر کہنے لگے کہ یہ تو جادوگر اور جھوٹا ہے۔''

نبی اکرم ﷺ کی بے ادبی کی نیت سے یہودی ''راعنا'' کا لفظ بولتے تھے، اللہ نے ان کی مذمت میں فرمایا:

﴿مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ (۴/النساء:۴۶)

''بعض یہود کلمات کو ان کی ٹھیک جگہ سے ہیر پھیر کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور نافرمانی کی اور سنیں اس کے بغیر کہ آپ کو سنا جائے اور ہماری رعایت کریں! (لیکن اس کہنے میں) اپنی زبان کو پیچ دیتے ہیں اور دین میں طعنہ دیتے

ہیں اور اگر یہ لوگ کہتے کہ ہم نے سنا اور ہم نے فرمانبرداری کی اور 'آپ سنیے' اور 'ہمیں دیکھیے' تو یہ ان کے لیے بہت بہتر اور نہایت ہی مناسب تھا، لیکن اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے انہیں لعنت کی ہے۔ پس یہ بہت ہی کم ایمان لاتے ہیں۔"

رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی ملعون نے ایک غزوہ کے موقع پر بکواس کرتے اور ڈھینگ مارتے ہوئے نبی اکرم ﷺ کو الاذل (ذلیل ترین) اور خود کو الاعز (معزز ترین) کہا۔ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

مَیں اپنے چچا کے ساتھ تھا، مَیں نے عبداللہ بن ابی ابن سلول کو یہ کہتے سنا:

"جو لوگ رسول (ﷺ) کے پاس ہیں ان پر کچھ خرچ نہ کرو تا کہ وہ منتشر ہو جائیں اور اگر اب ہم مدینہ واپس لوٹیں گے تو ان میں سے جو عزت والے ہیں ان ذلیلوں کو نکال باہر کر دیں گے۔"

مَیں نے اس کا ذکر اپنے چچا سے کیا اور انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے کہہ دیا۔ (منافقین سے جب پوچھا گیا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا تو) جب نبی ﷺ نے انہی کی تصدیق کر دی تو مجھے اس کا اتنا افسوس ہوا کہ پہلے کبھی کسی بات پر نہ ہوا ہوگا، مَیں غم سے اپنے گھر میں بیٹھ گیا۔ میرے چچا نے کہا کہ تمہارا کیا ایسا خیال تھا کہ نبی ﷺ نے تمہیں جھٹلایا اور تم پر خفا ہوئے ہیں؟ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی:

﴿ إِذَا جَآءَكَ ٱلْمُنَٰفِقُونَ ـــ ﴾ (۶۳/المنفقون:۱)

"جب منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں: آپ اللہ کے رسول ہیں......"

نبی ﷺ نے مجھے بلوا کر اس آیت کی تلاوت کی اور فرمایا کہ اللہ نے تمہاری تصدیق نازل کر دی ہے۔" (بخاری، التفسیر، تفسیر سورۃ المنفقون، ح:۴۹۰۰)

اس سورت میں اللہ نے جہاں منافقین کے اور کئی راز افشا کیے وہاں یہ بھی فرمایا:

﴿ يَقُولُونَ لَئِن رَّجَعْنَآ إِلَى ٱلْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ ٱلْأَعَزُّ مِنْهَا ٱلْأَذَلَّ ۚ وَلِلَّهِ ٱلْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِۦ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَٰكِنَّ ٱلْمُنَٰفِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴾

(۶۳/المنٰفقون:۸)

''وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم اب لوٹ کر مدینہ جائیں گے تو عزت والا وہاں سے ذلت والے کو نکال دے گا۔ سنو! عزت تو صرف اللہ کے لیے، اس کے رسول کے لیے اور ایمان داروں کے لیے ہے۔ لیکن یہ منافق جانتے نہیں۔''

اپنے آپ کو معزز کہنے والے کی ایسی ذلت اور رسوائی ہوئی کہ اس کا بیٹا عبداللہ (رضی اللہ عنہ) تلوار سونت کر مدینہ کے دروازے پر کھڑا ہو گیا اور اپنے باپ کی راہ روک کر کہنے لگا: جب تک اللہ کے رسول ﷺ اجازت نہ دیں آپ مدینہ میں داخل نہیں ہو سکتے کیونکہ معزز ترین تو اللہ کے رسول ﷺ ہیں اور ذلیل ترین تم ہو...... (سیرت ابن ہشام ۲/۲۹۰)

لوگ آپ ﷺ کو برے ناموں سے پکارتے۔ کفار آپ ﷺ کو دشمنی کی وجہ سے محمد (تعریف کیا گیا) نہ کہتے بلکہ مذمم (مذمت کیا گیا) نام سے پکارتے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((اَلَا تَعْجَبُوْنَ كَيْفَ يَصْرِفُ اللّٰهُ عَنِّيْ شَتْمَ قُرَيْشٍ وَلَعْنَهُمْ؟ يَشْتِمُوْنَ مُذَمَّمًا وَيَلْعَنُوْنَ مُذَمَّمًا وَاَنَا مُحَمَّدٌ))

(بخاری ، المناقب ، ماجاء فی اسماء رسول اللہ ﷺ ، ح:۳۵۳۳)

''تمہیں تعجب نہیں ہوتا کہ اللہ قریش کی گالیوں اور لعنت ملامت کو کس طرح مجھ سے دُور کرتا ہے، وہ مذمم کو برا کہتے ہیں، اس پر لعنت کرتے ہیں۔ جبکہ میں تو محمد ہوں۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی صحیح صورت حال بتانے کے لیے بعض دفعہ ان گستاخانہ الفاظ کو بیان کرتے تھے جو آپ کے لیے کہے جاتے۔ ابولہب نے نبی ﷺ کے لیے تبا لك (تُو ہلاک ہو) کے الفاظ بولے تھے جس پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ اللھب نازل کی۔ تبا لك کے الفاظ ابن عباس رضی اللہ عنہما لوگوں سے بیان کیا کرتے تھے۔ (بخاری، التفسیر، تفسیر سورۃ لھب، ح:۴۹۷۱)

مذکورہ بالا حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ گستاخانہ الفاظ کی تردید کے لیے ان الفاظ کو نقل کرنا بے ادبی اور گستاخی کے زمرے میں نہیں آتا۔

مرزا قادیانی کے اول المکفرین

سوال مرزا قادیانی کو سب سے پہلے کن لوگوں نے کافر قرار دیا تھا؟

جواب خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی ختم نبوت میں نقب زنی کی سعی ہر زمانے میں ہوئی ہے۔ مگر غلامانِ مصطفیٰ ﷺ نے خود ساختہ نبیوں کا دندان شکن جواب دیا ہے۔

ماضی قریب میں برصغیر میں جن لوگوں نے اسلامی عقائد کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے ان میں متنبّی مرزا غلام احمد قادیانی کا نام نمایاں ہے۔ جس نے پہلے مجدد، پھر مسیح موعود اور بالآخر ۱۹۰۲ء میں نبوت کا دعویٰ کیا، بعد ازاں ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو لاہور میں آنجہانی ہوا۔

مرزا کی زندگی میں اور پس از مرگ اُو علمائے حق اس فتنے کے استیصال کے لیے کمر بستہ رہے ہیں، اس فتنے کی سرکوبی کے لیے علمائے اہلِ حدیث کا کردار مثالی ہے۔ بعض حنفی المسلک علماء و عمائدین نے بھی تحریک ختمِ نبوت میں بھرپور حصہ لیا۔ اور اس سلسلے میں قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں۔ البتہ مرزا کی تکفیر میں اولیت علمائے اہلِ حدیث کو حاصل ہے۔ جس کا سہرا مولانا محمد حسین بٹالوی اور میاں نذیر حسین دہلوی رحمہما اللہ کے سر ہے۔ مرزا قادیانی نے خود لکھا:

مولوی محمد حسین بٹالوی نے جب جرأت کے ساتھ زبان کھول کر میرا نام دجال رکھا، اور میرے پر فتویٰ کفر لکھوا کر صدہا پنجاب و ہندوستان کے مولویوں سے مجھے گالیاں دلوائیں اور مجھے یہود و نصاریٰ سے بدتر قرار دیا اور میرا نام کذاب، مفسد، دجال مفتری، مکار، ٹھگ، فاسق و فاجر، خائن رکھا...... (روحانی خزائن ۲۲/۴۵۵)

فتویٰ تکفیر کے بارے میں مرزا قادیانی نے اپنی کتاب تحفہ گولڑویہ (ص:۱۲۱، مطبوعہ قادیان ۱۹۱۴ء) میں لکھا ہے:

مولوی محمد حسین نے یہ فتویٰ لکھا اور میاں نذیر حسین دہلوی سے کہا کہ سب سے پہلے اس پر مہر لگا دے اور میرے کفر کی بابت فتویٰ دے دے اور تمام مسلمانوں میں میرا کافر ہونا شائع کر دے...... مولوی محمد حسین جو (براہینِ احمدیہ کے شائع ہونے کے۔ راقم) بارہ برس بعد اول الکافرین بنے، بانی تکفیر کے وہی تھے اور اس آگ کو اپنی شہرت کی وجہ سے سلگانے والے میاں نذیر حسین دہلوی تھے۔

مرزا قادیانی کے 'کافروں' میں سے جن اہل حدیث علماء نے اس فتنہ کو دبانے میں گرانقدر علمی خدمات سرانجام دی ہیں ان میں سے چند ایک کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

سید نذیر حسین محدث دہلوی، مولانا محمد حسین بٹالوی، مولانا محمد بشیر سہسوانی، فاتح قادیان مولانا ثناء اللہ امرتسری، حافظ محمد ابراہیم میر سیالکوٹی، مولانا احمد اللہ امرتسری، سید سلیمان سلمان منصور پوری، حافظ عبدالمنان وزیر آبادی، مولانا عبدالرحمٰن لکھوی، مولانا محمد ابوالقاسم سیف بنارسی، مولانا عبدالرحمٰن بنارسی، مولانا عبدالجبار غزنوی، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، مولانا عبدالحق غزنوی، مولانا عبدالجبار عمر پوری، مولانا محمد حسن دہلوی، مولانا محمد شریف گھڑیالوی، حافظ عبداللہ روپڑی، مولانا عبداللہ ثانی، مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، حافظ محمد محدث گوندلوی، حافظ عبدالستار محدث دہلوی، مولانا عبدالمجید سوہدروی، مولانا نور الٰہی گرجاکھی، مولانا احمد دین گکھڑوی، مولانا محمد رفیق خاں پسروری، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف، مولانا ابراہیم کمیر پوری اور علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہم اللہ اجمعین۔

یہ علمائے حق کی سعی مشکور کا ہی نتیجہ تھا کہ پاکستان میں قادیانی اور مرزائی امت کو (۷ ستمبر ۱۹۷۴ء میں) پارلیمنٹ نے غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا۔ اولین فتویٰ تکفیر اور پارلیمنٹ کے فیصلے کو اگر یک نگاہ دیکھیں تو مذکورہ بالا علمائے کرام کی کاوشوں کا ثمرہ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔

فرسٹ لیڈی......

سوال کیا ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو فرسٹ لیڈی کہنا درست ہے؟ نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جعلی تصاویر شائع کرنے اور ان کی طرف گانے سننے کو منسوب کرنے کی کیا حیثیت ہے؟

جواب ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں مغرب کی نقالی میں "فرسٹ لیڈی" کی اصطلاح کا استعمال سراسر ان کی شان میں گستاخی ہے۔ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن عام خواتین جیسی نہیں ہیں ان کا مقام بہت اونچا ہے۔ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ (۳۳/الاحزاب:۳۲)

نبی علیہ السلام سے پوچھا گیا:

ای الناس احب الیك؟ قال:((عَائِشَةُ))

(ترمذی، المناقب، من فضل علیه، ح:۳۸۸۵)

ان کے بارے میں فرسٹ لیڈی کا استعمال ان کے عظیم مقام ومرتبہ کے منافی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی شان میں بھی گستاخی اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی توہین ہے۔

اسی طرح عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ، ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ یا دیگر نفوسِ قدسیہ کی تصاویر ان عظیم ہستیوں کی عزت وعظمت کو کم کرنے کی گھناؤنی سازش ہے۔ اگر آج اس کی اجازت دے دی گئی تو کل تہذیبِ جدید کے عناصر سید کائنات محمد ﷺ اور دیگر انبیاء کرام کی تصویر وتشبیہ سے بھی گریز نہیں کریں گے اور پھر جس پس منظر میں عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کی تصویر شائع کی گئی ہے اس میں اسلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی توہین کی عکاسی ہوتی ہے۔ عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ خود ادر عظیم مجاہد تھے ان کی یہ تصویر مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے کی ناپاک جسارت ہے۔

اسی طرح حدی خوانی کو معروف موسیقی پر محمول کرنا سراسر جہالت اور علم دشمنی کا نتیجہ ہے۔ حدی خوانی اور غنا میں وہی فرق ہے جو شربت وشراب میں فرق ہے۔

حدی خوانی عرب کا اشعار پڑھنے کا ایک سادہ اور فطری اسلوب تھا جب کہ غناء ایک فن اور آواز کے نشیب وفراز اور آلات ملاہی تار وساز سے گانے کا نام ہے۔ گانا صحابہ کرام، فقہاء اربعہ اور علماء امت کے نزدیک حرام اور ناجائز ہے۔

(جواب از مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ، سابق ممبر اسلامی نظریاتی کونسل)

اسلام و ایمان
اور
کفر

فطرت کیا ہے؟

سوال فطرت سے کیا مراد ہے؟

جواب فطرت کا معنی خلقت جبلت اور ساخت ہے صاحب مصباح اللغات کے نزدیک فطرت کا معنی طبیعی حالت، دین، سنت، طریقہ، پیدائش اور وہ صفت کہ ہر موجود اپنی پیدائش کے وقت جس پر ہو' ہے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ کے نزدیک فطرت سے مراد ملتِ اسلام ہے۔(إغاثة اللهفان في مصايد الشيطان ، صفحه:١٦٩، المكتب الاسلامي بيروت)

امام ابنِ کثیر رحمہ اللہ کے نزدیک فطرت سے مراد دین اسلام ہے۔
(تفسير القرآن العظيم، تفسير سورة الروم: ٣٠)

امام شوکانی رحمہ اللہ کے نزدیک بھی فطرت سے مراد اسلام ہے۔(فتح القدیر)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین ساخت اور تقویم پر پیدا کیا ہے اور اس میں دینِ اسلام کو قبول کرنے کی پوری پوری صلاحیت اور استعداد رکھ دی ہے جسے بروئے کار لا کر انسان اپنے آپ کو درست کرنے یا بگاڑنے اور دیگر اشخاص کے مفید یا مضر اثرات کو قبول یا رد کرنے کی لیاقت رکھتا ہے اور یہ ملکہ فطرتِ انسانی میں جاگزیں ہے تو گویا انسانی فطرت حیوانی فطرت کی طرح نہیں ہے کہ وہ اس سے انحراف ہی نہ کر سکے بلکہ اسے اختیار بھی دے دیا ہے، اس وجہ سے وہ بسا اوقات دنیوی جاہ وجلال اور خواہشات کی پیروی میں مگن ہو کر حق و باطل کا شعور رکھتے ہوئے بھی باطل عقائد ونظریات کا پیروکار بن جاتا ہے تو یوں وہ رفتہ رفتہ بیرونی اثرات ماحول اور والدین وغیرھم کی تربیت سے فطرت (اسلام) سے دُور ہو جاتا ہے اور اپنے والدین یا ماحول کا مذہب گلے سے لگا لیتا ہے۔

ارشادِ نبوی ہے:

((مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ إِلَّا يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ كَمَا تُنْتَجُ الْبَهِيْمَةُ بَهِيْمَةً جَمْعَاءَ هَلْ تُحِسُّوْنَ فِيْهَا مِنْ جَدْعَاءَ؟)) ثم يقول: ﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ﴾ (۳۰/الروم:۳۰)

(بخاری، التفسیر، لا تبدیل لخلق الله، ح:۴۷۷۵؛ مسلم ، القدر ، معنى كل مولود يولد على الفطرة، ح:۲۶۵۸)

''ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین اسے یہودی، عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں، جس طرح ایک چوپایہ مکمل اور صحیح سلامت بچہ جنتا ہے کیا اس میں کوئی کمی محسوس کرتے ہو؟ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: اللہ کی فطرت پر (قائم رہو) جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا، اللہ کی پیدا کردہ (فطرت) میں کوئی تبدیلی نہ کرو، یہی سیدھا (حق) دین ہے۔''

مذکورہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ہی دینِ فطرت ہے، اگر اسلام دینِ فطرت نہ ہوتا تو یہودیت، عیسائیت اور مجوسیت کے ساتھ اسلام کا بھی ذکر ہوتا۔ موسیٰ، عیسیٰ اور دیگر انبیاء علیہم السلام کا دین یہودیت، عیسائیت وغیرہ نہیں بلکہ اسلام تھا۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے سورۃ الروم کی مذکورہ آیت میں خلق الله کا مطلب دین اللہ اور فطرت کا مطلب اسلام بیان کیا ہے۔ (بخاری، التفسیر، تفسیر سورۃ الروم) اور آیت کا سیاق وسباق بھی اس کا مقتضی ہے۔ زبدة التفسير من فتح القدير میں ﴿ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ﴾ سے لزوم الفطرة هو الدين المستقيم (فطرت کو لازم پکڑنا ہی سیدھا دین ہے) مراد لیا گیا ہے۔ حدیثِ قدسی میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

((خَلَقْتُ عِبَادِيْ حُنَفَاءَ فَاجْتَالَتْهُمُ الشَّيَاطِيْنُ))

''میں نے اپنے بندوں کو موحد پیدا کیا مگر شیاطین نے انہیں بہکا دیا۔''

(مسلم، الجنة، الصفات التي يعرف بها في الدنيا اهل الجنة..... ، ح:۲۸۶۵)

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ توحید اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری انسانی فطرت کی آواز ہے، شیاطین کے بہکاوے میں آ کر انسان اپنی فطرت سے رُوگردانی کرتا ہے، غیر اللہ کو پکارتا ہے لیکن جب مشکلات کے بھنور میں پھنس جاتا ہے تو سب کو چھوڑ چھاڑ کر کائنات کے رب کے دروازے پر دستک دیتا ہے، قرآن کہتا ہے:

﴿قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ

اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴾

(۶/الانعام: ۴۰، ۴۱ نیز دیکھیے آیات ۶۳-۶۴؛ ۱۰/یونس: ۲۲-۲۳)

''آپ کہیے کہ اپنا حال تو بتاؤ کہ اگر تم پر اللہ کا کوئی عذاب آپڑے یا تم پر قیامت ہی آ پہنچے تو کیا اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے اگر تم سچے ہو بلکہ خاص اسی کو پکارو گے، پھر جس مصیبت کے لیے تم پکارو گے اگر وہ چاہے تو اسے دُور کر دے، اس وقت تم جنہیں شریک ٹھہراتے ہو اُن سب کو بھول جاتے ہو۔''

کاش کہ انسان صدائے فطرت پر کار بند رہے اور ان تمام امور سے اجتناب کرے جو انسانی فطرت کو مسخ کر کے رکھ دیتے ہیں اسی میں اخروی نجات کا راز پنہاں ہے۔

بخاری میں بہت سی ایسی روایات بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اگر توحید اور دیگر ایمانیات کا اقراری ہونے کی صورت میں وفات پاتا ہے تو اس کی موت فطرت پر واقع ہوتی ہے۔

براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جب آپ اپنے سونے کی جگہ (بستر) پر آئیں تو نماز کا سا وضو کر لیں، پھر دائیں کروٹ پر لیٹیں اور یوں دعا کریں:

((اَللّٰهُمَّ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ اِلَيْكَ وَفَوَّضْتُ اَمْرِيْ اِلَيْكَ وَاَلْجَأْتُ ظَهْرِيْ اِلَيْكَ رَغْبَةً وَرَهْبَةً اِلَيْكَ لَامَلْجَأَ وَلَا مَنْجَا مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ اَللّٰهُمَّ اٰمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِيْ اَنْزَلْتَ وَبِنَبِيِّكَ الَّذِيْ اَرْسَلْتَ))

''اللہ! آپ کے ثواب کی امید میں اور آپ کے عذاب کے ڈر سے مَیں نے اپنے آپ کو آپ کے سپرد کیا اور اپنا کام آپ کو سونپ دیا اور اپنی پشت کو آپ کے حوالے کر دیا، آپ سے بھاگ کر کہیں پناہ اور ٹھکانا نہیں مگر آپ کے ہی پاس۔ یا اللہ! مَیں آپ کی کتاب (قرآن) پر ایمان لایا جسے آپ نے اتارا اور آپ کے نبی پر جسے آپ نے بھیجا۔''

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اگر آپ اسی رات فوت ہو جائیں تو فطرت (اسلام) پر ہوں گے جبکہ یہ دعا آپ کا (سوتے وقت) آخری کلام ہو۔''

(بخاری، الوضوء، فضل من بات علی الوضوء، ح:۲۴۷)

بخاری، الدعوات، إذا بات طاهرا، ح:۶۳۱۱، اور مایقول إذا نام، ح:۶۳۱۳ میں ((فَإِنْ مُتَّ مُتَّ عَلَى الْفِطْرَةِ)) (اگر آپ کی موت واقع ہوئی تو فطرت پر ہوگی) کے الفاظ ہیں جبکہ باب النوم علی الشق الأیمن، ح:۶۳۱۵ میں یہ الفاظ ہیں:

((مَنْ قَالَهُنَّ ثُمَّ مَاتَ تَحْتَ لَيْلَتِهِ مَاتَ عَلَى الْفِطْرَةِ))

''جس نے یہ کلمات کہے اور اگر اسی رات مر گیا تو فطرت پر فوت ہوا۔''

مزید برآں فطرت کی طرف راہنمائی کرنا یہ بھی اللہ کی طرف سے بندے پر بہت بڑا فضل ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ اسراء کی رات اللہ کے رسول ﷺ کے پاس دو پیالے شراب اور دودھ کے لائے گئے تو آپ نے دودھ لے لیا، اس پر جبریل علیہ السلام نے کہا:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدَاكَ لِلْفِطْرَةِ لَوْ اَخَذْتَ الْخَمْرَ غَوَتْ أُمَّتُكَ))

(بخاری، التفسیر، تفسیر سورة بنی اسراء یل، ح:۴۷۰۹)

''اس اللہ کی سب تعریف ہے جس نے آپ کو فطرت کی طرف راہنمائی کی، اگر آپ شراب لے لیتے تو آپ کی امت بہک جاتی۔''

کیونکہ شراب عقل کو ضائع کر دیتی ہے لہٰذا فطرت کے منافی ہوئی، شاید یہی وجہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بھی بہت سے لوگ شراب سے متنفر تھے۔

فطرت پر پیدا ہونے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ انسان کو کسی علم وشعور اور ارادی تصدیق کی چنداں ضرورت نہیں اور نہ اسے کسی راہنمائی کی حاجت ہے، اسلام کی تعلیم حاصل کیے بغیر انسان تو جاہل مطلق رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ﴾ (۱۶/النحل ۷۸)

''اللہ نے جب تم کو پیدا کیا تو تم کچھ نہ جانتے تھے۔''

اور نبی علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

﴿ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ﴾ (۹۳/الضحیٰ:۷)

ابن رجب حنبلی اس آیت کی مراد یہ تحریر کرتے ہیں:

جس کتاب وحکمت کی تعلیم آپ کو دی گئی ہے اس سے آپ ناواقف تھے۔

(جامع العلوم والحكم شرح الحديث الرابع والعشرون)

جیسے فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ﴾ (۴۲/الشوریٰ:۵۲)

''آپ جانتے نہ تھے کہ کتاب اور ایمان کیا چیز ہے لیکن ہم نے اسے نور بنایا ہے، اپنے بندوں میں سے جسے ہم چاہتے ہیں اس کے ذریعے سے ہدایت نصیب کرتے ہیں۔''

مذکورہ بالا آیات سے ثابت ہوا کہ انسان اگر فطرتِ سلیم پر بھی باقی ہو تب بھی وہ وحی الٰہی کی راہنمائی حاصل ہوئے بغیر صحیح راستہ معلوم نہیں کر سکتا۔ آخر نبی اکرم ﷺ سے بڑھ کر اور کون فطرتِ سلیم پر قائم ہو سکتا ہے۔ آپ ﷺ بھی راہ پانے کے لیے وحی الٰہی کے محتاج تھے، اسی طرح ہر شخص راہ یاب ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ کی وحی سے راہنمائی لینے کا حاجت مند ہے۔ جس وقت یہودیت، نصرانیت، مجوسیت وغیرہ کا نام ونشان تک نہ تھا اس وقت بھی رب کائنات نے بنی نوع انسان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ (۲/البقرۃ:۳۸)

''اگر میری طرف سے تمہارے پاس راہنمائی آئے تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان پر نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

توحید کو تسلیم کرنے اور قبولِ حق کا جو مادہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں ودیعت کیا ہے۔ اسی فطرت کو اجاگر کرنے کے لیے انبیاء ورسل آئے تو جو انسانوں میں سے سلیم الطبع تھے، انہوں نے انبیاء کے ہر فرمان کو اپنے دل کی آواز سمجھا مگر جنہوں نے مخالفت کی وہ بھی

دل سے دعوت انبیاء کی حقانیت کے معترف تھے مثلاً فرعون اور اس کی قوم کے بارے میں آتا ہے کہ وہ نبی (موسیٰ علیہ السلام) کے معجزات کا انکار کرتے تھے لیکن دلی طور پر ان کی صداقت کا انہیں یقین تھا:

﴿ وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا ﴾ (۲۷/النمل:۱۴)

''انہوں نے صرف ظلم اور تکبر کی بنا پر انکار کر دیا حالانکہ اُن کے دل یقین کر چکے تھے۔''

قرآن حکیم کو کہیں ذکر اور کہیں تذکرہ کہا گیا ہے۔

(۳/آل عمرٰن:۵۸؛ ۱۵/الحجر:۶، ۹؛ ۲۷/النمل:۴۴؛ ۳۸/ص:۱؛ ۲۰/طٰہٰ:۳؛ ۸۰/عبس:۱۱)

قرآن کے 'ذکر' اور 'تذکرہ' ہونے سے بھی یہی ثابت ہوتا کہ قبولِ حق اور عقیدہ توحید کو تسلیم کرنے کی جو صلاحیت انسان میں رکھی گئی ہے اور جس کا اقرار وہ عہدِ الست میں کر چکا ہے اس کی یاد دہانی کرائی جائے۔ صراطِ مستقیم پر قائم رہنے کے لیے لازم ہے کہ انسان فطرت سے بالکل انحراف نہ کرے اور سیدھا کام وہی ہوگا جو اِسلام کے مطابق ہوگا، اسلام کا جو حکم بھی ہوگا وہ فطرت کے عین مطابق ہوگا، اس کے منافی نہیں ہوسکتا۔

لفظ ''فطرت'' سنت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے کہ آغاز کلام میں ذکر کیا جاچکا ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے، حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ نماز میں رکوع پورا نہیں کرتا تو آپ نے اس سے فرمایا کہ تم نے نماز ہی نہیں پڑھی:

((لَوْ مُتَّ مُتَّ عَلٰى غَيْرِ الْفِطْرَةِ))

(بخاری، الاذان، إذا لم يتم الركوع، ح:۷۹۱)

''اگر تو (اسی حالت میں) مرگیا تو فطرت پر نہیں مرے گا۔''

ایک حدیث میں آتا ہے:

((خَمْسٌ مِّنَ الْفِطْرَةِ)) (مسلم، الطهارة، خصال الفطرة، ح:۲۵۷)

''پانچ کام فطرت میں سے ہیں۔''

جب کہ دوسری حدیث میں مزید پانچ امور کا اضافہ کرکے دس اشیاء کا تذکرہ کیا گیا ہے:

((عَشْرٌ مِّنَ الْفِطْرَةِ)) (مسلم، الطھارۃ، خصال الفطرۃ، ح:۲۶۱)

اکثر شارحینِ حدیث کے نزدیک مذکورہ اور اس جیسی احادیث میں فطرت سے مراد سنت ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے شرح مسلم از نووی صفحہ ۱۲۸، ۱۲۹، قدیمی کتب خانہ کراچی)

چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات: نمازیں کیسے پڑھی جائیں؟

سوال بعض لوگ اسلام کے مکمل ضابطہ حیات ہونے کے حوالے سے شکوک و شبہات پیدا کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اسلام عالمگیر دین نہیں۔ اس کی مثال وہ یہ دیتے ہیں کہ اسلام کی تعلیمات کے مطابق دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں مگر ان علاقوں میں جہاں چھ چھ مہینے کا دن ہوتا ہے اور چھ چھ مہینے کی رات ہوتی ہے وہاں یہ پانچ نمازیں کیسے ادا ہوں گی نیز چھ مہینے کا دن ہوتو اتنے لمبے دن کا روزہ کیسے رکھا جاسکتا ہے؟ ہماری اس معاملے میں راہنمائی کریں۔

جواب اسلام عالمگیر دین ہے۔ پیغمبر اسلام کو اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کی راہنمائی کے لیے مبعوث کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۗفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (۳۴/سبا:۲۸)

''ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے خوشخبریاں سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے مگر لوگوں کی اکثریت بے علم ہے۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَۨا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُـحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ (۷/الاعراف:۱۵۸)

''آپ کہہ دیجیے: لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، تم اللہ پر ایمان لاؤ اور اس

کے نبی امی پر جو اللہ پر اور اس کے احکام پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کا اتباع کرو تاکہ تم راہ پر آجاؤ۔"

یہ آیت بھی رسالتِ محمدی کی عالمگیر رسالت کے اثبات میں بالکل واضح ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ اے کائنات کے انسانو! مَیں سب کی طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ یوں آپ ﷺ پوری بنی نوع انسانی کے نجات دہندہ اور رسول ہیں۔ اب نجات اور ہدایت نہ عیسائیت میں ہے نہ یہودیت میں، نہ کسی اور مذہب میں۔ نجات اور ہدایت اگر ہے تو صرف اسلام کے اپنانے اور اسے ہی اختیار کرنے میں ہے۔ (احسن البیان تفسیر آیت مذکور)

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اُعْطِيتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ اَحَدٌ قَبْلِى نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ وَجُعِلَتْ لِىَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُورًا فَاَيُّمَا رَجُلٌ مِنْ اُمَّتِى اَدْرَكَتْهُ الصَّلَاةُ فَلْيُصَلِّ وَاُحِلَّتْ لِىَ الْغَنَائِمُ وَلَمْ تَحِلَّ لِاَحَدٍ قَبْلِى وَاُعْطِيتُ الشَّفَاعَةَ وَكَانَ النَّبِىُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهِ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً)) (بخاری ، التیمم ، ح:۳۳۵)

"مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئی تھیں، ایک مہینہ کی مسافت سے رعب کے ذریعہ میری مدد کی گئی اور تمام زمین میرے لیے سجدہ گاہ اور پاکی کے لائق بنائی گئی۔ پس میری امت کا جو انسان نماز کے وقت کو (جہاں بھی) پالے اسے وہاں نماز ادا کر لینی چاہیے۔ (جبکہ باقی امتوں کے لوگ اپنی اپنی عبادت گاہوں میں ہی عبادت کر سکتے تھے) اور میرے لیے غنیمت کا مال حلال کیا گیا ہے، مجھ سے پہلے یہ کسی کے لیے بھی حلال نہ تھا۔ اور مجھے شفاعت عطا کی گئی۔ اور تمام انبیاء اپنی اپنی قوم کے لیے مبعوث ہوتے تھے لیکن میں تمام انسانوں کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔"

ایک اور حدیث میں ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((اُعْطِيْتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ اَحَدٌ قَبْلِيْ: كَانَ كُلُّ نَبِيٍّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ اِلٰى كُلِّ اَحْمَرَ وَاَسْوَدَ وَاُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ وَلَمْ تَحِلَّ لِاَحَدٍ قَبْلِيْ، وَجُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ طَيِّبَةً طَهُوْرًا وَ مَسْجِدًا فَاَيُّمَا رَجُلٌ اَدْرَكَتْهُ الصَّلَاةُ صَلّٰى حَيْثُ كَانَ وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ بَيْنَ يَدَيْ مَسِيْرَةِ شَهْرٍ وَاُعْطِيْتُ الشَّفَاعَةَ))

(مسلم، المساجد ومواضع الصلاۃ، ح:۵۲۱)

''مجھے پانچ چیزیں ملی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو نہیں ملیں؛ ایک تو یہ کہ ہر پیغمبر خاص اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا اور مَیں سرخ اور سیاہ ہر شخص کی طرف بھیجا گیا ہوں (سرد ملکوں کے لوگ سرخ ہیں اور گرم ملکوں کے لوگ سیاہ تو مطلب یہ ہے کہ میری نبوت عام ہے کسی ملک سے خاص نہیں) اور مجھے غنیمت کا مال حلال ہوا۔ مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہیں ہوا اور میرے لیے ساری زمین پاک اور پاک کرنے والی کی گئی۔ پھر جس شخص کو جہاں نماز کا وقت آجائے وہ وہیں نماز پڑھ لے، اور مجھے مدد دی گئی رعب سے جو ایک مہینہ کے فاصلے تک پہنچتا ہے (یعنی میری دھاک ایک مہینے کی راہ سے پڑ جاتی ہے) اور مجھے شفاعت عطا ہوئی ہے۔''

((وَبُعِثْتُ اِلٰى كُلِّ اَحْمَرَ وَاَسْوَدَ)) سے نبی ﷺ کی عالمگیریت ثابت ہوتی ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ اسلام عالمگیر دین ہے، اس میں تمام مسائل کا حل موجود ہے۔

قطبی علاقے جہاں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے وہاں چوبیس گھنٹے میں پانچ نمازیں ادا کی جائیں گی اور روزے بھی اندازے سے رکھے جائیں گے۔ اندازہ لگانے کی راہنمائی حدیث میں موجود ہے۔ نبی ﷺ نے دجال کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: تم میں سے جو اُسے پائے وہ اس پر سورۃ الکھف کی ابتدائی آیات تلاوت کرے۔ وہ شام اور عراق کے درمیان واقع راستے سے نکلے گا اور آنا فانا دائیں بائیں فساد ہی فساد برپا کردے گا۔ اللہ کے بندو! ثابت قدم رہنا۔ ہم (صحابہ) نے استفسار کیا: اللہ کے رسول! وہ

کتنی دیر تک دنیا میں رہے گا؟ آپ نے فرمایا: وہ (زمین میں) چالیس دن تک رہے گا۔ پہلا دن سال جتنا، دوسرا ایک ماہ کے مساوی اور تیسرا ایک ہفتے کے برابر ہوگا جبکہ باقی سب دن (۳۷ دن) تمہارے عام دنوں کے برابر ہوں گے۔ ہم نے کہا: اللہ کے رسول! کیا ہمیں اس دن میں، جو سال کے برابر ہوگا، ایک دن کی نمازیں ادا کرنا ہوں گی؟ آپ نے فرمایا:

((لَا، اُقْدُرُوْا لَهُ قَدْرَهُ)) (مسلم ، الفتن ، ذكر الدجال ، ح:۲۹۳۷)

''نہیں، بلکہ تم (پانچ نمازوں کے اوقات کا) اندازہ لگانا۔''

اس حدیث کی شرح میں شیخ محمد بن صالح عثیمین ؒ فرماتے ہیں:

یہ حدیث اللہ کے رسول ﷺ کی سچائی کی ایک بہت بڑی دلیل ہے کہ آج بھی بعض قطبی علاقوں میں چھ چھ ماہ کا دن اور اتنی لمبی رات ہوتی ہے۔ ایسے علاقوں میں یہ حدیث نماز کے حوالے سے ایک اہم دینی ضرورت کو پورا کرتی ہے، حالانکہ آج سے کئی صدیاں قبل جب نبی ﷺ نے یہ خبر دی تھی تب یہ صورتحال معلوم نہ تھی۔ سچ فرمایا رب العالمین نے:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾ (۵/المآئدۃ:۳)

''آج کے دن میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا، تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا ہے۔'' (دیکھیے مجموع فتاویٰ ورسائل ۲/۱۸)

لہٰذا اسلام پر کیے جانے والے اعتراضات میں کوئی وزن نہیں اور یہ خلافِ حقیقت ہیں نیز یہ اعتراضات معترضین کی جہالت کا منہ بولتا ثبوت بھی ہیں۔

جان کے خطرہ کی وجہ سے اسلام قبول نہ کرنا؟

سوال اسلام کے بارے میں ایک عیسائی سے میری گفتگو ہوئی۔ اس نے کہا: اگر میں نے اسلام قبول کیا تو میری ملازمت ختم ہو جائے گی، گھر والے مجھے گھر سے نکال دیں گے بلکہ عین ممکن ہے کہ میری برادری کے لوگ مجھے قتل بھی کر دیں، تو کیا یہ حالات اسلام قبول نہ کرنے میں عذر بن سکتے ہیں؟

جواب جو آدمی اسلام قبول نہیں کرتا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کا کوئی بھی عذر قبول

نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح جو شخص اسلام قبول کر لیتا ہے مگر مجبوری کے سبب خطرات کے ڈر سے اسلام چھوڑ دیتا ہے اس کا عذر بھی مقبول نہیں ہوگا۔

البتہ کسی کو اسلام قبول کرنے کی وجہ سے قتل ہو جانے کا ڈر ہو تو وہ اسلام کو سینے سے لگائے رکھے مگر ظاہر نہ کرے، بلکہ زبان سے اسلام کی نفی بھی کر سکتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ وَلَٰكِنْ مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِنَ اللَّهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝ لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۝ ﴾ (۱۶/النحل:۱۰۶۔۱۰۹)

''جو شخص اپنے ایمان کے بعد اللہ سے کفر کرے، بجز اس کے جس پر جبر کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر برقرار ہو مگر جو لوگ کھلے دل سے کفر کریں تو ان پر اللہ کا غضب ہے اور انہی کے لیے بہت بڑا عذاب ہے یہ اس لیے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت سے زیادہ محبوب رکھا، یقیناً اللہ کافر لوگوں کو راہِ راست نہیں دکھاتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے اور یہی لوگ غافل ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ یہی لوگ آخرت میں سخت نقصان اٹھانے والے ہیں۔''

اگر جان کا خطرہ نہ ہو تو صرف ملازمت کی خاطر اسلام کو چھپایا نہیں جا سکتا۔

مسلمان کو منحوس کہنے کی شرعی حیثیت؟

کوئی چیز ناپسند لگے تو کیا کہنا چاہیے؟

سوال ہمارے ایک بزرگ ہیں وہ جب بھی گھر جاتے ہیں تو ان کی بیوی انہیں منحوس کہہ کر پکارتی ہے۔ کیا شریعت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ کسی مسلمان کو منحوس کہہ کر

پکارا جائے؟ اگر نہیں تو ہماری اس سلسلے میں راہنمائی کریں تاکہ اس بڑھیا کو راہِ راست پر لایا جائے۔ نیز یہ بھی بتادیجیے کہ اگر کسی کو کوئی چیز ناپسند ہو تو وہ کیا کہے؟

جواب مذکورہ بڑھیا کا یہ طرزِ عمل بداخلاقی، انتہائی نامناسب اور غلط ہے۔ خاوند، جو کہ بیوی کا قوام (سرپرست) ہوتا ہے، احترام کا مستحق ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((لَوْ كُنْتُ اٰمِرًا اَحَدًا اَنْ يَّسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ النِّسَاءَ اَنْ يَّسْجُدْنَ لِاَزْوَاجِهِنَّ لِمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَهُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ حَقٍّ))

(ابوداؤد، النكاح، فی حق الزوج على المرأة، ح:۲۱۴۰)

''اگر میں کسی کو حکم دیتا کہ وہ کسی کو سجدہ کرے تو عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں کیونکہ خاوندوں کا بیویوں پر اللہ نے بڑا حق مقرر کیا ہے۔''

نیز اکثر عورتوں کے جہنمی ہونے کا سبب آپ ﷺ نے یہ بیان فرمایا:

((يَكْفُرْنَ الْعَشِيْرَ وَيَكْفُرْنَ الْاِحْسَانَ))

(مسلم، الکسوف، ما عرض على النبیﷺ فی صلاة الكسوف......، ح:۹۰۷)

''خاوندوں کی ناشکری کرتی ہیں اور احسان نہیں مانتیں۔''

دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((تُكْثِرْنَ اللَّعْنَ وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيْرَ))

(بخاری، الحيض، ترك الحائض الصوم، ح:۳۰۴)

''تم لعن طعن بہت کرتی ہو اور خاوند کی ناشکری کرتی ہو۔''

ظاہر بات ہے کہ خاوند کو منحوس کہنا خاوند پر لعن طعن بھی ہے اور ناشکری بھی کیونکہ خاوند تو بیوی کا محسن ہوتا ہے جو ساری زندگی بیوی کو نان ونفقہ دیتا ہے اور کھلاتا پلاتا ہے۔ جس کی قدر کی جانی چاہیے نہ کہ بے قدری اور ناشکری۔

مزید برآں تطیر (بدفالی اور بدشگونی) شیطانی اور شرکیہ عمل ہے جو کہ عقیدہ توحید کے سراسر خلاف ہے اور یہ بدشگونی بھی پھر مسلمان، نیک اور موحد بندوں کے بارے میں۔ بذاتِ خود کوئی چیز منحوس نہیں ہوتی، اگر فی نفسہ کسی چیز میں شوم (نحوست) ہوتی تو وہ عورت، سواری اور گھر میں ہوسکتی تھی۔ نبی اکرم ﷺ نے ان لوگوں کی تردید کی ہے جو

نحوست وغیرہ کا عقیدہ رکھتے ہیں جیسے نبی اکرم ﷺ نے ان لوگوں کا رد کیا جو ماہِ صفر کو منحوس سمجھتے تھے۔اسی طرح مشرکین کا پورے ہفتے میں سے بدھ کے دن کو منحوس خیال کرنا نیز ماہ شوال کو منحوس سمجھنا خصوصاً نکاح وغیرہ کے معاملے میں اور بعض پرندوں الو وغیرہ کو منحوس خیال کرنا سب غلط باتیں ہیں۔

البتہ جہلاء اور برے لوگوں کا ہر دور میں وطیرہ رہا ہے کہ جب وہ مصائب وآلام، قحط سالی اور تنگ دستی وغیرہ میں مبتلا ہوجاتے تو بیہودگی پر اتر آتے اور اس کا الزام دوسرے لوگوں پر دھرتے۔فرعون اور اس کی قوم کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَإِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوا بِمُوسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ۗ أَلَآ إِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (۷/الاعراف:۱۳۱)

''سو جب ان پر خوشحالی آجاتی تو کہتے کہ یہ تو ہمارے لیے ہونا ہی چاہیے اور اگر انہیں کوئی بدحالی پیش آتی تو موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست بتلاتے۔ یاد رکھو کہ ان کی نحوست اللہ کے پاس ہے لیکن ان کے اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

یعنی اس طرح کی سوچ وفکر رکھنے والے لوگوں پر یہ مصائب وآلام اور عذاب ان کی اپنی بری حرکتوں کی وجہ سے نازل ہوئے ہیں نیز ان لوگوں کو احمق اور جاہل قرار دیا گیا۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ایک بستی والوں کا تذکرہ کرتے ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ نے تین رسول مبعوث کیے مگر ان بستی والوں نے حیل وحجت کی اور آگے سے یہ جواب بھی دیا:

﴿قَالُوٓا إِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۖ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ قَالُوا طٰٓئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ۚ أَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ۚ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ ۝﴾

(۳۶/یٰس:۱۸۔۱۹)

''انہوں نے کہا کہ ہم تو تمہیں منحوس سمجھتے ہیں۔اگر تم باز نہ آئے تو ہم پتھروں سے تمہارا کام تمام کردیں گے اور تمہیں ہماری طرف سے سخت تکلیف پہنچے گی۔ان رسولوں نے کہا کہ تمہاری نحوست تمہارے ساتھ ہی لگی ہوئی ہے کیا

اسے نحوست سمجھتے ہو کہ تم کو نصیحت کی جائے بلکہ تم حد سے نکل جانے والے لوگ ہو۔''

سوال کا دوسرا حصہ کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی چیز کو دیکھے جو اُسے ناپسند ہو تو اس وقت کیا کہے؟ نبی اکرم ﷺ نے اس سلسلے میں ہماری راہنمائی کی ہے، آپ ﷺ فرماتے ہیں:

((فَإِذَا رَأَى اَحَدُكُمْ مَا يَكْرَهُ فَلْيَقُلْ اَللّٰهُمَّ لَا يَأْتِي بِالْحَسَنٰتِ اِلَّا اَنْتَ وَلَا يَدْفَعُ السَّيِّاٰتِ اِلَّا اَنْتَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِكَ))

(ابو داؤد، الطب، فی الطیرۃ، ح:۳۹۱۹، اس کی سند میں سفیان ثوری اور حبیب بن ابو ثابت دونوں مدلس راوی عنعن سے بیان کرتے ہیں۔محمد ارشد کمال)

''تم میں سے کوئی شخص ناپسند چیز دیکھے تو یہ دعا کرے۔ اللہ! تیرے سوا کوئی بھلائی نہیں لاتا اور تیرے سوا کوئی برائی دُور نہیں کر سکتا اور تیری مدد کے بغیر ہمیں نہ بھلائی کی طاقت نہ برائی سے بچنے کی ہمت ہے۔''

علامہ عبدالرحمٰن بن حسن اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

معنی یہ ہیں کہ اے اللہ! میرا یہ عقیدہ ہے کہ تطیر وغیرہ سے کوئی نعمت اور بھلائی حاصل نہیں ہوتی اور نہ کوئی مشکل دُور ہو سکتی ہے بلکہ تُو ہی ایسا مالک اور مربی ہے جس کا کوئی شریک اور ساجھی نہیں، کسی کو بھلائی اور نعمت سے مالا مال کرنا صرف تیرا ہی کام ہے اور مشکلات کو دُور کرنا بھی تیرے ہی اختیار میں ہے۔

ان دعائیہ جملوں میں الحسنات سے نعمت اور السیئات سے مصائب ومشکلات مراد ہیں، جیسے قرآن کریم میں ہے:

﴿وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۭ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ فَمَالِ هٰٓؤُلَاۗءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۝ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۡ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۭ﴾ (۴/النساء:۷۸۔۷۹)

''اگر انہیں کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر کوئی

نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ تمہاری بدولت ہے۔ آپ کہیں: سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات بھی نہیں سمجھتے۔ (انسان!) تجھے جو بھلائی بھی حاصل ہوتی ہے اللہ کی عنایت سے ہوتی ہے اور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرے اپنے کسب وعمل کی بدولت ہے۔"

پیش نظر دعا میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے دل کو تمام دنیا سے قطع تعلق کر کے صرف اللہ تعالیٰ سے جوڑ لے، کیونکہ نفع وضرر یا کسی نعمت سے مالا مال کرنا صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، دوسرے لفظوں میں اس کا اصل نام توحید ہے۔

جس شخص کے دل میں تطیر وغیرہ کا بھی احساس اور خیال پیدا ہو تو یہ دعا پڑھنا بہت ہی مناسب ہے جس سے دل کو سکون اور اطمینان حاصل ہوگا اور شیطانی وساوس ھباءً منثورا (اُڑائی ہوئی گرد وغبار) ہو جائیں گے۔ اس دعا کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے یہ یقین ہوتا ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی چیز میں بھلائی یا تکلیف پہنچانے کی طاقت نہیں اور جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ نفع وضرر پہنچانے میں کسی کو دخل ہے تو وہ احمق اور مشرک ہے۔

(قرۃ عیون الموحدین ۲/۳۸۷-۳۸۸)

کیا طریقت شریعت سے افضل ہے؟

سوال مجھے بعض ایسے پیروں سے واسطہ پڑا ہے، جو طریقت کو شریعت سے افضل بتاتے ہیں، کیا طریقت کو شریعت سے بہتر کہنا درست ہے؟

جواب نظام طریقت کے بہت سے معتقدات ونظریات مثلاً وحدت الوجود، وحدت الشہود اور حلول وغیرہ کتاب وسنت کے واضح دلائل کے منافی ہیں۔ قرآن وحدیث کے منافی نظریات کی حامل طریقت کو عموماً شریعت کے مقابلے میں پیش کیا جاتا ہے، یہ بات محتاج بیان نہیں کہ شریعت کے خلاف کوئی نظام قابل قبول نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ اسے شریعت سے افضل قرار دیا جائے۔ بہت سے طریقت کے داعی شریعت کی تعلیم محو کر کے طریقت کی تعلیم دیتے ہیں، وہ غیر شرعی احکام کی تلقین کرتے ہیں، طالبانِ طریقت کو قرآن وسنت سے دُور کرتے ہیں، نیز ان کے لیے شیخ کی غیر مشروط اطاعت لازمی قرار دی جاتی ہے، جبکہ اللہ سبحانہ

وتعالیٰ اور نبی اکرم ﷺ کے علاوہ کسی کی بھی غیر مشروط اطاعت جائز نہیں۔

یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رکھنی چاہیے کہ اگر طریقت کو شریعت سے افضل قرار دیا جائے تو پھر طریقت کا داعی شریعت کے داعی سے افضل ہونا چاہیے۔ شریعت کے داعی اور علمبردار تو خود نبی اکرم ﷺ تھے اور یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ آپ ﷺ سید ولد آدم ہیں۔ اس پوری کائنات ہست و بود میں کوئی شخص آپ ﷺ سے افضل نہیں۔

علم کا بیان

طالبانِ علم کے پیروں تلے فرشتے پر بچھاتے ہیں؟

سوال کیا یہ صحیح ہے کہ طالبِ علم کے لیے فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں؟ فرشتوں کے پَروں کی وضاحت بھی مطلوب ہے۔

جواب فرشتوں کے وجود اور اُن کی مختلف ذمہ داریوں کا ذکر قرآن وحدیث میں کیا گیا ہے۔ یہ کوئی خیالی مخلوق نہیں ہیں جیسا کہ بعض لوگ باور کروانے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن مجید اور صحیح احادیث میں فرشتوں کے پَروں کا ثبوت ملتا ہے، قرآن میں ہے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۭ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (۳۵/فاطر:۱)

”تمام تعریف اللہ کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور دو دو، تین تین اور چار چار پَروں والے فرشتوں کو اپنا قاصد (ایلچی) بنانے والا ہے۔ مخلوق میں جو چاہے اضافہ کرتا ہے، اللہ یقیناً ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔“

حدیث میں جبریل کے ۶۰۰ پَروں کا ذکر ہے۔ سلیمان شیبانی نے زر بن حبیش سے اس آیت ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ۝﴾ (۵۳/النجم:۹۔۱۰) کے بارے میں پوچھا، تو انہوں نے کہا: مَیں نے عبداللہ بن مسعود سے پوچھا تھا، انہوں نے فرمایا:

ان محمدا ﷺ رای جبریل له ستمائة جناح (بخاری، التفسیر، تفسیر سورة النجم، ح:۴۸۵۷)

”یقیناً محمد ﷺ نے جبریل کو دیکھا تھا، اُس کے ۶۰۰ پَر تھے۔“

فرشتوں کے پَروں کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔

یہ بات درست ہے کہ دین کا علم حاصل کرنے والے کے لیے فرشتے اپنے پَر بچھا دیتے ہیں۔ زر بن حبیش سے روایت ہے، کہتے ہیں: مَیں صفوان بن عسال مرادی کے پاس آیا تاکہ ان سے موزوں پر مسح کرنے کے بارے میں پوچھوں، تو انہوں نے کہا: زر! کس لیے

آئے ہو؟ تو انہوں کہا: علم حاصل کرنے کے لیے، تو انہوں نے کہا:

(ان الملائكة لتضع اجنحتها لطالب العلم رضا بما يطلب)

(ترمذی، الدعوات، ماجاء فی فضل التوبة و الاستغفار، ح:۳۵۳۵)

"طالب علم کی طلب سے خوش ہو کر اس کے لیے فرشتے اپنے پَر بچھاتے ہیں۔"

پھر انہوں نے موزوں پر مسح کے مسائل بیان کیے۔

سنت و بدعت

ہمارے باپ دادا یہی کرتے رہے ہیں!

سوال اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگوں سے جب کتاب وسنت کی بات کی جاتی ہے تو جھٹ سے کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا اسی طرح کرتے رہے ہیں۔ ہم تو ان کے طریقے پر ہی چلیں گے۔ وہ کوئی غلط تھے؟ انہیں ان باتوں کا علم نہیں تھا؟ تمہیں زیادہ علم ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کے اشکالات کی کیا حیثیت ہے؟

جواب اس قسم کے اشکالات کوئی نئی بات نہیں۔ یہ ہر دور کا مشترک مرض ہے۔ جب بھی کوئی نبی کسی قوم کی طرف اللہ کا پیغام لے کر آیا تو قوم نے آگے سے جواب دیا:

﴿ إِنَّا وَجَدْنَآ ءَابَآءَنَا عَلَىٰٓ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰٓ ءَاثَٰرِهِم مُّهْتَدُونَ ۝ ﴾ (۴۳/الزخرف:۲۲،۲۳)

''ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک دین پر پایا، ہم تو انہی کے نقش قدم پر چلیں گے۔''

باپ دادا صحیح دین پر ہوں، حق پر ہوں تو پھر ان کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ اگر وہ غلط راہ پر گامزن ہوں تو پھر بھی انہی کے طریقے کو اختیار کر لینا ضلالت اور جہالت ہے۔ اللہ نے اس کی سختی سے مذمت کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

① ﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ٱتَّبِعُوا۟ مَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ قَالُوا۟ بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ ءَابَآءَنَآ ۚ أَوَلَوْ كَانَ ٱلشَّيْطَٰنُ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ ٱلسَّعِيرِ ۝ ﴾ (۳۱/لقمان:۲۱)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو نازل کیا ہے اس کی اتباع کرو تو یہ کہتے ہیں کہ ہم تو اس پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ بھلا اگر شیطان ان کے باپ دادا کو دوزخ کی آگ کی طرف بلاتا رہا ہو (تو کیا یہ ان کے ساتھ دوزخ میں چلے جائیں گے!)''

② ﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ٱتَّبِعُوا۟ مَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ قَالُوا۟ بَلْ نَتَّبِعُ مَآ أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ ءَابَآءَنَآ ۗ أَوَلَوْ كَانَ ءَابَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْـًٔا وَلَا يَهْتَدُونَ ۝ ﴾ (۲/البقرۃ:۱۷۰)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز کی پیروی کرو جو اللہ نے اتاری ہے تو کہتے ہیں ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو (چلتے ہوئے) پایا ہے۔ تو کیا اگرچہ ان کے باپ دادا بے عقل اور گمراہ ہوں (تب بھی

یہ انھی کی پیروی کیے جائیں گے!)''

③ ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۗؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـــًٔـا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ﴾ (۵/المائدۃ:۱۰۴)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے اتاری ہے اور رسول کی طرف تو کہتے ہیں کہ ہمیں تو وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ بھلا اگر ان کے آباء واجداد بے علم اور گمراہ ہوں (تو پھر بھی یہ ان کے پیچھے ہی چلیں گے!)''

پیر کے ''ارشاد'' کی تحقیق؟

سوال اکثر پیر اپنے مریدوں کو اپنے 'ارشادات' کی تحقیق کی اجازت نہیں دیتے، بلکہ تحقیق کرنے کو منافقت قرار دیتے ہیں۔ ان کا یہ طرز عمل شریعت کی روشنی میں کیا حیثیت رکھتا ہے؟

جواب تمام مسلمان اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم ﷺ کی اطاعت کرنے کے پابند ہیں۔ کتاب وسنت کی مخالفت سے اہلِ اسلام کو روکا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُـقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ﴾

(۴۹/الحجرٰت:۱)

''ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو، اور اللہ سے ڈرتے رہو۔''

لہٰذا اللہ اور رسول کے علاوہ ہر کسی کی بات کو کتاب وسنت کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا اگر وہ قرآن وحدیث کے خلاف ہو تو اسے مسترد کر دیا جائے گا کیونکہ اسے ماننے سے قرآن وحدیث کی مخالفت لازم آتی ہے جو کہ حرام ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا﴾ (۴/النساء:۱۱۵)

''جو شخص باوجود راہ ہدایت کے واضح ہو جانے کے بھی رسول کا خلاف کرے اور

تمام مومنوں کی راہ چھوڑ کر چلے، ہم اسے ادھر ہی متوجہ کر دیں گے جدھر وہ خود متوجہ ہو اور پھر اسے جہنم میں ڈال دیں گے، وہ پہنچنے کی بہت ہی بری جگہ ہے۔''

اس آیت میں جو ﴿ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ ﴾ کا تذکرہ ہوا ہے اس سے مراد بھی کتاب و سنت کی اتباع ہے کیونکہ تمام صحابہ اور دیگر اہلِ ایمان کا ہمیشہ سے یہی طریقہ رہا ہے کہ وہ قرآن وحدیث کی پیروی کرتے ہیں۔ اہلِ ایمان کو حکم بھی یہی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں۔ باقی ہر کسی کی اطاعت مشروط ہے یعنی اگر کسی کی بات کتاب وسنت کے مطابق ہوگی تو مان لی جائے گی ورنہ اسے مسترد کر دیا جائے گا۔ اسی لیے صحابہ کرام بالخصوص حکمران صحابہ لوگوں سے فرمایا کرتے تھے کہ اگر ہم قرآن وسنت کے مطابق تمہیں حکم دیں تو اس کی اطاعت کریں، اگر اس کے برعکس ہو تو ہمیں سیدھا کر دیں، ہماری اصلاح کریں اور ہماری بات نہ مانیں۔

پیروں کا لوگوں کو اپنی ہر بات ماننے کا حکم دینا اور اپنے اقوال کی تحقیق کرنے کو منافقت قرار دینا درحقیقت منافقت ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر لوگ ہماری باتوں کی تحقیق کرنے لگ گئے تو ہماری جہالت کا پردہ چاک ہو جائے گا، دریں صورت لوگوں کو زیادہ دیر تک بیوقوف نہیں بنایا جاسکتا۔ فرمانِ الٰہی، منہجِ نبوی اور ارشاداتِ نبویہ سے دُور رہنے اور لوگوں کو اُن تک نہ پہنچنے دینے کو قرآن نے منافقت قرار دیا ہے۔ نیز قرآن میں صرف اللہ اور رسول کی غیر مشروط اطاعت کو ایمان کا تقاضا قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۝ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَن يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا ۝ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا ۝ ﴾ (۴/النساء:۵۹-۶۱)

''ایمان والو! اللہ کی فرمانبرداری کرو اور رسول کی فرمانبرداری کرو اور اپنے میں سے اختیار والوں کی۔ پھر اگر کسی چیز میں اختلاف کرو تو اسے اللہ کی طرف اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تمہیں اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہے۔ یہ بہت بہتر ہے اور باعتبار انجام کے بہت اچھا ہے۔ کیا آپ نے انہیں نہیں دیکھا جن کا دعویٰ تو یہ ہے کہ جو آپ پر اور جو آپ سے پہلے اتارا گیا ہے اس پر ان کا ایمان ہے، لیکن وہ اپنے فیصلے غیر اللہ کی طرف لے جانا چاہتے ہیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ شیطان کا انکار کریں، شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ انہیں بہکا کر دور ڈال دے۔ ان سے جب کبھی کہا جائے کہ اللہ کے نازل کردہ کلام کی اور رسول کی طرف آؤ تو آپ دیکھ لیں گے کہ یہ منافق آپ سے منہ پھیر کر کے جاتے ہیں۔''

بدعت حسنہ.....؟

سوال بدعات وخرافات سے بھرپور ''الحقیقۃ'' نامی ایک رسالہ نظر سے گزرا، جس میں ایک مقالہ نگار نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ بدعت حسنہ ایجاد کرنے میں ثواب ہوتا ہے۔ بلکہ جو ان پر عمل کرنے والے ہوں گے ان کا بھی ثواب اچھے نئے کاموں کے موجد کو ہوگا۔ اور بدعت وہ مردود ہے جو کتاب وسنت کے خلاف ہو۔ جیسے نوحہ کرنا ہے، اس موقف کو انہوں نے حدیث کے طور پر بیان کیا ہے۔ کیا یہ موقف درست ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین ﷺ کے ذریعے دین اسلام کی تکمیل کر دی۔ اور اسی دین کی پیروی کو ذریعہ نجات قرار دیا اور اس کی مخالفت کو ناکامی کا سبب گردانا۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں عبادات کے اصول (دین کے طور طریقے) مقرر کئے وہاں احکام وعبادات کے طریقے بھی متعین ومکمل کئے جو کہ مکمل شکل میں اہلِ اسلام کے پاس محفوظ ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (۵/المائدۃ:۳)

دین وشریعت چونکہ مکمل ہے۔ اس لیے اسی کی پیروی کا حکم اللہ تعالیٰ اور اس کے

رسول ﷺ نے دیا ہے۔ان سے انحراف گمراہی ہے۔ارشاد نبوی ہے:

((فَإِنَّهُ مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرَى اخْتِلَافًا كَثِيْرًا فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الْمَهْدِيِّيْنَ الرَّاشِدِيْنَ تَمَسَّكُوْا بِهَا وَ عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ وَإِيَّاكُمْ وَ مُحْدَثَاتِ الْأُمُوْرِ فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ)) (ابوداؤد ، السنة ، لزوم السنة ، ح:٤٦٠٧)

''تم میں جو میرے بعد زندہ رہے گا وہ بہت اختلاف دیکھے گا پس تم میری سنت کو اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریقے کو لازم پکڑنا۔اسے خوب مضبوطی سے تھامنا، اسے ڈاڑھوں سے مضبوط پکڑنا، نئے نئے کام (بدعات) ایجاد کرنے سے بچنا۔اس لیے کہ ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔''

اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے بدعات کی واضح طور پر اور مطلقاً تردید کی اور ہر بدعت کو گمراہی قرار دیا۔((وَ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ)) کے الفاظ قابل غور ہیں۔بدعت ظاہری طور پر اچھی ہی معلوم ہوتی ہے کیونکہ وہ ثواب کے حصول کے لیے اور دین قرار دے کر کی جاتی ہے۔مگر خلاف سنت ہونے کی وجہ سے مذموم قرار پاتی ہے۔مثلاً ایک آدمی ساری رات عبادت کرنے کو معمول بناتا ہے تو بادی النظر میں یہ عمل بہت اچھا ہے مگر خلاف سنت ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔اسی طرح ایک آدمی ہمیشہ یعنی بارہ مہینے کے روزے رکھتا ہے یہ عمل بھی بظاہر اچھا ہے مگر خلاف سنت ہونے کی وجہ سے مسترد ہوگا۔کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَا صَامَ مَنْ صَامَ الْأَبَدَ)) مسلم ، الصیام ، النهی عن صوم الدهر ، ح:١١٥٩)

حالانکہ نفلی روزے رکھنا باعث اجر وثواب ہے۔مگر طریقہ بھی وہی اختیار کرنا چاہیے جو نبی اکرم ﷺ نے اختیار کیا تھا۔یا جس کی آپ نے اجازت دی تھی۔اگر ایک آدمی مغرب کے چار فرض ادا کرے تو چوتھی رکعت میں ظاہر ہے قرآن کی تلاوت اور رکوع وسجود میں تسبیحات پڑھے گا اور مغرب کے چار فرض پڑھنے سے آپ نے منع بھی نہیں کیا۔تو کیا اس وجہ سے کہ آپ نے منع نہیں کیا اور تلاوتِ قرآن وتسبیحات پڑھنا اچھا کام ہے، مغرب کی فرض رکعات چار عدد پڑھنا جائز ہوگا؟ بدعات کو حسنہ قرار دینے والوں کے نزدیک تو جائز ہونا چاہیے! جب

کہ کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔ مگر اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے ''اچھی بدعت'' کا انوکھا سہارا ڈھونڈ لیا جاتا ہے۔

بدعات کو حسنہ قرار دینے والے رحمتِ دو عالم ﷺ کی اس حدیث پر غور کریں اور اپنی فکر کا زاویہ درست کر لیں۔ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

تین آدمی (علی، عبداللہ بن عمرو اور عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہم) نبی ﷺ کی بیویوں کے گھر آئے، انہوں نے آپ کی عبادت کا حال پوچھا، جب انہیں بتلایا گیا تو انہوں نے اس عبادت کو کم خیال کیا، کہنے لگے: ہم کہاں نبی ﷺ کہاں! ہمیں آپ سے کیا نسبت، آپ کے اللہ نے اگلے پچھلے سب قصور معاف کر دیے ہیں (ہم لوگ گنہگار ہیں ہمیں بہت عبادت کرنا چاہیے) ان میں سے ایک کہنے لگا: مَیں تو ساری عمر رات بھر نماز پڑھتا رہوں گا، دوسرا کہنے لگا: مَیں ہمیشہ روزہ دار رہوں گا کبھی دن کو افطار نہیں کروں گا اور تیسرا کہنے لگا: مَیں تو عمر بھر عورتوں سے الگ رہوں گا، نکاح نہیں کروں گا۔ اتنے میں اللہ کے رسول ﷺ تشریف لے آئے، آپ نے فرمایا:

((اَنْتُمُ الَّذِیْنَ قُلْتُمْ کَذَا وَکَذَا؟ اَمَا وَاللّٰهِ اِنِّیْ لَاَخْشَاکُمْ لِلّٰهِ وَاَتْقَاکُمْ لَهٗ لٰکِنِّیْ اَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَاُصَلِّیْ وَاَرْقُدُ وَ اَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ))

(بخاری، النکاح، الترغیب فی النکاح، ح:۵۰۶۳)

''آپ لوگوں نے ایسی ایسی باتیں کہیں؟ سن لو! مَیں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور مَیں تم سب سے بڑھ کر پرہیزگار ہوں مگر مَیں روزہ بھی رکھتا ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں، رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں تو جو کوئی میرے طریق کو پسند نہ کرے وہ میرا نہیں ہے۔''

کاش کہ دین کو اپنی مرضی اور خواہشات کے مطابق ڈھالنے والے ((فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ)) پر غور کریں۔

مزید برآں جن روایات سے استدلال کر کے بدعات ایجاد کرنے کا جواز کشید کرنے کی

کوشش کی گئی ہے اگر اُن کا وہی مطلب ومعنیٰ ہوتا جو یہ لوگ مراد لیتے ہیں تو یہ ''کارِ خیر'' سب سے پہلے صحابہ کرام، تابعین عظام اور ائمہ دین سرانجام دیتے کیونکہ یہ لوگ نیکی کے کاموں میں سبقت کرنے والے تھے۔ ان حضرات نے اس طرح کی کوئی بات نہ کہی اور نہ کوئی ایسا عمل ہی کیا، جس سے ہمیں یقینی طور پر معلوم ہوا کہ معاملہ اس کے برعکس ہے جو ''بدعت حسنہ'' کے حمایتی سمجھتے ہیں۔

سوال میں جس حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اگر اس کا معنیٰ یہ ہوتا کہ ایجادِ بدعت اچھی چیز ہے تو عہدِ رسالت میں نہ صرف یہ کہ ایسا کرنے کی اجازت ہوتی بلکہ بدعت کے مُوجد کی حوصلہ افزائی کی جاتی جبکہ معاملہ اس کے برعکس ہے جیسا کہ مذکورہ بالا احادیث میں گزرا ہے کہ بدعات ایجاد کرنے کی حوصلہ شکنی اور ممانعت کی گئی ہے۔

حدیث میں تو دین کے ثابت شدہ عمل کے اجراء کی بات کی گئی ہے۔ اسی لیے نبی ﷺ نے بدعت حسنہ نہیں سنت حسنہ کے الفاظ استعمال کیے۔ اس حدیث سے ''بدعت حسنہ'' کی حمایت حاصل کرنے والے اگر مکمل حدیث اس کے شانِ ورودسمیت ذکر کریں تو اُن کی قلعی کھل جائے۔ حدیث ثابت شدہ شرعی عمل کے اجراء کے بارے میں ہی ہے۔ جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

ہم دن کے اول حصہ میں اللہ کے رسول ﷺ کے پاس تھے کہ ایک جماعت ننگے بدن آئی، اون کی دھاری دھار چادریں یا کمبل ڈالے ہوئے اور تلواریں لٹکائے ہوئے کہ جن میں اکثر بلکہ سب مضر قبیلے کے لوگ تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا چہرہ اُن کا فقر وفاقہ دیکھ کر متغیر ہوگیا۔ آپ (گھر کے) اندر گئے پھر باہر آئے اور بلال کو حکم دیا، انہوں نے اذان پڑھی (نماز کا وقت ہو چکا تھا) اور تکبیر کہی، آپ نے نماز پڑھائی، خطبہ دیا اور یہ آیت پڑھی:

''لوگو! اس اللہ سے ڈرو کہ جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا......

اور دوسری وہ آیت پڑھی جو سورۃ الحشر میں ہے:

ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور غور کرو کہ تم نے کل کے لیے کیا آگے پہنچا رکھا ہے۔ آپ نے فرمایا: صدقہ کرو اشرفی، درہم، کپڑے، گیہوں کے صاع اور کھجور کے صاع سے (صاع:

اڑھائی کلو) حتی کہ آپ نے فرمایا: اگر چہ کھجور کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔ انصار میں سے ایک صاحب ایک تھیلی لے کر آئے گویا کہ ان کا ہاتھ اس سے تھکا جاتا ہے بلکہ تھک ہی گیا تھا پھر تو لوگوں کا تانتا بندھ گیا یہاں تک کہ مَیں نے دو ڈھیر کھانے اور کپڑے کے دیکھے اور مَیں نے اللہ کے رسول ﷺ کے چہرے کو دیکھا کہ وہ چمک رہا ہے گویا کہ وہ سونے کا ٹکڑا ہے۔ پھر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يُنْقَصَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْءٌ وَمَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يُنْقَصَ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ))

(مسلم ، الزكوة ، الحث على الصدقة ولو بشق تمرة او بكلمة طيبة ، ح:١٠١٧)

''جو شخص اسلام میں کسی نیک کام کی بنیاد ڈالے تو اس کے لیے اس کے عمل اور جو اُس کے بعد عمل پیرا ہوں ان کا ثواب بھی ہے بغیر اس کے کہ ان کے ثواب میں کوئی کمی کی جائے اور جس نے اسلام میں بری بات نکالی تو اس پر اس کے عمل کا بھی گناہ ہے اور جو اُس کے بعد اس پر عمل کریں ان کا بھی گناہ ہے بغیر اس کے کہ ان کے گناہ میں کچھ کمی ہو۔''

یہ حدیث بھی واضح ہے اور اس کی مزید وضاحت دیگر احادیث سے بھی ہو جاتی ہے جس سے یہ بات پوری طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی سنت کو جاری کرنے والے کے لیے مذکورہ بالا اجر وثواب کا اعلان کیا گیا ہے نہ کہ بدعات ایجاد کرنے والے اور دین کا حلیہ بگاڑنے والے کے لیے۔ ایک حدیث میں ہے:

((مَنْ دَعَا إِلَى هُدًى كَانَ لَهُ مِنَ الْأَجْرِ مِثْلَ أُجُوْرِ مَنْ تَبِعَهُ لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْئًا وَمَنْ دَعَا إِلَى ضَلَالَةٍ كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْإِثْمِ مِثْلَ آثَامِ مَنْ تَبِعَهُ لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ آثَامِهِمْ شَيْئًا))

(مسلم ، العلم ، من سن سنة حسنة او سيئة ، ح:٢٦٧٤)

''جس نے کسی کو ہدایت کی طرف بلایا تو اسے ان تمام لوگوں کے برابر اجر ملے گا

جو اُس کی پیروی کرنے والوں کو ملے گا، یہ ان کے اجر سے کچھ کمی نہیں کرے گا اور جو کسی کو کسی گمراہی کی طرف بلائے تو اس پر ان تمام لوگوں کے گناہوں کا اتنا ہی وبال ہوگا جو اُس کی پیروی کرنے والوں کو گناہ کرنے کا ہوگا۔ یہ ان کے گناہوں میں سے کچھ کمی نہیں کرے گا۔"

اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ دَلَّ عَلٰی خَیْرٍ فَلَهٗ مِثْلُ اَجْرِ فَاعِلِهٖ))

(مسلم، الامارة، فضل اعانة الغازی ، ح:۱۸۹۳)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((ثُمَّ ادْعُهُمْ اِلَی الْاِسْلَامِ وَاَخْبِرْهُمْ بِمَا یَجِبُ عَلَیْهِمْ مِّنْ حَقِّ اللّٰهِ تَعَالٰی فِیْهِ فَوَاللّٰهِ لَاَنْ یَّهْدِیَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا وَاحِدًا خَیْرٌ لَّكَ مِنْ حُمُرِ النَّعَمِ))

(بخاری ، الجهاد ، فضل من اسلم علی یدیه رجل، ح:۳۰۰۹؛مسلم ، فضائل الصحابة ، من فضائل علی رضی الله عنه ، ح:۲۴۰۶)

"پھر انہیں اسلام کی دعوت دو اور انہیں بتاؤ کہ تم پر اللہ تعالیٰ کے یہ یہ حق واجب ہیں، اللہ کی قسم! تمہارے ذریعے سے کسی ایک آدمی کا ہدایت یافتہ ہوجانا تمہارے لیے (بیش قیمت) سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔"

کیا انگوٹھے چومنے سے نظر تیز ہوجاتی ہے؟

سوال کیا نبی ﷺ کا نام سن کر "ﷺ" کہنے کے بعد انگوٹھے چوم کر آنکھوں پر لگانے سے نظر تیز ہوتی ہے؟

جواب قرآن اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی ﷺ پر درود وسلام پڑھنا ضروری ہے۔ آپ ﷺ کا اسم گرامی سن کر درود پڑھنا چاہیے۔ البتہ کسی بھی صحیح حدیث سے درود وسلام کے علاوہ کچھ ثابت نہیں۔ نبی اکرم ﷺ کا نام سن کر انگلیاں اور انگوٹھے وغیرہ چومنا ثابت نہیں۔ اس سلسلے کی چند روایات کی حقیقت واضح کی جاتی ہے:

ایک روایت ہے کہ جو آدمی اذان کے کلمات ((اشهد ان محمدا رسول الله)) سن کر کہے:

مرحبا بحبیبی و قرة عینی محمد بن عبدالله

پھر اپنے انگوٹھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگائے، وہ کبھی آنکھ کی تکلیف میں مبتلا نہیں ہوگا۔ اس حدیث کو ماہرینِ فن نے ضعیف قرار دیا ہے۔ (سلسلة الاحاديث الضعيفة: ٧٣)

اسی روایت کو خضر علیہ السلام سے بھی روایت کیا گیا ہے کہ امام سخاوی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو اپنی کتاب المقاصد الحسنۃ میں یوں روایت کیا: خضر علیہ السلام سے مروی ہے کہ جو ((اشهد ان محمدا رسول الله)) سن کر اپنے انگوٹھوں کو چومے اور پھر اپنی آنکھوں پر لگائے وہ کبھی آنکھیں دُکھنے کی تکلیف میں مبتلا نہیں ہوگا۔ امام سخاوی نے اس حدیث کو غیر ثابت قرار دیا ہے، اس حدیث پر وہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس روایت کو کسی صوفی نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ اس روایت کی سند کے راوی محدثین کے نزدیک مجہول ہیں، یعنی اس کی سند من گھڑت ہے اور پھر (یہ بھی قابل توجہ ہے کہ) خضر علیہ السلام سے کس نے یہ روایت سنی ہے اس کا بھی کوئی تذکرہ نہیں۔

امام سخاوی رحمہ اللہ کا یہی تبصرہ امام شیبانی نقل کرتے ہیں:

قال شيخنا ولا يصح، في سنده مجاهيل مع انقطاعه عن الخضر و كل ما روى من هذا فلا يصح رفعه البتة

(تمييز الطيب من الخبيث، ص: ١٨٩)

"ہمارے شیخ فرماتے ہیں کہ یہ روایت صحیح نہیں، اس کی سند میں مجہول راوی ہیں، خضر پر اس کی سند منقطع ہے۔ (بلکہ خضر علیہ السلام کا عہد نبوی میں زندہ ہونا ثابت ہی نہیں، اگر وہ زندہ ہوتے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے یا کم از کم خلافت راشدہ میں ان کا کوئی تذکرہ ہوتا، راقم) اس سلسلے میں (یعنی انگوٹھے چومنے کے بارے میں) جو کچھ بھی مروی ہے اس کا مرفوع ہونا ہرگز درست نہیں۔"

ایک اور روایت میں ہے جو شخص مؤذن کے ((اشهد ان محمدا رسول الله))

کہنے پر ((اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَ بِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا)) کہے اور شہادت کی انگلیوں کو بوسہ دے کر ان کے اندرونی حصے کو اپنی آنکھوں میں پھیرے تو ایسا شخص میری شفاعت کا مستحق ہوگا۔ سخاوی نے اس روایت کو غیر صحیح جبکہ ملاعلی قاری نے اسے موضوعاتِ کبیر میں موقوف قرار دیا ہے۔ (ص:۷۳)

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ انگوٹھے چوم کر آنکھوں کو لگانے والی روایت کے بارے میں تیسیر المقال میں لکھتے ہیں:

کلها موضوعات "یہ سب روایات موضوع ہیں۔"

حسن بن علی نے بھی تعلیقات مشکوٰۃ میں ان روایات کو غیر صحیح قرار دیا ہے۔

لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا تقاضا یہی ہے کہ جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلے میں ثابت ہے، اسی پر اکتفا کیا جائے اور اس میں اپنی طرف سے کسی چیز کا اضافہ نہ کیا جائے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی سن کر درود پڑھنے پر ہی اکتفا کرنا چاہیے۔

کیا لمبی تقریر کرنا خلافِ سنت ہے؟

سوال ایک پروفیسر صاحب سے میں نے سنا، وہ کہہ رہے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ مختصر خطبہ دیتے تھے۔ آپ کے خطبات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کبھی پندرہ بیس منٹ سے زیادہ خطبہ نہیں دیا، کیا یہ درست ہے؟

جواب اگرچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عام طور پر مختصر خطبہ ہی دیا کرتے تھے مگر حسبِ ضرورت طویل خطبہ بھی دیتے۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

قام فينا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم مقاما ماترك شيئا يكون في مقامه ذلك الى قيام الساعة الا حدث به حفظه من حفظه ونسيه من نسيه

(مسلم ، الفتن، اخبار النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیما یکون الی قیام الساعة، ح:۲۸۹۱؛ بخاری ، القدر ، وکان امر اللہ قدرا مقدورا، ح:۶۶۰۴)

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے درمیان کھڑے ہو کر خطاب فرمایا۔ آپ

نے اپنے کھڑے ہونے سے لے کر قیامت تک کی کوئی چیز نہ چھوڑی جسے آپ نے بیان نہ فرمایا ہو۔جس نے جو کچھ یاد رکھا اسے یاد رہ گیا اور جس نے بھلا دیا اسے بھول گیا۔''

ایک اور حدیث میں ہے،عمرو بن اخطب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

صلى بنا رسول الله ﷺ الفجر ، وصعد المنبر ، فخطبناحتى حضرت الظهر ، فنزل فصلى ، ثم صعد المنبر فخطبنا حتى حضرت العصر ، ثم نزل فصلى ، ثم صعد المنبر فخطبنا حتى غربت الشمس ، فاخبرنا بما كان وبما هو كائن فاعلمنا احفظنا

(مسلم ، الفتن ، اخبار النبی ﷺ فیما یکون الی قیام الساعة ، ح:۲۸۹۲)

''رسول اللہ ﷺ نے ہمیں نماز فجر پڑھائی اور منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور ہمیں خطاب فرمایا یہاں تک کہ ظہر کا وقت ہوگیا، پھر آپ نیچے تشریف لے آئے، نماز پڑھائی، پھر منبر پر تشریف فرما ہوئے اور ہمیں خطاب کیا حتیٰ کہ عصر کا وقت ہوگیا۔ پھر منبر سے اترے اور نماز پڑھائی، پھر منبر پر تشریف لے گئے یہاں تک کہ سورج ڈوب گیا آپ نے ہمیں (قیامت اور فتنوں سے متعلق) ہر اس چیز کی خبر دی جو قیامت تک ہونے والی تھی۔(عمرو بن اخطب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں) ہم میں سے زیادہ جاننے والا وہ ہے جو زیادہ حافظے والا ہے۔''

بدعت کے مرتکب کو سلام کا جواب دینا؟

سوال حدیث ہے کہ غیر مسلم کو سلام مت کرو، اگر وہ سلام کرے تو جواباً صرف وعلیکم کہو۔اہل بدعت کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اگر وہ سلام کریں تو کیا جواب دینا چاہیے؟

جواب اس سوال کا جواب سمجھنے سے پہلے آپ ﷺ کے اس فرمان کا پس منظر سمجھنا چاہیے۔آپ ﷺ نے اہلِ کتاب کے سلام کے جواب میں وعلیکم کہنے کا حکم دیا ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ مدینہ کے اہل کتاب پیغمبر اسلام اور مسلمانوں سے دشمنی، کینہ اور حسد رکھتے تھے اور اس کا اظہار وہ مختلف طریقوں سے کرتے تھے۔ بعض اوقات ذو معنی الفاظ استعمال کرتے یا زبان کے معمولی ہیر پھیر سے الفاظ میں تبدیلی پیدا کر دیتے جو بادی النظر میں محسوس نہ ہوتی مثلاً آپ ﷺ کی مجلس میں آتے تو وہ راعنا (ہماری رعایت کیجئے اور بات دوبارہ سمجھایئے) کی بجائے راعينا (ہمارا چرواہا) کہتے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ﴾

(۴/النساء:۴۶)

''بعض یہود کلمات کو اُن کی ٹھیک جگہ سے ہیر پھیر کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں: ہم نے سنا اور نافرمانی کی۔ اور سن اس کے بغیر کہ تو سنا جائے (تیری بات نہ سنی جائے) اور ہماری رعایت کر! (لیکن اس کہنے میں) اپنی زبان کو پیچ دیتے ہیں اور دین میں طعن کرتے ہیں اور اگر یہ لوگ کہتے کہ ہم نے سنا اور ہم نے فرمانبرداری کی، آپ سنیے اور ہمیں دیکھیے تو یہ ان کے لیے بہتر اور نہایت ہی مناسب تھا۔'' (نیز دیکھیے ۲/البقرۃ:۱۰۴)

اسی طرح ''سلام'' کے الفاظ میں بھی تحریف کرتے تھے۔ جیسے کہ قرآن میں ہے:

﴿وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ ۙ﴾ (۵۸/المجادلۃ:۸)

''اور جب آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کو اُن الفاظ میں ''سلام'' کرتے ہیں جن میں اللہ نے نہیں کہا۔''

اس کی وضاحت احادیث میں آتی ہے کہ جب یہودی لوگ نبی ﷺ کے پاس آتے تو ''السلام علیکم'' کی بجائے السام علیکم یا علیك (تم پر موت وارد ہو، تم ہلاک ہو جاؤ) کہتے تو آپ ﷺ جواباً صرف ''وعلیکم یا وعلیك'' (اور تم پر ہی ہو) کہہ دیتے۔

(بخاري، الجهاد، الدعاء على المشركين بالهزيمة.....ح: ٢٩٣٥)

تو اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم بڑا ہی حکیمانہ جواب دیتے کہ جو تم نے کہا ہے تم پر ہی ہو۔
بدعت کا ارتکاب اگرچہ بہت بڑا گناہ اور گمراہی ہے مگر اہلِ بدعت کو غیر مسلم قرار نہیں دیا جاتا۔ مزید براں بدعت کی ایجاد بھی حسنِ نیت پر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ بدعت اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں بلکہ بدعت کو بدعت ہی نہیں سمجھتے۔ اسی لیے وہ اہلِ اسلام سے دشمنی یا حسد وبغض نہیں رکھتے۔ لہٰذا اُن سے اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ مسلمانوں کو السام علیکم (تم ہلاک ہو جاؤ) کہیں گے۔ اس بنیادی فرق کی وجہ سے بدعتی کو سلام کا پورا جواب دیا جائے گا نہ کہ صرف وعلیکم (واللہ اعلم)

البتہ سنت سے شدید محبت کرنے والے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بدعتی کے سلام کا جواب نہیں دیا تھا۔ (ترمذی، ح:٢١٥٢)

مسجد
کے
احکام ومسائل

﴿ وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلَّهِ ﴾ کا مفہوم

سوال ﴿ وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا ﴾ (۷۲/الجن:۱۸) سے کیا مراد ہے؟

جواب مشرکین نے بیت اللہ میں بت نصب کر رکھے تھے۔ مسجدِ حرام میں کھلم کھلا بتوں کی پوجا ہوتی اور شرکیہ اعمال کیے جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مساجد تو اللہ کی ہیں، ان میں اسی کی عبادت ہونی چاہیے، کسی غیر کی عبادت کی ہرگز اجازت نہیں۔

بیت اللہ میں بتوں کی موجودگی کا تذکرہ کئی احادیث میں ہے۔ نبی ﷺ جب فتح مکہ کے وقت بیت اللہ میں داخل ہوئے تو آپ کے ہاتھ میں چھڑی تھی، آپ اس کی نوک سے بتوں کو مارتے جاتے اور پڑھتے جاتے:

﴿ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ﴾ (۱۷/بنی اسرائیل:۸۱)،

﴿ جَاءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ ﴾ (۳۴/سبا:۴۹)

(بخاری، التفسیر، تفسیر سورۃ بنی اسراء یل، ح:۴۷۲۰؛ مسلم، الجهاد، ازالۃ الاصنام من حول الکعبۃ، ح:۱۷۸۱)

بعض مفسرین نے مذکور بالا آیت میں مذکور لفظ المساجد سے مراد جسم کے وہ اعضاء لیے ہیں جنہیں سجدے کے وقت زمین پر رکھا جاتا ہے یعنی پیشانی، دونوں ہاتھ، دونوں گھٹنے اور دونوں پاؤں۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تمام اعضاء اللہ کے ہی دیے ہوئے ہیں، لہٰذا یہ قطعاً جائز نہیں ہے کہ ان کے ذریعے اپنے حقیقی خالق و مالک کے علاوہ کسی اور کو بھی سجدہ کیا جائے۔

الغرض مساجد کے قیام کا مقصد اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت ہے۔ اس لیے مسجدوں میں کسی اور کی عبادت، کسی اور سے دعا و مناجات اور استغاثہ و استمداد ہرگز جائز نہیں۔ اگرچہ یہ غیر شرعی افعال مسجد سے باہر بھی جائز نہیں ہیں مگر مسجد میں، جو کہ بنائی ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے جاتی ہے، غیر اللہ کی عبادت زیادہ سنگین جرم ہے۔

مساجد میں ﴿ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ﴾ اور ((التحیات للہ و الصلوات و

الطیبات)) کا اقرار و اعلان کرنے والوں کو کہاں زیب دیتا ہے کہ وہ غیر اللہ اور من دون اللہ کے نعرے بلند کریں۔ مخلوق سے مافوق الاسباب استمداد عقیدہ توحید اور آیتِ قرآنی ﴿وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا﴾ کے منافی ہے۔

سعودی عرب کی سب سے بڑی کمیٹی 'لجنة العلماء' کے رکن علامہ عبداللہ بن عبدالرحمٰن الجبرین سے اولیاء اور پیروں سے مانگنے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ اولیاء اور پیروں سے مانگنا اور انہیں پکارنا، نیز مصائب و شدائد پیش آنے کے وقت ان سے مدد طلب کرنا شرکِ اکبر ہے۔ اس لیے کہ سارے پیران و اولیاء خود مخلوق اور پرورش کیے گئے ہیں۔ (ان کا رب بھی اللہ تعالیٰ ہے۔) یہ لوگ خود اپنے آپ کے نفع و نقصان کے مالک بھی نہیں، نہ موت و حیات ان کے اختیار میں ہے اور نہ خود اپنی مرضی سے دوبارہ اٹھیں گے تو پھر کیسے یہ ان اشخاص کے مالک ہو سکتے ہیں جو اِن سے دعا مانگتے ہیں؟ پھر انہوں نے یہی آیت پیش کی:

﴿وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا﴾ (۷۲/الجن:۱۸)

''اور یہ کہ مساجد اللہ ہی کے لیے ہیں، پس اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو۔''

جٹاں دی مسجد؟

سوال قرآن مجید میں ہے کہ مساجد اللہ کی ہیں، کیا کسی مسجد کے بارے میں یہ کہنا درست ہے کہ وہ فلاں لوگوں کی مسجد ہے مثلاً جٹاں دی مسجد؟

جواب مساجد اللہ کے نام وقف ہوتی ہیں، کوئی شخص مسجد کا مالک نہیں ہو سکتا اور نہ کسی کے لیے مالکانہ رویہ اختیار کرنا جائز ہے۔ البتہ شناخت کے طور پر اگر کسی نام سے مشہور ہو جائے جیسے سوال میں ذکر کیا گیا ہے تو کوئی حرج نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری، کتاب الصلاۃ میں ایک باب یوں قائم کیا ہے:

هل يقال مسجد بني فلان؟ (کیا یوں کہہ سکتے ہیں کہ فلاں قبیلے کی مسجد؟)

اس باب کے تحت درج ذیل حدیث (ح:۴۲۰) ذکر کرتے ہیں:

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے جو گھوڑے تیار کرائے

تھے ان کی دوڑ ھیا سے لے کر اخیر مقام ثنیۃ الوداع تک مقرر کی اور جو گھوڑے تیار نہیں کیے گئے تھے ان کی دوڑ ثنیۃ الوداع سے بنی زریق کی مسجد تک رکھی اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے گھوڑے دوڑائے تھے۔

مذکورہ روایت میں مسجد بنی زریق کا تذکرہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شناخت کے لیے کسی قوم یا قبیلہ وغیرہ کی طرف مسجد منسوب کی جاسکتی ہے۔

مسجد کو دوسری جگہ منتقل کرنے کی شرعی حیثیت

سوال ہمارے گاؤں میں ایک چھوٹی سی مسجد تھی جو کہ بہت پہلے تعمیر کی گئی تھی۔ وہ اب غیر آباد تھی۔ اس میں کبھی کسی نے اذان دے دی تو دے دی ورنہ اکثر اذان تک نہیں ہوتی تھی۔ نہ نماز باجماعت ہی ہوتی تھی۔ البتہ کبھی کبھار کوئی اکا دکا آدمی نماز ادا کر لیتے تھے۔ اس مسجد کے قریب ہی ایک بڑی جامع مسجد موجود ہے۔ جو پہلے دُور تھی مگر توسیع اور تعمیرِ نو کی وجہ سے مزید اس چھوٹی مسجد کے قریب ہوگئی ہے۔ محلّہ کے بہت سے نمازی وہیں باجماعت نماز ادا کرتے ہیں۔ اس وجہ سے بھی چھوٹی مسجد غیر آباد تھی اس لیے محلّہ کے بہت سے لوگوں نے اس مسجد کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے گرا دیا تاکہ غیر آباد ہونے کی وجہ سے کہیں وبال کا ذریعہ نہ بن جائے البتہ بعض لوگوں نے کہا کہ مساجد شعائر اللہ ہیں ان کی تعظیم کا اور باقی رکھنے کا حکم ہے۔ مسجد کو گرانے سے اہل محلّہ پر عذاب آسکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہم نے علماء کی طرف رجوع کیا تو کچھ علماء نے کہا کہ اس مسجد کو مدرسہ بنا دو۔ بعض نے کہا کہ اس کی جگہ قریب والی جامع مسجد کو دے دی جائے۔ جہاں مسجد بن گئی ہو تو کیا وہاں سے اسے کسی عذر یا مجبوری کی وجہ سے ختم کیا جاسکتا ہے تاکہ اسے دوسری جگہ منتقل کیا جائے؟ کیا ایک مسجد کا سامان اور جائیداد دوسری مسجد کے لیے استعمال ہوسکتی ہے؟

جواب جو اَشیاء وقف ہوچکی ہوں ان کی وقف کی حیثیت ختم کرنا درست نہیں۔ البتہ انہیں کسی مصلحت کی خاطر دوسری جگہ منتقل یا وقف کی حیثیت سے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ایک مسجد کو دوسری جگہ منتقل بھی کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ مسجد کو غیر آباد رکھنے کی بجائے اس کا قریبی مسجد میں ضم کرنا بہتر ہے، اگر ایسا کرنا شعائر اللہ کی توہین یا بے ادبی کے لیے نہ ہو تو اس میں کوئی

حرج نہیں۔ ذیل میں مفتیانِ کرام کے چند فتاویٰ پیش کیے جاتے ہیں:

حافظ عبداللہ محدث روپڑی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ

مسجد کی منتقلی کے بارے میں محدث روپڑی لکھتے ہیں:

مسجد وقف کی قسم سے ہے اور وقف عقد لازم ہے یہ فسخ نہیں ہوسکتا۔ حدیث میں ہے:

لَا يُبَاعُ أَصْلُهَا وَلَا يُوْهَبُ وَلَا يُوْرَثُ

(بخاری، الوصایا، الوقف و کیف یکتب، ح:۲۷۷۲؛ مسلم، الوصیة بالوقف، ح:۱۶۳۲؛ ابوداؤد، ح:۲۸۷۸؛ ترمذی، ح:۱۳۷۵)

”وقف نہ فروخت ہوسکتی ہے نہ ہبہ کی جاسکتی ہے۔ اور نہ وراثت میں لی جاسکتی ہے۔“

اس بنا پر مسجد کی عمارت خواہ بالکل خراب ہوجائے وہ چٹیل میدان ہی رہے گا۔ لیکن اب دیکھنا چاہیے کہ اس سے فائدہ اٹھانے کی صورت کیا ہے؟

اگر مسجد کی صورت میں اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے تو یہ اول نمبر ہے۔

اگر وہاں مسجد بننے کی کوئی صورت نہیں مثلاً وہ کسی وجہ سے مسجد کے قابل نہیں رہی یا اسے بنانے کے لیے پیسوں کا انتظام ہونا مشکل ہے اور نماز کے لیے دوسری مسجد موجود ہے یا کوئی اور وجہ ہے تو اس مسجد کو کسی اور وقف میں تبدیل کر دیا جائے جس سے دوسری مسجد کو فائدہ پہنچے مثلاً یہ جگہ کرایہ پر یا ٹھیکہ پر دے دی جائے یا اس میں کھیتی کی جائے یا کوئی شخص اپنے پیسوں سے یہاں دکان یا مکان بنائے اور اس کے کرایہ سے اپنا قرض پورا کر کے اسے چھوڑ دے یا کرایہ ادا کرتا رہے۔

اگر وقف رہنے کی صورت میں دوسری مسجد کو فائدہ نہیں تو پھر فروخت کر کے اس کی قیمت دوسری مسجد پر خرچ کر دی جائے۔ اگر دوسری مسجد پر ضرورت نہ ہو تو درس و تدریس یا کسی اور نیک مصرف میں لگا دی جائے ہر صورت جو شے خدا کی ہو چکی حتی الوسع کسی نہ کسی طرح اسے اسی راہ میں صرف کرنا چاہیے۔ ضائع نہ ہونے دے۔ اگر کوئی اور صورت نہ ہو تو قبرستان ہی سہی۔ کیونکہ یہ بھی مسلمانوں کے عام فائدہ کی شے ہے، ہاں اگر معاملہ طاقت سے باہر ہوجائے تو جدھر جاتی ہے جانے دے۔ منتقی باب ما یصنع بفاضل مال الکعبۃ میں ہے:

عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے سنا، فرماتے تھے:

((لَوْلَا اَنَّ قَوْمَكِ حَدِيثُوْا عَهْدٍ بِجَاهِلِيَّةٍ)) او قال((بِكُفْرٍ لَاَنْفَقْتُ كَنْزَ الْكَعْبَةِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَجَعَلْتُ بَابَهَا بِالْاَرْضِ وَلَاَدْخَلْتُ فِيْهَا مِنَ الْحَجَرِ))(مسلم، الحج، نقض الكعبة و بنائها، ح:۱۳۳۳)

''اگر تیری قوم کفر (جاہلیت) کے ساتھ نئے زمانے والی نہ ہوتی تو میں بیت اللہ کا خزانہ نکال کر اللہ کی راہ میں تقسیم کر دیتا اور بیت اللہ کا دروازہ زمین کے ساتھ ملا دیتا اور حجر کا کچھ حصہ بیت اللہ میں داخل کر دیتا۔''

بیت اللہ کے خزانہ سے مراد وہ مال ہے جو لوگ بیت اللہ کی خاطر نذر دیا کرتے تھے جیسے مساجد میں لوگ دیتے ہیں۔ یہ خزانہ بیت اللہ میں اسی طرح دفن ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے جب دیکھا کہ یہ بیت اللہ کی حاجت سے زائد بے کار ہے تو خیال ہوا کہ اسے فی سبیل اللہ تقسیم کر دیا جائے لیکن کفار چونکہ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے خطرہ تھا کہ کہیں وہ بدظن نہ ہو جائیں اس لیے چھوڑ دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب وقف کی حالت ایسی ہو جائے کہ ضائع جاتی نظر آئے تو اس کی کوئی ایسی صورت بنانی چاہیے جس سے وہ ضائع نہ ہو۔ کشف القناع عن متن الاقناع جلد۲ص۱۷۴ میں ہے:

واحتج الامام بان ابن مسعود رضی اللہ عنہ قد حول المسجد الجامع من التمارين اى بالكوفة

''اور امام احمد نے وقف کی تبدیلی پر اس بات سے استدلال کیا ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جامع مسجد کھجوروں کے تاجروں سے بدل دی۔''

یعنی بدل کر کوفہ میں دوسری جگہ لے گئے۔

اور عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ شارع عام تنگ ہو گیا تو انہوں نے مسجد کا کچھ حصہ راستہ میں ڈال دیا۔ (ملاحظہ ہو فتاویٰ ابن تیمیہ جلد۳ص۲۸۸)

غرض اس قسم کے تصرفات اوقاف اور خیرات میں درست ہیں جن سے وہ ضائع نہ ہو بلکہ بڑھے یا محفوظ ہو جائے۔ بلکہ حنفیہ کا بھی آخری فتویٰ اسی پر ہے، چنانچہ درالمختار جلد۳ص۴۰۷

میں اس کی تصریح کی گئی ہے اور امام محمد نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر وقف بیکار ہو جائے تو اس کی اصل مالک یا وارثوں کی مِلک میں ہو جائے گی۔ خلاصہ یہ کہ وقف کی غرض پر مدار ہے۔ حتی الوسع اسے ضائع نہ ہونے دے ورنہ حوالۂ خدا۔ (عبداللہ امرتسری روپڑی، ۹ دسمبر ۱۹۳۸ء)

شیخ الحدیث حافظ عبدالمنان نور پوری رحمہ اللہ کا فتویٰ

آپ سے سوال کیا گیا کہ مسجد کو ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیل کرنا یا مسجد کے سامان کو قیمتاً خریدنا کیسا ہے؟ تو آپ نے جواب میں فرمایا: درست ہے بشرطیکہ مسجد کی آبادی مقصود ہو، بربادی مقصود نہ ہو۔ اسی طرح آپ سے سوال ہوا کہ مسجد کے لیے خریدی گئی جگہ بیچ کر کوئی اور جگہ خریدی جاسکتی ہے۔ تو آپ نے جواب میں لکھا کہ درست ہے بشرطیکہ مسجد کی آبادی مقصود ہو:

﴿ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ ﴾ (۹/التوبۃ:۱۸)

''اللہ کی مسجدوں کی آبادی انہی لوگوں سے ہوتی ہے جو اللہ پر ایمان لائے۔''

﴿ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسَاجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا ﴾ (۲/البقرۃ:۱۱۴)

''اور کون ہے بہت ظالم اس شخص سے کہ منع کرتا ہے مسجدوں اللہ کی سے یہ کہ ذکر کیا جائے بیچ ان کے نام اس کا اور کوشش کرتا ہے بیچ خراب کرنے ان کے کے۔'' (احکام و مسائل ۱/۱۰۴)

شیخ الحدیث مفتی حافظ عبدالستار حماد حفظہ اللہ کا فتویٰ

ان سے سوال کیا گیا کہ سڑک کے کنارے بنی ہوئی مسجد کو کسی دوسری جگہ منتقل کر کے پہلی جگہ پر دکان تعمیر کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ تو آپ نے جواب میں لکھا: مساجد کو بلاوجہ دوسری جگہ منتقل نہیں کرنا چاہیے ہاں اگر پہلی مسجد بے آباد ہو جائے یا اس سے وہ مقاصد پورے نہ ہو رہے ہوں جو تعمیر کے پیش نظر ہوتے ہیں تو ایسے حالات میں ایک مسجد کو دوسری جگہ منتقل کیا جاسکتا ہے، اس صورت میں پہلی مسجد کا ساز و سامان دوسری مسجد میں استعمال کیا جائے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کوفہ کی ایک پرانی مسجد کو دوسری جگہ منتقل کر دیا تھا اور پہلی مسجد کی جگہ کھجوروں کی منڈی بنادی تھی۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے فتویٰ میں اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی

ہے۔(۲۶۵/۳۱)

سڑک کے کنارے بنی ہوئی مسجد کو اگر کسی دکان وغیرہ کی صورت میں تبدیل کرنا ہو تو اس کا کرایہ یا آمدن دوسری مسجد پر صرف ہونی چاہیے۔(فتاویٰ اصحاب الحدیث)

لہٰذا ایک مسجد کو دوسری میں کسی مصلحت کی وجہ سے ضم کرنا درست ہے یا اس کی وقف کی حیثیت کو کسی اور وقف کی حیثیت میں تبدیل کر کے اس کی آمدن دوسری مسجد پر خرچ کرنا جائز ہے۔

مسجد کو ایک جگہ سے ختم کرنے اور دوسری جگہ بنانے کی دلیل یہ روایت بھی ہے:

کوفہ میں بیت مال المسلمین کو نقب لگا کر کسی نے چوری کر لی۔ نقب لگانے والا بھی پکڑا گیا۔ اس وقت بیت المال کے نگران عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔ انہوں نے امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی طرف لکھا تو انہوں نے جواب دیا:

ان انقل المسجد وصير بيت المال فی قبلته

''مسجد کو یہاں سے اس طرح منتقل کر لو کہ بیت المال مسجد کے قبلہ میں آ جائے۔''

سعد بن مالک نے مسجد وہاں سے ختم کر کے کھجوروں کی منڈی میں بنا دی اور منڈی کو مسجد والی جگہ منتقل کر دیا۔ بیت المال بھی مسجد کے قبلہ میں بن گیا۔(فتاویٰ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ۲۱۷/۳۱)

ایک دلیل یہ بھی ہے:

جس چیز کی نذر مانی گئی ہو، وہ بھی وقف ہو جاتی ہے، اسے تبدیل کرنا بھی فرمانِ پیغمبر سے ثابت ہے۔ مثلاً ایک شخص نذر مانتا ہے کہ میں اپنے گھر کو مسجد بناؤں گا پھر وہ اس سے زیادہ اچھی جگہ پر مسجد بنوا دیتا ہے تو یہ درست ہے۔ اس کی دلیل مسند احمد اور ابوداؤد کی حدیث ہے۔

جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، ایک شخص فتح مکہ کے موقع پر کھڑا ہوا اور کہنے لگا: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ نے مکہ فتح کر دیا تو میں بیت المقدس جا کر نماز پڑھوں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا:

((صَلِّ هَاهُنَا)) ''یہیں (مسجد نبوی میں) نماز پڑھ لے۔''

اس نے پھر وہی بات کی۔ آپ نے اسے پھر یہی جواب دیا۔ اس نے بات تیسری

مرتبہ پھر دہرائی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((فَشَأْنُكَ إِذًا)) ''پھر جس طرح مرضی کر۔''

(ابوداؤد، الأیمان و النذور، من نذر ان یصلی فی بیت المقدس، ح:۳۳۰۵؛ مسند احمد ۳/ ۳۶۳)

ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں:

((وَالَّذِیْ بَعَثَ مُحَمَّدًا بِالْحَقِّ لَوْ صَلَّیْتَ هَاهُنَا لَاَجْزَأَ عَنْكَ صَلٰوةً فِیْ بَیْتِ الْمَقْدِسِ))

(ابوداؤد، الأیمان و النذور، من نذر ان یصلی فی بیت المقدس، ح:۳۳۰۶؛ مسند احمد ۳/ ۳۷۳)

نبی کریم ﷺ نے اسے بیت المقدس کی بجائے مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کا فرمایا اور فرمایا کہ اگر یہاں پڑھے تو یہ تجھے بیت المقدس میں نماز پڑھنے سے افضل ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اسے افضل عمل کی طرف راہنمائی کر دی۔

مسجد کے نام وقف شدہ زمین کا حکم؟

سوال مسجد کے نام وقف شدہ زمین کا کیا حکم ہے؟ جبکہ مسجد کی تعمیر سے پہلے وقف شدہ جگہ کے بالکل قریب، چند گز کے فاصلے پر کوئی دوسرا شخص مسجد تعمیر کر دے یا وقف کی گئی جگہ پر مسجد بنانا مقصود نہ رہے۔ آیا وقف شدہ مسجد کی جگہ فروخت کر کے کسی دوسری جگہ مسجد بنائی جا سکتی ہے یا نہیں؟

جواب صورت مسئولہ میں دوسری جگہ مسجد بنائی جا سکتی ہے۔ نزدیکی نئی تعمیر شدہ مسجد کی توسیع پر بھی اس وقف شدہ جگہ کی رقم استعمال کی جا سکتی ہے، جس میں مصلحت ہو اسی صورت کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

مسجد کی دیوار پر پڑوسی کے گھر کی چھت!

سوال مسجد کا ہمسایہ اپنے گھر کی چھت مسجد کی دیوار پر رکھنا چاہتا ہے۔ مسجد کی دیوار پر جتنی لاگت آئی ہے اس کا خرچ بھی دینے کی ذمہ داری لیتا ہے۔ اہل محلّہ (مسجد کی انتظامیہ) اس پر رضامند ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ جہاں مسجد کی دیوار بنی ہوئی ہے، اس کے بارے میں یہ حتمی علم نہیں ہے کہ وہ جگہ مسجد کی ہے، ہمسائے کی ہے یا مسجد اور ہمسائے کی مشترکہ ہے۔ صورت مسئولہ میں کیا پڑوسی کو اجازت ہے کہ وہ مسجد کی انتظامیہ کی رضامندی سے دیوار کی

قیمت ادا کر کے اپنے کمرے کی چھت اس دیوار پر رکھ لے؟

جواب صورت مسئولہ میں پڑوسی کو اجازت ہے کہ وہ اپنے گھر کے کمرے کی چھت مسجد کی دیوار پر رکھ لے۔ اگر وہ دیوار پر لاگت شدہ رقم کی ادائیگی بھی کر دیتا ہے تو سونے پر سہاگہ ہے۔ مسجد کی دیوار سے استفادہ تو کیا جا سکتا ہے مگر پڑوسی کو مسجد کی دیوار کا مالک قرار نہیں دیا جائے گا۔ دیوار مسجد کی ملکیت ہی رہے گی۔ یعنی یہ نہیں ہو گا کہ کل کو مسجد کا ہمسایہ اپنی ذاتی مصلحت کے لیے دیوار کو گرا سکے۔ یہ بھی واضح رہے کہ مسجد کی اشیاء کو مسجد کے مفاد کے لیے فروخت یا تبدیل کیا جا سکتا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔

حتی کہ کسی مسجد کو آگے پیچھے کرنا پڑے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ مگر ہر صورت میں مسجد کی بہتری اور مفاد کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ اگر کوئی مسجد نمازیوں کے لیے ناکافی ہو، آس پاس کی جگہ مسجد میں ملانا ممکن نہ ہو تو اس مسجد کی جگہ فروخت کر کے متبادل جگہ، جو نمازیوں کی تعداد کے لیے کفایت کرے، خرید کر مسجد بنائی جا سکتی ہے۔

اس کی تائید صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل سے بھی ہوتی ہے۔ کوفہ میں مسلمانوں کے بیت المال کو نقب لگا کر کسی نے چوری کر لی۔ نقب لگانے والا پکڑا جاتا ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس وقت بیت المال کے نگران تھے۔ انہوں نے امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف خط لکھا تو انہوں نے جواب دیا:

ان انقل المسجد وصير بيت المال فی قبلته: مسجد کو منتقل کر لو کہ بیت المال مسجد کے قبلہ میں آ جائے۔ مسجد میں کوئی نہ کوئی نمازی تو ہوتا ہے (بیت المال اس طرح کے واقعات سے محفوظ ہو جائے گا) تو سعد بن مالک نے وہاں سے مسجد ختم کر کے کھجوروں کی منڈی میں بنا دی اور منڈی کو مسجد کی جگہ منتقل کر دیا۔ بیت المال بھی مسجد کے قبلہ میں بن گیا۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ ۳۱/۲۱۷)

مساجد کا سیاسی مقاصد کے لیے استعمال؟

مسجد کا استعمال بطور عدالت، جیل اور ہسپتال؟

سوال کیا مساجد کو سیاسی، انتظامی اور فوجی مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے؟

جواب مساجد صرف نماز کی ادائیگی کے لیے نہیں بلکہ مسلمانوں کے طرزِ زندگی میں مسجد کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور زندگی کے جملہ پہلوؤں کے ساتھ اس کا گہرا رابطہ ہے۔ مسجد ہی مرکزِ ملت ہے۔ غلط فہمیاں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب سیاست کو دین سے الگ سمجھا جانے لگے۔ یعنی سیاسی اُمور میں دین و شریعت سے راہنمائی نہ لی جائے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سیاست کا فریضہ تو انبیاء علیہم السلام ادا کرتے رہے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا کے مقالہ نگار کے بقول:

The Religion and politics could not be separated. Same individual was ruler and chief administrator in the two fields,and the same building,the Mosque was the centre of gravity for both,politics and religion.

"دین اور سیاست کو جدا نہیں کیا جا سکتا، دونوں شعبوں میں ایک ہی فرد حکمران اور ناظم اعلیٰ ہوتا، ایک ہی عمارت مسجد سیاست اور مذہب کی ضروریات کا مرکز ہوتی۔"

علامہ اقبال کہتے ہیں ؎

جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

نبی اکرم ﷺ سیاسی گفتگو اور معاہدات مساجد میں کرتے، نیز کسی اہم سیاسی امر کی طرف توجہ دلانا ہوتی تو بھی مسجد ہی میں خطبہ دیتے۔ خلیفہ اول ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیعت لینے کے بعد پہلا خطبہ مسجد ہی میں دیا تھا۔ ان کے بعد کے حکمران بھی اسی نہج پر چلتے رہے۔

ان کے یہ خطبے ان کے سیاسی طرزِ عمل کے آئینہ دار ہوتے تھے۔ لہٰذا وہ حکمران طبقہ ہوش کے ناخن لے جو بڑھکیں مارتا ہے کہ مساجد کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی! وہ جانتے ہیں کہ ان کے سیکولرازم کے خلاف آواز مساجد ہی سے اٹھتی ہے اور انہیں ایسے ''علماء و مشائخ'' درکار ہیں جنہوں نے مساجد کا منہ بھی نہ دیکھا ہو، تا کہ ان کی ''اتاترکی'' کی حمایت کے لیے ہاں میں ہاں ملانے والا کوئی تو ہو!

حکمران ''مفتیان'' کو تو کم از کم علم ہونا چاہیے کہ ہمارے ہادی ومُرشد ﷺ کے عہدِ مبارک میں تقسیمِ غنائم اور وفود سے سرکاری ملاقاتیں مسجد میں ہی ہوتی تھیں اور سفراء کو مسجد ہی میں ٹھہرایا جاتا تھا۔ غزوات وسرایا اور مہم جوئی کے لیے چندہ یہیں اکٹھا کیا جاتا تھا (کہ جسے معین الدین حیدر ''بھتہ'' وصول کرنا کہتے ہیں۔) مسلمانوں کے عہدِ زریں میں یہی حیثیت برقرار رہی۔ خلفائے راشدین مسجد ہی سے عساکر (فوجی دستے) روانہ کرتے تھے اور یہیں پر عسکری مجالس کا انعقاد ہوتا تھا۔ گویا مسجد پارلیمنٹ ہاؤس اور جنرل ہیڈکوارٹر (G.H.Q) کے طور پر بھی مستعمل تھی۔ لہٰذا وزیرِ داخلہ دینی اُمور میں دخل اندازی سے گریز کریں اور اپنی بھڑک ''مسجد کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دی جائے گی'' پر نظرِ ثانی کریں۔

عہدِ نبوی میں مسجد معسکر (Military Training Centre) کے طور پر بھی استعمال ہوتی تھی۔ سیدہ عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ مَیں نے ایک دن اللہ کے رسول ﷺ کو اپنے حجرے کے دروازے پر دیکھا اور حبشی مسجد میں کھیل رہے تھے۔ (اسلحہ کی مشق کر رہے تھے۔)

(بخاری، الصلوٰۃ، اصحاب الحراب فی المسجد، ح:۴۵۴)

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

والحبشة يلعبون بحرابهم (ایضاً، ح:۴۵۵)

''اور حبشی اپنے ہتھیاروں سے کھیل رہے تھے۔''

(نوٹ: ایک 'شیخ الاسلام' حبشیوں کے اس کھیل سے رقص کی دلیل لیتے ہیں! حالانکہ وہ اپنے ہتھیاروں کے ساتھ جہادی اور عسکری تربیت کی مشق کر رہے تھے۔ یہ غلط استدلال کرنے

والے اگر کسی اور کی نہیں مانتے تو کم از کم سید علی ہجویری کی ہی بات مان لیں جنہوں نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں رقص (dance) کو حرام قرار دیا ہے۔)

اسلحے کو ستر ے کے طور پر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

ان النبی ﷺ کان یرکز له الحربة فیصلی الیها

(بخاری، الصلاۃ، الصلاۃ الی الحربة، ح:۴۹۸)

''نبی ﷺ کے لیے برچھا گاڑا جاتا آپ اس کی طرف نماز پڑھتے۔''

مسجد نبوی میں بعض قیدیوں کو بھی باندھا جاتا تھا۔ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: اللہ کے رسول ﷺ نے کچھ سوار نجد کی طرف بھیجے وہ بنی حنیفہ کے ایک شخص کو پکڑ کر لائے جس کا نام ثمامہ بن اُثال تھا۔اسے لاکر مسجد نبوی کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا۔''

(بخاری، الصلاۃ، دخول المشرك المسجد، ح:۴۶۹)

تنازعات اور مقدمات کے فیصلہ جات بھی مسجد میں کر دیے جاتے۔بعض احادیث اس امر پر دلالت کرتی ہیں۔

(دیکھیے بخاری، الصلاۃ، التقاضی و الملازمة فی المسجد، ح:۴۵۷، الخصومات، التوثق ممن تخشی معرته، ح:۲۴۲۲)

بنی مخزوم کی فاطمہ نامی عورت، جس نے چوری کا ارتکاب کیا تھا، کا فیصلہ بھی مسجد میں ہی ہوا تھا۔ اس طرح مسجد کا استعمال عدالت کے طور پر بھی تھا۔عہد نبوی میں مسجد نبوی ''سپریم کورٹ'' بھی تھی۔

بوقتِ ضرورت مریضوں کے خیمے بھی مسجد میں لگائے جاتے تھے۔ان کی دیکھ بھال اور ادویات کی فراہمی وہیں پر ہو جاتی تھی۔عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو غزوۂ خندق میں ہفت اندام کی رگ (جس کی فصد سے سر، سینہ، پشت اور پاؤں کا خون نکلتا ہے) میں زخم لگا:

فضرب النبی ﷺ خیمة فی المسجد ....

''تو نبی ﷺ نے ان کے لیے مسجد میں ایک خیمہ لگا دیا۔''

(بخاری، الصلاۃ، الخیمة فی المسجد للمرضی وغیرهم، ح:۴۶۳)

اس حدیث کی شرح میں مولانا محمد داؤد راز رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ذی قعدہ ۴ھ میں جنگِ خندق میں ابنِ عرفہ نامی ایک کافر کے تیر سے زخمی ہو گئے تھے جو جان لیوا ثابت ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وقت کی ضرورت کے تحت ان کا خیمہ مسجد ہی میں لگوا دیا تھا۔ جنگی حالات میں ایسے اُمور پیش آ جاتے ہیں اور اِن مِلّی مقاصد کے لیے مساجد تک کو اِستعمال کیا جا سکتا ہے۔

طہارت اور وضو

مجبوری کی حالت میں بغیر طہارت کے نماز ادا کرنا؟

سوال اگر پانی میسر نہ ہو اور نہ تیمّم کے لیے کوئی چیز دستیاب ہو تو کیا وضو اور تیمّم کے بغیر نماز ادا کی جا سکتی ہے؟

جواب ایسے مواقع شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں کہ کوئی بھی چیز دستیاب نہ ہو، تاہم یہ غیر ممکن نہیں، مثلاً اگر کوئی مسلمان جنگی قیدی بن جائے اور اسے دشمن اس طرح جکڑ دے کہ اسے پانی اور صعید (مٹی) میسر نہ ہو تو ایسی اضطراری حالت میں حسبِ استطاعت بغیر وضو و تیمّم کے نماز ادا کی جا سکتی ہے۔

شدید بیماری، جس میں آدمی حرکت کرنے پر بھی قدرت نہ رکھتا ہو اور نہ کوئی دوسرا شخص اس کے قریب ہو جو اُسے پانی یا مٹی فراہم کر دے تو ایسی صورت میں بھی ظاہر ہے کہ نماز کی فرضیت ساقط نہیں ہوتی، حسبِ استطاعت چونکہ عمل کرنا ضروری ہے لہٰذا اُسے اسی حالت میں فرض کی ادائیگی کر لینی چاہیے۔

اس مسئلہ کا استدلال آیتِ تیمّم کے شانِ نزول سے ہے۔ تیمّم کی اجازت نازل ہونے سے پہلے ایک سفر میں نماز کا وقت ہو گیا مگر مسلمانوں کے پاس پانی نہیں تھا لہٰذا اُنہوں نے بغیر وضو کے ہی نماز ادا کر لی۔ ایک حدیث میں فصلوا بغیر وضوء کے الفاظ ہیں۔ پھر جب واپسی پر انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے بات کی تو آیتِ تیمّم نازل ہوئی۔

(ابوداؤد ، الطھارۃ ، التیمم، ح:۳۱۷؛ مسند احمد ٦/ ٥٧)

ان لوگوں کا بغیر وضو کے نماز ادا کرنا اگر غلط ہوتا تو نبی ﷺ اس کی وضاحت کر دیتے مگر آپ ﷺ سے ایسا کچھ بھی منقول نہیں اور اس وقت پانی کا نہ ہونا پانی اور تیمّم کے لیے مٹی دونوں کے نہ ہونے کے مترادف تھا کیونکہ اس وقت طہارت کا حکم صرف پانی کے ساتھ خاص تھا۔

کپڑے کا ایک حصہ ناپاک ہو جائے تو؟

سوال کپڑے کا ایک حصہ ناپاک ہو جائے تو کیا سارا کپڑا دھونا ضروری ہے؟

جواب کپڑے کا جو حصہ ناپاک ہو جائے اسے دھو لیا جائے تو کپڑا پاک ہو جاتا

ہے۔ باقی کپڑے کو دھونے کی ضرورت نہیں۔

ٹشو پیپر سے استنجا؟

سوال آج کل شہروں میں کاغذ کو استنجے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ کیا کاغذ اس مقصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے؟

سوال کاغذ سے صحیح طہارت حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ عموماً چکنا ہوتا ہے، البتہ وہ ٹشو پیپر جو اِسی مقصد کے لیے تیار کیا جاتا ہے اگر اس سے طہارت حاصل ہو سکتی ہو اور اس کے استعمال میں کوئی اور قباحت نہ ہو تو اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔ (واللہ اعلم)

اذان و نماز

تثویب بدعت ہے؟

سوال اذان دینے کے بعد لاؤڈ سپیکر کے ذریعے یا بلند آواز سے ''نماز کا وقت ہوگیا ہے۔لہٰذا جلدی جلدی مسجد میں آجاؤ'' کہہ کر پکارنا درست ہے یا نہیں؟

جواب اذان کے بعد اس انداز سے بلانے کا کوئی طریقہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں موجود نہیں تھا،لہٰذا اذان کے بعد لوگوں کو باآواز بلند نماز کے لیے پکارنا درست نہیں۔ بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حی علی الصلاۃ اور حی علی الفلاح کی بجائے دیگر کلمات سے نماز کے لیے بلانے کو بدعت سمجھتے تھے۔اس عمل کو تثویب کہا جاتا ہے۔امام مجاہد رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ تھا،ایک آدمی نے ظہر یا عصر میں تثویب کہی تو ابن عمر نے فرمایا:

''ہمیں یہاں سے لے چلو یہ تو یقیناً بدعت ہے۔''

(ابو داؤد، الصلوۃ، فی التثویب، ح: ۵۳۸، اس کی سند میں ابویحییٰ القتات ضعیف راوی ہے۔محمد ارشد کمال)

معلوم ہوا کہ تثویب شریعتِ اسلامیہ میں روا نہیں کیونکہ اس میں اذان سے مشابہت پائی جاتی ہے۔

بوقت فجر تثویب کا شرعی حکم؟

سوال ماہنامہ دعوۃ التوحید کے بعض شماروں میں تثویب کی ممانعت کے بارے میں لکھا گیا، جبکہ ہم نے ایک مولوی صاحب سے سنا تھا کہ فجر کے وقت تثویب کہی جاسکتی ہے؟ کیا یہ درست ہے؟

جواب اذان فجر کے علاوہ کسی بھی موقع پر تثویب کہنا بدعت ہے۔امام ابن قدامہ ایک فصل کا عنوان یوں قائم کرتے ہیں:

ویکرہ التثویب فی غیر الفجر (اور فجر کے علاوہ تثویب کہنا مکروہ ہے۔)

آگے لکھتے ہیں: تثویب اذان میں کہی جائے یا اذان کے بعد ایک ہی بات ہے۔اس کی دلیل بلال رضی اللہ عنہ سے مروی حدیثِ نبوی ہے۔بلال رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

امرنی رسول اللہ ﷺ ان اثوب فی الفجر و نھانی ان اثوب فی العشاء

(ابن ماجة، الاذان و السنة فیها، السنة فی الاذان، ح: ۷۱۵، و فی سنده ضعف)

''مجھے اللہ کے رسول ﷺ نے حکم دیا کہ میں (اذان) فجر میں تثویب کہوں، جبکہ آپ نے مجھے عشاء کے وقت تثویب سے منع کر دیا۔''

ابن عمر رضی اللہ عنہما ایک مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے داخل ہوئے، آپ نے ایک آدمی کو ظہر کی اذان میں تثویب کہتے سنا تو مسجد سے باہر نکل آئے تو ان سے کہا گیا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا:

اخرجتنی البدعة ''مجھے بدعت نے نکال دیا ہے۔''

اذان فجر میں تثویب کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ اس وقت اکثر لوگ سو رہے ہوتے ہیں اور نیند سے بیدار ہو کر نماز کے لیے اٹھتے ہیں، تو اس کے لیے تثویب کو حسب حاجت مختص کیا گیا۔ (المغنی مع الشرح الکبیر ۲/۵۱۳، ۱۴۲۵ھ/۲۰۰۴ء دار الحدیث، القاهرہ)

ملحوظہ: صلاۃ الفجر کے وقت جو تثویب کہی جاتی ہے، یہ اذان کا جز ہے اذان سے علیحدہ نہیں ہے، کیونکہ وقتِ فجر کی تثویب (الصلوٰۃ خیر من النوم) کی تعلیم خود نبی اکرم ﷺ نے اپنے مؤذن بلال رضی اللہ عنہ کو دی تھی۔

اذان کے بعد لوگوں کو نماز کے لیے بلانا؟

سوال چند دوست ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے کہ اذان شروع ہوگئی۔ اذان کے بعد ان میں سے کچھ لوگ نماز کے لیے اٹھے تو انہوں نے باقی دوستوں کو بھی نماز ادا کرنے کا کہا، تو انہوں نے جواب دیا، کہ اذان ہو جانے کے بعد نماز پڑھنے کی تلقین نہیں کی جا سکتی؟

جواب امر بالمعروف اور نھی عن المنکر کے اصول کے مطابق نماز کی تلقین کرنا چاہیے۔ اس کی کوئی ممانعت شریعت مطہرہ میں موجود نہیں بلکہ اگر اسلامی حکومت ہو تو ان پر سختی بھی کی جا سکتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اس سلسلے میں ایک دفعہ فرمایا:

((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَقَدْ هَمَمْتُ اَنْ اٰمُرَ بِحَطَبٍ لِیُحْطَبَ ثُمَّ اٰمُرَ بِالصَّلٰوةِ فَیُؤَذَّنَ لَهَا ثُمَّ اٰمُرَ رَجُلًا فَیَؤُمَّ النَّاسَ ثُمَّ اُخَالِفَ اِلٰی رِجَالٍ فَاُحَرِّقَ عَلَیْهِمْ بُیُوْتَهُمْ))

(بخاری ، الاذان ، وجوب صلوۃ الجماعۃ ،ح:۶۴۴؛ مسلم ، المساجد ، فضل صلوٰۃ الجماعۃ ،ح:۶۵۱)

''اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے،مَیں نے ارادہ کیا کہ مَیں لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دوں ۔ پھر اذان کہلواؤں اور کسی شخص کو لوگوں کی امامت کے لیے کہوں، پھر ان لوگوں کے گھر جلا دوں جو نماز (جماعت) میں حاضر نہیں ہوتے ۔''

نماز کے وقت پر انفرادی دعوت پر استدلال ان روایات سے بھی ہو سکتا ہے جن میں یہ آتا ہے، کہ نماز کے وقت بلال رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کو بلایا کرتے تھے جیسا کہ حتی یاتیه المؤذن للصلاۃ (بخاری،الوتر،ماجاءفی الوتر،ح:۹۹۴) کے الفاظ سے عیاں ہوتا ہے۔

البتہ بلانے کا انداز اذان سے مشابہ نہیں ہونا چاہیے۔(جس طرح آج کل بعض جگہوں پر اذان دینے کے بعد نمازیوں کو لاؤڈ سپیکر پر آوازیں دی جاتی ہیں) کیونکہ اس سے اذان کی اہمیت کم ہوتی ہے۔ابن ابی شیبہ نے مجاہد سے روایت کیا ہے، کہ جب عمر رضی اللہ عنہ مکہ میں آئے ،تو ابومحذورہ رضی اللہ عنہ اذان کہہ کر انہیں بلانے کے لیے آئے اور کہا:

الصلوۃ یا امیر المؤمنین!حی علی الصلوۃ حی علی الفلاح

عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:خرابی ہو تیری!تُو دیوانہ ہے؟ کیا اذان کا بلانا کافی نہ تھا؟

(مصنف ابن ابی شیبہ ۱/۳۵۰،ح:۳۵۳۴،نوٹ:امام مجاہد کا عمر رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں۔محمد ارشد کمال)

اسی سے ملتی جلتی وہ ضعیف روایت بھی ہے جو مؤطا امام مالک ، الصلوۃ ، ماجاء فی النداء للصلوۃ (ح:۱۵۶) میں ہے کہ مؤذن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس نماز فجر کی اطلاع دینے آیا،تو انہوں نے دیکھا کہ وہ نیند کر رہے ہیں،تو مؤذن نے کہا:

الصلوۃ خیر من النوم

اس پر عمر رضی اللہ عنہ نے اسے حکم دیا کہ وہ اسے صبح کی اذان میں کہے۔

مطلب یہ ہے کہ ان کلمات کو ان کے اصل موقع ومحل پر کہا جائے نہ کہ سوئے ہوئے آدمی کے پاس جا کر اسے جگانے کے لیے یہ کلمات کہے جائیں۔الصلوۃ خیر من النوم اذان میں دوبار پڑھنے کی تعلیم نبی ﷺ نے دی تھی،جس موقع پر انہیں پڑھنے کی تعلیم نبی ﷺ نے

دی انہیں اسی موقع پر پڑھنا چاہیے۔ غالباً عمر رضی اللہ عنہ کی یہی منشا تھی۔ واللہ اعلم

اذان فجر میں الصلاۃ خیر من النوم کا اضافہ کس نے کیا تھا؟

سوال لیکچر کے دوران ٹیچر نے کہا: ''یہ بات جو لوگوں میں مشہور ہوگئی ہے کہ اذان میں ((اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ)) کا اضافہ عمر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا غلط ہے۔'' مَیں حیران رہ گیا کیونکہ مَیں نے بھی سن رکھا تھا کہ یہ اضافہ اوّلیات عمر میں سے ہے، صحیح بات کیا ہے؟

جواب آپ کے استاد نے بالکل درست اور حق بات کہی، کیونکہ ((اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ)) کے کلمات عہدِ نبوی میں بھی اذان فجر میں کہے جاتے تھے اور اس کی تعلیم خود نبی ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو دی تھی، موذنِ رسول ابو محذورہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مَیں نے اللہ کے رسول ﷺ سے عرض کیا:

اللہ کے رسول! مجھے اذان کا طریقہ سکھا دیں، تو آپ ﷺ نے ابو محذورہ کو فجر کی اذان میں ((اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ)) کہنے کی تعلیم دی اور فرمایا: اگر صبح کی نماز ہو تو آپ (اذان میں) یہ کہیں:

((اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ، اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ))

(ابو داوٗد، الصلاۃ، کیف الاذان، ح: ۵۰۰، اس کی سند میں حارث بن عبید ضعیف راوی ہے تاہم یہ مسئلہ سنن نسائی (ح: ۶۳۳)، ابن خزیمہ (ح: ۳۸۵) وغیرہ کی احادیث سے ثابت ہے۔)

یہاں یہ تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کی وضاحت کی جائے کہ یہ غلط بات کیونکر لوگوں میں رائج ہوگئی، دراصل اس کا سبب عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب شدہ ایک روایت ہے جسے سمجھنے میں لوگوں نے غلطی کی ہے، ویسے وہ روایت اصول حدیث کے مطابق صحیح بھی نہیں ہے، محدثین نے اس روایت کو معضل اور مرسل ہونے کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے۔ اگر روایت بالفرض درست بھی ہو تب بھی یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اذان میں ((اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ)) کا اضافہ عمر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔ روایت یوں ہے:

امام مالک سے روایت ہے کہ انہیں یہ بات پہنچی:

ان المؤذن جاء الی عمر بن الخطاب یوذنه لصلاۃ الصبح

فوجده نائما، فقال:((اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ)) فامره عمر ان يجعلها فى نداء الصبح (مؤطا، الصلاة، ماجاء فى النداء للصلاة، ح:١٥٦)

"موذن صبح کی نماز کی اطلاع دینے کے لیے عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ آپ سو رہے ہیں، تو موذن نے کہا: ((اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ)) (آپ رضی اللہ عنہ بیدار ہو گئے) تو آپ نے یہ کلمات موذن کو صبح کی اذان میں کہنے کا حکم دیا۔"

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ موذن کو سمجھا رہے تھے کہ ان کلمات کو اذان میں رکھو، ان کا موقع محل یہ نہیں بلکہ یہ کلمات اذان فجر میں کہنے کے لیے ہیں (جو کہ تعلیم نبوی سے ثابت ہے۔) سوئے ہوئے شخص کو جگانے کے لیے اس کے پاس آ کر کہنے کے لیے یہ الفاظ نہیں ہیں!

بلال رضی اللہ عنہ نے اذان نہ دی تو دن ہی نہ چڑھا؟

سوال قوالوں نے یہ بات مشہور کر رکھی ہے کہ ایک دفعہ بلال رضی اللہ عنہ نے فجر کی اذان نہیں دی تھی تو دن ہی نہیں چڑھا تھا۔ کیا یہ بات درست ہے؟

جواب سیدنا بلال رضی اللہ عنہ موذن رسول اور جلیل القدر صحابی ہیں، مگر یہ بات کہ انہوں نے فجر کی اذان نہیں دی تھی تو رات ہی ختم نہیں ہوئی تھی، غلط ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ بعض دفعہ فجر کی اذان بلال رضی اللہ عنہ نہیں دیتے تھے بالخصوص رمضان المبارک میں کیونکہ احادیث سے ثابت ہے کہ رمضان المبارک میں فجر کی اذان عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ دیا کرتے تھے اور بلال رضی اللہ عنہ سحری کی اذان دیتے تھے، جیسا کہ بخاری کی روایت سے ثابت ہے۔

(بخاری، الاذان، اذان الاعمی اذا کان ......، ح:٦١٧)

دوسری بات یہ ہے کہ احادیث میں یہ بات بڑی صراحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ سوئے ہوئے تھے کہ سورج نکل آیا۔ ایک مکمل حدیث ملاحظہ کریں تاکہ اصل صورت حال واضح ہو، ابوقتادہ رضی اللہ عنہ اپنے باپ حارث بن ربعی سے روایت بیان کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

ہم (خیبر سے واپسی پر) رات کو نبی ﷺ کے ساتھ سفر کر رہے تھے تو بعض لوگوں نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ! آپ یہاں پڑاؤ ڈال لیں تو بہتر ہوگا، آپ نے فرمایا:

((اَخَافُ اَنْ تَنَامُوْا عَنِ الصَّلَاةِ))

''مَیں ڈرتا ہوں کہیں تمہاری آنکھ نہ لگ جائے (اور نماز کے لیے نہ اٹھو)''

بلال نے عرض کیا: مَیں آپ کو جگا دوں گا، پھر سب لیٹ گئے اور بلال نے اپنی پشت اپنی اونٹنی سے لگائی اور نیند کے غلبے سے سو گئے پھر (سب سے پہلے) نبی ﷺ جاگے، اس وقت سورج کا اوپر کا کنارہ نکل آیا تھا (سورج طلوع ہو رہا تھا) تو آپ ﷺ نے فرمایا: بلال! آپ نے تو کہا تھا: مَیں تمہیں جگا دوں گا؟ بلال نے عرض کیا: مجھے ایسی نیند کبھی نہیں آئی تھی۔ آپ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ قَبَضَ اَرْوَاحَكُمْ حِيْنَ شَاءَ وَرَدَّهَا عَلَيْكُمْ حِيْنَ شَاءَ. يَابِلَالُ قُمْ فَاَذِّنْ بِالنَّاسِ بِالصَّلَاةِ))

(بخاری، مواقیت الصلاۃ، الاذان بعد ذهاب الوقت، ح:٥٩٥؛ مسلم، المساجد، قضاء الصلاۃ الفائتة واستحباب تعجيل قضائها، ح:٦٨١)

''اللہ نے جب چاہا تمہاری جانیں قبض کر لیں اور جب چاہا پھر تم کو دے دیں، بلال! اٹھو اور نماز کے لیے اذان دو۔''

بلال نے اذان دی، آپ نے وضو کیا، جب سورج بلند ہو کر سفید ہو گیا آپ کھڑے ہوئے اور نماز پڑھی۔''

احادیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے وہاں سے کوچ کیا اور دوسری جگہ جا کر نماز پڑھی۔
اس حدیث سے معلوم ہوا کہ لوگوں کا یہ کہنا کہ بلال رضی اللہ عنہ نے اذان نہیں دی تھی تو صبح ہی نہیں ہوئی تھی، خلافِ حقیقت ہے۔

اذان کی آواز پر کتے کیوں روتے ہیں؟

سوال جب اذان ہوتی ہے تو بعض اوقات کتے رونا شروع کر دیتے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ نمازیوں کے گناہوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ کیا واقعی ایسا ہے؟

جواب جن لوگوں نے یہ کہا ہے ان کے پاس کیا دلیل ہے؟ ایسا کہنا مشاہدے کے بھی خلاف ہے۔ بعض جگہوں پر مجرموں کے سرغنے بھی موجود ہوتے ہیں مگر وہاں اذان کی آواز سن کر کتے نہیں روتے۔ مزید برآں ایسا کہنے والے کون سے معصوم عن الخطاء ہیں۔ کیا یہ کوئی معمولی گناہ ہے کہ ان ''مسلمانوں'' کو اسلام کے عظیم رکن نماز کی بھی کوئی پروا نہیں ہوتی۔

اذان پر کتوں کے رونے (مخصوص انداز سے بھونکنے) سے اگر کوئی لوگوں کے گناہگار ہونے پر اس طرح کی دلیل لینا چاہتا ہو تو کہہ سکتا ہے کہ اذان کی آواز پر کتے اس لیے روتے ہیں کہ ارے موذن! تم تو لوگوں کو نماز اور فلاح کی طرف بلاتے ہو مگر یہ نماز ضائع کرنے والے لوگ ایسے ڈھیٹ ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ یہ بدقسمت اس لائق ہیں کہ ان پر رویا جائے!

گاہکوں کو بھگتا لو پھر نماز پڑھ لینا!

سوال اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مجھے نماز پنجگانہ کی توفیق ملی ہوئی ہے، البتہ عموماً مجھے ایک مشکل پیش آتی ہے، وہ یہ کہ میں والد صاحب کے ساتھ دکانداری کرتا ہوں۔ جماعت کے اوقات میں اگر گاہکوں کا رش ہو تو ابا جان مجھے روک لیتے ہیں کہ ٹھہرو گاہکوں کو فارغ کر لیں پھر نماز پڑھیں گے۔ اتنے میں جماعت نکل جاتی ہے۔ راہنمائی کریں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کیا اس صورت میں والد صاحب کی بات ماننا ضروری ہے؟

سوال آپ والدِ محترم کو احسن انداز سے قائل کرنے کی کوشش کریں۔ ان کے لیے اللہ سے دعا کریں۔ اگر وہ اپنے طرزِ عمل پر برقرار رہتے ہیں تو ان کی بات نہ ماننے میں آپ پر کوئی گناہ نہیں بلکہ آپ ان کی ایسی بات نہ مانیں کہ جس سے اللہ کی نافرمانی ہوتی ہو۔ اس سلسلے میں درج ذیل اصول، جو حدیث نبوی میں بیان ہوا ہے، ذہن میں رکھیں:

((لَا طَاعَةَ لِأَحَدٍ فِيْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى))(مسند احمد ۵/ ۶۶)

''اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہیں۔''

ایک روایت میں ہے:

((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ))(ایضاً)

''اللہ کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت نہیں کی جاتی۔''

اس اصول کو سمجھنے کے لیے درج ذیل آیات کو بھی مدِنظر رکھیں:

① ﴿وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾ (۲۹/العنکبوت:۸)

''اور اگر وہ دونوں (والدین) یہ کوشش کریں کہ تُو میرے ساتھ اسے شریک کرے جس کا تجھے علم نہیں تو ان کی اطاعت نہ کرنا۔''

② ﴿وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾ (۳۱/لقمٰن:۱۵)

''اور اگر وہ دونوں تجھ پر اس بات کا دباؤ ڈالیں کہ تُو میرے ساتھ شرک کرے جس کا تجھے علم نہ ہو تو تُو اُن کا کہنا نہ ماننا۔''

کیا لیلۃ القدر میں عبادت کر لینے سے فرض نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں رہتی؟

سوال ایک آدمی سے مَیں نے کہا: آؤ نماز پڑھیں! اس نے کہا: مَیں نے ہزار مہینوں کی نمازیں پڑھ لی ہیں کیونکہ لیلۃ القدر ہزار مہینوں کی عبادت سے افضل ہے۔ اب ہم کیوں نماز پڑھیں؟ ہماری کونسی اتنی عمر ہوتی ہے! اگر ہوئی بھی تو ایک دفعہ پھر شب قدر میں عبادت کر لیں گے۔ وہ ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ ہماری دو چار دفعہ لیلۃ القدر کی عبادت کئی آدمیوں کو جنت میں لے جائے گی۔ مَیں اسے کیا جواب دوں؟ سمجھ میں نہیں آتا!!

جواب آپ کے دوست کا موقف غلط ہے، اسے سمجھانے اور راہِ راست کی طرف لانے کی کوشش کریں کیونکہ

① کسی شخص کو قطعی علم نہیں ہو سکتا کہ اس نے لیلۃ القدر کو پا لیا ہے اس لیے کہ اللہ نے اسے مخفی رکھا ہے۔

② لیلۃ القدر سمیت راتوں کی عبادت نفلی ہوتی ہے۔ فرائض چھوڑنے پر باقی اعمال کالعدم قرار پاتے ہیں، فرض نماز کی ادائیگی نہ ہو تو نفلی نماز ہزاروں کیا لاکھوں مہینوں کی ہی کیوں نہ ہو اُس کی کوئی حیثیت نہیں۔

③ فرض چیز بعینہٖ اور بذاتہٖ مقصود ہوتی ہے۔ ورنہ فرض نہیں۔ الّا یہ کہ اسلام نے کسی عذر کے پیش نظر کسی سے کسی حکم کی فرضیت خود ہی ساقط کر دی ہو۔

④ ہزار مہینوں سے بہتر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لیلۃ القدر کی قدر کرنے والے کو اس قدر ثواب عنایت کیا جائے گا، اگرچہ ہزار مہینہ یا اس سے زیادہ کی عبادت بالفعل واقع نہیں ہوئی لہٰذا یہ اس عبادت کا بدل کیسے ہو سکتی ہے جو بالفعل مطلوب ہے۔ جیسے باجماعت نماز پڑھنے سے پچیس نمازوں کا ثواب ملتا ہے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کی پچیس فرض نمازیں ادا ہوگئی ہیں، اسی طرح نیکی کی ترغیب دینے والے کو بھی اسی قدر ثواب دیا جاتا ہے جتنا اس نیکی کے کرنے والے کو دیا جاتا ہے۔ بالفعل تو ایک ہی کرتا ہے۔

⑤ اپنی تمام زندگی میں نبی ﷺ نے ایک نماز بھی نہیں چھوڑی۔ آپ ﷺ ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہیں۔

⑥ اللہ نے پوری زندگی عبادت کرنے کا حکم دیا ہے حتی کہ انسان کی موت واقع ہو جائے۔ (۱۵/الحجر:۹۸-۹۹)

نیز تادمِ موت اللہ کی فرمانبرداری کا حکم ہے۔ (۳/ آل عمران:۱۰۲؛ ۲/البقرۃ:۱۳۲)

⑦ کئی اشخاص کو جنت میں لے جانے والی بات یہود کے عقیدے کی طرح ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے البقرہ کی آیات ۸۰، ۱۳۴، ۱۴۱، النجم کی آیات ۳۸ تا ۴۰ اور دیگر کئی آیات میں تردید کی ہے۔ نیز یہ عیسائیوں کے عقیدۂ کفارہ سے بھی مشابہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے صلیب پر چڑھنے کی وجہ سے ہم سب کی نجات ہوگئی ہے۔

تنبیہ: آپ کے دوست نے اسلامی احکام کا مذاق اڑایا ہے، اسلام کے کسی مسلّمہ عقیدہ اور حکم کا استہزاء کفر ہے۔ اس طرح انسان کے تمام اعمال ضائع ہو جاتے ہیں جس کے لیے قرآن نے ﴿حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ﴾ جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

(مثلاً دیکھیے ۱۸/الکہف:۱۰۳تا۱۰۶)

امام جہری نماز میں سلام بلند آواز سے نہ کہے تو......؟

سوال نمازِ مغرب امام صاحب کی اقتداء میں پڑھی گئی مگر آخر میں امام صاحب نے

جہری طور پر السلام علیکم ورحمۃاللہ نہ کہا اور اسی جگہ کھڑے ہو کر نماز شروع کر دی۔ مقتدیوں نے امام صاحب کی اس حرکت کو محسوس کرتے ہوئے سلام پھیر دیا۔ آیا نماز ہو گئی یا دوبارہ پڑھنا ہوگا؟ یا سہو کے سجدے لازم ہوئے؟

جواب صورتِ مسئولہ میں مقتدیوں کی نماز ہو گئی، انہیں نماز دوبارہ پڑھنے یا سجود السہو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

نومسلم نماز میں کیا پڑھے؟

سوال ایک ہندو دن دس بجے مسلمان ہوا، مسلمان ہونے کے ساتھ ہی نماز فرض ہو گئی۔ اب اس نے ظہر کی نماز پڑھنی ہے، ابھی اس نے سورۃ الفاتحہ یاد نہیں کی۔ کیا یہ شخص سورۃ الفاتحہ کے بغیر نماز پڑھ سکتا ہے؟ یا سورۂ فاتحہ سیکھنے تک اسے نماز پڑھنے میں کوئی رعایت حاصل ہے؟

جواب سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ اگر کسی کی مجبوری ہے کہ وہ نہیں پڑھ سکتا تو یہ دوسری بات ہے۔ مثلاً سیکھنے کے لیے اس کا حافظہ ٹھیک نہیں، زبان میں کوئی رکاوٹ ہے یا اسے اتنا وقت ہی نہیں ملا کہ وہ سورۂ فاتحہ یاد کر سکے، جس کی ایک صورت سوال میں ذکر کی گئی ہے تو ایسی سورت میں قرآن کی کوئی بھی سات آیات پڑھ لے وہ سورۂ فاتحہ کے قائم مقام ہو جائیں گی۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو سبحان اللہ، الحمدللہ، لاالہ الا اللہ، اللہ اکبر اور لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھ کر نماز مکمل کرے (نماز نہ پڑھنے کی کوئی رعایت نہیں ہے۔)

اس سلسلے میں درج ذیل دو احادیث ملاحظہ کریں:

① ابن ابواوفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: مَیں قرآن پاک سیکھنے کی استطاعت نہیں رکھتا، آپ مجھے کچھ سکھا دیں تا کہ اسے قرآن کی جگہ پڑھ سکوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کہو:

((سبحان اللہ والحمدللہ ولاالہ الااللہ واللہ اکبر ولاحول ولاقوۃ الا باللہ))

(نسائی، الافتتاح، مایجزئ من القراءۃ لمن لایحسن القرآن ح:۹۲۴)

② رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک آدمی کو نماز سکھائی اور فرمایا:

((فَإِنْ كَانَ مَعَكَ قُرْآنٌ فَاقْرَأْ وَإِلَّا فَاحْمِدِ اللّٰهَ وَكَبِّرْهُ وَهَلِّلْهُ ثُمَّ ارْكَعْ))

(ابوداؤد، الصلاۃ، لا صلاۃ من لایقیم صلبه فی الرکوع......ح:۸۶۱؛ ترمذی، ح:۳۰۲)

''اگر تمہیں کچھ قرآن یاد ہو تو اسے پڑھو ورنہ اللہ کی حمد، تکبیر اور تہلیل بیان کرو، پھر رکوع کرو۔''

کیا پہلی شریعتوں میں رکوع اور سجدہ نہیں تھا؟

سوال کیا پہلی شریعتوں میں سجدہ اور رکوع نہیں تھا؟

جواب یہ بات درست نہیں ہے کہ پہلی شریعتوں میں رکوع وسجود کا تصور نہیں تھا۔ قرآن مجید میں بہت سی آیات میں پہلی امتوں کے سجدے اور رکوع کا ذکر ملتا ہے۔ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کو رکوع وسجدہ کرنے والوں کے لیے بیت اللہ کو پاک وصاف رکھنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ﴾ (۲/البقرۃ:۱۲۵)

داؤد علیہ السلام کے بارے میں ﴿ خَرَّ رَاكِعًا ﴾ (۳۸/ص:۲۴) (سجدے میں گر پڑے) کے الفاظ قرآن مجید میں آئے ہیں۔

ان کے بیٹے سلیمان علیہ السلام کے عہد میں لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر سورج کو سجدہ کرتے تھے جیسا کہ ﴿ يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ ﴾ (۲۷/النمل:۲۴) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ہُدہُد نے کہا تھا کہ انہیں چاہیے کہ اس (اللہ) کو سجدے کریں جو آسمانوں اور زمینوں کی پوشیدہ چیزوں کو باہر نکالتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ أَلَّا يَسْجُدُوا لِلّٰهِ الَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ﴾ (۲۷/النمل:۲۵)

اسی طرح بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا:

﴿ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا ﴾ (۴/النساء:۱۵۴)

''دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ۔''

اس قوم کو اللہ تعالیٰ نے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝ ﴾ (۲/البقرۃ:۴۳)

''اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔''

وہ جادوگر، جن کا مقابلہ موسیٰ علیہ السلام سے ہوا تھا، حق پا کر سجدہ میں گر پڑتے ہیں:

﴿ وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ۝ ﴾ (۷/الاعراف:۱۲۰)

مریم علیہا السلام کو اللہ تعالیٰ نے رکوع وسجود کا حکم دیا تھا:

﴿ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝ ﴾ (۳/آل عمران:۴۳)

''مریم! اپنے رب کی فرمانبرداری کر، سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔''

دورانِ نماز موت کو یاد کرنا؟

سوال دورانِ نماز اگر موت یاد آجائے تو اس سے نماز میں کوئی خلل تو واقع نہیں ہوتا؟ کیا نماز میں موت کو قصداً یاد کرنا جائز ہے؟

جواب نماز پڑھتے ہوئے موت کا یاد آجانا یا یاد کرنا مستحسن ہے۔ اس لیے کہ یادِ موت سے نماز میں خشوع وخضوع پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا نبی اکرم ﷺ نے موت کو یاد رکھنے کی تلقین کی ہے۔ فرمانِ نبوی ہے:

((اُذْكُرِ الْمَوْتَ فِيْ صَلَاتِكَ فَاِنَّ الرَّجُلَ اِذَا ذَكَرَ الْمَوْتَ فِيْ صَلَاتِهٖ لَحَرِيٌّ اَنْ يُّحْسِنَ صَلَاتَهٗ وَ صَلِّ صَلَاةَ رَجُلٍ لَا يَظُنُّ اَنَّهٗ يُصَلِّيْ غَيْرَهَا)) (مسند الفردوس از دیلمی ۱/ ۴۳۱، ح:۱۷۵۵)

''نماز میں موت کو یاد رکھ، جب آدمی دورانِ نماز موت کو یاد کرتا ہے تو یقیناً وہ نماز احسن انداز سے ادا کرے گا اور اس شخص کی طرح نماز پڑھو جسے یقین نہ ہو کہ اگلی نماز پڑھ سکے گا۔''

ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ایک آدمی کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

((اِذَا قُمْتَ فِيْ صَلَاتِكَ فَصَلِّ صَلَاةَ مُوَدِّعٍ))

(ابن ماجة ، الزهد ، الحكمة ، ح:۴۱۷۱؛ مسنداحمد ۵/ ۴۱۲)

"جب تم نماز پڑھنے لگو تو اسے الوداعی نماز سمجھ کر ادا کیا کرو۔"

نمازی کو کیا خبر کہ شاید اس کی یہ آخری نماز ہو اس لیے نماز میں خشوع وخضوع کا خوب اہتمام کرے۔ مذکورہ بالا دونوں احادیث سے معلوم ہوا کہ نماز میں موت یاد آنے یا قصداً یاد کرنے سے نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔

مزید براں جب نمازی موت کے تذکرے والی آیات کی تلاوت کر رہا ہو، مثلاً

﴿ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ﴾ (۳/ آل عمرٰن:۱۸۵)،

﴿ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ﴾ (۴/ النساء:۷۸)

﴿ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ﴾ (۶۲/ الجمعۃ:۸)

ان آیات میں موت کا تذکرہ ہے تو دریں صورت موت یاد آ جانا لازمی امر ہے۔

نماز کا وقت جا چکا ہو تو......؟

سوال طبیعت کی خرابی (بیماری یا غلبہ نیند) کی وجہ سے اگر جاگ دیر سے آئے جبکہ نماز فجر کا وقت جا چکا ہو تو کیا حکم ہے؟

جواب بیمار شخص کو حتی المقدور پوری کوشش کرنی چاہیے کہ نماز وقت پر ادا کرے، اگر کوئی شخص سویا ہوا ہو اور اس کی آنکھ ہی اس وقت کھلے جب سورج طلوع ہو چکا ہو تو اس شخص کو اُسی وقت پوری نماز پڑھ لینا چاہیے اور اس پر کسی قسم کا کوئی کفارہ نہیں۔ ابو قتادہ حارث بن ربعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں:

ہم (خیبر سے واپسی پر) رات کو نبی ﷺ کے ساتھ سفر کر رہے تھے تو بعض لوگوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! آپ یہاں پڑاؤ ڈال لیں تو بہتر ہوگا، آپ نے فرمایا:

((اَخَافُ اَنْ تَنَامُوْا عَنِ الصَّلَاةِ))

"میں ڈرتا ہوں کہیں تمہاری آنکھ نہ لگ جائے اور نماز کے لیے نہ اٹھو!"

بلال نے عرض کیا: میں تمہیں جگا دوں گا، پھر سب لیٹ گئے اور بلال نے اپنی پشت

اپنی اونٹنی سے لگائی اور نیند کے غلبے سے سو گئے پھر (سب سے پہلے) نبی ﷺ جاگے، اس وقت سورج کا اوپر کا کنارہ نکل آیا تھا (سورج طلوع ہو رہا تھا) تو آپ ﷺ نے فرمایا: بلال! آپ نے تو کہا تھا: میں تمہیں جگادوں گا؟ بلال نے عرض کیا: مجھے ایسی نیند کبھی نہیں آئی تھی، آپ نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ قَبَضَ أَرْوَاحَكُمْ حِيْنَ شَاءَ وَرَدَّهَا عَلَيْكُمْ حِيْنَ شَاءَ. يَا بِلَالُ قُمْ فَأَذِّنْ بِالنَّاسِ بِالصَّلَاةِ))

(بخاری، مواقیت الصلاۃ، الاذان بعد ذھاب الوقت، ح:۵۹۵؛ مسلم، المساجد، قضاء الصلاۃ الفائتۃ واستحباب تعجیل قضائھا، ح:۶۸۱)

''اللہ نے جب چاہا تمہاری جانیں قبض کر لیں اور جب چاہا پھر تم کو دے دیں، بلال! اٹھو اور نماز کے لیے اذان دو۔''

بلال نے اذان دی، آپ نے وضو کیا، جب سورج بلند ہو کر سفید ہو گیا تو آپ کھڑے ہوئے اور نماز پڑھی۔''

ایک اور فرمانِ نبوی ہے:

((مَنْ نَسِيَ صَلَاةً أَوْ نَامَ عَنْهَا فَكَفَّارَتُهَا أَنْ يُّصَلِّيَهَا إِذَا ذَكَرَهَا))

(مسلم، المساجد، قضاء الصلاۃ الفائتۃ واستحباب تعجیل قضائھا، ح:۶۸۴)

''جو شخص کوئی نماز بھول گیا، یا اس سے سویا رہا تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے جب یاد آئے تو نماز پڑھ لے۔''

ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں:

((إِذَا أَرْقَدَ أَحَدُكُمْ عَنِ الصَّلَاةِ أَوْ غَفَلَ عَنْهَا فَلْيُصَلِّهَا إِذَا ذَكَرَهَا فَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى يَقُوْلُ: ﴿وَأَقِمِ الصَّلَوٰةَ لِذِكْرِىٓ﴾)) (۲۰/طٰہٰ:۱۴) (ایضا)

''جب تم میں سے کوئی شخص سو گیا یا نماز سے غافل رہا تو اسے جب یاد آئے تو نماز پڑھ لے، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: نماز کو میری یاد کے لیے قائم کرو۔''

سونے والا شخص چونکہ مرفوع القلم ہوتا ہے اس لیے اگر اس کی آنکھ نہیں کھل سکی تو جب بیدار ہو تو جلد نماز کی ادائیگی کر لے، اس کے علاوہ اس کے ذمے اور کوئی کفارہ نہیں۔

نماز با جماعت میں شرکت کریں یا مریض دیکھیں؟

سوال میرا کلینک مسجد کے بالکل سامنے ہے، میری ہمیشہ کوشش ہوتی ہے کہ نماز با جماعت ادا کروں، لہٰذا اذان سنتے ہی مسجد میں چلا جاتا ہوں، وضو کرتے وقت یا سنتیں ادا کرنے کے وقت مسجد کا گن مین یا کوئی اور نمازی پیغام دیتا ہے کہ آپ کی دکان کے باہر عورتیں (مریض) کھڑی ہیں۔ مَیں اکثر کہہ دیتا ہوں کہ نماز پڑھ کر آتا ہوں، بعض نمازی حضرات اعتراض کرتے ہیں کہ آپ غلط کر رہے ہیں کیونکہ یہ بھی عبادت ہے۔ اکثر اوقات مَیں دکان پر چلا جاتا ہوں، لیکن دل مطمئن نہیں ہوتا، کیونکہ کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ مریض کو چیک کرتے وقت یا دوا دیتے وقت کوئی اور مریض آ گیا تو پھر جماعت گزر گئی۔ مجھے بعد میں اکیلے نماز ادا کرنا پڑتی ہے، امام صاحب سے اس مسئلہ پر بات ہوئی تو انہوں نے یہ حدیث سنا دی کہ جب دوران نماز کسی بچے کے رونے کی آواز آتی تو آپ ﷺ نماز ہلکی کر دیتے تھے۔ مجھے اس صورت حال میں کیا کرنا چاہیے، یاد رہے کہ میرے پاس کوئی ملازم بھی نہیں ہے، اگر ہوتا تو مَیں اس کے لیے بھی اس بات کو ترجیح دیتا کہ وہ بھی با جماعت نماز ادا کرے۔

جواب نماز با جماعت ادا کرنے کی اسلام میں بہت تاکید آئی ہے، اللہ رب العزت نے نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا حکم ﴿وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ﴾ (۲/البقرۃ:۴۳) کے الفاظ سے دیا ہے، جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا واجب ہے، نبی ﷺ نے ان لوگوں کے گھروں کو آگ لگانے کا ارادہ کر لیا تھا جو جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے۔ (بے قصور بچوں اور عورتوں کی وجہ سے آپ نے یہ ارادہ ترک کر دیا تھا۔) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ آمُرَ بِحَطَبٍ لِيُحْطَبَ ثُمَّ آمُرَ بِالصَّلٰوةِ فَيُؤَذَّنَ لَهَا ثُمَّ آمُرَ رَجُلًا فَيَؤُمَّ النَّاسَ ثُمَّ أُخَالِفَ إِلٰى رِجَالٍ فَأُحَرِّقَ عَلَيْهِمْ بُيُوتَهُمْ))

(بخاری، الاذان، وجوب صلوۃ الجماعۃ، ح:۶۴۴؛ مسلم، المساجد، فضل صلوۃ

الجماعۃ، ح:۶۵۱)

''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، مَیں نے ارادہ کیا کہ لکڑیاں اکٹھی کرنے کا حکم دوں، پھر نماز کا حکم دوں، اس کی اذان دی جائے، پھر ایک شخص کو کہہ دوں کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائے اور مَیں انہیں پیچھے چھوڑ کر ان لوگوں کے پاس جاؤں تو (جو جماعت میں حاضر نہیں ہوئے) ان کے گھر جلا دوں۔''

ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی بھی شخص جماعت پر کسی چیز کو ترجیح نہیں دے گا۔ مریضوں کو چیک کرنا جہاں خدمت خلق ہے وہاں کاربار بھی ہے، کاربار، بیع و شراء (خرید وفروخت) اور دکانداری پر نماز باجماعت مقدم ہے، حالانکہ یہ بھی عبادت ہے، بشرطیکہ کرنے والے کی نیت خالص ہو اور وہ باقی شرعی پابندیوں کا لحاظ رکھتا ہو، ورنہ یہ ''عبادت'' تو کفار بھی کرتے ہیں۔ یہ سوچنے کی بات ہے اگر ڈاکٹر صاحب کو اپنا ذاتی کام ہو مثلاً کوئی شادی وغیرہ کی تقریب ہے یا انہوں نے آرام کے لیے دکان بند کردی ہو تو کیا آپ ڈاکٹر صاحب کو یہی مشورہ دیں گے کہ ۲۴ گھنٹے کلینک پر رہیں (عبادت کریں!) آرام نہ کریں۔ کیونکہ مریض آئے ہوئے ہیں؟ تو کیا نماز باجماعت کی انسان کے اپنے ذاتی کام جتنی بھی اہمیت نہیں۔ البتہ اگر ہنگامی حالت ہو تو ایسی صورت میں نماز تاخیر سے بھی پڑھی جا سکتی ہے کیونکہ ایمرجنسی میں شریعت رخصت دیتی ہے، ایسے احکام کو فقہاء احکام الطواریٔ کا نام دیتے ہیں۔ کہ جن میں بعض حرام چیزیں بھی مباح ہو جاتی ہیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کس قدر ایمرجنسی پر رخصت ملتی ہے؟ اس کا اندازہ کرنے کے لیے سورۃ النساء (آیت:۱۰۲) کا مطالعہ کریں۔ کہ جہاں صلاۃ الخوف کا بیان ہے، دشمن کے ساتھ جنگ جاری ہو تب بھی حتی الوسع کوشش کریں کہ باجماعت نماز ادا کی جائے۔

ملحوظہ: محترم امام صاحب کا اس حدیث سے استدلال صحیح نہیں کہ ''جب دوران نماز نبی اکرم ﷺ کسی بچے کے رونے کی آواز سنتے تو آپ نماز ہلکی کر دیتے تھے'' کیونکہ یہ اختیاری کام ہے، اگر کوئی امام بچے کے رونے کے بغیر بھی ہلکی نماز پڑھائے تو اسے بھی اجازت ہے، بلکہ عام طور پر

ہلکی نماز پڑھانے کی ہی تلقین ہے۔ یہ جو احادیث میں ہے کہ سیدنا نبی اکرم ﷺ بعض دفعہ لمبی نماز پڑھانے کا ارادہ کرتے مگر کسی بچے کے رونے کی وجہ سے نماز مختصر کر دیتے، یہ اس لیے تھا کہ بچے کی ماں کو پریشانی اور تکلیف نہ ہو۔

(بخاری ، الاذان ، من اخف الصلاۃ عند بکاء الصبی ، ح:۷۰۷-۷۱۰)

چونکہ عورتیں بھی آپ ﷺ کے پیچھے باجماعت نماز پڑھتی تھیں، اس لیے آپ ﷺ نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا، اگر بچے کی ماں نماز نہ پڑھ رہی ہو اور اس کا بچہ رونے لگے یا مسجد کے پڑوس میں کسی بچے کے رونے کی آواز آئے تو کیا اس وقت بھی امام صاحب کے لیے ضروری ہے کہ وہ نماز مختصر کر دے، ظاہر بات ہے کہ اس کی نوعیت مختلف ہے۔

کیا قضا عمری کی کوئی شرعی دلیل ہے؟

سوال کیا قضا عمری شریعت مطہرہ سے ثابت ہے؟

جواب وہ لوگ جن پر نماز فرض ہو جاتی ہے لیکن وہ ادا نہیں کرتے مگر جب وہ باقاعدہ نمازی بن جاتے ہیں تو ان کی جو نمازیں رہ گئی ہوتی ہیں ان کی ادائیگی کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایک نماز کے ساتھ ایک قضا نماز بھی ادا کر لی جائے۔ مثلاً اگر ظہر کی نماز پڑھ رہے ہیں تو ظہر کی قضا نماز بھی ادا کر لی جائے۔ مگر اس کی شریعت میں کوئی دلیل اور بنیاد نہیں ہے، بلکہ یہ شریعت کے خلاف ہے۔ جو نماز رہ جائے اس کی ادائیگی کے لیے شریعت نے یہ بیان کیا ہے کہ اسے فوری طور پر ادا کر لیا جائے۔ زندگی پر بھروسا نہ کیا جائے، مثلاً اگر چار نمازیں (ظہر، عصر، مغرب، عشاء) چھوٹ گئی ہیں تو بجائے اس کے کہ انہیں کل تک مؤخر کیا جائے کہ ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کے ساتھ ایک ایک کر کے پڑھ لی جائے، انہیں فوری ادا کر لینا چاہیے جیسا کہ غزوۂ احزاب میں نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی چار نمازیں رہ گئی تھیں تو انہوں نے انہیں موقع ملتے ہی ایک ساتھ ادا کر لیا تھا۔

اگر ایک شخص نے بدقسمتی سے عرصۂ دراز تک نماز نہیں پڑھی یا کبھی پڑھتا رہا کبھی چھوڑتا رہا، یا بعض نمازیں پڑھتا رہا مگر بعض سے لاپرواہی اختیار کرتا رہا تو دریں صورت اسے چاہیے کہ صدق دل سے اپنے گناہوں کی اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرے اور آئندہ نماز ترک نہ

کرنے کا پختہ عزم کرے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا ہے۔

مذکورہ حالات میں چھوٹی ہوئی نمازوں کی ادائیگی نہیں ہوسکتی کیونکہ آدمی کو حتمی طور پر علم ہی نہیں کہ اس کی کتنی نمازیں چھوٹی ہیں۔

بعض لوگ ایک اور مختصر راستہ اختیار کرتے ہیں۔ رمضان المبارک کے آخری جمعہ میں قضا عمری یعنی ساری عمر کی چھوٹی ہوئی نمازیں ادا کرتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ اختیار کرتے ہیں کہ پانچ نمازیں پڑھ کر یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ "جمعة الوداع" کی برکت سے اللہ تعالیٰ گزشتہ زندگی کی چھوٹی ہوئی نمازیں بھی قبول کرلیتا ہے۔ یہ عمل یقیناً مضحکہ خیز اور عقل سلیم کے خلاف ہے۔ شریعتِ بیضاء (روشن شریعت) میں اس کی کوئی بنیاد نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ نے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ ایک اور بات جو قابل غور ہے کہ "جمعۃ الوداع" کا جو تصور برصغیر پاک وہند میں پایا جاتا ہے اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ عہدِ نبوی اور عہدِ صحابہ وتابعین میں یہ جمعہ بھی رمضان المبارک کے باقی جمعوں کی طرح گزر جاتا۔ اس کے لیے کبھی کسی نے خصوصی اہتمام نہیں کیا تھا۔

پھر یہ بات بھی توجہ چاہتی ہے کہ بعض اوقات رمضان کے آخری جمعہ کے بارے میں یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ وہ آخری ہے۔ مثلاً اگر رمضان کی ۲۳ تاریخ کو جمعہ آتا ہے، اب آپ شک میں مبتلا ہیں کہ شاید یہ آخری جمعہ ہے۔ اب اگر آپ اس جمعہ کو یہ قضا عمری نہیں کرتے کہ ۳۰ رمضان کو آخری جمعہ ہوگا لیکن رمضان المبارک ۲۹ دن کا ہوجاتا ہے تو پھر آپ کیا کریں گے؟ خدارا! اپنی طرف سے شریعت سازی نہ کریں۔

دورانِ نماز میں فون بند کرنے کی شرعی حیثیت

سوال پریشانیوں اور گہما گہمی کے اس جدید دور میں بسا اوقات آدمی کو نماز سے پہلے موبائل فون Off کرنا یاد نہیں رہتا۔ دوران نماز Bell ہونے کی وجہ سے نماز میں خلل واقع ہوتا ہے اور نمازیوں کی توجہ اس طرف مبذول ہوجاتی ہے۔ مسلسل گھنٹی بجنے سے نماز میں جو خلل پیدا ہوتا ہے اسے ختم کرنے کے لیے دورانِ نماز فون بند کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

جواب نماز شروع کرنے سے پہلے اُن تمام عوارض کو دُور کرنا چاہیے جن کے ہوتے

ہوئے نماز دھیان سے نہ پڑھی جا سکتی ہو۔ مثلاً شدید بھوک کی حالت ہو اور کھانا سامنے ہو تو پہلے کھانا کھا لینا چاہیے۔ اسی طرح اگر کسی کو واش روم استعمال کرنے کی حاجت ہو تو پہلے اس ضرورت سے فارغ ہونا چاہیے۔ اسی زُمرے میں موبائل فون Silent mode میں لانا بھی آتا ہے بلکہ اس کا بند کرنا زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ Silent mode سے دیگر نمازیوں کو خلل سے بچایا جا سکتا ہے جب کہ بند کرنے کی صورت میں خود بھی Vibrator وغیرہ کی خلل اندازی سے بچا جا سکتا ہے۔

اگر کسی وجہ سے نماز سے پہلے فون بند کرنا یاد نہ رہا ہو تو دوران نماز بھی Call آنے کی صورت میں فون بند کیا جا سکتا ہے کیونکہ نماز کی بہتری اور خلل سے بچنے کے لیے جو حرکت کی جاتی ہے شریعت اس کی اجازت دیتی ہے۔ جیسے نمازی کے آگے سے کوئی گزرے تو وہ اسے اپنے ہاتھ سے روک سکتا ہے۔ اسی طرح موذی جانور سانپ، بچھو وغیرہ کو بھی مارا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے موبائل فون کو بند کرنے کے لیے اس سے عموماً کم حرکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا دورانِ نماز میں بھی Call دیکھے بغیر فون بند کر دینا چاہیے۔

سورج کے طلوع وغروب اور زوال کے وقت عبادت کی شرعی حیثیت

سوال وہ کون سے اوقات ہیں جن میں کسی بھی قسم کی کوئی نماز ادا کرنا جائز نہیں۔ کیا یہ بات درست ہے اگر سورج کے طلوع وغروب اور زوال کے وقت سجدہ کیا جائے تو وہ سجدہ سورج کو ہوتا ہے؟ اگر کسی آدمی کے نماز پڑھتے ہوئے ایسا وقت داخل ہو جائے تو اسے نماز روک دینی چاہیے یا جاری رکھے؟

جواب عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں:

ثلاث ساعات کان رسول اللهﷺ نهانا ان نصلی فیهن او ان نقبر فیهن موتانا: حین تطلع الشمس بازغة حتی ترتفع وحین یقوم قائم الظهیرة حتی تمیل الشمس وحین تضیف الشمس للغروب حتی تغرب

(مسلم، فضائل القرآن، الاوقات التی نهی عن الصلاة فیها، ح: ۸۳۱؛ ابوداوٗد، الجنائز،

الدفن عند طلوع الشمس وعند غروبها، ح:۱۹۲)

''تین اوقات میں اللہ کے رسول ﷺ ہمیں نماز پڑھنے اور مردے دفن کرنے سے منع کرتے تھے؛ جب سورج طلوع ہو رہا ہو حتیٰ کہ بلند ہو جائے، جب آفتاب بالکل سیدھا ہو (نہ مشرق کی طرف مائل اور نہ مغرب کی طرف) حتیٰ کہ ڈھل جائے اور جب غروب ہونے لگے حتیٰ کہ پوری طرح غروب ہو جائے۔''

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ایک اور حدیث میں ہے، فرماتے ہیں:

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((اذَا بَدَا حَاجِبُ الشَّمْسِ فَاَخِّرُوا الصَّلَاةَ حَتّٰى تَبْرُزَ وَاِذَا غَابَ حَاجِبُ الشَّمْسِ فَاَخِّرُوا الصَّلَاةَ حَتّٰى تَغِيْبَ))

(مسلم، صلاۃ المسافرین، مایتعلق بالقراء ات، ح:۸۳۱)

''جب سورج کا کنارہ نکلنا شروع ہو جائے تو نماز کو مؤخر کر دو، یہاں تک کہ نکل کر نمایاں ہو جائے اور جب سورج کا ایک کنارہ غائب ہو جائے تو نماز ملتوی کر دو حتیٰ کہ سورج (مکمل طور پر) غروب ہو جائے۔''

ایک حدیث میں اس ممانعت کا سبب بھی بیان کیا گیا ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَحَرَّوْا بِصَلَاتِكُمْ طُلُوْعَ الشَّمْسِ وَلَا غُرُوْبَهَا فَاِنَّهَا تَطْلُعُ بِقَرْنَيِ الشَّيْطَانِ))(ایضاً)

''نماز کو سورج کے طلوع وغروب کے اوقات میں نہ پڑھو کیونکہ وہ شیطان کے دو سینگوں کے درمیان سے طلوع ہوتا ہے۔''

آفتاب کے طلوع وغروب کے وقت شیطان افق پر اپنے سینگ سورج کے سامنے کر دیتا ہے، چونکہ آتش پرست اس وقت سورج کو سجدہ کرتے ہیں اور اس کی پوجا کرتے ہیں تو شیطان یہ باور کرواتا ہے کہ لوگ اُسے سجدہ کرتے ہیں، اس لیے سورج کے طلوع وغروب کے وقت نماز پڑھنے اور سجدہ کرنے سے منع کیا گیا ہے تاکہ بت پرستوں اور مشرکوں سے

مشابہت نہ ہو۔

بعض لوگوں کا شیطان کے سینگوں کے بارے میں یہ اشکال کہ جس شیطان کے سینگ اتنے بڑے ہیں وہ خود کتنا بڑا ہوگا اور کہاں ٹھہرتا ہوگا حالانکہ سورج جسامت میں اتنا بڑا ہے کہ ہماری زمین سے لاکھوں گنا بڑا ہے۔ اس کے جواب میں مولانا عبدالرحمن کیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

شیطان کو اتنا بڑا تصور کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ سورج آپ کی دو انگلیوں کے درمیان بھی آ سکتا ہے اور طلوع بھی ہوسکتا ہے۔ اپنی دو انگلیاں اپنی آنکھوں سے ذرا آگے بڑھا کر اور ان میں فاصلہ دے کر سورج کی طرف دیکھیے تو سورج ان دو انگلیوں کے درمیان دکھائی دے گا۔ پس یہی صورت سورج کے شیطان کے دو سینگوں کے درمیان طلوع ہونے کی سمجھ لیجیے۔ (آئینہ پرویزیت ص:۷۴۸،ط:۴)

عمرو بن عبسہ سلمی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک لمبی حدیث میں سورج کے طلوع وغروب کے وقت نماز پڑھنے کی ممانعت کا سبب بیان کرنے کے ساتھ ساتھ سورج کے نصف النہار پر (زوال کے وقت) ہونے کے وقت نماز نہ پڑھنے کی وجہ بھی بیان کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ اس وقت جہنم دہکائی جاتی ہے (البتہ بکثرت احادیث یقوی بعضھا بعضا اور آثار صحابہ کی روشنی میں جمعۃ المبارک کا دن مستثنیٰ ہے)۔ عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سوالات کیے تھے ان میں ایک سوال نماز کے بارے میں بھی تھا، جس کے جواب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((صَلِّ صَلَاةَ الصُّبْحِ ثُمَّ اَقْصِرْ عَنِ الصَّلٰوةِ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ حَتّٰى تَرْتَفِعَ فَاِنَّهَا تَطْلُعُ حِيْنَ تَطْلُعُ بَيْنَ قَرْنَيْ شَيْطَانٍ وَحِيْنَئِذٍ يَسْجُدُ لَهَا الْكُفَّارُ ثُمَّ صَلِّ فَاِنَّ الصَّلٰوةَ مَشْهُوْدَةٌ مَّحْضُوْرَةٌ حَتّٰى يَسْتَقِلَّ الظِّلُّ بِالرُّمْحِ ثُمَّ اَقْصِرْ عَنِ الصَّلٰوةِ فَاِنَّ حِيْنَئِذٍ تُسْجَرُ جَهَنَّمُ فَاِذَا اَقْبَلَ الْفَيْءُ فَصَلِّ فَاِنَّ الصَّلٰوةَ مَشْهُوْدَةٌ مَّحْضُوْرَةٌ حَتّٰى تُصَلِّي الْعَصْرَ ثُمَّ اَقْصِرْ عَنِ الصَّلٰوةِ حَتّٰى تَغْرُبَ الشَّمْسُ فَاِنَّهَا تَغْرُبُ بَيْنَ قَرْنَيْ شَيْطَانٍ وَحِيْنَئِذٍ يَسْجُدُ لَهَا الْكُفَّارُ))

(مسلم ، فضائل القرآن، اسلام عمرو بن عبسة ، ح:۸۳۲)

''صبح کی نماز پڑھو، پھر نماز سے پرہیز کرو یہاں تک کہ آفتاب نکل کر بلند ہوجائے، اس لیے کہ وہ شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان نکلتا ہے اور اس وقت کافر اسے سجدہ کرتے ہیں (پھر اگر تم بھی نماز پڑھو گے تو ان سے مشابہت ہوگی)، پھر جب آفتاب بلند ہوجائے نماز پڑھو کہ اس وقت کی نماز کی فرشتے گواہی دیں گے اور فرشتے حاضر ہوں گے (یعنی مقبول ہوگی) یہاں تک کہ پھر سایہ نیزہ کا اس کے سر پر آجائے (یعنی ٹھیک دوپہر ہو) تو پھر نماز نہ پڑھو اس لیے کہ اس وقت جہنم جھونکی جاتی ہے۔ پھر جب یہ سایہ آئے (یعنی سورج ڈھل جائے) پھر نماز پڑھو اس لیے کہ اس وقت کی نماز میں فرشتے گواہی دیں گے اور حاضر ہوں گے یہاں تک کہ تم عصر پڑھو، پھر نماز سے رُکے رہو یہاں تک کہ آفتاب غروب ہوجائے، اس لیے کہ وہ شیطان کے دونوں سینگوں کے بیچ میں ڈوبتا ہے۔ اور اس وقت کافر بھی اسے سجدہ کرتے ہیں۔''

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار و مشرکین سے مشابہت کی وجہ سے ہی ان اوقات میں سجدہ اور عبادت کرنے سے روکا گیا ہے ورنہ جو سجدہ اللہ تعالیٰ کو کیا جائے وہ شیطان یا سورج کے لیے کیونکر ہوسکتا ہے! اسی لیے جو شخص سورج کے طلوع یا غروب ہونے سے قبل نماز شروع کرچکا ہو اُسے نماز توڑنے کا نہیں بلکہ مکمل کرنے کا حکم ہے۔ اس کے لیے درج ذیل احادیث ملاحظہ کریں:

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ اَدْرَكَ مِنَ الصُّبْحِ رَكْعَةً قَبْلَ اَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَقَدْ اَدْرَكَ الصُّبْحَ وَمَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنَ الْعَصْرِ قَبْلَ اَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ فَقَدْ اَدْرَكَ الْعَصْرَ))

(بخاری، مواقیت الصلاۃ، من ادرك من الفجر ركعة، ح:۵۷۹؛ مسلم، المساجد ومواضع الصلاۃ، من ادرك ركعة من الصلاۃ فقد ادرك تلك الصلاۃ، ح:۶۰۸۔ الفاظ صحیح بخاری کے ہیں۔)

''جس نے فجر کی ایک رکعت سورج نکلنے سے پہلے پالی اس نے فجر کی پوری نماز

پالی اور جس نے عصر کی ایک رکعت سورج غروب ہونے سے قبل پڑھ لی اس نے عصر کی مکمل نماز پالی۔"

یہی اصول ہر نماز کے بارے میں ہے یعنی جس نماز کی بھی ایک رکعت وقت گزرنے سے پہلے پڑھ لی جائے اور باقی نماز اگرچہ وقت گزرنے کے بعد ہی پڑھی جائے وہ ادا ہی شمار ہوگی، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنْ صَلَاةٍ فَقَدْ اَدْرَكَ الصَّلَاةَ))

(بخاری، مواقیت الصلاۃ، من ادرك من الفجر ركعة، ح:۵۸۰)

"جس نے ایک رکعت نماز پالی اس نے پوری نماز پالی۔"

اسی طرح اگر ایک شخص جماعت کے ساتھ ایک رکعت پڑھ لیتا ہے تو اسے پوری نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے کا اجر مل جاتا ہے، جیسا کہ ارشادِ نبوی ہے:

((مَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنَ الصَّلَاةِ مَعَ الْاِمَامِ فَقَدْ اَدْرَكَ الصَّلَاةَ))

(مسلم، المساجد ومواضع الصلاۃ، من ادرك ركعة من الصلاة فقد ادرك تلك الصلاة، ح:۶۰۷)

مذکورہ بالا احادیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جب ایک شخص کسی نماز کی ایک رکعت وقت پر پڑھ لیتا ہے اور پھر ممنوع وقت داخل ہونے پر نماز توڑ دیتا ہے تو اس کی ایک رکعت ہی پوری نماز شمار ہوگی۔ مذکورہ بالا صورتِ حال میں ممنوعہ اوقات میں بھی نماز پڑھنا جائز ہے۔ دریں صورت کفار سے مشابہت نہیں ہوگی۔ اسی لیے نماز پوری کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِذَا اَدْرَكَ اَحَدُكُمْ سَجْدَةً مِّنَ الصَّلَاةِ الْعَصْرِ قَبْلَ اَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ فَلْيُتِمَّ صَلَاتَهُ وَاِذَا اَدْرَكَ سَجْدَةً مِّنْ صَلَاةِ الصُّبْحِ قَبْلَ اَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَلْيُتِمَّ صَلَاتَهُ))

(بخاری، مواقیت الصلاۃ، من ادرك ركعة من العصر قبل الغروب، ح:۵۵۶)

"اگر عصر کی نماز کی ایک رکعت بھی کوئی شخص سورج غروب ہونے سے قبل پا سکا تو پوری نماز پڑھ لے۔ اسی طرح اگر سورج طلوع ہونے سے پہلے فجر کی نماز کی ایک رکعت بھی پڑھ سکے تو پوری نماز پڑھے۔ (اوقاتِ ممنوعہ کے داخل ہونے کی

وجہ سے باقی نماز ترک نہ کرے۔)"

نوٹ: نمازوں کو صحیح وقت پر ادا کرنا چاہیے، اگر عذر کی وجہ سے کسی کی نماز مؤخر ہو جائے تو مذکورہ بالا رعایت اس کے لیے ہے۔

نماز چوری سے روک دے گی!

سوال دفتر میں ایک صاحب نماز پڑھنے والوں پر برس پڑے کہ تمہاری نمازوں کا کیا فائدہ جب آپ غلط کام ترک نہیں کرتے۔ تم سے ہم بے نماز ہی اچھے ہیں جو گناہ کے کاموں سے بچتے ہیں۔ مَیں نے کہا کہ گناہوں سے بچنے کی کوشش کریں مگر نماز نہیں چھوڑنی چاہیے۔ ایک آدمی نماز بھی پڑھتا تھا اور چوری بھی کرتا تھا، تو نبی ﷺ نے فرمایا: "اس کی نماز اسے چوری سے روک دے گی۔" بے نماز کہنے لگا: ایسی کوئی بات نہیں۔ اس گفتگو کو مدنظر رکھتے ہوئے راہنمائی کریں؟

جواب اس میں کوئی شک نہیں کہ نماز برے کاموں سے روکتی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ الصَّلَوٰةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ ﴾ (۲۹/العنکبوت:۴۵)

"یقیناً نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔"

ایک مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۝ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۝ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ۝ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۝ ﴾

(۷۰/المعارج:۱۹-۲۳)

"بے شک انسان بڑے کچے دل والا بنایا گیا ہے۔ جب اسے مصیبت پہنچتی ہے تو ہڑ بڑا اٹھتا ہے اور جب راحت ملتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے، مگر وہ نمازی (ایسے نہیں ہوتے) جو اپنی نماز پر ہمیشگی کرنے والے ہیں۔"

شعیب علیہ السلام نے جب غیر اللہ کی عبادت، ماپ تول میں کمی بیشی کے ذریعے لوگوں کی حق تلفی کرنے سے اپنی قوم کو منع کیا اور انہیں اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نفع پر اکتفا کرنے کی تلقین

کی تو قوم نے اُن کا مذاق اُڑایا:

﴿قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ۝﴾ (ہود: ۸۷)

''انہوں نے جواب دیا: شعیب! کیا تیری صلوٰۃ (عبادت) تجھے یہی حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادوں کے معبودوں کو چھوڑ دیں اور ہم اپنے مالوں میں جو کچھ چاہیں اس کا کرنا بھی چھوڑ دیں تو بڑا ہی باوقار اور نیک چلن آدمی ہے!''

شعیب علیہ السلام کی مشرک، حرام خور اور مفسد قوم کا خیال یہ تھا کہ نماز (عبادت) کا دیگر اعمال زندگی کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ یہ وہی سوچ ہے جو آج بھی بعض لوگوں میں پائی جاتی ہے، جو کہتے ہیں کہ نماز اپنی جگہ پر اور باقی کام اپنی جگہ پر۔ جبکہ قرآن کی مذکورہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کا انسان کے اخلاق و کردار اور اس کی معاشی و معاشرتی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے مگر اس گہرے تعلق کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نمازی سے گناہ کا ارتکاب ہو ہی نہیں سکتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بعض ایسے لوگوں پر حد کا نفاذ کیا گیا تھا جو نمازی بھی تھے۔

وہ لوگ جو نماز کی صحیح معنوں میں پابندی کرنے والے ہوں، وہ برائیوں اور گناہوں پر اصرار کرنے والے نہیں ہوتے۔ اگر کہیں شیطان کا حملہ ان پر ہوتا ہے، تو وہ نماز کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے ہوئے چوکنا ہو جاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ وہ نافرمانی ہو جانے کی وجہ سے نماز بھی چھوڑ دیتے ہوں۔ فرض نماز کا چھوڑ نا بذاتِ خود گناہ کبیرہ ہے۔

مزید برآں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ نماز گناہوں کو دُور کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ۝﴾ (ہود: ۱۱۴)

''دن کے دونوں سروں میں نماز قائم رکھ اور رات کی کئی ساعتوں میں بھی۔ یقیناً نیکیاں برائیوں کو دُور کر دیتی ہیں، یہ نصیحت ہے نصیحت پکڑنے والوں کے لیے۔''

احادیث میں اس سلسلے کی بہت تفصیلات بیان کی گئی ہیں، ارشادِ نبوی ہے:

((اَلصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ وَالْجُمُعَةُ إِلَى الْجُمُعَةِ وَرَمَضَانُ إِلَى رَمَضَانَ مُكَفِّرَاتٌ مَابَيْنَهُنَّ إِذَا اجْتُنِبَ الْكَبَائِرُ))

(مسلم، الطهارة، الصلوات الخمس و الجمعة الى الجمعة...... ح:۲۳۳)

''پانچ نمازیں، جمعہ دوسرے جمعہ تک اور رمضان دوسرے رمضان تک ان کے مابین ہونے والے گناہوں کا کفارہ ہے، بشرطیکہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کیا جائے۔''

(بعض دیگر احادیث کے لیے دیکھیے بخاری، مواقیت الصلاۃ، الصلوٰت الخمس کفارۃ، ح:۵۲۸؛ مسلم، المساجد، مشی الی الصلوٰۃ تمحی به الخطایا وترفع به الدرجات، ح:۶۶۶۔۶۶۸)

نماز پڑھنے والے اگر گناہ کے کام چھوڑنا چاہتے ہوں تو نماز اس سلسلے میں ان کی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر کہنے لگا: فلاں شخص رات کو نماز پڑھتا ہے، مگر جب صبح ہوتی ہے تو چوری کرتا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّهُ سَيَنْهَاهُ مَايَقُولُ)) (مسنداحمد ۲/ ۴۴۷)

''اس کا یہ عمل عنقریب اسے اس (چوری) سے روک دے گا۔''

یہاں یہ بات قابل غور ہے، کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ نماز بھی چھوڑ دے، بلکہ یہ نوید سنائی کہ اس کی نماز اسے چوری سے عنقریب روک دے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نماز کی پابندی کرنے اور اس کے پیغام پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا کرے۔

ایک عورت اور دو مردوں کی نماز باجماعت کا طریقہ؟

سوال گھر میں بعض اوقات نماز کی جماعت کروانی پڑتی ہے۔ گھر کے تین افراد بیٹا اور والدین ہیں۔ صفیں کس طرح بنائی جانی چاہئیں؟

جواب مردوں اور عورتوں کی صفیں چونکہ علیحدہ علیحدہ بنائی جاتی ہیں، اس لیے والدہ

پیچھے کھڑی ہوگی اور باپ بیٹا میں سے ایک کو شرعی اصولوں کے مطابق امام بنالیا جائے، پھر چونکہ اکیلا مرد حالتِ جماعت میں علیحدہ صف نہیں بنا سکتا، اس لیے مقتدی امام کے دائیں طرف اس کے برابر اسی صف میں کھڑا ہوگا۔ انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

ان رسول اللہﷺ صلی به وبامه او خالته قال:فاقامنی عن يمينه واقام المرأة خلفنا۔

(مسلم ، المساجد، جواز الجماعة في النافلة...... ، ح:٦٦٠)

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اور ان کی والدہ یا خالہ کو نماز پڑھائی وہ (انس رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنی دائیں جانب کھڑا کیا اور خاتون کو ہمارے پیچھے کھڑا کرلیا۔''

اگر مرد حضرات زیادہ ہوں تو پہلے مردوں کی صفیں اور آخر میں عورتوں کی صفیں بنائی جائیں۔ انس رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے:

فقام عليه رسول اللهﷺ وصففت انا واليتيم وراء ه والعجوز من ورائنا فصلى لنا رسول اللهﷺ ركعتين ثم انصرف

(ایضاً، ح:٦٥٨)

''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس (چٹائی) پر (نماز پڑھانے کے لیے) کھڑے ہوئے تو میں اور یتیم بچہ آپ کے پیچھے اور بوڑھی عورت ہمارے پیچھے کھڑی ہوئی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں دو رکعت پڑھائیں پھر آپ تشریف لے گئے۔''

ایک اور روایت میں ہے، انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

صلى النبيﷺ في بيت ام سليم فقمت و يتيم خلفه و ام سليم خلفنا

(بخاری ، الاذان ، صلوة النساء خلف الرجال ، ح:٨٧١)

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (میری والدہ) ام سلیم کے گھر میں نماز پڑھائی۔ میں اور ایک یتیم (یعنی لڑکا) مل کر آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے اور ام سلیم ہمارے پیچھے کھڑی ہوئیں۔''

دورانِ نماز توجہ کس طرف ہو؟

سوال بعض مرید مرشد کا تصور ذہن میں رکھ کر عبادت کرتے ہیں۔ ایسا کرنا درست ہے؟

جواب مرشد کا تصور ذہن میں رکھ کر نماز اور دیگر عبادات بجالانا جہالت ہے۔ حدیث نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان رکھ کر عبادت بجالانی چاہیے آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ))

(مسلم ، الایمان ، بیان الایمان والاسلام والاحسان......... ، ح:۸)

''یہ کہ تم ایسے عبادت کرو گویا کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو یا اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو پھر کم از کم یہ خیال تو موجود رہنا چاہیے کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔''

ہر رکعت میں بار بار ایک ہی سورت کی تلاوت؟

سوال کیا امام سورۃ الفاتحہ کے بعد تمام رکعتوں میں ایک ہی سورت تلاوت کر سکتا ہے؟ جیسا کہ بعض لوگ ہر رکعت میں سورۃ الفاتحہ کے بعد سورۃ الاخلاص ہی پڑھتے ہیں۔

جواب سورۃ الفاتحہ کا تکرار تو ہر رکعت میں لازمی ہے جبکہ اس کے علاوہ بھی ہر رکعت میں ایک ہی سورت کو دہرایا جا سکتا ہے۔ ایک صحابی (کلثوم بن ہدم رضی اللہ عنہ) ہر رکعت میں سورۃ الفاتحہ کے بعد سورۃ الاخلاص پڑھتے تھے تو نبی ﷺ نے اس طرزِ عمل کو جائز قرار دیا۔

(بخاری ، الاذان ، الجمع بین السورتین......... ، ح:۷۷۴)

اس حدیث تقریری کے علاوہ نبی ﷺ کے عمل مبارک سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایک سورت کو پہلی رکعت میں پڑھنے کے بعد اسے دوسری رکعت میں دہرایا جا سکتا ہے۔ معاذ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

نبی ﷺ نے نمازِ فجر کی دونوں رکعتوں میں ﴿اذا زلزلت﴾ (سورۃ الزلزال) کی تلاوت کی۔

(ابوداؤد ، الصلاۃ ، الرجل یعید سورۃ واحدۃ فی الرکعتین ، ح:۸۱۶)

کیا امام بھی ((رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ)) کہے؟

سوال بعض احادیث میں ہے کہ جب امام ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ)) کہے تو تم ((رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ)) کہو تو کیا امام رکوع سے اٹھتے ہوئے ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ)) کے بعد ((رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ)) بھی کہے گا یا صرف ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ))؟

جواب جن احادیث میں ہے کہ جب امام ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ)) کہے تو تم ((رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ)) کہو، ان سے مقصود صرف یہ ہے کہ مقتدی امام کے تسمیع (سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ کہنے) کے بعد ((رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ)) کہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّمَا جُعِلَ الْاِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهٖ فَاِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوْا وَاِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوْا وَاِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ فَقُوْلُوْا رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ وَاِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوْا وَاِذَا صَلّٰى جَالِسًا فَصَلُّوْا جُلُوْسًا اَجْمَعُوْنَ))

(بخاری ، الاذان ، ایجاب التکبیر وافتتاح الصلاۃ، ح: ۷۳۴)

''امام اس لیے ہے کہ اس کی پیروی کی جائے لہٰذا جب وہ تکبیر کہے گا تو تم بھی تکبیر کہو، جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو، جب وہ ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ)) کہے تو تم ((رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ)) کہو، جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو اور جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم سب بھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔''

اس حدیث میں آنے والے لفظ فَقُوْلُوْا میں حرف فاء تعقیب کے لیے ہے یعنی امام کے ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ)) کے متصل بعد مقتدی کو ((رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ)) کہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی معنی کی حدیث انس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے جس کے بارے میں علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

یہاں یہ بات یاد رہے کہ اس حدیث کا مقصد یہ بتانا نہیں کہ امام اور مقتدی اس موقع پر کیا کہیں بلکہ محض یہ بتانا ہے کہ مقتدی کی ((رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ)) امام کی ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ)) کے بعد ہونی چاہیے۔ (صفۃ صلاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ص: ۱۳۵)

مزید برآں نبی اکرم ﷺ سے ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ)) کے بعد قومے میں ((رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ)) کہنا بھی ثابت ہے۔ چند احادیث درج ذیل ہیں:

① ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

كان رسول الله ﷺ اذا قام الى الصلاة يكبر حين يقوم، ثم يكبر حين يركع، ثم يقول:((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ)) حين يرفع صلبه من الركوع، ثم يقول وهو قائم:((رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ))ثم يكبر حين يهوى، ثم يكبر حين يرفع راسه، ثم يكبر حين يسجد ثم يكبر حين يرفع راسه، ثم يفعل ذلك فى الصلوة كلها حتى يقضيها و يكبر حين يقوم من الثنتين بعد الجلوس

(بخاری ، الاذان ، التكبير اذا قام من السجود، ح: ۷۸۹)

''اللہ کے رسول ﷺ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو تکبیر کہتے۔ پھر جب رکوع کرتے تب بھی تکبیر کہتے تھے۔ پھر جب سر اٹھاتے تو ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ)) کہتے اور کھڑے ہی کھڑے ((رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ)) کہتے۔ پھر اللہ اکبر کہتے ہوئے (سجدہ کے لیے) جھکتے، پھر جب سر اٹھاتے تو اللہ اکبر کہتے۔ پھر جب (دوسرے) سجدہ کے لیے جھکتے تب تکبیر کہتے اور جب سجدہ سے سر اٹھاتے تب بھی تکبیر کہتے۔ اسی طرح آپ تمام نماز پوری کر لیتے تھے۔ قعدۂ اولیٰ سے اٹھنے پر بھی تکبیر کہتے تھے۔''

قعدۂ اولیٰ سے اٹھتے ہوئے تکبیر کہنے کا تذکرہ حدیث مذکور میں بیان کردہ نماز کے فرض نماز ہونے کا قرینہ ہے۔ نوافل کی ادائیگی نبی اکرم ﷺ گھر پر کرتے تھے۔

② عبداللہ بن ابو اوفی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب اللہ کے رسول ﷺ رکوع سے اٹھتے تو یہ پڑھتے:

((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلْءُ السَّمٰوٰتِ وَ مِلْءُ الْاَرْضِ وَ مِلْءُ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ))

(مسلم، الصلوۃ ، مایقول اذا رفع رأسہ من الرکوع ،ح:۴۷۶)

''اللہ نے اس شخص کی بات سن لی جس نے اس کی تعریف کی۔ اللہ! ہمارے رب! تیرے ہی لیے ہے سب تعریف تمام آسمان بھر کر، زمین بھر کر اور اس کے بعد وہ چیز بھر کر جسے تُو چاہے۔''

③ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب اللہ کے رسول ﷺ اپنا سر رکوع سے اٹھاتے تو یہ کلمات پڑھتے:

((رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلْءُ السَّمٰوَاتِ وَ مِلْءُ الْاَرْضِ وَ مِلْءُ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ،اَهْلَ الثَّنَاءِ وَالْمَجْدِ اَحَقُّ مَا قَالَ الْعَبْدُ وَ كُلُّنَا لَكَ عَبْدٌ،اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ)) (ایضاً،ح:۴۷۷)

''ہمارے پروردگار! ہر قسم کی تعریف صرف تیرے لیے ہے آسمانوں اور زمین اور ہر اُس چیز کے بھراؤ کے برابر جو تُو چاہے اور بندے نے جو تیری تعریف اور بزرگی کی وہ تیرے لائق ہے اور ہم سب تیرے ہی بندے ہیں، اللہ ! کوئی روکنے والا نہیں اس چیز کو جو تُو نے دی اور کوئی دینے والا نہیں اس چیز کو جو تُو نے روک دی اور دولت مند کو دولت مندی تیرے عذاب سے نہیں بچا سکتی۔''

اس قسم کی اور بھی کئی دعائیں ہیں جن میں نبی اکرم ﷺ سے ((رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ)) یا ((رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ)) یا ((اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ)) وغیرہ کلمات پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے۔

سوال میں جن احادیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان سے یہ لازم نہیں آتا کہ ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ)) کے بعد امام ((رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ)) وغیرہ کلمات نہ کہے، کیونکہ یہ احادیث ان احادیث کے مشابہ ہیں جن میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب امام ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ کہے تو تم آمین کہو۔ لوگوں کو آمین کہنے کا حکم دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ امام آمین نہ کہے۔ دیگر احادیث سے امام کے آمین کہنے کا ثبوت ملتا ہے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِذَا اَمَّنَ الْاِمَامُ فَاَمِّنُوْا))(بخاری ، الاذان ، جهر الامام بالتامين ، ح: ٧٨٠)

"جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔"

وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

کان رسول اللہ ﷺ اذا قال:﴿ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾قرأ:((امين)) ورفع بها صوته

(ابو داؤد ، الصلاة، التامين وراء الامام، ح: ٩٣٢؛ الترمذی، الصلاة، ماجاء فی التامین ، ح: ٢٤٨)

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب﴿ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ پڑھتے تو آمین کہتے، آپ آمین بلند آواز سے کہتے تھے۔"

تو جس طرح حدیث 'جب امام ﴿ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ کہے تو تم آمین کہو' کی وضاحت مذکورہ بالا احادیث سے ہو جاتی ہے اسی طرح 'جب امام ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ)) کہے تو تم ((رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ)) کہو' کی وضاحت بھی ان احادیث سے ہو جاتی ہے جن میں اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ)) کے بعد قومہ میں ((رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ)) وغیرہ کلمات پڑھتے تھے۔ لہٰذا امام کو ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ)) کے بعد قومہ میں یہ کلمات بھی پڑھنے چاہئیں۔

مقتدی کو ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ)) کہنا چاہیے؟

سوال مقتدی کو رکوع سے اٹھتے ہوئے ((رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ)) کہنے پر اکتفا کرنا چاہیے یا پھر اس سے قبل ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ)) بھی کہنا چاہیے؟

جواب سنت کے زیادہ قریب اور راجح موقف یہی ہے کہ امام، مقتدی اور منفرد سب رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ)) کہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ نماز بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

کان رسول اللہ ﷺ اذا قام الی الصلوۃ یکبر حین یقوم ثم یکبر حین یرکع ثم یقول ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ))حین یرفع

صلبه من الركوع ثم يقول و هو قائم ((رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ))

(بخاری، الاذان، التکبیر اذا قام من السجود، ح: ۷۸۹)

"اللہ کے رسول ﷺ جب نماز کے لیے اٹھتے تو کھڑے ہو کر اللہ اکبر کہتے، پھر جب رکوع کرتے تو بھی تکبیر کہتے پھر رکوع سے اٹھتے ہوئے ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ)) کہتے ہوئے کھڑے ہو کر (قومہ میں) یہ پڑھتے: ((رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ))"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ)) رکوع سے اٹھتے وقت پڑھنا چاہیے جبکہ ((رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ)) حالت قومہ میں پڑھنا چاہیے۔ تو یہ معلوم ہوا کہ یہ دو مختلف موقعوں کے اذکار ہیں۔ لہٰذا امام و مقتدی اور منفرد ہر ایک کے لیے مشروع ہے کہ وہ ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ)) بھی کہے اور ((رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ)) بھی۔ مولانا محمد داؤد راز رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ بہتر یہی ہے کہ امام و مقتدی ہر دو ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ)) کہیں اور پھر ہر دو ((رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ)) کہیں۔ (شرح بخاری ۱/۲۶۸)

نبی ﷺ نے اپنے طریقے کے مطابق ہی لوگوں کو نماز قائم کرنے کا حکم دیا تھا:

((صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ فَإِذَا حَضَرَتِ الصَّلٰوةُ فَلْيُؤَذِّنْ لَكُمْ أَحَدُكُمْ وَلْيَؤُمَّكُمْ أَكْبَرُكُمْ))

(بخاری، الاذان، الاذان للمسافرين اذاكانوا جماعة والاقامة......، ح: ۶۳۱)

"اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے، جب نماز کا وقت آجائے تو کوئی ایک اذان دے اور جو تم میں سے بڑا ہو وہ نماز پڑھائے۔"

اس حدیث کے عمومی مفہوم کا تقاضا ہے کہ ہر نمازی ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ)) کہے۔ مگر انس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی احادیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((وَإِذَا قَالَ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ فَقُوْلُوْا: رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ))

(ایضاً، ایجاب التکبیر و افتتاح الصلوٰۃ، ح: ۷۳۲،۷۳۴)

"جب امام ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ)) کہے تو تم ((رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ)) کہو۔"

اس حدیث کی روشنی میں بعض علماء نے یہ کہا کہ مقتدی کو ((سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ)) نہیں کہنا چاہیے کیونکہ اسے ((رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ)) کہنے کا حکم دیا گیا ہے حالانکہ اس طرح کے استدلال کے مطابق تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ امام کو ((رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ)) نہیں کہنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ یہ استدلال صحیح اور صریح احادیث کے خلاف ہے کیونکہ نبی ﷺ سے بحیثیت امام ((رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ)) کہنا بہت سی احادیث سے ثابت ہے۔

(اس سلسلے کی بعض تفصیلات ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کی کتاب صفۃ صلاۃ النبی ﷺ (ص: ۱۳۵) میں دیکھی جا سکتی ہیں۔)

کیا نماز کے بعد ''اللہ اکبر'' کہنا ثابت نہیں؟

سوال فرض نماز کے بعد سب سے پہلے کون سا ذکر کرنا چاہیے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نماز کے بعد ''اللہ اکبر'' کہنا صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ کیا یہ بات درست ہے؟

جواب فرض نماز کے بعد بہت سے اذکار نبی ﷺ سے ثابت ہیں، مگر ترتیب کی صراحت نہیں کی گئی، البتہ بعض صحیح احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نماز سے فارغ ہوتے ہی بلند آواز سے ''اللہ اکبر'' پڑھا کرتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

كنت اعرف انقضاء صلاة النبي ﷺ بالتكبير

(بخاری، الاذان، الذکر بعد الصلاۃ، ح: ۸۴۲)

''میں نبی ﷺ کی نماز ختم ہونے کو تکبیر (کی آواز) کی وجہ سے سمجھ جاتا تھا۔''

تکبیر کے بعد تین مرتبہ قدرے آہستہ آواز سے استغفر اللہ کہنا چاہیے۔

بخاری کی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اُن لوگوں کا، جو یہ کہتے ہیں کہ فرض نماز کے اختتام پر ''اللہ اکبر'' کہنا صحیح حدیث سے ثابت نہیں، موقف درست نہیں۔

کیا نابینا آدمی امام بن سکتا ہے؟

سوال نابینا آدمی امام بن سکتا ہے یا نہیں؟ اس پر ہمارے گاؤں میں بہت بحث چلتی رہی، جو حضرات کہتے تھے کہ نابینا شخص امام نہیں بن سکتا ان کا کہنا تھا کہ وہ چونکہ گندگی سے نہیں بچ سکتا، اس لیے اسے امام نہیں بنایا جا سکتا، مثلاً ہو سکتا ہے کہ کوئی جانور کتا وغیرہ اس

پر چھینٹے ڈال دے اور اسے خبر بھی نہ ہو!

جواب شرائطِ امام پر پورا اُترنے والے نابینا شخص کو امام مقرر کرنا جائز ہے اور اس کی اقتداء میں نماز ادا کرنا بلا کراہت درست ہے۔ نابینا کی امامت درست ہونے کی صحیح اور واضح دلیل درج ذیل حدیث ہے، انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

ان النبی ﷺ استخلف ابن ام مکتوم یؤم الناس و ھو اعمٰی

(ابوداؤد، الصلاۃ، امامۃ الاعمی، ح: ۵۹۵)

''نبی ﷺ نے عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو (مدینہ میں دوبار) اپنا نائب بنایا، وہ لوگوں کو نماز کی امامت کرواتے، حالانکہ وہ نابینا تھے۔''

باقی یہ اشکال کوئی حیثیت نہیں کہ نابینا آدمی اس لیے امام نہیں بن سکتا کہ وہ نجاست سے نہیں بچ سکتا۔ کیونکہ انسان حسبِ استطاعت ہی احکامِ شریعت کا پابند ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (۲/البقرۃ:۲۸۶)

''اللہ کسی جان کو اُس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔''

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر نابینا آدمی بحیثیت مقتدی نماز پڑھ رہا ہو تو اس کی نماز یقیناً جائز ہوگی، تو پھر اس کا امام بننا کیونکر درست نہیں ہوگا۔ حالانکہ جو طہارت امام کے لیے ضروری ہے وہی مقتدی اور منفرد کے لیے ضروری ہے۔

مزید براں نابینا شخص کے امام بنانے کا تعامل بھی تمام مکاتبِ فکر میں پایا جاتا ہے۔ نابینا شخص کا کوئی قصور نہیں کہ اسے امام بننے کی سعادت سے صرف اس لیے محروم رکھا جائے کہ وہ بینائی سے محروم ہے۔

بعض حنفی علما نے بھی نابینا کی اقتداء میں نماز کو صحیح قرار دیا ہے۔ مولانا محمد یوسف لدھیانوی سے کسی نے سوال پوچھا کہ ہمارے امام صاحب ایک بڑے عالم ہیں، لیکن آنکھوں سے معذور ہیں تو کیا میں ان کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہوں، اگر نہیں تو کیا صرف جمعہ کی نماز پڑھ سکتا ہوں؟ تو موصوف نے بعض علماء کے بلا دلیل اقوال کا ''رکھ رکھاؤ'' کرنے کے باوجود نابینا عالم کی امامت کو درست قرار دیا۔ انہوں نے لکھا: ''نابینا امام کے پیچھے نماز اس صورت

میں مکروہ ہے جبکہ پاکی پلیدی میں احتیاط نہ کرسکتا ہو ورنہ بلا کراہت صحیح ہے۔ جمعہ کا اور پنجگانہ نمازوں کا ایک ہی حکم ہے۔"

اس فتوی سے معلوم ہوا کہ نابینا شخص بھی پاکی پلیدی میں احتیاط کرسکتا ہے، لہٰذا اُس کے پیچھے نماز ادا کرنا بلا کراہت صحیح ہے۔ اس سلسلے میں حرفِ آخر نبی ﷺ کا عمل ہے کہ آپ نے اپنے نابینا مؤذن کو امام مقرر کیا۔

صفوں میں دائیں طرف کھڑا ہونا کیوں افضل ہے؟

سوال ہم نے مجلّہ دعوۃ التوحید میں پڑھا کہ حالتِ نماز میں صفوں میں دائیں طرف کھڑا ہونا زیادہ بہتر ہے مگر ہم نے بعض علماء کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ مسجد نبوی میں بائیں طرف کھڑے ہونے کا اجر زیادہ ہے کیونکہ اس طرف اللہ کے رسول ﷺ کی قبر مبارک سامنے آتی ہے۔ آپ ہماری راہنمائی کریں کہ بحالت نماز صفوں میں دائیں طرف کھڑے ہونے کی فضیلت مسجد نبوی میں حاصل نہیں ہوتی ہے؟

جواب شریعتِ اسلامی میں دائیں طرف کو عموماً فوقیت حاصل ہے۔ ایسے تمام کام جو زینت، عزت یا شرف کا باعث ہوں انہیں دائیں طرف سے شروع کرنا چاہیے۔ جیسے لباس پہننا، مسجد میں پاؤں رکھنا، سرمہ لگانا، کھانا کھانا، کسی کو کوئی چیز پکڑانا یا لینا، اسی طرح جوتا پہننا، کنگھی کرنا اور وضو کرنا وغیرہ۔ حدیث نبوی ہے:

كان النبی ﷺ يحب التيمن ما استطاع فی شانه كله فی طهوره وترجله وتنعله

(بخاری، الصلاۃ، التیمن فی دخول المسجد و غیرہ، ح:۴۲۶؛ مسلم، ح:۲۶۸؛ ترمذی، ح:۶۰۸)

"نبی ﷺ اپنے تمام کاموں میں اپنی استطاعت کے مطابق دائیں طرف سے شروع کرنا پسند کرتے؛ وضو کرنے میں، کنگھی کرنے میں اور جوتا پہننے میں۔"

اسی بنا پر جنت والوں کو اصحاب الیمین (دائیں طرف والے) کہا گیا ہے۔

نماز میں بھی یہی اصول ہے۔ اور دائیں طرف کو پسند کیا گیا ہے۔ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى مَيَامِنِ الصُّفُوفِ))

(ابوداود، الصلاۃ، الصف بین السواری، ح:٦٧٦۔ اسے سفیان ثوری (مدلس) نے عنعن سے بیان کیا ہے۔)

''صفوں میں دائیں طرف کھڑے ہونے والوں پر اللہ رحمتیں نازل کرتا ہے اور فرشتے رحمت کی دعا کرتے ہیں۔''

بعض احادیث میں پہلی صفوں کے لیے رحمت کا اعلان کیا گیا ہے۔ مذکورہ بالا حدیث میں تمام صفوں کی دائیں طرف کے لیے اعلانِ رحمت کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ ہر صف کی دائیں طرف اس کی بائیں طرف سے افضل ہے۔ اور یہ حکم تمام مساجد کے لیے ہے۔ مسجد نبوی کو اس حکم سے مستثنیٰ کرنے کی کتاب وسنت میں کوئی دلیل نہیں۔ بلکہ یہ حکم اور فضیلت آپ ﷺ نے بنیادی طور پر مسجد نبوی کے لیے ہی بیان کی تھی اور باقی مساجد ضمناً اس حکم میں داخل ہیں۔

نبی ﷺ کے ارشاد کے وقت جس چیز کا وجود ہی نہیں تھا وہ اس حکم کا سبب نہیں ہوسکتی، یہ ظاہر ہے کہ جب نبی ﷺ نے مذکورہ بالا فضیلت بیان کی تھی اس وقت نبی ﷺ کی قبر مبارک بنی ہی نہیں تھی! لہٰذا جو علماء مسجد نبوی میں بائیں طرف کھڑے ہونے کو ترجیح دیتے ہیں ان کا قول بے دلیل اور غلو فی الدین کے مترادف ہے۔

'جائے نماز' لپیٹنے کا ایک طریقہ

سوال 'جائے نماز' کو Fold کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسے لمبائی کے رُخ فولڈ کرنا چاہیے یعنی جب اس کی پہلی تہہ لپیٹیں گے تو اس کی چوڑائی آدھی رہ جائے گی، پھر اسے دوسرے رُخ موڑ دیا جائے تو اس کی لمبائی آدھی رہ جائے گی۔ یوں جائے نماز کو تہہ کیا جائے، تہہ کرتے وقت سجدے والی جگہ اس جگہ کے ساتھ نہ لگے جس کے ساتھ پاؤں لگتے ہیں۔ کیا یہ کوئی شرعی مسئلہ ہے؟

جواب 'جائے نماز' کو آپ جیسے چاہیں لپیٹ دیں۔ شریعت میں اس بارے میں کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ ذاتی ذوق کو شریعت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

صلاۃ الاوابین ، نمازِ اشراق اور صلاۃ الضحیٰ

سوال ایک عالم سے سوال کیا گیا کہ اشراق، چاشت اور اوابین کی نمازوں کی کتنی کتنی رکعتیں ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ اشراق چار رکعتیں، چاشت آٹھ رکعتیں اور اوابین چھ رکعتیں ہیں۔ وضاحت مطلوب ہے کہ ان نمازوں کے اوقات کیا ہیں؟ ان کی رکعات کی تعداد کیا ہے؟ ان نمازوں کی حقیقت کیا ہے؟ بعض لوگ مغرب اور عشاء کے درمیان پڑھے جانے والے چھ نوافل کو نمازِ اوابین کہتے ہیں، کیا یہ درست ہے؟

جواب صلاۃ الاوابین، اشراق اور صلاۃ الضحیٰ (نمازِ چاشت) دراصل ایک ہی نماز کے مختلف نام ہیں۔ جسے مختلف اوقات میں پڑھنے کی وجہ سے کئی ناموں سے پکارا گیا ہے۔

صلاۃ الضحیٰ کی احادیث میں بہت فضیلت بیان ہوئی ہے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((يُصْبِحُ عَلٰى كُلِّ سُلَامٰى مِنْ اَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ فَكُلُّ تَسْبِيْحَةٍ صَدَقَةٌ وَكُلُّ تَحْمِيْدَةٍ صَدَقَةٌ وَكُلُّ تَهْلِيْلَةٍ صَدَقَةٌ وَكُلُّ تَكْبِيْرَةٍ صَدَقَةٌ وَاَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ وَيُجْزِىءُ مِنْ ذٰلِكَ رَكْعَتَانِ يَرْكَعُهُمَا مِنَ الضُّحٰى))

(مسلم ، صلاۃ المسافرین ، استحباب صلاۃ الضحیٰ ، ح:۸۲۰)

”تم میں سے ہر ایک اس حال میں صبح کرتا ہے کہ اس کے ذمے اس کے تمام جوڑوں (۳۶۰ جوڑ) پر صدقہ ہوتا ہے۔ سبحان اللہ کہنا صدقہ ہے، الحمدللہ کہنا صدقہ ہے، لاالٰہ الااللہ کہنا صدقہ ہے، اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے، نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا صدقہ ہے۔ اس سلسلے میں (صدقے کے طور پر) ضحیٰ کی دو رکعت بھی کفایت کر جاتی ہیں جو کوئی انہیں ادا کرتا ہے۔“

ایک حدیث قدسی میں ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

((يَا ابْنَ اٰدَمَ! ارْكَعْ لِيْ اَرْبَعَ رَكَعَاتٍ مِّنْ اَوَّلِ النَّهَارِ اَكْفِكَ اٰخِرَهٗ))

(ترمذی، الوتر، ماجاء فی صلاۃ الضحیٰ، ح:۴۷۵)

”آدم کے بیٹے! خالص میرے لیے چار رکعتیں دن کے شروع میں پڑھ مَیں تجھے اس دن کی شام تک کفایت کروں گا۔“

تجھے اپنی حفاظت میں رکھوں گا اور تیرے کام سنواروں گا۔

صلاۃ الضحیٰ (چاشت، اشراق، صلاۃ الاوابین) کی رکعات کی تعداد مقرر نہیں البتہ نبی ﷺ اکثر چار رکعات ادا کیا کرتے تھے۔ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

كان رسول الله ﷺ يصلي الضحى اربعا ويزيد ماشاء الله

(مسلم، صلاة المسافرين، استحباب صلاة الضحى وان اقلها ركعتان واكملها ثمان ركعات واوسطها اربع ركعات اوست والحث على المحافظة عليها، ح: ۷۱۹)

”اللہ کے رسول ﷺ ضحیٰ کی چار رکعات پڑھا کرتے تھے اور اللہ کو منظور ہوتا تو زیادہ بھی کر لیتے تھے۔“

نبی ﷺ کے عمل سے ضحیٰ کی زیادہ سے زیادہ آٹھ رکعتیں ثابت ہیں۔ ام ہانی (فاختہ بنتِ ابوطالب) رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

ان النبی ﷺ دخل بيتها يوم فتح مكة فاغتسل وصلى ثماني ركعات فلم ار صلاة قط اخف منها غير انه يتم الركوع والسجود

(بخاری، التهجد، صلاة الضحى فى السفر، ح: ۱۱۷۶)

”فتح مکہ کے دن آپ ان کے گھر تشریف لائے، آپ نے غسل کیا اور پھر آٹھ رکعات (چاشت کی) نماز پڑھی۔ مَیں نے ایسی ہلکی پھلکی نماز کبھی نہیں دیکھی۔ البتہ آپ رکوع اور سجدہ پوری طرح ادا کرتے تھے۔“

اس حدیث کی شرح میں مولانا محمد داؤد راز رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”حدیثِ ام ہانی میں نبی ﷺ کی جس نماز کا ذکر ہے شارحین نے اس کے بارے میں اختلاف کیا ہے، بعض نے اسے شکرانہ کی نماز قرار دیا ہے۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ ضحیٰ کی نماز تھی۔ ابوداؤد میں وضاحت موجود ہے کہ صلی سبحۃ الضحی یعنی آپ نے ضحیٰ کے نفل ادا کیے اور مسلم نے کتاب الطہارۃ میں نقل کیا:

ثم صلى ثمان ركعات سبحة الضحى یعنی پھر نبی ﷺ نے ضحیٰ کی آٹھ

رکعت نفل نماز ادا کی اور تمہید ابن عبدالبر میں ہے کہ قالت قدم ﷺ مکة فصلی ثمان رکعات فقلت ما هذه الصلوة قال هذه صلوة الضحی ''ام ہانی کہتی ہیں کہ آپ ﷺ مکہ آئے اور آپ نے آٹھ رکعات ادا کیں۔ مَیں نے پوچھا کہ یہ کیسی نماز ہے؟ آپ نے فرمایا کہ یہ ضحیٰ کی نماز ہے۔''

احادیث میں صلاۃ الضحیٰ کی کم ازکم رکعات کی تعداد دو بھی بیان ہوئی ہے جیسا کہ پیچھے بیان کردہ مسلم کی ایک روایت میں ((رَكْعَتَانِ يَرْكَعُهُمَا مِنَ الضُّحٰى)) کے الفاظ ذکر کئے گئے ہیں۔ ایک اور حدیث میں ہے، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

اوصانی خلیلی بثلاث بصیام ثلاثة ایام من کل شهر ورکعتی الضحی وان اوتر قبل ان ارقد

(مسلم، صلاة المسافرين، استحباب صلاة الضحى ... ح:۷۲۱؛ بخاری، التهجد، صلاة الضحى في الحضر، ح:۱۱۷۸)

''میرے خلیل۔ (جانی دوست ﷺ) نے مجھے تین چیزوں کی وصیت کی: مَیں (ساری زندگی) ہر مہینے کے تین (نفلی) روزے رکھوں، ضحیٰ کی دو رکعت پڑھتا رہوں اور سونے سے پہلے وتر ادا کروں۔''

سونے سے پہلے وتر ادا کرنے کے بارے میں امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''سونے سے پہلے وتر ادا کرنا اس شخص کے لیے مستحب ہے جو رات کے آخری حصے میں اٹھنے کے بارے میں اپنے آپ پر اعتماد نہیں کرتا۔ اگر اسے اعتماد ہو تو پھر رات کا آخری حصہ (وتر کی ادائیگی کے لیے) افضل ہے (ریاض الصالحین) حدیث سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

(دیکھیے مسلم، صلاۃ المسافرین، من خاف ان لا یقوم، ح:۷۵۵)

جہاں تک صلاۃ الضحیٰ کے وقت کا معاملہ ہے تو وہ سورج کے ایک نیزہ تک بلند ہو جانے سے شروع ہو کر زوالِ آفتاب تک رہتا ہے۔ مگر سورج کے خوب بلند ہو جانے کے بعد اور گرمی کی شدت کے وقت پڑھنا افضل ہے۔ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کچھ لوگوں کو چاشت کی نماز پڑھتے دیکھا تو کہا: سنو! یقیناً یہ لوگ جانتے ہیں کہ اس کے علاوہ دوسرے وقت میں نماز پڑھنا افضل ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((صَلَاةُ الْأَوَّابِيْنَ حِيْنَ تَرْمَضُ الْفِصَالُ))

(مسلم، صلاة المسافرين، صلاة الاوابين حين ترمض الفصال، ح: ۷۴۸)

''صلاۃ الاوابین (رجوع کرنے والوں کی نماز) اس وقت ہے جب گرمی کی شدت سے اونٹوں کے بچوں کے پاؤں جلیں۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ضحیٰ (چاشت) کی نماز طلوعِ آفتاب کے کافی وقت بعد پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔ ہاں اس نماز کو اگر اس کے ابتدائی وقت یعنی سورج نکلنے کے کچھ دیر بعد پڑھ لیا جائے تو اسے نمازِ اشراق کہہ دیا جاتا ہے۔ وقت کا اندازہ مذکورہ بالا حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ صلاۃ الضحیٰ اور صلاۃ الاوابین ایک ہی نماز کے دو نام ہیں۔ ایک اور حدیث میں بھی صریحاً صلاۃ الضحیٰ کو صلاۃ الاوابین کہا گیا ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''صلاۃ الضحیٰ کی حفاظت اوّاب (اللہ کی طرف رجوع کرنے والا) ہی کر سکتا ہے، پھر فرمایا: یہی صلاۃ الاوابین ہے۔'' (مستدرک حاکم ۱/۳۱۴؛ ابن خزیمہ، ح: ۱۲۲۴)

نمازِ مغرب اور عشاء کے درمیان پڑھے جانے والے نوافل کو صلاۃ الاوابین کہنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ (واللہ اعلم)

نوٹ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صلاۃ الضحیٰ کو پابندی سے ادا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ کئی کئی دنوں کا وقفہ ڈال لیتے تھے۔ اس کا ایک مقصد امت کے لیے آسانی بھی ہو سکتا ہے۔

خطبہ جمعہ کے دوران سامعین کا باتیں کرنا؟

سوال خطیب جب جمعہ کا خطبہ دے رہا ہو تو سامعین کو خاموش رہنا چاہیے۔ دورانِ خطبہ سامعین کا آپس میں گفتگو کرنا منع ہے۔ (دیکھیے بخاری، ح:۹۳۴) بعض لوگ کہتے ہیں کہ دورانِ خطبہ تحیۃ المسجد کی دو رکعت بھی ادا نہیں کرنی چاہئیں، کیا یہ قول قابلِ لحاظ ہے؟

جواب خطبہ جمعۃ المبارک کے دوران میں لوگوں کا آپس میں ہم کلام ہونا درست نہیں البتہ خطیب لوگوں سے اور لوگ خطیب سے ہم کلام ہونا چاہیں تو درست ہے۔ نبی ﷺ سے بعض لوگ دعا وغیرہ کے سلسلے میں گفتگو کر لیتے، جبکہ آپ برسرِ منبر خطبہ ارشاد فرما رہے ہوتے۔ (دیکھیے بخاری، ح:۹۳۲،۹۳۳)

اسی طرح آپ ﷺ دورانِ خطبہ میں لوگوں سے کلام کر لیتے تھے۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

نبی ﷺ لوگوں کو جمعے کا خطبہ دے رہے تھے کہ ایک آدمی (سلیک) آیا، آپ نے اس سے پوچھا:

((اَصَلَّيْتَ يَافُلَانُ؟))

''ارے! آپ نے (تحیۃ المسجد کی) نماز پڑھ لی ہے؟''

اس نے عرض کیا کہ نہیں، آپ نے فرمایا:

((قُمْ فَارْكَعْ))

(بخاری، الجمعة، اذا رأى الامام رجلا جاء وهو يخطب امره ان يصلى ركعتين، ح:۹۳۰)

''اٹھو اور نماز ادا کرو۔''

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے اسے فرمایا:

((فَصَلِّ رَكْعَتَيْنِ))

(ایضاً، من جاء والامام يخطب صلى ركعتين خفيفتين، ح:۹۳۱)

''دو رکعت ادا کرو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ان رکعتوں کی ادائیگی اس کلام میں شامل نہیں جس کی دورانِ خطبہ

ممانعت ہے۔ ابوسعید خدری جمعہ کے دن آئے جبکہ مروان خطبہ پڑھ رہا تھا۔ آپ (رضی اللہ عنہ) نماز پڑھنے لگے۔ آپ کو بٹھانے کے لیے چوکیدار آئے مگر آپ نے انکار کر دیا، یہاں تک کہ آپ نے نماز (تحیۃ المسجد) پڑھی، جب آپ نماز جمعہ سے فارغ ہوئے تو ہم آپ کے پاس آئے، ہم نے عرض کی: اللہ آپ پر رحم کرے! یہ لوگ تو آپ پر حملہ کرنے والے تھے۔ انہوں نے فرمایا: مَیں نے جو کام اللہ کے رسول ﷺ کو کرتے ہوئے دیکھا ہے مَیں اسے کبھی چھوڑنے والا نہیں ہوں، پھر انہوں نے بتایا کہ ایک آدمی جمعہ کے دن پریشان شکل میں آیا، جبکہ نبی ﷺ جمعے کا خطبہ دے رہے تھے، اس نے آپ کے حکم سے دو رکعت پڑھیں جبکہ خود نبی ﷺ خطبہ پڑھ رہے تھے۔

(ترمذی، الجمعۃ، ما جاء فی الرکعتین اذاجاء الرجل والامام یخطب، ح:۵۱۱)

ان سب روایات میں اس بات کی صراحت ہے کہ نبی ﷺ حالتِ خطبہ میں تھے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فاذا جاء والامام یخطب فلیرکع رکعتین ولیتجوز فیهما رعایة للسنة الراتبة وادب الخطبة جمیعا بقدر الامکان ولاتغتر فی هذه المسئلة بما یلهج به اهل بلدك فان الحدیث صحیح واجب اتباعه

''جب کوئی اس حالت میں آئے کہ امام خطبہ دے رہا ہو تو دو رکعت ادا کرے مگر جہاں تک ہو سکے ان رکعتوں کو مختصر ادا کرے تاکہ سنت راتبہ اور ادبِ خطبہ ہر دو کا لحاظ رکھا جا سکے۔ اپنے شہر کے لوگوں کے شور (یعنی ان رکعات سے روکنے) کی وجہ سے اس مسئلہ میں دھوکا نہ کھانا، کیونکہ یہ حدیث صحیح ہے جس کی اتباع کرنا واجب ہے۔'' (حجۃ اللہ البالغۃ ۲/ ۱۰۱)

کیا عید کے دن جمعہ پڑھنا ضروری نہیں؟

سوال اگر جمعہ کے دن عید آجائے تو کیا جمعہ پڑھنا ضروری نہیں رہتا؟ لوگوں میں مشہور ہے کہ دو خطبے (عید اور جمعہ) ایک ہی دن آجائیں تو بھاری ہوتے ہیں اس کی کیا

حقیقت ہے؟

جواب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے ثابت ہے کہ آپ مذکورہ بالا صورت میں عید اور جمعہ دونوں ادا کرتے تھے۔ اس لیے مقامی لوگوں کو جمعہ کی ادائیگی کرنی چاہیے البتہ غیر مقامی لوگ کو، جو دُور دراز کے دیہاتوں سے چل کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے عید ادا کرتے تھے، آپ نے رخصت دے دی تھی کہ جو اَپنے اہل وعیال (دیہات) میں جانا چاہتا ہو (بغیر جمعہ پڑھے) جا سکتا ہے۔ لہٰذا ایسے لوگ اس سہولت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دو عیدیں عید الفطر اور جمعہ جمع ہو گئیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو عید کی نماز پڑھائی اور پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

((قَدِ اجْتَمَعَ فِيْ يَوْمِكُمْ هٰذَا عِيْدَانِ فَمَنْ شَاءَ اَجْزَاَهُ مِنَ الْجُمُعَةِ وَاِنَّا مُجَمِّعُوْنَ))

(ابوداوٗد، الصلاۃ، اذا وافق یوم الجمعۃ یوم عید، ح:۱۰۷۳؛ ابن ماجۃ، ح:۱۳۱۱؛ حاکم (۱/ ۲۸۸) نے مسلم کی شرائط پر صحیح کہا ہے اور ذہبی نے ان سے موافقت کی ہے۔ البانی نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔)

"تمہارے اس دن میں دو عیدیں جمع ہو گئیں ہیں، تو جو چاہے یہ (نمازِ عید) جمعہ کے بدلے کافی ہے اور بلاشبہ ہم جمعہ پڑھیں گے۔"

معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا تمہارے ہوتے ہوئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دَور میں دو عیدیں (جمعہ اور عید) ایک ہی دن اکٹھی ہوئی ہیں؟ انہوں نے فرمایا: ہاں۔ پوچھا کہ تب آپ نے کیسے کیا؟ انہوں نے کہا کہ آپ نے عید کی نماز پڑھی پھر جمعہ کے بارے میں اجازت دے دی اور فرمایا:

((مَنْ شَاءَ اَنْ يُّصَلِّيَ فَلْيُصَلِّ))

(ابوداوٗد، ایضاً، ح:۱۰۷۳؛ نسائی، ح:۱۵۹۳؛ ابن خزیمۃ (ح:۱۴۶۴) نے اسے صحیح کہا ہے۔)

"جو (جمعہ) پڑھنا چاہے وہ پڑھ لے۔"

اگرچہ عید کی نماز کی بہت زیادہ اہمیت ہے، مگر یہ جمعہ کی طرح فرض نہیں ہے۔ اس کا

وقت بھی جمعہ کے وقت سے مختلف ہوتا ہے اس لیے مقامی لوگوں کا جمعہ ادا کرنا ہی بہتر ہے۔

باقی رہا بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ دو خطبے بھاری ہوتے ہیں، اس کی کوئی حقیقت نہیں، اگر ایسا ہوتا تو نبی ﷺ کوئی نہ کوئی اشارہ ضرور کرتے کیونکہ جمعہ کے دن عید تو آپ کے عہد میں بھی آئی تھی جیسا کہ مذکورہ بالا احادیث میں بیان ہوا ہے، نیز عید خیر و برکت کا حامل عمل ہے، اسی طرح جمعہ کی بھی بہت زیادہ فضیلت ہے لہٰذا ان کا ایک ہی دن میں آجانا بھاری اور باعث مشکلات کی بجائے مزید باعثِ رحمت و برکت اور نورٌ علیٰ نور ہے۔

نمازِ جنازہ کے مسائل

قبروں کی طرف منہ کر کے نمازہ جنازہ ادا کرنا؟

سوال کیا قبرستان میں (جبکہ سامنے قبریں ہوں) نمازِ جنازہ ادا کی جا سکتی ہے؟

جواب قبرستان میں نماز پڑھنا جائز نہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اِجْعَلُوْا فِيْ بُيُوْتِكُمْ مِّنْ صَلَاتِكُمْ وَ لَا تَتَّخِذُوْهَا قُبُوْرًا))

(بخاری، الصلاۃ، کراھیة الصلاۃ فی المقابر، ح:۴۳۲)

"اپنے گھروں میں بھی نماز (نفل) پڑھا کرو اور انہیں قبریں نہ بناؤ۔"

مگر نمازِ جنازہ چونکہ میت کے لیے محض دعا ہوتی ہے اس لیے یہ قبرستان میں بھی پڑھی جا سکتی ہے۔ حتیٰ کہ قبر کے پاس بھی نمازِ جنازہ پڑھی جا سکتی ہے۔ ایک عورت مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی، اس کا انتقال ہو گیا تو لوگوں نے اسے رات کے وقت ہی دفن کر دیا۔ (انہوں نے نبی ﷺ کو بے آرام کرنا مناسب خیال نہ کیا۔) نبی ﷺ نے اس کے متعلق دریافت کیا تو لوگوں نے بتایا کہ وہ فوت ہو گئی ہے۔ آپ نے فرمایا:

تم نے مجھے کیوں نہ بتایا؟ مجھے اس کی قبر بتاؤ۔ پھر آپ اس کی قبر پر تشریف لائے اور اس پر نماز (نمازِ جنازہ) پڑھی۔

(بخاری، الصلاۃ، کنس المسجد و التقاط الخرق و القذی و العیدان، ح:۴۵۸)

جنازے کے ساتھ جاتے ہوئے آواز بلند کرنا؟

سوال بعض لوگ جب جنازہ لے جا رہے ہوتے ہیں تو 'کلمہ شہادت' کی صدا بلند کرتے ہیں۔ راولپنڈی میں ایسے مواقع پر کئی دفعہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ لوگ کلمہ شہادت اور دیگر نظمیں وغیرہ بلند آواز سے پڑھتے ہیں۔ ایسا کرنا شریعت کی نظر میں کیسا ہے؟

جواب ایسا کرنا قطعاً جائز نہیں کیونکہ جنازے کے ساتھ خاموشی سے چلنا چاہیے۔ ارشادِ نبوی ہے:

((لَا تُتْبَعُ الْجَنَازَةُ بِصَوْتٍ وَّلَا نَارٍ))

(ابوداؤد، الجنائز، فی النار یتبع بھا المیت، ح:۳۱۷۱، اس کی سند ضعیف ہے؛ مسند احمد ۲/ ۵۲۸)

"جنازے کے ساتھ آواز اور آگ نہ جائے۔"

صحابہ کے طرزِ عمل سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ قیس بن عبادہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

كان اصحاب النبى ﷺ يكرهون رفع الصوت عندالجنائز

(السنن الكبرىٰ از بيهقى، الجنائز، كراهية رفع الصوت فى الجنائز ۴/ ۷۴، ح۷۱۸۲؛ کتاب الزھد لابن المبارک، ص:۸۳)

''نبی ﷺ کے صحابہ جنازوں کے پاس بلند آواز ناپسند کرتے تھے۔''

امام نووی رحمہ اللہ (شارح مسلم) فرماتے ہیں:

جنازے کے ساتھ بالکل خاموشی سے چلنا چاہیے جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دیگر سلف صالحین کرتے تھے۔ قراءتِ قرآن، ذکر یا کسی اور دوسری چیز کو بلند آواز سے نہ پڑھا جائے۔ اس کی حکمت بالکل واضح ہے۔ آدمی کے خیالات وافکار پُرسکون اور مجتمع رہتے ہیں۔ وہ جنازے اور موت کے بارے میں غور کرسکتا ہے اور یہی بات اس موقع پر مطلوب اور یہی صحیح ہے۔'' (الاذکار، ص:۲۰۳)

لہٰذا اہلِ اسلام کا طریقہ یہی ہونا چاہیے کہ جنازے کے ساتھ خاموشی اختیار کریں۔ اس صورت میں وہ عیسائیوں کی مشابہت سے بھی بچ سکتے ہیں کیونکہ وہ ایسے مواقع پر بلند اور غمگین آواز سے گا گا کر انجیل اور دوسرے اذکار پڑھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کی توفیق بخشے!

دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھنا؟

سوال ایک دوست نے لندن میں مجھے ایک مجلہ دیا جس میں لکھا گیا تھا کہ اگر آپ لوگوں نے یہاں میت پر نمازِ جنازہ پڑھ لی تو پاکستان میں دوبارہ نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جاسکتی کیونکہ وارثوں نے امام صاحب کو نمازِ جنازہ پڑھانے کی اجازت دے دی ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں ہماری راہنمائی کی جائے کہ کیا قرآن وحدیث سے یہی ثابت ہے کہ اگر ولی (وارث) امام کو نمازِ جنازہ پڑھانے کی اجازت دے دے تو پھر کوئی دوسری بار نمازِ جنازہ نہیں پڑھا سکتا۔ اگر پڑھا دی جائے تو کیا وہ بدعت ہوگی؟ یہ خط آپ کو اس لیے لکھ رہا ہوں کہ میں نے سنا ہے کہ آپ لوگ صرف اور صرف قرآن وحدیث سے جواب دیتے ہیں۔ ہم سب

کے سب مسلمان ہیں، یہ فرقے ہمیں کہیں سے کہیں لے گئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ ہماری راہنمائی کریں گے۔

جواب ایک سے زائد مرتبہ نمازِ جنازہ پڑھی جاسکتی ہے۔ جو لوگ پہلی بار نمازِ جنازہ میں شرکت نہ کر سکے ہوں وہ دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھ سکتے ہیں اور ان کے ساتھ وہ لوگ دوبارہ نمازِ جنازہ میں شریک ہوسکتے ہیں جنہوں نے پہلے نمازِ جنازہ پڑھ لی ہو۔ کسی ولی (وارث) نے پہلے نمازِ جنازہ پڑھ لی ہو نہ پڑھی ہو یا پڑھانے کی اجازت دی یا نہ دی ہو اس سے کوئی سروکار نہیں کیونکہ شریعتِ اسلامیہ میں ایسی کوئی شرط عائد نہیں کی گئی۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک قبر کے پاس سے ہوا، میت رات کو ہی دفنائی گئی تھی، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا:

((مَتٰی دُفِنَ هٰذَا؟))

''اسے کب دفن کیا گیا؟''

لوگوں نے عرض کیا: گزشتہ رات، آپ نے فرمایا:

((اَفَلَا آذَنْتُمُوْنِیْ؟))

''تم نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی؟''

لوگوں نے کہا کہ اسے اندھیری رات میں دفن کیا گیا تھا اس لیے ہم نے آپ کو جگانا مناسب نہ سمجھا (آپ کو بے آرام کرنا اچھا خیال نہ کیا۔) عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں: پھر آپ کھڑے ہوگئے اور ہم نے آپ کے پیچھے صفیں بنالیں۔ مَیں بھی ان کے ساتھ تھا۔

(بخاری ، الجنائز ، صفوف الصبيان مع الرجال فی الجنائز ، ح:۱۳۲۱)

ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک الگ تھلگ قبر کے پاس سے گزرے:

فأمهم و صلوا خلفه

''آپ نے امامت کروائی اور لوگوں نے آپ کے پیچھے نمازِ جنازہ پڑھی۔''

(ایضاً ، الصلاة علی القبر بعد ما یدفن ، ح:۱۳۳۶)

ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جس نے پہلے نمازِ جنازہ نہ پڑھی ہو وہ بعد میں پڑھ

سکتا ہے نیز جو لوگ ایک بار نمازِ جنازہ پڑھ چکے ہوں وہ بھی دوبارہ نمازِ جنازہ میں شریک ہو سکتے ہیں۔ نیز یہ بھی واضح ہوا کہ جب قبر میں دفن میت کی نمازہ جنازہ دوبارہ پڑھی جاسکتی ہے تو جو میت ابھی تک دفن نہ کی گئی ہو اس پر دوبارہ کیوں نہیں پڑھی جاسکتی؟

سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی بار نمازِ جنازہ ادا کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے حمزہ رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ ادا کی بعد ازاں

اتى القتلى يصفون ويصلى عليهم وعليه معهم

''دوسرے شہداء باری باری لائے گئے، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کی بھی نمازِ جنازہ ادا کی اور ان کے ساتھ ساتھ حمزہ (رضی اللہ عنہ) کی بھی نمازِ جنازہ ادا کرتے رہے۔''

(معانی الآثار ۱؍۲۹۰)

اگر دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھنے کی شریعت میں ممانعت ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حمزہ رضی اللہ عنہ کی بار بار نمازِ جنازہ کبھی نہ پڑھتے۔

امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ اور بعض دیگر ائمہ دین نے احادیث کی روشنی میں ہی دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھنے کی اجازت دی ہے بالخصوص ان لوگوں کے لیے جنہوں نے پہلے نمازِ جنازہ نہ پڑھی ہو۔ آخر کیا وجہ ہے کہ میت کے رشتہ داروں اور احباب کو نمازِ جنازہ میں شریک ہونے سے محروم رکھا جائے، خصوصاً جب وہ ایک ساتھ اپنے عزیز کی نمازِ جنازہ میں شریک نہ ہو سکتے ہوں جیسا کہ سوال میں ذکر کیا گیا ہے کہ وہاں کے رشتہ دار نمازِ جنازہ میں شریک ہوتے ہیں تو پاکستان میں رہنے والے محروم ہوتے ہیں اور اگر پاکستان میں رہنے والوں نے نمازِ جنازہ پڑھنی ہے تو برطانیہ میں بسنے والے رشتے دار اور احباب محروم رہتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں احادیث، سنت مطہرہ، اسوۂ صحابہ اور ائمہ دین کے فتاویٰ کی روشنی میں میت پر دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھی جاسکتی ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جس مسئلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہو دیکھا جائے کہ کتاب وسنت کے زیادہ قریب کون سا موقف ہے، پھر فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے قبول کر لیا جائے۔

نمازِ جنازہ میں سر اوپر اٹھائیں یا ہاتھ؟

سوال کیا یہ بات ثابت ہے کہ نمازِ جنازہ کی ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کیا جائے؟ یا پہلی تکبیر کے وقت رفع الیدین کیا جائے جبکہ باقی تکبیرات میں سر اوپر اٹھایا جائے؟

جواب نمازِ جنازہ میں تکبیرِ اُولیٰ کے وقت رفع الیدین کرنا تمام ائمہ کے نزدیک مسنون ہے۔

تکبیرِ اُولیٰ کے وقت رفع الیدین کرنے پر سب ائمہ دین کا اجماع ہے۔

(الاجماع لابن المنذر، ص:۳۱)

تکبیروں میں رفع الیدین کرنا بھی نبی ﷺ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

ان النبی ﷺ کان اذا صلی علی جنازة رفع یدیه فی کل تکبیرة

(العلل از دارقطنی ۱۳/ ۲۲، ح:۲۹۰۸)

”نبی ﷺ جب نمازِ جنازہ ادا کرتے تو ہر تکبیر کے وقت دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتے۔“

اسی روایت کو حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے تلخیص الحبیر (۱۴۶/۲) میں نقل کیا ہے۔

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی بعض روایات میں صحیح سند کے ساتھ یہ الفاظ بھی منقول ہیں:

کان رسول اللہ ﷺ یرفع یدیه فی کل تکبیرة

(بیہقی ۴۴/۳، نصب الرایة از زیلعی ۲/ ۲۸۵، جزء رفع الیدین از بخاری، ص: ۳۵)

”اللہ کے رسول ﷺ ہر تکبیر کے وقت ہاتھ اٹھاتے تھے۔“

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی نمازِ جنازہ کی تمام تکبیرات میں رفع الیدین کرنا ثابت ہے، نافع نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں بیان کیا:

انه کان یرفع یدیه مع کل تکبیرة علی الجنازة

(مصنف ابن ابی شیبة، الجنازة، فی الرجل یرفع یدیه فی التکبیر علی الجنازة ۳/ ۱۸۱،جزء رفع الیدین، ح:۱۰۹،۱۱۰،۱۱۱؛ مصنف عبدالرزاق ۳/ ۴۷۰، ح:۶۳۶۰)

”آپ جنازہ کی ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرتے تھے۔“

صحیح بخاری میں نمازِ جنازہ کے بارے میں ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کا یہ عمل موجود ہے:

''وہ جب تک وضو نہ کر لیتے نمازِ جنازہ ادا نہ کرتے، طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب کے وقت نماز (جنازہ) نہ پڑھتے اور وہ جنازے کی نماز میں (تکبیرات کہتے وقت) رفع الیدین کرتے تھے۔''

(الجنائز، سنة الصلاة علی الجنازة، بعد از ح: ۱۳۲۱)

ابن قدامہ نے مسئلہ ۳۶۲ و یرفع یدیه فی کل تکبیرة (نمازِ جنازہ کی ہر تکبیر کے وقت ہاتھ اٹھائے جائیں) کے تحت لکھا ہے کہ ابن عمر اور انس رضی اللہ عنہما ہر تکبیر کے وقت یہ عمل (یعنی رفع الیدین) کرتے تھے۔ (المغنی ۳/۳۴۸-۳۴۹، دارالحدیث، قاہرہ)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے سعید بن منصور کی روایت سے لکھا ہے کہ ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے صحیح سند سے منقول ہے:

انه کان یرفع یدیه فی تکبیرات الجنازة

(التلخیص الحبیر، الجنائز، ۱/ ۳۳۳)

''آپ جنازے کی تکبیرات میں رفع الیدین کرتے تھے۔''

اس سلسلے میں کسی بھی صحابی سے ابن عمر، انس اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کے خلاف عمل کرنا یعنی تکبیراتِ جنازہ میں ترکِ رفع الیدین ثابت نہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اتباعِ سنت کی انتہائی زیادہ پابندی کرنے والے تھے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر اہلِ علم صحابہ اور دیگر کا یہ موقف ہے کہ نمازِ جنازہ میں آدمی ہر تکبیر کے وقت رفع الیدین کرے، عبداللہ بن مبارک، امام شافعی، امام احمد اور اسحاق بن راہویہ کا یہی فرمان ہے۔

(ترمذی، الجنائز، ماجاء فی رفع الیدین علی الجنازة، ح: ۱۰۷۷)

امام حسن بصری، عمر بن عبدالعزیز، محمد بن یسار اور عطا بن ابی رباح اور امام زہری رحمۃ اللہ علیہم و دیگر کا یہی موقف ہے۔ حافظ عبداللہ محدث روپڑی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

تکبیراتِ جنازہ میں رفع الیدین کرنا چاہیے۔

(فتاویٰ اہل حدیث ۲/۱۲۱،ادارہ احیاء السنۃ النبویۃ،سرگودھا)

البتہ امام مالک، امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوری کا کہنا ہے کہ نماز جنازہ میں پہلی تکبیر کے علاوہ باقی تکبیرات میں ہاتھ نہ اٹھائے جائیں۔(المغنی ۲/۳۶۹)

ناصر الدین الالبانی رحمہ اللہ کا بھی یہی موقف ہے کہ پہلی تکبیر میں ہی ہاتھ اٹھائے جائیں۔انہوں نے دو ضعیف احادیث سے استدلال کیا ہے۔اور لکھا ہے کہ یہ ایک دوسری کو تقویت دیتی ہیں۔(احکام الجنائز،ص:۱۵۶،۱۵۷،نور الاسلام اکیڈمی،لاہور)

یہ ضعیف احادیث درج ذیل ہیں:

① ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

ان رسول اللہ ﷺ کبر علی جنازۃ فرفع یدیہ فی اول تکبیرۃ ووضع الیمنٰی علی الیسرٰی

(ترمذی، الجنائز، ماجاء فی رفع الیدین علی الجنازۃ، ح: ۱۰۷۷)

"اللہ کے رسول ﷺ نے ایک جنازے پر تکبیر کہی تو پہلی تکبیر میں رفع الیدین کیا اور دائیں ہاتھ کو بائیں پر رکھ لیا۔"

اس روایت کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے غریب قرار دیا ہے۔(ایضاً)

② ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

ان رسول اللہ ﷺ کان یرفع یدیہ علی الجنازۃ فی اول تکبیرۃ ثم لا یعود (دارقطنی ۲/ ۷۵، ح:۱۸۱۴)

"اللہ کے رسول ﷺ نماز جنازہ میں پہلی تکبیر کے وقت رفع الیدین کرتے تھے، پھر ایسا نہیں کرتے تھے۔"

ان دو روایات میں سے پہلی روایت میں نماز جنازہ کی ابتدائی کیفیت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔باقی تکبیرات اور ان کے ساتھ رفع الیدین کے بارے میں یہ حدیث خاموش ہے۔لہٰذا یہ کہنا کہ ایک روایت دوسری کو تقویت دیتی ہے، درست نہیں۔ثم لا یعود والی روایت باقی تکبیرات میں عدم رفع الیدین کے بارے میں صریح ہے، مگر یہ بھی ضعیف ہے اور صحیح احادیث

کے خلاف ہے۔ضعیف حدیث صحیح احادیث کے خلاف دلیل نہیں بن سکتی۔پہلی روایت کو علامہ البانی نے خود ہی ضعیف، جبکہ دوسری روایت کے راوی کو مجہول قرار دیا ہے۔

نیز دار قطنی کی یہ روایت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اپنا عمل اس حدیث کے خلاف تھا۔وہ نمازِ جنازہ کی تمام تکبیرات میں رفع الیدین کرتے تھے۔ (جیسا کہ پیچھے بیان ہو چکا ہے) اہل کوفہ (احناف) کا اصول یہ ہے کہ جب راوی کا فتویٰ یا عمل اس کی روایت کے خلاف ہو تو راوی کی روایت لینے کی بجائے راوی کے فتویٰ اور عمل کو اختیار کیا جاتا ہے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ بعض علمائے احناف بھی نمازِ جنازہ کی تمام تکبیرات میں ہاتھ اٹھانے کے قائل ہوگئے۔علامہ سرخسی لکھتے ہیں:

بلخ کے بہت سے ائمہ دین نے نمازِ جنازہ میں ہر تکبیر کے ساتھ ہاتھ اٹھانے کا عمل اختیار کیا ہے۔(المبسوط ۲/ ۶۴)

سر اوپر اٹھانے کے جواز پر کوئی روایت ثابت نہیں ہے بلکہ علماء نے لکھا ہے کہ دورانِ نماز آسمان کی طرف سر اٹھانے کی ممانعت پر اجماع ہے۔(فتح الباری ۲/ ۲۳۴)

جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَيَنْتَهِيَنَّ أَقْوَامٌ يَرْفَعُونَ أَبْصَارَهُمْ إِلَى السَّمَاءِ فِي الصَّلٰوةِ أَوْ لَا تَرْجِعُ إِلَيْهِمْ))

(مسلم، الصلٰوۃ، النھی عن رفع البصر الی السماء فی الصلٰوۃ، ح:۴۲۸)

”دورانِ نماز لوگ اپنی نظریں آسمان کی طرف اٹھانے سے ضرور باز آجائیں، ورنہ ان کی نظر جاتی رہے گی۔“

دورانِ نماز اگر دعا کا موقع ہو تو اس وقت بھی نگاہ اوپر نہیں اٹھانی چاہیے۔ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَيَنْتَهِيَنَّ أَقْوَامٌ عَنْ رَفْعِهِمْ أَبْصَارَهُمْ عِنْدَ الدُّعَاءِ فِي الصَّلٰوةِ إِلَى السَّمَاءِ أَوْ لَتُخْطَفَنَّ أَبْصَارُهُمْ)) (مسلم، ایضاً، ح:۴۲۹)

"لوگ نماز میں دعا کرتے وقت آسمان کی طرف نگاہ اٹھانے سے ضرور رک جائیں ورنہ ان کی بینائی اچک لی جائے گی۔"

ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

((لَيَنْتَهِنَّ عَنْ ذٰلِكَ اَوْلَيَخْطِفَ اللّٰهُ اَبْصَارَهُمْ))

(ابن ماجة، اقامة الصلوٰة، الخشوع فی الصلوٰة، ح: ۱۰۴۴)

"لوگ اس سے باز آ جائیں ورنہ اللہ ان کی نگاہیں اچک لے گا۔"

نبی اکرم ﷺ کی ان احادیث میں کسی نماز کی تخصیص نہیں ہے۔ لہٰذا نمازِ فرض، سنت و نفل اور نمازِ جنازہ وغیرہ سب میں اس کی عمومی ممانعت کا اطلاق ہوتا ہے۔

احناف کے عالم مولانا محمد یوسف لدھیانوی سے سوال کیا گیا کہ کیا نمازِ جنازہ کی ہر تکبیر میں سر آسمان کی طرف اٹھانا چاہیے؟ تو انہوں نے "نہیں" میں جواب دیا۔

(آپ کے مسائل اور اُن کا حل ۳/۱۶۴)

بچے کی نمازِ جنازہ پڑھنا ضروری نہیں؟

سوال ایک بچہ اپنی پیدائش کے دو تین گھنٹے بعد فوت ہو گیا، لوگ امام مسجد کے پاس گئے تا کہ وہ اس کی نمازِ جنازہ پڑھائے تو امام صاحب فرمانے لگے کہ نمازِ جنازہ پڑھنے کی ضرورت نہیں، اس کے لیے دعائے خیر کر لینا۔ لوگوں نے بچے کو نمازِ جنازہ پڑھے بغیر دفن کر دیا، عوام الناس میں طرح طرح کی چہ مگوئیاں ہو رہی ہیں۔ کیا امام صاحب کا طرزِ عمل درست تھا؟

جواب وہ بچہ جو زندہ پیدا ہوا ہو اُس کی نمازہ جنازہ پڑھنا مشروع ہے۔ بلکہ وہ بچہ جس میں روح پھونکی جا چکی ہو اگر وہ مردہ پیدا ہو تو اس کی بھی نمازِ جنازہ پڑھنا مشروع ہے۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((اَلرَّاكِبُ يَسِيْرُ خَلْفَ الْجَنَازَةِ وَالْمَاشِيْ يَمْشِيْ خَلْفَهَا وَاَمَامَهَا وَعَنْ يَمِيْنِهَا وَعَنْ يَسَارِهَا قَرِيْبًا مِّنْهَا وَالسِّقْطُ يُصَلّٰى عَلَيْهِ وَيُدْعٰى لِوَالِدَيْهِ بِالْمَغْفِرَةِ وَالرَّحْمَةِ))

(ابوداؤد، الجنائز، المشی امام الجنازۃ، ح:۳۱۸۰؛ نسائی، ح:۱۹۴۲)

''سوار جنازہ کے پیچھے چلے، جب کہ پیدل آگے، پیچھے اور دائیں بائیں اس کے قریب چلیں اور سقط (نا تمام بچہ) پر بھی نمازِ جنازہ پڑھی جائے اور اس کے والدین کے لیے مغفرت اور رحمت کی دعا کی جائے۔''

ایک حدیث میں ((وَالطِّفْلُ يُصَلّٰى عَلَيْهِ)) (بچے پر نمازہ جنازہ پڑھی جائے) کے الفاظ ہیں۔ (ترمذی، الجنائز، ما جاء فی الصلاۃ علی الاطفال، ح:۱۰۳۱)

امام بخاری رحمہ اللہ نے تعلیقاً روایت کیا ہے کہ حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا:

يقرأ على الطفل بفاتحة الكتاب ويقول:اللهم اجعله لنا سلفا وفرطا واجرا (بخاری، الجنائز، قراءۃ فاتحۃ الکتاب علی الجنازۃ)

''بچے کی نمازِ جنازہ میں پہلے سورۃ الفاتحہ پڑھی جائے (جیسے بڑوں کے لیے پڑھی جاتی ہے) اور پھر یہ دعا اللھم......اجرا پڑھی جائے (جس کا ترجمہ یہ ہے) ''یا اللہ! اس بچے کو ہمارے لیے آگے چلنے والا، پیش رو (میرِ سامان) اور باعثِ اجر بنا۔''

اس روایت سے بچے کی نمازِ جنازہ پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے۔

ملحوظہ: سلف اس مال کو کہتے ہیں جو آدمی فائدے کے لیے آگے بھیجتا ہے اور فرط اس شخص کو کہتے ہیں جو لشکر سے آگے جا کر اُس کے کھانے پینے کا انتظام کرتا ہے، تو گویا جو بچے فوت ہو جاتے ہیں وہ اپنے والدین کے نفع بخش مال کی طرح ہوتے ہیں جو اُن کے آگے جاتا ہے نیز وہ اپنے والدین کے لیے اس بات کا سبب بنتے ہیں کہ انہیں راحت و نجات حاصل ہو نیز بچے کی وفات پر اس کے والدین صبر کرتے ہیں تو انہیں اجر ملتا ہے حتیٰ کہ باقی لوگوں کو حکم ہے کہ وہ اس بچے کے والدین کے لیے بھی رحمت و مغفرت کی دعا کریں جیسا کہ اوپر حدیث میں گزرا۔

البتہ یہ بات واضح رہے کہ بچے کی نمازِ جنازہ پڑھنا جائز ہے فرض و واجب نہیں کیونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فرزند ابراہیم رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی تھی۔ ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

مات ابراهیم بن النبی ﷺ وهو ابن ثمانیة عشر شهرا فلم یصل علیه رسول الله ﷺ

(ابوداوٗد، الجنائز، فی الصلاة علی الطفل، ح: ۳۱۸۷)

''نبی ﷺ کے بیٹے ابراہیم نے ڈیڑھ سال کی عمر میں وفات پائی تو اللہ کے رسول ﷺ نے اس کی نمازِ جنازہ ادا نہیں کی۔''

کیا نجاشی کی میت نمازِ جنازہ کے وقت پیغمبر ﷺ کے سامنے کر دی گئی تھی؟

سوال بادشاہ نجاشی فوت ہوا تو اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ نے ادا کی تھی۔ اس کے بارے میں نوائے وقت میں ایک کالم دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں لکھا تھا کہ ''نجاشی رضی اللہ عنہ کے جسم کا حبشہ میں ہونے کے باوجود رسول اللہ ﷺ کا ان کی نمازِ جنازہ پڑھانا یہ آپ کا خاصہ ہے اور آپ اپنے امتی کے جسم کو دیکھ رہے تھے اور نمازِ جنازہ پڑھ رہے تھے۔'' کیا اس دیکھنے کا کوئی ثبوت احادیث میں موجود ہے؟ اگر آپ کا میت کو دیکھنا ثابت ہو تو کیا اس سے غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھانا پیغمبر ﷺ کا خاصہ قرار پاتا ہے؟

جواب کسی بھی صحیح اور قابلِ استناد حدیث سے یہ ثابت نہیں ہے کہ نبی ﷺ نجاشی (اصحمہ) کی نمازِ جنازہ پڑھاتے وقت اس کے جسم کو دیکھ رہے تھے۔ صحیح احادیث میں، جن میں نجاشی کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھنے کا تذکرہ ہوا ہے، امتی کے جسم کو دیکھ کر نمازِ جنازہ پڑھنے کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔ (اس سلسلے میں درج ذیل احادیث ملاحظہ کی جا سکتی ہیں: بخاری، ح: ۱۲۴۵، ۱۳۱۸، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۳۸۸۰؛ مسلم، ح: ۹۵۱)

ان احادیث میں اس بات کی بھی صراحت موجود ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی نبی ﷺ کی اقتداء میں نجاشی کی غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کی جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ خاصہ پیغمبر نہ تھا ورنہ نبی اکرم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھنے سے روک دیتے۔ روکنا تو درکنار آپ نے تو انہیں غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ اور آپ کے حکم کی تعمیل میں ہی انہوں نے آپ کی اقتداء میں صفیں بنائی تھیں۔ جیسا کہ فصف بهم (بخاری، ح: ۱۲۴۵، ۱۳۳۳)، فصفوا خلفه (ایضاً، ح: ۱۳۱۸) اور ((فَهَلُمَّ فَصَلُّوا عَلَيْهِ)) (ایضاً، ح:

۱۳۲۰)(آ وَ ان کی نمازِ جنازہ پڑھو) وغیرہ الفاظ سے ثابت ہوتا ہے۔
اگر صحابہ کے آپ کے پیچھے نمازِ جنازہ پڑھنے کا تذکرہ بالفرض نہ بھی ہوتا تو بھی یہ ماننا پڑتا کہ صحابہ نے آپ کی معیت میں نمازِ جنازہ ادا کی ہوگی کیونکہ شریعت مطہرہ میں جماعت کے بغیر نمازِ جنازہ ادا کرنے کا طریقہ موجود نہیں، اگر نبی اکرم ﷺ نے اکیلے ہی غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کی ہوتی تو یہ ایسی منفرد بات ہوتی جس کا نقل کیا جانا ضروری تھا۔
علامہ کرمانی لکھتے ہیں:

قولهم رفع الحجاب عنه ممنوع ولئن سلمنا فكان غائب عن الصحابة الذين صلوا مع النبي ﷺ (فتح الباری ۳/ ۲۳۲)

''لوگوں کا یہ کہنا کہ پردہ اٹھا دیا گیا تھا ممنوع ہے۔ (اللہ کی قدرت سے تو بعید نہیں مگر اس واقعے میں اس کا ثبوت نہیں۔ راقم) اور اگر ہم تسلیم بھی کر لیں تو نجاشی کی نعش ان صحابہ سے تو غائب تھی جنھوں نے نبی ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تھی۔''

اگر بالغرض اس بات کو درست بھی تسلیم کر لیا جائے کہ نجاشی کی لاش سے پردہ ہٹا دیا گیا تھا تو بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ پیغمبر ﷺ کا خاصہ تھا۔ کیونکہ غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کرنے کا سبب حجاب ہٹانا نہیں تھا۔ اگر رفع حجاب کو نمازِ جنازہ غائبانہ کا سبب مان لیا جائے تو بہت سی نمازیں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ خاص ہو جائیں گی۔ نماز کی حالت میں آپ ﷺ کو بہت سے ایسے مناظر دکھائے جاتے تھے جو امتی نہیں دیکھ سکتے۔ اس کی ایک مثال صلوٰۃ الکسوف میں نبی اکرم ﷺ کو جنت وجہنم کا دکھایا جانا بھی ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

((اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اٰيَتَانِ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ لَا يَخْسِفَانِ لِمَوْتِ اَحَدٍ وَلَا لِحَيَاتِهٖ فَاِذَا رَاَيْتُمْ ذٰلِكَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ))

''سورج اور چاند دونوں اللہ کی نشانیاں ہیں اور کسی کی موت وحیات کی وجہ سے انہیں گرہن نہیں لگتا، اس لیے جب تمہیں معلوم ہو کہ گرہن لگ گیا ہے تو اللہ کا ذکر کرو۔''

صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! ہم نے دیکھا کہ (نماز میں) آپ اپنی جگہ سے کچھ آگے بڑھے اور پھر اس کے بعد پیچھے ہٹ گئے؟ آپ نے فرمایا:

((اِنِّیْ رَاَیْتُ الْجَنَّةَ، فَتَنَاوَلْتُ عُنْقُوْدًا وَلَوْ اَصَبْتُهُ لَاَكَلْتُمْ مِنْهُ مَا بَقِيَتِ الدُّنْيَا وَاُرِيْتُ النَّارَ فَلَمْ اَرَ مَنْظَرًا كَالْيَوْمِ قَطُّ اَفْظَعَ))

(بخاری، الکسوف، صلوة الکسوف جماعة، ح:۱۰۵۲)

''مَیں نے جنت دیکھی اور اس کا ایک خوشہ توڑنا چاہتا تھا، اگر مَیں اسے توڑ سکتا تو تم اسے رہتی دنیا تک کھاتے۔ اور مجھے جہنم بھی دکھائی گئی مَیں نے اس سے زیادہ بھیانک اور خوفناک منظر کبھی نہیں دیکھا۔''

اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہما بیان کرتی ہیں:

جب سورج کو گرہن لگا تو مَیں نبی ﷺ کی زوجہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر آئی۔ اچانک لوگ کھڑے ہوگئے، وہ نماز پڑھ رہے تھے اور عائشہ رضی اللہ عنہا بھی نماز میں شریک تھیں۔ مَیں نے پوچھا کہ لوگوں کو کیا بات پیش آئی؟ اس پر آپ نے آسمان کی طرف اشارہ کرکے سبحان اللہ کہا۔ مَیں نے پوچھا: کیا کوئی نشانی ہے؟ اس کا آپ نے اشارہ سے ہاں میں جواب دیا۔ انہوں نے بیان کیا کہ پھر مَیں بھی کھڑی ہوگئی لیکن مجھے چکر آ گیا، اس لیے مَیں اپنے سر پر پانی ڈالنے لگی۔ جب اللہ کے رسول ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو اللہ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا:

((مَا مِنْ شَيْءٍ كُنْتُ لَمْ اَرَهُ اِلَّا وَقَدْ رَاَيْتُهُ فِيْ مَقَامِيْ هٰذَا، حَتَّى الْجَنَّةَ وَالنَّارَ۔ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّكُمْ تُفْتَنُوْنَ فِي الْقُبُوْرِ))

(ایضاً، صلوة النساء مع الرجال فی الکسوف، ح:۱۰۵۳)

''وہ چیزیں جو مَیں نے پہلے نہیں دیکھی تھیں، اب انہیں مَیں نے اپنی اسی جگہ سے دیکھ لیا۔ جنت اور دوزخ تک مَیں نے دیکھی اور مجھے وحی کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ تم قبروں میں فتنہ میں مبتلا ہو گے۔''

مذکورہ اور ان جیسی احادیث سے یہ استدلال درست نہیں ہوگا کہ صلوة الکسوف (سورج گرہن کے موقع پر پڑھی جانے والی نماز) پڑھنا پیغمبر کا خاصہ ہے اور اس کی دلیل میں

پردہ ہٹنے کو پیش کرنا درست نہیں ہوگا۔

آج تک کسی بھی امام نے صلوۃ الکسوف کو خصوصیات نبویہ میں شمار نہیں کیا، اگرچہ آپ نے اس نماز میں غیر معمولی مناظر ملاحظہ کیے۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نجاشی کی میت سے پردہ ہٹنے اور اس سے غائبانہ نمازِ جنازہ کو خاصہ رسول قرار دینے کے بارے میں لکھتے ہیں:

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نجاشی کی میت سے پردہ ہٹا دیا گیا تھا مگر اولاً: تو اس کی کوئی صحیح روایت نہیں۔ ثانیاً: اگر پردہ ہٹا بھی دیا گیا ہو تو یہ خاص ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ کیونکہ ایک تو اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ پردے کا ہٹایا جانا ہی اس نماز کے مشروع ہونے کی بنیاد تھی۔ دوسرے نبی ﷺ نے گہن کی نماز پڑھائی، دورانِ نماز آپ کو جنت و جہنم دکھلائی گئی۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ چونکہ آپ کے بعد کسی کو جنت و جہنم نہیں دکھلائی جائے گی اس لیے گہن کی نماز آپ کے ساتھ خاص ہوئی۔ اور کسی اور کے لیے مشروع نہیں!

(نمازِ نبوی، ص:۲۹۷ (حاشیہ) دارالسلام)

کیا قصہ نجاشی سے غائبانہ نمازِ جنازہ پر استدلال نہیں ہو سکتا؟

سوال نمازِ نبوی نامی کتاب میں غائبانہ نمازِ جنازہ کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھنے پر نجاشی کے قصہ سے دلیل لی جاتی ہے۔ یہ قصہ صحیح بخاری (۱۲۴۵، ۱۳۱۸، ۱۳۲۰، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۳۳) اور صحیح مسلم (۹۵۱) میں موجود ہے مگر اس سے غائبانہ نمازِ جنازہ پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ (ص:۲۹۶) کیا یہ درست ہے کہ قصہ نجاشی سے غائبانہ نمازِ جنازہ پر استدلال کرنا صحیح نہیں؟ کیا کسی امام، محدث، فقیہ اور کسی معروف عالم دین یا مفتی نے اس قصے سے غائبانہ نمازِ جنازہ پر استدلال کیا ہے؟

جواب نبی اکرم ﷺ نے اصحمہ نجاشی کی (رجب ۹ھ میں) غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کی تھی، جس سے غائبانہ نمازِ جنازہ کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ یہ استدلال بالکل درست ہے۔ اس کے خلاف کوئی بھی دلیل موجود نہیں۔

قدیم و جدید بے شمار علمائے امت نے قصہ نجاشی سے غائبانہ نمازِ جنازہ پر استدلال

کیا ہے۔چند ایک کے استدلالات کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے:

① امام شافعی رحمہ اللہ (م۲۰۴ھ) کے نزدیک غائبانہ نمازِ جنازہ قصۂ نجاشی کی وجہ سے جائز ہے، لکھتے ہیں:

ولا باس ان يصلى على الميت بالنية فقد فعل ذلك رسول الله ﷺ بالنجاشي صلى عليه بالنية وقال بعض لا يصلى عليه بالنية وهذا خلاف سنة رسول الله ﷺ (كتاب الام ١/ ٢٣٠)

''اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ کسی میت پر (اسے حاضر فی الذہن کر کے) صرف نیت ہی سے نمازِ جنازہ ادا کی جائے کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ نے نجاشی کے جنازہ پر اسی طرح کیا تھا۔آپ نے نیت سے ہی اس پر نمازِ جنازہ پڑھی تھی اور بعض نے کہا ہے کہ نیت سے میت پر نمازِ جنازہ نہ پڑھی جائے (یعنی نمازِ جنازہ غائبانہ نہ پڑھی جائے)۔یہ بات سنتِ رسول اللہ ﷺ کے خلاف ہے۔''

② امام ابن حزم رحمہ اللہ (م۴۵۶ھ) المحلی (۱۶۹/۵) میں لکھتے ہیں:

ويصلى على الميت الغائب بامام وجماعة قد صلى رسول الله ﷺ على النجاشي ومات بارض الحبشة وصلى معه اصحابه عليه صفوفا وهذا اجماع منهم

''غائب میت پر باجماعت نمازِ جنازہ پڑھی جائے اور آپ کے صحابہ نے بھی آپ کی اقتداء میں نجاشی کی نمازِ جنازہ پڑھی۔یہ اجماعِ صحابہ ہے۔''

③ امام بیہقی رحمہ اللہ (م۴۵۸ھ) کی حدیث نجاشی پر تبویب سے بھی قصہ نجاشی سے غائبانہ نمازِ جنازہ پر استدلال ثابت ہوتا ہے۔باب کے الفاظ یہ ہیں:

باب الصلوة على الميت الغائب بالنية (السنن الكبرىٰ ٤/ ٤٩)

''غائب میت پر نیت سے ہی نمازِ جنازہ پڑھنے کا بیان۔''

④ شارح صحیح مسلم امام نووی رحمہ اللہ (م۶۷۶ھ) قصۂ نجاشی سے غائبانہ نمازِ جنازہ پر استدلال سے موافقت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وفيه دليل للشافعي وموافقيه في الصلوة على الميت الغائب

(شرح صحیح مسلم ۱/۳۰۹، قدیمی کتب خانہ، کراچی)

''نجاشی کی غائبانہ نمازِ جنازہ سے متعلق حدیث میں امام شافعی اور ان سے موافقت کرنے والوں کے لیے غائبانہ نمازِ جنازہ کی دلیل پائی جاتی ہے۔''

⑤ امام ابن دقیق العید رحمہ اللہ (م۷۰۲ھ) نے بھی قصہ نجاشی سے غائبانہ نمازِ جنازہ پر استدلال کیا ہے، لکھتے ہیں:

وفي الحديث دليل على جواز الصلوة على الغائب

(احکام الاحکام شرح عمدۃ الاحکام ۲/۲۳۰)

''اس حدیث میں غائب میت پر نمازِ جنازہ پڑھنے کی دلیل ہے۔''

⑥ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ (م۸۵۲ھ) نے حدیث نجاشی سے غائبانہ نمازِ جنازہ پر استدلال کو درست قرار دیا ہے، لکھتے ہیں:

واستدل به على مشروعية الصلوة على الميت الغائب عن البلد وبه قال الشافعي واحمد وجمهور السلف حتى قال ابن حزم لم يات عن احد من الصحابة منعه (فتح الباری ۳/ ۲۳۱)

''حدیث نجاشی سے ملک میں غیر موجود میت پر نمازِ جنازہ پڑھنے کے جواز پر استدلال کیا گیا ہے۔ امام شافعی، امام احمد اور جمہور سلف اسی کے قائل ہیں۔ ابن حزم نے تو یہاں تک کہا ہے کہ کسی ایک صحابی سے بھی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھنے سے منع کرنا مروی نہیں ہے۔''

⑦ علامہ عینی رحمہ اللہ (م۸۵۵ھ) نجاشی سے متعلق حدیث میں لکھتے ہیں:

فيه حجة لمن جوز الصلوة على الغائب ومنهم شافعي واحمد

(عمدۃ القاری ۸/ ۲۱)

''اس حدیث میں غائبانہ نمازِ جنازہ کو جائز قرار دینے والوں کی دلیل ہے۔ ان (مجوزین) میں شافعی اور احمد (بن حنبل) بھی شامل ہیں۔''

⑧ بلوغ المرام کے شارح علامہ محمد بن اسماعیل امیر یمانی رحمہ اللہ (م۱۱۸۲ھ) حدیثِ نجاشی سے استدلال کے بارے میں لکھتے ہیں:

فیه دلالة علی شرعیة صلوة الجنازة علی الغائب

(سبل السلام ۲/ ۱۰۱)

''یہ حدیث غائبانہ نمازِ جنازہ کی دلیل ہے۔''

⑨ شوکانی رحمہ اللہ (م۱۲۵۰ھ) قصۂ نجاشی سے غائبانہ نمازِ جنازہ پر استدلال کے بارے میں رقمطراز ہیں:

وقد استدل بهذه القصة القائلون بمشروعية الصلوة علی الغائب عن البلد (نیل الاوطار ۴/ ۵۳)

''ملک سے غائب میت کی نمازِ جنازہ کے قائلین نے اس کے جواز پر نجاشی کے واقعہ سے استدلال کیا ہے۔''

⑩ علامہ محمود سبکی رحمہ اللہ (م۱۳۵۲ھ) فرماتے ہیں:

وفی الحدیث دلالة علی جواز الصلوة علی المیت الغائب

(المنهل العذب المورود شرح ابوداؤد۹/ ۳۹)

''اس حدیث میں غائب میت پر نمازِ جنازہ کے جواز کی دلیل ہے۔''

⑪ مسند احمد کی شرح میں شیخ احمد عبدالرحمٰن الساعاتی لکھتے ہیں:

وقصاری القول ان القائلین بمشروعية صلوة الجنازة علی الغائب حجتهم اقوی لانها تتمشی مع الدلیل بدون تکلف و لا تاویل (بلوغ الامانی ۷/ ۲۲۳)

''خلاصۂ کلام یہ ہے کہ نمازِ جنازہ غائبانہ کے جواز کے قائلین کی حجت زیادہ قوی ہے کیونکہ یہ بغیر کسی تکلف اور بغیر کسی تاویل کے دلیل ہے۔''

⑫ موطا امام مالک کی شرح المصفّٰی (۱/ ۱۹۹) میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ حدیثِ نجاشی کی روشنی میں رقمطراز ہیں:

يتقدم الامام ويصف الناس خلفه ويكبرون اربع تكبيرات ولو على القبر او الغائب

"نمازِ جنازہ میں امام آگے کھڑا ہو۔ دیگر لوگ اس کے پیچھے صفیں بنائیں اور چار تکبیریں کہیں اگرچہ یہ (نمازِ جنازہ) قبر پر ہو یا غائب پر۔"

⑬ ڈاکٹر خلیل ہراس رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وقد احتج بهذا الحديث من ذهب الى جواز الصلوة على الغائب وهو حجة قوية وهو الصحيح

(حاشية الخصائص الكبرى للسيوطى ٢/ ٣٧٢)

"اس حدیث سے ان لوگوں نے دلیل لی ہے جو غائب میت پر نمازِ جنازہ کے قائل ہیں اور یہ حجت قوی ہے اور یہی صحیح موقف ہے۔"

⑭ شیخ الکل سید نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

نمازِ جنازہ غائب پر پڑھنا درست ہے۔ اور دلیل میں انہوں نے حدیث نجاشی کو پیش کیا ہے۔ (دیکھیے فتاویٰ نذیریہ ا/۳۹۸)

⑮ مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ سے غائبانہ نمازِ جنازہ کا ثبوت طلب کیا گیا تو انہوں نے جواب میں لکھا:

جنازہ غائب نبی ﷺ نے نجاشی بادشاہ کا پڑھا اور اس کے بعد کسی روایت میں منع نہیں آیا لہٰذا یہ فعل سنت ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ا/۱۲)

⑯ حدیث نجاشی سے استدلال کرتے ہوئے علامہ وحید الزمان لکھتے ہیں:

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نمازِ جنازہ میت غائب پر درست ہے۔

(شرح مؤطا امام مالک ص: ۱۹۱، اسلامی اکادمی، اردو بازار، لاہور)

⑰ نجاشی سے متعلق احادیث کی تشریح میں شارح صحیح بخاری مولانا محمد داؤد راز رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ان سب حدیثوں سے میت غائب پر نمازِ جنازہ غائبانہ پڑھنا ثابت ہوا۔

(بخاری ۲/ ۳۷۰، مکتبہ قدوسیہ، اردو بازار، لاہور)

⑱ مولانا محمود احمد میر پوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

بہر حال اس حدیث سے غائبانہ نماز کا ثبوت ملتا ہے، اس کی وجہ یا علت کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ (فتاویٰ صراطِ مستقیم ص:۲۵۶، مکتبہ قدوسیہ، لاہور)

⑲ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

اس سے معلوم ہوا کہ میت کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی جاسکتی ہے۔

(نمازِ نبوی ص:۲۹۶ (حاشیہ)، دارالسلام)

⑳ مولانا محمد عاصم الحداد رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

کسی میت کی غائبانہ نماز پڑھنا صحیح ہے۔ دلیل میں انہوں نے حدیث نجاشی کو پیش کیا ہے۔ پھر لکھتے ہیں:

نماز غائبانہ اسی طرح پڑھی جائے گی جس طرح سامنے رکھے ہوئے جنازہ کی نماز پڑھی جاتی ہے۔ (فقہ السنۃ ۱/۳۵۰۔۳۵۱، ادارہ معارف اسلامی منصورہ، لاہور)

㉑ مدرس مسجد النبوی الشریف فضیلۃ الشیخ ابوبکر جابر جزائری لکھتے ہیں:

اسی طرح غائبانہ نمازِ جنازہ بھی پڑھنا جائز ہے۔ چاہے درمیان میں طویل مسافت ہو، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے نجاشی رضی اللہ عنہ کا جنازہ پڑھا تھا اور وہ حبشہ میں تھے اور اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ میں تھے۔

(منہاج المسلم ص:۴۰۶، مترجم: شیخ الحدیث مولانا محمد رفیق الاثری)

غائب میت کم فاصلے پر ہو یا زیادہ دور ہو۔ جہت قبلہ میں ہو یا بالعکس، اس سے غائبانہ نمازِ جنازہ کے جواز پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میت جس طرف بھی ہو نمازِ جنازہ پڑھنے والوں کے لیے قبلہ رخ ہونا ضروری ہے۔

㉒ شیخ الحدیث حافظ عبدالمنان نور پوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

غائبانہ نمازِ جنازہ درست ہے خواہ شہید کی ہو خواہ غیر شہید کی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے نجاشی کی نمازِ جنازہ پڑھی اور شہداءِ اُحد کی آٹھ سال بعد نمازِ جنازہ پڑھی جو دونوں ہی غائبانہ ہیں۔

(احکام ومسائل ۱/۲۶۰، المکتبۃ الکریمیۃ، لاہور)

مولانا سے ایک مطالبہ یہ ہوا کہ نجاشی کی غائبانہ نمازِ جنازہ کے علاوہ اور مسلمانوں (صحابہ) کی غائبانہ نمازِ جنازہ کے حوالہ جات تحریر کریں تو آپ نے جواب میں لکھا:

نجاشی کے غائبانہ جنازہ والی حدیث کے علاوہ غائبانہ جنازہ کی احادیث پیش کرنے کی ضرورت تب ہے جب نجاشی کے غائبانہ نمازِ جنازہ والی حدیث ثابت نہ ہو یا اس سے غائبانہ نمازِ جنازہ ثابت نہ ہوتی ہو۔ تو جب نجاشی کے غائبانہ نمازِ جنازہ والی حدیث ثابت ہے۔ بخاری و مسلم میں بھی موجود ہے اور اس سے غائبانہ نمازِ جنازہ ثابت ہو رہی ہے تو عمل کے لیے تو اتنا ہی کافی ہے۔ اس کے علاوہ احادیث پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ (ایضاً)

㉓ غائبانہ نمازِ جنازہ کی شرعی حیثیت کے بارے میں حافظ عبدالستار الحماد حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

ہمارا رجحان جواز کی طرف ہے۔ دلیل میں قصہ نجاشی والی احادیث پیش کرتے ہیں۔

(فتاویٰ اصحاب الحدیث ۱۶۴/۱۔۱۶۵، مکتبہ اسلامیہ، اردو بازار، لاہور)

㉔ مسئلہ ۴۳۵ کے تحت مولانا محمد اقبال کیلانی حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھنی جائز ہے۔ مولانا کیلانی دلیل میں نجاشی سے متعلق متفق علیہ حدیث پیش کرتے ہیں۔ (کتاب الصلوۃ، ص:۱۶۱، سعودی عرب)

المختصر، بے شمار ائمہ دین اور علمائے امت حدیث نجاشی سے غائبانہ نمازِ جنازہ پر استدلال کرتے ہیں۔

وصیت: اپنے ماموں سے میل جول نہ رکھنا......؟

سوال ہمارے والدِ محترم نے وفات سے چند روز پہلے وصیت کی کہ اپنے ماموں سے کوئی میل جول نہ رکھیں۔ تعلقات منقطع رکھیں۔ اگر تم نے ان سے دوبارہ تعلقات استوار کیے تو میں تمہیں قیامت کے دن معاف نہیں کروں گا۔ ان کی وفات کے بعد (گھریلو مجبوری کی وجہ سے) صلح ہوگئی۔ کیا ان کی وصیت کی خلاف ورزی کرنا گناہ تو نہیں؟

جواب وصیت کے پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسلام کے قانونِ وصیت کی حدود میں ہو۔ قرآن وسنت کے احکام سے ہٹ کر کی جانے والی وصیت قابل نفاذ نہیں ہوتی۔ مثلاً کوئی وصیت کرے کہ اس کی قبر پکی بنائی جائے تو اس کی وصیت کو پورا نہیں کیا جائے

گا کیونکہ یہ خلافِ شریعت ہے، شریعت نے پکی قبر بنانے سے منع کیا ہے۔ اسی طرح قطع رحمی کی وصیت بھی غیر شرعی ہے جو کہ آپ کے والد مرحوم نے کی ہے۔ اپنے والد کی اس لغزش کی معافی کے لیے ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے استغفار کریں۔

قرآن مجید کے مطابق وصیت کو پورا کرنا ضروری ہے مگر وصیت غلط ہو تو اسے پورا نہیں کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں درج ذیل آیات مدنظر رکھیں:

﴿فَمَنْ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ (۲/البقرۃ:۱۸۲_۱۸۱)

''تو جو شخص وصیت سننے کے بعد بدل دے، اس کا گناہ بدلنے والے پر ہی ہوگا۔ یقیناً اللہ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے۔ ہاں جو شخص وصیت کرنے والے کی جانب داری یا گناہ کی وصیت کر دینے سے ڈرے تو وہ ان میں آپس میں اصلاح کرا دے تو اس پر گناہ نہیں، اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔''

قبر بنانے کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا طریقہ

سوال قبر بنانے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ کیا تھا۔ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی قبر مبارک کیسی بنائی تھی؟

جواب نبی اکرم ﷺ کے فرامین کی روشنی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی قبر پکی بنایا کرتے تھے۔ حتی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی اکرم ﷺ کی تربت مبارک بھی پکی اور کوہان نما بنائی تھی۔ سفیان التمار بیان کرتے ہیں:

انه رأى قبر النبی ﷺ مسنما

(بخاری، الجنائز، ماجاء فی قبر النبی ﷺ وابی بکر وعمر رضی اللہ عنہما، ح:۱۳۹۰)

''انہوں نے نبی ﷺ کی قبر دیکھی ہے جو کوہان نما تھی۔''

عامر بن سعد اپنے والد کے بارے میں کہتے ہیں:

ان سعد بن ابی وقاص قال فی مرضه الذی هلك فيه: الحدوا لی

لحدا وانصبوا علیّ اللبن نصبا کما صنع برسول اللہ ﷺ

(مسلم، الجنائز، فی اللحد...، ح:۹۶۶)

''سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے مرض الموت میں وصیت کی: میرے لیے لحد بنانا اور مجھ پر کچی اینٹیں لگانا جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی لحد (مبارک) کے ساتھ کیا گیا تھا۔''

نوٹ: اگر قبر میں اس کی قبلہ کی جانب جگہ کھودی جائے تو اسے لحد کہتے ہیں اور اگر درمیان میں کھودی جائے تو وہ شق ہے، دونوں طرح کی قبر بنانا جائز ہے لیکن لحد بہتر ہے کیونکہ اجماعِ صحابہ کے بعد اس طرح کی قبر کو نبی اکرم ﷺ کے لیے پسند کیا گیا۔ اینٹیں کھڑی کر کے لگائی جائیں اور نبی ﷺ کی قبر پر نو اینٹیں لگائی گئی تھیں۔ لہٰذا یہی بہتر ہے۔

(حاشیہ مشکوٰۃ المصابیح از شیخ الحدیث محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ، دفن المیت، الفصل الاول، شرح نووی)

موت کی تمنا

سوال ہمارے ایک بھائی نے دنیوی مشکلات سے تنگ آ کر کہا: ''یا اللہ! میں مر ہی جاؤں تو بہتر ہے۔'' جب میں نے اسے ایسا کہنے سے روکا تو اس نے کہا: ایسا کہنا منع نہیں۔ آپ اس بارے میں ہماری راہنمائی کریں۔

جواب دنیوی مشکلات سے تنگ آ کر اپنی موت کی تمنا یا دعا کرنا درست نہیں، کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ نے اس سے منع کیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں:

((لَا يَتَمَنّٰى اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ اِمَّا مُحْسِنًا فَلَعَلَّهٗ يَزْدَادُ وَاِمَّا مُسِيْئًا فَلَعَلَّهٗ يَسْتَعْتِبُ)) (بخاری، التمنی، مایکرہ من التمنی، ح:۷۲۳۵)

''کوئی شخص تم میں سے موت کی آرزو نہ کرے، اگر وہ نیک ہے تو ممکن ہے نیکی میں اور زیادہ ہو اور اگر بُرا ہے تو ممکن ہے اس سے توبہ کر لے۔''

قیس بیان کرتے ہیں:

ہم خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ان کی عیادت کے لیے حاضر ہوئے۔ انہوں نے سات داغ لگوائے تھے، پھر انہوں نے کہا:

لو لا ان رسول اللہﷺ نہانا ان ندعو بالموت لدعوت به

(ایضاً، ح:۷۲۳۴)

''اگر اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں موت کی دعا کرنے سے منع نہ کیا ہوتا تو میں اس کی دعا کرتا۔''

انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

لو لا انی سمعت النبیﷺ یقول: لا تمنوا الموت لتمنیت

(ایضاً، ح:۷۲۳۳)

''اگر میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے یہ نہ سنا ہوتا کہ موت کی تمنا نہ کرو تو میں موت کی آرزو کرتا۔''

انس رضی اللہ عنہ بہت بوڑھے ہو گئے تھے اور انہوں نے مسلمانوں میں بہت زیادہ فتنہ وفساد دیکھا مثلاً عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت، حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت اور خارجیوں کا ظلم وجور وغیرہ، مگر انہوں نے ان حالات میں بھی موت کی تمنا نہ کی کیونکہ اس سے پیغمبر ﷺ نے منع فرمایا تھا۔ ہاں اگر فتنہ وغیرہ میں پڑنے کا خوف ہو تو یوں کہہ سکتے ہیں:

((اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مَاكَانَتِ الْحَيٰوةُ خَيْرًا لِّيْ وَتَوَفَّنِيْ اِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِّيْ)) (بخاری، الدعوات، الدعاء بالموت و الحیاۃ، ح:۶۳۵۱)

''اللہ! جب تک میرا زندہ رہنا بہتر ہے مجھے تب تک زندہ رکھنا اور جب میری وفات بہتر ہو مجھے فوت کر لینا۔''

وفات پر سوگ منانے کی مدت و دیگر احکام

سوال ہماری دادی جان کو فوت ہوئے دو مہینے ہو چکے تھے کہ عید آ گئی۔ میرے چچاؤں نے عید پر نئے کپڑے وغیرہ نہیں پہنے۔ جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے اس کی وجہ یہ بیان کی کہ والدہ مرحومہ کی وفات کی وجہ سے ہم سوگ میں ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے لیے ایسے کپڑے پہننا درست نہیں۔ کیا ان کا یہ عمل درست تھا؟

جواب آپ کے چچاؤں کا سوگ کی وجہ سے اچھے کپڑے نہ پہننا شریعت کی خلاف

ورزی ہے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ الاحداد (سوگ منانا) خواتین کا کام ہے۔ طبعی طور پر جو صدمہ اور غم ہوتا ہے وہ الگ بات ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ خواتین کے فوت ہونے پر سوگ نہیں منایا جاتا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اچھے اور سادہ کپڑے پہننا سوگ کے خلاف نہیں ہے۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ تین دن سے زیادہ سوگ منانا جائز ہی نہیں۔ البتہ خاوند کی وفات پر بیوی چار مہینے دس دن سوگ مناتی ہے۔ ام عطیہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

كنا ننهى ان نحد على ميت فوق ثلاث الا على زوج اربعة اشهر وعشرا ولا نكتحل ولا نطيب ولا نلبس ثوبا مصبوغا الا ثوب عصب وقد رخص لنا عند الطهر اذا اغتسلت احدانا من محيضها فى نبذة من كست اظفار وكنا ننهى عن اتباع الجنائز

(بخاری، الطلاق، القسط للحادة عند الطهر، ح:۵۳۴۱)

''ہمیں اس سے منع کیا گیا ہے کہ کسی میت کا تین دن سے زیادہ سوگ منائیں سوائے شوہر کے کہ اس کی وفات پر چار مہینے دس دن کی عدت تھی۔ اس عرصہ میں ہم نہ سرمہ لگاتیں، نہ خوشبو استعمال کرتیں اور نہ رنگا کپڑا پہنتی تھیں۔ البتہ وہ کپڑا اس سے الگ تھا جس کا (دھاگہ) بُننے سے پہلے ہی رنگ دیا گیا ہو۔ ہمیں اس کی اجازت تھی کہ اگر کوئی حیض کے بعد غسل کرے تو اس وقت اظفار کا تھوڑا سا عُود استعمال کر لے اور ہمیں جنازہ کے پیچھے چلنے کی بھی ممانعت تھی۔''

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَایَحِلُّ لِامْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ تُحِدَّ فَوْقَ ثَلَاثٍ اِلَّا عَلٰی زَوْجٍ فَاِنَّهَا لَا تَكْتَحِلُ وَلَا تَلْبَسُ ثَوْبًا مَصْبُوْغًا اِلَّا ثَوْبَ عَصْبٍ)) (ایضاً، تلبس الحادة ثیاب العصب، ح:۵۳۴۲)

''جو عورت اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہو اس کے لیے جائز نہیں کہ تین دن سے زیادہ کسی کا سوگ منائے سوائے شوہر کے۔ وہ اس کے سوگ میں نہ سرمہ لگائے، نہ رنگا ہوا کپڑا پہنے مگر یمن کا دھاری دار کپڑا (جو بُننے سے پہلے ہی

رنگا گیا ہو۔''

محمد بن سیرین فرماتے ہیں:

توفی ابن لام عطیة رضی اللہ عنہافلما کان الیوم الثالث دعت بصفرة فتمسحت به وقالت:نهینا ان نحد اکثر من ثلاث الا بزوج

(بخاری، الجنائز، احداد المراة علی غیر زوجها، ح:۱۲۷۹)

''ام عطیہ رضی اللہ عنہا کا ایک بیٹا فوت ہوگیا۔ وفات کے تیسرے دن انہوں نے صفرہ خلوق (ایک قسم کی زرد خوشبو) منگوائی اور اسے اپنے بدن پر لگایا اور فرمایا کہ خاوند کے سوا کسی دوسرے پر تین دن سے زیادہ سوگ کرنے سے ہمیں منع کیا گیا ہے۔''

زینب بنت ابوسلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: مَیں ام المومنین زینب بن جحش کے پاس اس وقت گئی جب ان کا بھائی فوت ہوا، انہوں نے خوشبو منگوائی اور اسے لگایا اور پھر فرمایا: مجھے خوشبو کی کوئی ضرورت نہ تھی لیکن مَیں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

((لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ تَحِدُّ عَلٰى مَيِّتٍ فَوْقَ ثَلَاثٍ اِلَّا عَلٰى زَوْجٍ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا)) (ایضاً، ح:۱۲۸۲)

''کسی بھی عورت، جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہو، شوہر کے سوا کسی مُردے پر بھی تین دن سے زیادہ سوگ کرنا جائز نہیں ہے۔ ہاں شوہر پر چار مہینے دس دن تک سوگ کرے۔''

اسی طرح جب ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے والد ابوسفیان رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو ام المومنین نے خوشبو منگوائی جس میں خلوق خوشبو کی زردی یا کسی اور چیز کی ملاوٹ تھی، پھر وہ خوشبو ایک لونڈی نے انہیں لگائی اور ام المومنین نے خود اسے اپنے چہرے پر لگایا، اس کے بعد فرمایا:

واللہ! مجھے خوشبو کے استعمال کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن مَیں نے اللہ کے رسول سے سنا ہے، آپ نے فرمایا:

((لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ تَحِدُّ عَلٰى مَيِّتٍ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ إِلَّا عَلٰى زَوْجٍ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا))

(ایضاً، الطلاق، تحد المتوفی عنها اربعة اشهر وعشرا، ح:۵۳۳۴)

''کسی عورت کے لیے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہو، جائز نہیں کہ وہ تین دن سے زیادہ کسی کا سوگ منائے، سوائے شوہر کے کہ اس کا سوگ چار مہینے دس دن کا ہے۔''

بیوگان کے سوگ کی حدود و قیود

سوال میرے خالو فوت ہوئے تو خالہ جان کو سوگ کے سلسلے میں عجیب صورت حال کا سامنا کرنا پڑا، انہیں مختلف باتیں سننے کو ملیں، یہ کہ آپ غیر محرم سے بات نہیں کر سکتیں، بغیر پردہ کے کسی کے سامنے نہیں آ سکتیں۔ (یاد رہے کہ خالہ کی عمر ۵۰۔۵۵ سال کے درمیان ہے) آپ کسی صورت میں گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتیں، کسی غیر محرم کی تقریر یا تلاوت نہیں سن سکتیں، کسی غمی خوشی میں شریک نہیں ہو سکتیں وغیرہ۔ آپ سے گزارش ہے کہ وضاحت کریں کہ ان باتوں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ نیز کپڑوں کے متعلق بھی بتا دیں کہ نئے کپڑے یا صاف ستھرے کپڑے پہننے یا صاف ستھرا رہنے کی کوئی ممانعت تو نہیں؟

جواب زمانہ جاہلیت میں عربوں نے عورتوں پر ان کی عدت اور سوگ کے دوران روح فرسا اور تکریم انسانیت کے منافی بے جا پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ اسلام نے ان خودساختہ پابندیوں کو ختم کر دیا۔ احداد (سوگ منانے) کی جو بھی پابندی عائد کی اس میں انسانی وقار کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا۔ اس سلسلے کی چند احادیث درج ذیل ہیں:

① ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک خاتون اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور عرض کیا: اللہ کے رسول! میری لڑکی کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے اور اس کی آنکھوں میں تکلیف ہے تو کیا وہ سرمہ لگا سکتی ہے؟ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمایا کہ نہیں، دو تین مرتبہ (آپ نے یہ فرمایا)۔ ہر مرتبہ یہ فرماتے تھے کہ نہیں! پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ (شرعی عدت) چار مہینے اور دس دن ہی کی ہے۔ جاہلیت میں تو تمہیں سال بھر تک مینگنی پھینکنی پڑتی تھی (تب کہیں

عدت سے باہر ہوتی تھے)۔حمید نے بیان کیا کہ میں نے زینب بنت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ اس کا کیا مطلب ہے کہ "سال بھر تک مینگنی پھینکنی پڑتی تھی؟" انہوں نے فرمایا کہ زمانۂ جاہلیت میں جب کسی عورت کا شوہر فوت ہوجاتا تو وہ ایک نہایت تنگ و تاریک کوٹھڑی میں داخل ہوجاتی۔سب سے بُرے کپڑے پہنتی اور خوشبو کا استعمال ترک کردیتی۔یہاں تک کہ اسی حالت میں ایک سال گزر جاتا، پھر کسی چوپائے گدھے یا بکری یا پرندہ کو اس کے پاس لایا جاتا اور وہ عدت سے باہر آنے کے لیے اس پر ہاتھ پھیرتی۔ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ وہ کسی جانور پر ہاتھ پھیر دے اور وہ مر نہ جائے۔اس کے بعد وہ نکالی جاتی اور اسے مینگنی دی جاتی جسے وہ پھینکتی۔اب وہ خوشبو وغیرہ کوئی بھی چیز استعمال کرسکتی تھی۔

(بخاری ، الطلاق ، تحد المتوفی عنها اربعة اشهر و عشرا ، ح:٥٣٣٦،٥٣٣٧)

② ایک حدیث میں ہے: ایک عورت کے شوہر کا انتقال ہوگیا، اس کے بعد اس کی آنکھ میں تکلیف ہوئی تو اس کے گھر والے اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے سرمہ لگانے کی اجازت مانگی۔نبی ﷺ نے فرمایا کہ سرمہ (زمانہ عدت میں) نہ لگاؤ۔(زمانہ جاہلیت میں) تمہیں بدترین کپڑے میں وقت گزارنا پڑتا تھا، یا (یہ فرمایا کہ) بدترین گھر میں وقت (عدت) گزارنا پڑتا تھا۔جب اس طرح ایک سال پورا ہوجاتا تو اس کے پاس سے کتا گزرتا اور وہ اس پر مینگنی پھینکتی، (تب عدت سے باہر آتی۔) پس سرمہ نہ لگاؤ۔یہاں تک کہ چار مہینے دس دن گزر جائیں اور میں نے زینب بنت ام سلمہ سے سنا، وہ ام حبیبہ سے بیان کرتی تھیں کہ یہ نبی ﷺ نے فرمایا تھا۔

(ایضاً، الکحل للحادۃ، ح:٥٣٣٨،٥٣٣٩)

③ ام عطیہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

ہمیں اس سے منع کیا گیا کہ کسی میت کا تین دن سے زیادہ سوگ منائیں سوائے شوہر کے کہ اس کے لیے چار مہینے دس دن کی عدت تھی۔اس عرصہ میں ہم نہ سرمہ لگاتیں، نہ خوشبو کا استعمال کرتیں، اور نہ رنگا ہوا کپڑا پہنتی تھیں۔البتہ وہ کپڑا اس سے الگ تھا جسے بُننے سے پہلے ہی رنگ دیا گیا ہو۔

(ایضاً ، القسط للحادۃ عندالطهر ، ح:٥٣٤١)

④ زینب بنت ابوسلمہ بیان کرتی ہیں کہ مَیں ام حبیبہ کے پاس گئی۔ جب ان کے باپ ابوسفیان فوت ہو گئے تو انہوں نے خوشبو منگوا کر ایک لڑکی کو لگائی، پھر اپنے گالوں پر لگائی اور کہا: اللہ کی قسم! مجھے خوشبو کی حاجت نہیں مگر مَیں نے اللہ کے رسول ﷺ کو فرماتے سنا ہے، کہ اُس عورت کو حلال نہیں جو اللہ اور قیامت کو مانتی ہو کہ تین دن سے زیادہ کسی مردے کے غم میں سوگ کرے اور اپنا سنگار چھوڑ دے مگر اپنے خاوند کی عدت پر چار مہینے اور دس دن سوگ کرے۔ پھر زینب نے کہا: مَیں زینب بنت جحش کے پاس گئی، جب ان کے بھائی (عبیداللہ بن جحش) فوت ہو گئے۔ انہوں نے خوشبو منگوا کر لگائی۔ اس کے بعد کہا: اللہ کی قسم! مجھے خوشبو کی حاجت نہیں ہے، مگر مَیں نے اللہ کے رسول ﷺ سے سنا، آپ منبر پر فرماتے تھے: اس عورت کو جو اللہ پر اور آخرت پر ایمان لائے تین دن سے زیادہ کسی مردے پر سوگ کرنا درست نہیں ہے مگر خاوند پر چار مہینے دس دن تک۔ زینب نے کہا: مَیں نے اپنی ماں ام سلمہ سے سنا، وہ فرماتی تھیں: ایک عورت اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آئی اور بولی: اللہ کے رسول ﷺ! میری بیٹی کا خاوند فوت ہو گیا اور اس کی آنکھیں دُکھتی ہیں، کیا اسے سرمہ لگا دیں؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔ دو بار فرمایا، ہر بار یہی فرمایا کہ نہیں (یعنی سرمہ لگانے کی اجازت نہ دی مگر دوسری حدیث میں اجازت ہے کہ رات کو لگا لے دن کو پونچھ ڈالے۔)

(ابو داؤد، الطلاق، احداد المتوفی عنها زوجها، ح:۲۲۹۹)

⑤ مالک بن سنان کی بیٹی فریعہ، جو ابوسعید خدری کی بہن ہے، اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آئی اور آپ سے پوچھنے لگی: کیا مَیں اپنے کنبے میں چلی جاؤں جو قبیلہ بنی خدرہ میں ہے، اس لیے کہ اس کا خاوند اپنے بھاگے ہوئے غلاموں کو ڈھونڈنے نکلا تھا، غلاموں نے اسی کو قدوم (جگہ) میں مار ڈالا۔ فریعہ نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ سے مَیں نے پوچھا کہ میرے خاوند نے تو میرے واسطے کوئی ذاتی مکان نہیں چھوڑا اور نہ نان ونفقہ ہے، یعنی جس مکان میں رہتی ہوں وہ دوسرے کا ہے۔ میرے خاوند کی ملک نہیں اور نہ روٹی کپڑا کچھ اس نے چھوڑا، تو اب میں عدت کیونکر اس مکان میں رہ کر پوری کروں؟ اس صورت میں اپنے کنبے کے لوگوں میں چلی جاؤں؟ فریعہ نے کہا: آپ نے فرمایا: ہاں اپنے کنبہ میں چلی جا۔ فریعہ نے کہا: پھر

مَیں وہاں سے نکل کر مسجد میں آئی یا حجرہ میں تو آپ نے مجھے بلایا اور فرمایا: تم نے کیا بیان کیا؟ مَیں نے پھر اپنے شوہر کے مارے جانے کا سارا قصہ بیان کیا اور نان ونفقہ نہ چھوڑنے کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا: اسی گھر میں رہ جب تک عدت پوری نہ ہو۔ فریعہ نے کہا: پھر مَیں نے اسی گھر میں چار مہینے دس دن پورے کیے۔ جب عثمان بن عفان کی خلافت ہوئی، انہوں نے میرے پاس آدمی بھیجا اور مجھ سے پوچھا۔ مَیں نے یہ سارا مسئلہ بیان کیا (جیسا آپ نے مجھے حکم کیا تھا۔) عثمان نے اس کی پیروی کی اور ویسا ہی حکم کیا۔

(ایضاً، فی المتوفی عنها تنقل، ح:۲۳۰۰)

⑥ ارشادِ نبوی ہے:

((الْمُتَوَفَّى عَنْهَا زَوْجُهَا لَا تَلْبَسُ الْمُعَصْفَرَ مِنَ الثِّيَابِ وَلَا الْمُمَشَّقَةَ وَلَا الْحُلِيَّ وَلَا تَخْتَضِبُ وَلَا تَكْتَحِلُ))(ایضاً، ح:۲۳۰۴)

''جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے وہ عورت کسم کے رنگ کا کپڑا، گیرو کا کپڑا اور زیور نہ پہنے، نہ ہاتھ پاؤں اور بالوں کو مہندی لگائے اور نہ سرمہ ہی لگائے۔''

مذکورہ بالا احادیث سے جہاں سوگ کی پابندیوں کا پتا چلتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ:

جو عورت سوگ میں ہو وہ بوقت ضرورت غیر محرم سے بھی بات کر سکتی ہے جیسا کہ حدیث ۵ میں فریعہ رضی اللہ عنہا کا عمل موجود ہے۔

واضح رہے کہ بوڑھی عورتوں کے لیے پردے کی پابندی ضروری نہیں۔

(دیکھیے ۲۴/النور:۶۰)

مذکورہ بالا احادیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس عورت کا خاوند فوت ہو گیا ہو اُس کے لیے انتہائی ضرورت کے وقت گھر سے باہر نکلنا بھی جائز ہے۔ گھر سے نہ نکلنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ عدت خاوند کے گھر میں گزارے۔ البتہ شادی بیاہ کی محافل میں ایسی عورتوں کو شریک نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ سوگ میں زیب وزینت کے تمام کام منع ہیں۔

جب سوگ کی حالت میں عورت کو غیر محرم سے ضرورت کے وقت بات کی اجازت ہے تو

تقریر وتلاوت تو بدرجہ اولیٰ سن سکتی ہے جو کہ اجر وثواب کے کام ہیں۔

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ زمانہ جاہلیت میں بیوگان سوگ کی حالت میں گندے کپڑے پہنتی تھیں جبکہ اسلام میں صرف زرق برق اور شوخ رنگ کے کپڑے پہننے کی ممانعت ہے۔ سادہ کپڑوں کے، خواہ نئے ہوں یا پرانے، پہننے کی حادہ (سوگ والی عورت) کے لیے کوئی ممانعت نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

میت پر تین دن سے زیادہ رونا؟

سوال کیا مُردے پر تیسرے دن کے بعد رونا جائز ہے؟

جواب اگر کوئی مسلمان فوت ہو جائے تو دیگر مسلمانوں (میت کے اعزہ واقارب وغیرہ) کے لیے حکم ہے کہ وہ صبر کریں۔ جزع فزع کرنا، گریبان پھاڑنا اور پیٹنا منع ہے۔ میت پر (سوگ کرنے کے لیے) تین دن سے زیادہ رونے سے نبی ﷺ نے منع کیا ہے۔ ہاں اگر بعد میں بھی بے اختیار رونا آ جائے تو یہ منع نہیں ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ آلِ جعفر کو یہ فرما کر چلے گئے کہ آپ تین دن بعد آئیں گے۔ تین دن بعد آ کر فرمایا:

((لَا تَبْكُوا عَلَى أَخِي بَعْدَ الْيَوْمِ))

(ابو داؤد، الترجل، فی حلق الرأس، ح:۴۱۹۲)

''آج کے بعد میرے بھائی کو نہ رونا۔''

آنکھوں سے آنسو جاری ہونا اور دل کا پریشان ہونا خلافِ شریعت نہیں بلکہ شفقت و رحمت اور نرم دلی کی دلیل ہے۔ چنانچہ انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

ہم اللہ کے رسول ﷺ کے ہمراہ ابوسیف لوہار کے، جو کہ ابراہیم کے رضاعی باپ تھے، پاس آئے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ابراہیم کو گود میں لے کر بوسہ دیا اور پیار کیا۔ بعد میں ہم دوبارہ گئے تو ابراہیم آخری سانس لے رہے تھے۔ یہ دیکھ کر اللہ کے رسول ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! آپ بھی روتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا:

((یَا ابْنَ عَوْفٍ اِنَّهَا رَحْمَةٌ))

''ابن عوف! یہ تو شفقت (الٰہی) ہے۔''

دوسری مرتبہ پوچھنے پر آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَعُ وَ الْقَلْبَ يَحْزَنُ وَ لَانَقُوْلُ اِلَّا مَا يَرْضٰى رَبُّنَا، وَ اِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ))

(بخاری، الجنائز، قول النبی ﷺ انا بك لمحزونون، ح:۱۳۰۳)

''آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں اور دل غمگین ہوتا ہے مگر ہم صرف وہ بات کہتے ہیں جس سے ہمارا رب راضی ہوتا ہے۔ ابراہیم! ہم تیری جدائی سے بہت غمگین ہیں۔''

انس رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ قبر کے پاس بیٹھی روتی ہوئی ایک عورت کے پاس سے گزرے۔ آپ نے اس سے فرمایا:

((اِتَّقِی اللّٰهَ وَاصْبِرِیْ))(بخاری، الجنائز، زیارۃ القبور، ح: ۱۲۸۳)

''اللہ سے ڈرو اور صبر کرو۔''

جنازہ آتے دیکھ کر کھڑا ہونا یا بیٹھے رہنا؟

سوال جنازہ آتے دیکھ کر کھڑا ہونا جائز ہے یا شریعت میں اس کی ممانعت پائی جاتی ہے؟

جواب بخاری و مسلم کی بہت سی احادیث ایسی ہیں جن میں جنازے کو دیکھ کر کھڑے ہونے کا بیان اور حکم ہے۔ نبی اکرم ﷺ جنازہ آتا دیکھ کر کھڑے ہو جاتے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی کھڑے ہونے کا حکم فرماتے۔ جنازے کے ساتھ جانے والوں کو بھی نبی اکرم ﷺ حکم فرماتے کہ جب تک جنازہ نیچے نہ رکھ دیا جائے تب تک نہ بیٹھیں۔

عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا رَاَيْتُمُ الْجَنَازَةَ فَقُوْمُوْا حَتّٰى تُخَلِّفَكُمْ))

(بخاری، الجنائز، القیام للجنازۃ، ح:۱۳۰۷)

''جب تم جنازہ دیکھو تو کھڑے ہو جاؤ اور کھڑے رہو یہاں تک کہ جنازہ تم سے آگے نکل جائے۔''

مذکورہ راوی سے ہی روایت ہے، نبی ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا رَاٰی اَحَدُکُمْ جَنَازَةً فَاِنْ لَّمْ یَکُنْ مَاشِیًا مَعَهَا فَلْیَقُمْ حَتّٰی یُخْلِفَهَا اَوْ تُخْلِفَهٗ اَوْ تُوْضَعَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُخْلِفَهٗ))

(ایضاً، متی یقعد اذا قام للجنازة، ح:۱۳۰۸)

''جب تم میں سے کوئی جنازہ دیکھے تو اگر اس کے ساتھ نہیں چل رہا ہے تو کھڑا ہی ہو جائے تا آنکہ جنازہ آگے نکل جائے یا آگے جانے کی بجائے خود جنازہ رکھ دیا جائے۔''

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، فرماتے ہیں:

ہمارے سامنے سے ایک جنازہ گزرا تو نبی ﷺ کھڑے ہو گئے اور ہم بھی کھڑے ہو گئے۔ پھر ہم نے عرض کیا: اللہ کے رسول! یہ تو یہودی کا جنازہ تھا! آپ نے فرمایا:

((اِذَا رَاَیْتُمُ الْجَنَازَةَ فَقُوْمُوْا)) (ایضاً، من قام لجنازة یهودی، ح:۱۳۱۱)

''جب تم جنازہ دیکھو تو کھڑے ہو جایا کرو۔''

ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا:

((اَلَیْسَتْ نَفْسًا)) (ایضاً، ح:۱۳۱۲)

''کیا یہودی کی جان نہیں ہے۔''

یعنی وہ بھی تو انسان ہے ایسی ہی صورتِ حال میں نبی ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ الْمَوْتَ فَزَعٌ فَاِذَا رَاَیْتُمُ الْجَنَازَةَ فَقُوْمُوْا))

(مسلم، الجنائز، القیام للجنازة، ح:۹۶۰)

''موت تو بہت ہی گھبراہٹ میں ڈالنے والی چیز ہے تو جب تم جنازہ دیکھو تو کھڑے ہو جایا کرو۔''

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بلا امتیازِ مذہب عبرت حاصل کرنے اور موت کو یاد

کرنے کے لیے جنازہ دیکھ کر کھڑے ہو جانا چاہیے۔ مذکورہ بالا احادیث کی روشنی میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دیگر ائمہ نے یہ موقف اختیار کیا کہ جنازہ دیکھ کر کھڑے ہو جانا چاہیے۔ اور جن احادیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جنازہ دیکھ کر بیٹھے رہنے کا ذکر ہے، ان احادیث کو انہوں نے جواز پر محمول کیا ہے۔ یعنی کھڑا ہونا ضروری تو نہیں البتہ مستحب (بہتر) ہے۔

امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک جنازہ دیکھ کر کھڑے ہونے کی احادیث درج ذیل احادیث سے منسوخ ہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

قام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم قعد

(ایضاً، نسخ القیام للجنازۃ، ح:۹۶۲)

''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم (جنازہ دیکھ کر) کھڑے ہوتے تھے۔ پھر بیٹھنے لگے۔''

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ہے فرماتے ہیں:

راینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قام فقمنا وقعد فقعدنا (ایضاً)

''ہم نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ (جنازہ دیکھ کر) کھڑے ہو جاتے تو ہم بھی کھڑے ہو جاتے اور جب آپ بیٹھے رہنے لگے تو ہم بھی بیٹھے رہنے لگے۔''

ایک اور حدیث میں ہے:

کان یقوم فی الجنائز ثم جلس بعد

(مؤطا امام مالک، الجنائز، الوقوف للجنازۃ، القیام للجنازۃ، ح:۵۴۹)

''آپ پہلے جنازے کی خاطر کھڑے ہوتے تھے بعد ازاں بیٹھے رہنے لگے۔''

مسند احمد کی ایک حدیث میں قدرے تفصیل بھی بیان ہوئی ہے:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرنا بالقیام فی الجنازۃ ثم جلس بعد ذلک وامرنا بالجلوس (۸۲/۱)

''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں جنازہ کی خاطر کھڑا ہونے کا حکم دیا تھا بعد میں

آپ بیٹھنے لگے اور ہمیں بھی بیٹھنے کا حکم دیا۔"

اس قسم کی احادیث کی روشنی میں مولانا صادق سیالکوٹی رحمۃ اللہ نے فرمایا تھا کہ اب جنازہ دیکھ کر اٹھنا سنت نہیں۔ (مسلمان کا سفر آخرت، ص:۲۰۶)

امام نووی رحمۃ اللہ کے نزدیک احادیث کو منسوخ قرار دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ دونوں قسم کی احادیث میں تطبیق ممکن ہے اور دونوں قسم کی روایات پر عمل ہوسکتا ہے یعنی جنازہ دیکھ کر کھڑا ہونا ضروری تو نہیں البتہ کھڑا ہونا بہتر ہے۔ فرماتے ہیں:

فیکون الامربه للندب والقعود للجواز ولا یصح دعوی النسخ فی مثل هذا انما یکون اذا تعذرالجمع بین الاحادیث ولم یتعذر والله اعلم (مسلم مع شرح النووی ۱/ ۳۱۰)

"امر (نبی ﷺ کو بیٹھے رہنے کا حکم) مندوب ہونے کے لیے ہے (نہ کہ وجوب کے لیے) اور آپ کا بیٹھے رہنا جواز بیان کرنے کے لیے ہے۔ اس طرح کی احادیث میں منسوخ ہونے کا دعویٰ کرنا صحیح نہیں۔ نسخ تو وہاں قرار دیا جائے گا جہاں احادیث میں تطبیق نہ ہوسکتی ہو اور یہاں احادیث میں تطبیق متعذر (محال اور ناممکن) نہیں، واللہ اعلم۔"

ایک ایک کفن اور قبر میں دو دو مردے؟

سوال بعض قبرستانوں میں اجتماعی قبریں دریافت ہوئی ہیں۔ کیا یہ شرعاً درست ہے کہ ایک قبر میں ایک سے زائد لاشوں کو دفن کیا جائے؟

جواب ایک قبر میں ایک مردہ ہی دفن کیا جانا چاہیے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ تھا۔ البتہ اگر میتیں کسی وجہ سے زیادہ ہوگئی ہوں اور زیادہ قبریں بنانے یا زیادہ کفنوں کا انتظام کرنا مشکل ہو تو ضرورتاً ایک ایک کفن دو دو مُردوں کو پہنایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ایک ایک قبر میں دو دو اور تین تین مردے بھی دفن کیے جاسکتے ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ نے اپنی صحیح بخاری (الجنائز) میں ایک باب یوں قائم کیا ہے:

باب دفن الرجلین والثلاثة فی قبر واحد (دو یا تین آدمیوں کو ایک قبر میں دفن

کرنے کا بیان)۔اس باب کے تحت امام موصوف نے نبی اکرم ﷺ کا شہدائے احد کے بارے میں عمل مبارک ذکر کیا ہے کہ آپ دو دو شہیدوں کو ایک ایک قبر میں دفن کرتے تھے، جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

اللہ کے رسول ﷺ اُحد کے دو دو شہید ایک ہی کپڑے میں لپیٹتے اور پوچھتے:

((اَيُّهُمْ اَكْثَرُ اَخْذًا لِلْقُرْاٰنِ؟)) فاذا اشير له الى احدهما قدمه فى اللحد وقال:((اَنَا شَهِيْدٌ عَلٰى هٰؤُلَاءِ)) وامر بدفنهم بدمائهم ولم يصل عليهم ولم يغسلهم

(بخاری ، الجنائز ، من يقدم فی اللحد ، ح:۱۳۴۷)

''ان میں قرآن کس نے زیادہ یاد کیا ہے؟ پھر جب کسی ایک کی طرف اشارہ کر دیا جاتا تو لحد میں اسی کو آگے بڑھاتے اور فرماتے جاتے کہ میں ان پر گواہ ہوں۔آپ نے خون سمیت انہیں دفن کرنے کا حکم دیا، نہ ان کی نمازِ جنازہ پڑھی اور نہ انہیں غسل دیا۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بوقت ضرورت ایک کفن دو آدمیوں کو دیا جا سکتا ہے اور اسی طرح ایک قبر میں دو میتوں کو بھی دفن کیا جا سکتا ہے۔نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جسے قرآن زیادہ یاد ہوتا اس کی نبی ﷺ کے نزدیک بڑی تکریم ہوتی حتیٰ کہ اس کے فوت ہونے کے بعد بھی آپ ﷺ اسے قبر میں آگے یعنی قبلہ کی جانب رکھتے تھے۔

یہ حدیث اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ نبی ﷺ عالم الغیب نہ تھے تبھی تو آپ ﷺ لوگوں سے دریافت فرماتے:((اَيُّهُمْ اَكْثَرُ اَخْذًا لِلْقُرْاٰنِ؟))

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ میدانِ جنگ میں شہید ہونے والوں کو غسل نہیں دیا جاتا۔البتہ شہداء کی نمازِ جنازہ پڑھنا جائز ہے جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے۔احد کے شہداء پر بھی آپ ﷺ نے ایک وقت گزرنے کے بعد نمازِ جنازہ پڑھی تھی۔

ایک منٹ کی خاموشی

سوال ''ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔'' ''دو منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔''

یہ اور اس طرح کے جملے بعض دفعہ اخبارات و رسائل میں پڑھنے کو ملتے ہیں کہ کسی المیہ یا رنج و غم کی وجہ سے لوگ مذکورہ طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا شرعاً درست ہے؟ یہ بھی بتائیں کہ شریعت میں خاموشی کا موقع و محل کیا ہے؟

جواب غم اور سوگ کے اظہار کا مذکورہ طریقہ شریعت مطہرہ سے ثابت نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی نے خاموش رہنے کی نذر بھی مان لی ہو تو اس کا پورا کرنا بھی جائز نہیں۔ حالانکہ عام حالات میں نذر کا پورا کرنا ضروری ہوتا ہے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک آدمی کھڑا ہے۔ آپ نے اس کے متعلق پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ یہ ابو اسرائیل ہے، اس نے نذر مانی ہے کہ وہ کھڑا ہی رہے گا۔ نہ بیٹھے گا، نہ سائے میں جائے گا، نہ بات ہی کرے گا اور یہ کہ وہ روزہ رکھے گا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اسے کہیں کہ بات کرے، سائے میں چلا جائے، بیٹھ جائے، ہاں روزہ پورا کرلے۔''(بخاری، الایمان و النذور، النذر فیما لا یملك ...... ح: ٦٧٠٤)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس دو شخص آئے، ایک نے تو سلام کیا جبکہ دوسرے نے نہ کیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: اس کی کیا وجہ ہے؟ لوگوں نے کہا: اس نے قسم کھائی ہے کہ آج یہ کسی سے بات نہ کرے گا۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

کلم الناس وسلم علیهم

''لوگوں سے سلام و کلام کرو۔''

ایسا کرنا تو ایک عورت (مریم علیہا السلام) کے لیے ہی تھا۔

(تفسیر ابن کثیر، تفسیر آیت انی نذرت للرحمن صوما فلن اکلم الیوم انسیا۔ سورۃ مریم، ٢٦٩/٤؛ تفسیر طبری ٤٦/٧، اس کی سند میں ابو اسحاق سبیعی (مدلس) راوی نے عنعن سے بیان کیا ہے۔ محمد ارشد کمال)

معلوم ہوا کہ چپ کا روزہ یا مکمل خاموشی اختیار کرنے کا ضابطہ مقرر کرنا ہماری شریعت میں جائز نہیں۔

جہاں تک تعلق ہے عمومی حالات میں خاموشی اختیار کرنا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی

باتوں سے خاموشی اختیار کی جائے جو حرام، بے کار اور بے فائدہ ہیں۔ یہی زبان کی حفاظت ہے ورنہ زبان تو اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ ایمان واسلام، تلاوت وذکر، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، درس وتدریس، اہل وعیال اور دوست واحباب سے خوش کلامی سب امور اس کے ذریعے سرانجام پاتے ہیں، جس طرح بعض مواقع پر بولنا جائز نہیں مثلاً خطبہ جمعہ خاموشی سے سننا چاہیے۔ اسی طرح بعض اوقات خاموش رہنا بھی جائز نہیں ہوتا مثلاً گواہی کے وقت۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۗ﴾ (۲/البقرۃ:۲۸۳)

''اور گواہی نہ چھپاؤ، جو اسے چھپائے گا تو اس کا دل گنہگار ہوگا۔''

لہٰذا بے مقصد باتوں سے خاموشی اختیار کرنی چاہیے جبکہ با مقصد گفتگو سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں:

((مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَالَا يَعْنِيهِ))

(ترمذی، الزھد، ح:۲۳۱۷؛ ابن ماجۃ، ح:۳۹۷۶)

''آدمی کے اسلام کی خوبی میں سے ہے کہ وہ اس چیز کو چھوڑ دے جو اس کے مقصد کی نہیں۔''

ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْلِيَصْمُتْ))

(بخاری، الادب، من کان یؤمن باللہ...... ح:۶۰۱۸)

''جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتا ہو وہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے۔''

وفات پر رشتہ داروں کا طرزِ عمل؟

سوال کسی کی وفات پر اس کے رشتہ داروں کو کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے؟

جواب میت کے رشتہ دار تقدیر پر صبر ورضا کا مظاہرہ کریں کہ صبر کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ بڑی نوازشات کرتا ہے اور ان پر اپنی رحمتیں نازل کرتا ہے، اللہ کے رسول ﷺ ایک عورت کے پاس سے گزرے، وہ قبر پر بیٹھی رو رہی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِتَّقِی اللّٰهَ وَاصْبِرِیْ))

''اللہ سے ڈرو اور صبر کرو۔'' (بخاری ، الجنائز ، زیارۃ القبور ، ح:۱۲۸۳)

اولاد کی وفات پر صبر کرنا تو بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَیُّمَا امْرَأَۃٍ مَاتَ لَهَا ثَلَاثَۃٌ مِنَ الْوَلَدِ کَانُوْا لَهَا حِجَابًا مِّنَ النَّارِ))

قالت امرأۃ: واثنان؟ قال: ((وَاثْنَانِ))

(بخاری ، الجنائز ، فضل من مات له ولد فاحتسب ، ح:۱۲۴۹)

''جس عورت کے تین بچے فوت ہوئے وہ اس کے لیے آگ سے رکاوٹ بن جائیں گے۔ ایک عورت نے پوچھا: دو کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا: دو بھی (دو کا بھی یہی حکم ہے۔)''

نیز انا للہ وانا الیہ راجعون (ہم بھی اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں) پڑھیں اور یہ دعا مانگیں جو حدیث میں آتی ہے:

((اَللّٰهُمَّ اَجُرْنِیْ فِیْ مُصِیْبَتِیْ وَاخْلُفْ لِیْ خَیْرًا مِّنْهَا))

(مسلم ، الجنائز ، مایقال عند المصیبۃ ، ح:۹۱۸)

''اللہ! مجھے میری تکلیف پر اجر عطا کر اور مجھے اس کا نعم البدل عنایت کر دے۔''

عورت اپنے بچے یا کسی رشتہ دار کی وفات پر تین دن تک سوگ منا سکتی ہے۔ البتہ شوہر کی وفات پر چار ماہ دس دن سوگ منائے۔ ارشادِ نبوی ہے:

((لَا یَحِلُّ لِامْرَأَۃٍ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ تَحِدَّ عَلٰی مَیِّتٍ فَوْقَ ثَلَاثٍ اِلَّا عَلٰی زَوْجٍ اَرْبَعَۃَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا))

(بخاری ، الجنائز ، احداد المرأۃ علی غیر زوجها ، ح:۱۲۸۰)

''جو عورت اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہو وہ کسی مرنے والے کا تین دن سے زیادہ سوگ نہ کرے۔ البتہ اپنے خاوند کا چار ماہ دس دن تک سوگ کرے۔''

رمضان المبارک
اور
روزہ

سب سے افضل مہینہ کون سا ہے؟

سوال سب سے افضل مہینہ کون سا ہے؟ بعض لوگ رمضان المبارک کی بجائے کسی اور مہینے کو افضل کہتے ہیں۔ کیا اس طرح کی کوئی بات قرآن وحدیث سے ثابت ہے؟

جواب کتاب وسنت کے واضح دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام مہینوں سے افضل مہینہ رمضان المبارک ہے۔ بعض کج فہم عقلی گھوڑے دوڑاتے ہوئے قرآن وحدیث کے واضح دلائل کے خلاف موقف رکھتے ہیں، حالانکہ رمضان المبارک کی فضیلت اظہر من الشمس ہے۔ یہ صرف رمضان المبارک ہی ہے جس کے بارے میں نبی ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا دَخَلَ شَهْرُ رَمَضَانُ فُتِحَتْ اَبْوَابُ السَّمَاءِ وَ غُلِّقَتْ اَبْوَابُ جَهَنَّمَ وَ سُلْسِلَتِ الشَّيَاطِيْنُ))

(بخاري، الصوم، هل يقال رمضان او شهر رمضان...... ، ح:١٨٩٩)

”جب ماہِ رمضان آتا ہے تو آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، (ایک حدیث میں رحمت کے در کھلنے کا ذکر ہے۔) جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور (سرکش) شیاطین باندھ دیے جاتے ہیں۔“

یہ رمضان المبارک ہی ہے جس میں اعمال کا اجر وثواب دیگر مہینوں سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ رمضان المبارک میں عمرہ کرنے کا ثواب حج کے برابر ہو جاتا ہے۔ نبی ﷺ نے ام سنان (انصاریہ) رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

((فَاِنَّ عُمْرَةً فِيْهِ تَعْدِلُ حَجَّةً))

(بخاري، العمرة، عمرة في رمضان، ح:١٧٨٢؛ مسلم، الحج، فضل العمرة في رمضان، ح: ١٢٥٦، و اللفظ له)

”اس ماہ (رمضان المبارک) کا عمرہ حج کے برابر ہے۔“

نوٹ: یہ واضح رہے کہ ایسا کرنے سے حج کی فرضیت ساقط نہیں ہوتی۔ صاحبِ استطاعت پر حج کرنا فرض ہے اگرچہ اس نے رمضان المبارک میں عمرہ ادا کر لیا ہو۔

یہ شرف صرف رمضان المبارک کو ہی حاصل ہے کہ اس میں ایک ایسی رات ہے کہ جسے

قرآن میں ﴿ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ﴾ (الدخان) یعنی مبارک رات کہا گیا ہے۔ اسی رات کو قرآن کریم میں ﴿ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ﴾ (القدر) یعنی شبِ قدر بھی کہا گیا ہے۔ اسی رات کی فضیلت میں اللہ تعالیٰ نے ایک مکمل سورت (سورۃ القدر) نازل کی۔ جس میں فرمایا:

﴿ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ﴾ (۹۷/القدر:۳)

''شبِ قدر ہزار مہینوں سے افضل ہے۔''

غور کریں کہ کسی مہینے کا رمضان المبارک کے ساتھ تقابل کرنا ہی غلط ہے کیونکہ رمضان المبارک کی تو صرف ایک رات (لیلۃ القدر) ہی باقی سیکڑوں مہینوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ رمضان المبارک کے عظمتوں والے باقی انتیس شب و روز اس کے علاوہ ہیں۔

ماہِ رمضان میں شیطانی اعمال کیوں ہوتے ہیں؟

سوال ہم نے سنا ہے کہ رمضان المبارک میں شیطان قید کر دیے جاتے ہیں، اگر ایسا ہی ہے تو پھر اس میں جو شیطانی کام قتل و غارت، چوری، ڈاکہ زنی، دغا بازی، قمار بازی اور حرام خوری وغیرہ کیونکر ظہور پذیر ہوتے ہیں؟

جواب آپ نے صحیح سنا ہے کہ رمضان المبارک میں شیاطین قید کر دیے جاتے ہیں۔ کئی احادیث میں ((صُفِّدَتِ الشَّيَاطِيْنُ)) (مسلم، ح:۱۰۷۹)، ((تُصَفَّدُ فِيْهِ الشَّيَاطِيْنُ)) (مسند احمد ۵/۴۱۱) اور ((سُلْسِلَتِ الشَّيَاطِيْنُ)) (بخاری، ح:۱۸۹۹) جیسے الفاظ آئے ہیں۔

بعض احادیث میں ((مَرَدَةُ الشَّيَاطِيْنُ)) (سرکش شیاطین) کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ (نسائی، ح:۲۱۰۴) اور سرکش شیاطین کو زنجیروں میں جکڑنے کا ہی نتیجہ ہوتا ہے کہ اس ماہِ مبارک میں گناہوں میں مجموعی طور پر کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اعمالِ صالحہ اکثر اور عام دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس کا ایک منہ بولتا ثبوت مساجد میں نمازیوں کا ہجوم بھی ہے، وہ لوگ جنہوں نے کبھی مسجد کا منہ نہیں دیکھا ہوتا وہ بھی رمضان المبارک میں پیش پیش ہوتے ہیں۔

جو لوگ رمضان المبارک کی قدر کرتے ہیں اور روزوں کے آداب و شرائط کا لحاظ رکھتے ہیں وہ یقیناً شیاطین سے کافی حد تک محفوظ رہتے ہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ نافرمانی صرف شیطان کے اکسانے یا بہکانے پر ہی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو

ہر شیطان کے لیے ایک شیطان ہوتا اور پھر اس طرح یہ سلسلہ چل نکلتا اور یہ بھی معلوم ہے کہ ابلیس سے پہلے کوئی شیطان نہیں تھا تو اس نے جو معصیت کی تھی اس کا سبب اس کا نفس ہی تھا۔ (حاشیہ مسلم از ابوالحسن سندھی، الصیام)

شیاطین کے علاوہ شر اور نافرمانی کے دیگر بھی کئی اسباب ہیں جیسے:

النفوس الخبيثة والعادات القبيحة والشياطين الإنسية

''ناپاک نفس، بری عادات اور انسانی شیطان۔'' (فتح الباری ۸/۲۴۹، مکتبہ قاہرہ)

قرآن حکیم میں ہے:

﴿ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ ﴾ (۱۲/ یوسف:۵۳)

''بے شک نفس برائی پر اُکسانے والا ہے۔''

خطبہ مسنونہ میں ہے:

((وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا))

(ابن ماجة، النكاح، خطبة النكاح، ح:۱۸۹۳)

''ہم اپنے نفس کی شرارتوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔''

بعض لوگ برائیوں میں اس قدر آگے نکل جاتے ہیں کہ نافرمانیاں کرتے کرتے خود شیطان صفت بن جاتے ہیں۔ سورۃ الناس میں اس کا تذکرہ ملتا ہے کہ شیطان انسانوں سے بھی ہوتے ہیں۔ ﴿ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ﴾

یہ شیطان صفت لوگ ہی ہوتے ہیں جن کے دلوں پر تالے اور مہریں لگ چکی ہوتی ہیں اور ان کی بدعملی کی بنا پر ان کے دل زنگ آلود ہو چکے ہوتے ہیں۔

نمازِ تراویح چار چار رکعت کر کے پڑھنا؟

سوال ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث نبوی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعات پڑھتے تھے، پہلے چار پڑھتے، پھر چار پڑھتے پھر تین (وتر) پڑھتے تھے، اس حدیث سے دلیل لیتے ہوئے 'نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ نماز' نامی کتاب کے مؤلف نے لکھا ہے: ''اس حدیث میں ایک سلام سے چار رکعتیں پڑھنے کا ذکر ہے۔'' تو کیا

تراویح وتہجد چار چار رکعتیں ایک ایک سلام سے پڑھی جاسکتی ہیں؟

جواب رات کی نماز کے مختلف نام ہیں۔اس کے لیے صلوۃ اللیل ، تہجد، قیام اللیل ، قیام رمضام، تراویح وغیرہ مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں، مراد ایک ہی نماز ہے۔ قولی اور فعلی احادیث سے صلوٰۃ اللیل کا دو دو رکعت ادا کرنا ثابت ہوتا ہے۔

ارشاد نبوی ہے:

((صَلٰوۃُ اللَّیْلِ مَثْنٰی مَثْنٰی))

(بخاری، الوتر، ماجاء فی الوتر، ح:۹۹۰؛ مسلم، صلٰوۃ المسافرین، صلوۃ اللیل مثنی مثنی...... ح:۷۴۹)

''رات کی نماز دو دو رکعت ہے۔''

ایک سلام سے چار رکعتیں ادا کرنے کا کسی بھی حدیث میں تذکرہ نہیں بلکہ سوال میں جس حدیث سے ایک سلام سے چار چار رکعتیں پڑھنے پر استدلال کیا گیا ہے اسی حدیث کے دیگر الفاظ سے ایک سلام سے دو رکعت پڑھنا ثابت ہوتا ہے مثلاً فی رمضان ولا فی غیرہ والی روایت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ان الفاظ سے بھی مروی ہے:

کان رسول اللہ ﷺ یصلی فیما بین ان یفرغ من صلوۃ العشاء وھی التی یدعو الناس العتمۃ الی الفجر احدی عشر رکعۃ یسلم بین کل رکعتین ویوتر بواحدۃ

(مسلم، صلوۃ المسافرین وقصرھا، صلٰوۃ اللیل وعدد رکعات النبی ﷺ فی اللیل و ان الوتر رکعۃ وان الرکعۃ صلوۃ صحیحۃ، ح:۷۳۶)

''رسول اللہ ﷺ عشاء کی نماز سے، جسے لوگ عتمہ بھی کہتے ہیں، فارغ ہونے کے بعد صبح تک گیارہ رکعات پڑھتے تھے اور ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے اور ایک وتر پڑھتے تھے۔''

یسلم بین کل رکعتین سے رات کی نماز کا دو دو رکعت کرکے پڑھنا سنت رسول ﷺ سے ثابت ہوتا ہے۔

نماز تراویح میں بھول کر تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہونے والا کیا کرے؟

سوال نماز تراویح پڑھنے والا اگر بھول کر تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہوجائے تو کیا وہ تین رکعتوں کے بعد سجدۂ سہو کرے یا چار رکعتیں مکمل کرنے کے بعد سجدۂ سہو کرے؟

جواب نماز تراویح چونکہ دو دو رکعت کرکے پڑھی جاتی ہے جیسا کہ حدیث ((صَلٰوةُ اللَّيْلِ مَثْنٰى مَثْنٰى)) (بخاری، ح:۹۹۰، ۹۹۳؛ مسلم، ح:۷۴۹) سے معلوم ہوتا ہے، لہٰذا تراویح میں بھول کر تیسری رکعت کے لیے اٹھنے والا نمازی یاد آنے پر بیٹھ جائے اور آخر میں سہو کے دو سجدے کرلے۔ ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں علامہ عبدالرحمٰن ناصر سعدی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جب وہ بھول کر تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہوجائے تو اس کے لیے واپس پلٹنا لازم ہوگا اور اس پر سہو کے سجدے واجب ہوں گے، وہ چار رکعات پوری نہیں کرے گا کیونکہ رات کو نوافل ادا کرنے والا جب تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہوجائے تو اسے (تشہد کی طرف) پلٹنا ہوتا ہے تاہم دن کو نفلی نماز پڑھنے والے کو اختیار ہوتا ہے۔

(الفتاوی السعدیۃ، ص:۱۵۰، مکتبۃ المعارف، الریاض)

اختیار سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ چاہے تو چار رکعتیں پوری کر کے سہو کے سجدے کرلے۔

(واللہ اعلم)

نماز تراویح میں بچوں کو امام بنانا؟

سوال ہر سال رمضان مبارک کی آمد پر بچوں کے نماز تراویح میں امام بننے پر بسا اوقات بحث وتکرار شروع ہوجاتی ہے۔ آپ راہنمائی کریں کہ کیا تراویح میں بچوں کو امام بنایا جاسکتا ہے؟

جواب ابومسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((يَؤُمُّ الْقَوْمَ اَقْرَؤُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ فَإِنْ كَانُوْا فِي الْقِرَاءَةِ سَوَاءً فَاَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ فَإِنْ كَانُوْا فِي السُّنَّةِ سَوَاءً فَاَقْدَمُهُمْ هِجْرَةً فَإِنْ كَانُوْا فِي الْهِجْرَةِ سَوَاءً فَاَقْدَمُهُمْ سِلْمًا وَلَا يَؤُمَّنَّ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فِيْ سُلْطَانِهِ وَلَا يَقْعُدْ فِيْ بَيْتِهِ عَلٰى تَكْرِمَتِهِ إِلَّا بِإِذْنِهِ))

(مسلم، المساجد، من احق بالامامة، ح:۶۷۳)

''لوگوں کا امام وہ ہونا چاہیے جواُن میں قرآن کا بڑا قاری (عالم) ہو اور اگر قراءت میں سب برابر ہوں تو پھر وہ امامت کروائے جو سنت کو سب سے زیادہ جانتا ہو، پھر اگر سنت کے علم میں بھی سب برابر ہوں تو پھر امامت وہ کروائے جس نے سب سے پہلے (مدینہ کی طرف) ہجرت کی۔ اگر ہجرت میں بھی برابر ہوں تو پھر امامت وہ کروائے جو سب سے پہلے مسلمان ہوا، اور (بلا اجازت) کوئی شخص کسی کی جگہ امامت نہ کرائے اور نہ کسی کے گھر میں صاحبِ خانہ کی مسند پر اس کی اجازت کے بغیر بیٹھے۔''

ایک حدیث میں ''جو سب سے پہلے مسلمان ہوا'' کی جگہ پر ''جو عمر میں سب سے بڑا ہو'' کا تذکرہ ملتا ہے۔(ایضاً)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جو قرآن کا بڑا عالم و قاری ہوتا اُسے امام بنایا جاتا تھا۔ عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اپنے قبیلے میں سب سے زیادہ قرآن مجھے یاد تھا۔ پس مجھے امام بنایا گیا حالانکہ میری عمر سات سال تھی۔(بخاری، المغازی، ح:۴۳۰۲)

ایک روایت میں عمرو بن سلمہ جرمی رضی اللہ عنہ قرآن زیادہ یاد ہونے کا سبب بھی بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں: ہمارے پاس سے قافلے گزرتے تھے تو ہم ان سے قرآن سیکھتے تھے۔ میرے والد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جسے قرآن زیادہ یاد ہو وہ امامت کروائے۔ میرے والد آ کر کہنے لگے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

جسے قرآن زیادہ یاد ہو وہ امام بنے، لوگوں نے دیکھا تو مجھے سب سے زیادہ قرآن یاد تھا پس مَیں ان کی امامت کرواتا تھا جبکہ میری عمر آٹھ سال تھی۔

(نسائی، الامامة، امامة الغلام قبل ان یحتلم، ح:۷۸۹)

معلوم ہوا کہ نابالغ کی امامت فرض اور نفلی ہر دو نمازوں میں صحیح ہے۔ حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک بھی نفل نماز میں نابالغ لڑکا امام بن سکتا ہے۔

دُوربین سے چاند دیکھ کر روزہ رکھنا؟

سوال: کیا ٹیلی سکوپ کے ذریعے ۲۹ رمضان المبارک کا چاند دیکھ کر صبح کو روزہ رکھنا یا عید الفطر کرنا جائز ہے؟

جواب: دُوربین سے چاند نظر آنے کا اعتبار کیا جائے گا۔ دُوربین موجود چیز دکھاتی ہے غیر موجود کو موجود نہیں کر سکتی۔ (از افادات مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ)

سقوطِ حمل اور روزہ

سوال: اگر رمضان المبارک میں کسی عورت کا تین چار ماہ کا حمل ساقط ہو جائے تو کیا اس عورت کو روزہ رکھنا جائز ہے؟

جواب: مذکورہ عورت کو جب تک نفاس کا خون جاری رہے وہ (حائضہ کی طرح) روزہ نہ رکھے، جو روزے رہ جائیں وہ بعد میں رکھ لے۔

حالتِ صوم میں منجن کا استعمال؟

سوال: کیا روزے میں ایسا منجن استعمال کرنا جائز ہے جس میں نمک اور سیاہ مرچ ہو؟

جواب: ایسا منجن استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں، اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ روزے کی حالت میں جیسے کڑوی مسواک کرنا جائز ہے ایسے ہی منجن بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

سفر میں روزہ

سوال: عصر حاضر میں جدید ترین ذرائع مواصلات کی وجہ سے سفر میں اتنی آسانیاں ہوگئی ہیں کہ روزہ رکھنا مشکل نہیں رہا، اندریں حالات سفر میں روزہ رکھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب: مسافر روزہ رکھ سکتا ہے اور چھوڑ بھی سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ (۲/البقرۃ:۱۸۵)

''لیکن جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ اور دنوں میں گنتی کو پورا کر لے۔''

صحابہ اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ جب برسرِ سفر ہوتے تھے تو کچھ روزے سے ہوتے تھے اور کچھ بغیر روزے کے، مگر روزہ دار غیر روزہ دار پر، یا غیر روزہ دار روزہ دار پر حرف گیری نہیں کرتا تھا۔ (بخاری، الصوم، لم یعب اصحاب النبی ﷺ بعضھم بعضا.....ح:۱۹۴۷)

اللہ کے رسول ﷺ بھی سفر میں روزہ رکھ لیا کرتے تھے، ابودرداء رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم نے اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ سخت گرمی کے دنوں میں سفر کیا، اس سفر میں اللہ کے رسول ﷺ اور عبداللہ بن رواحہ کے علاوہ کوئی بھی روزے سے نہیں تھا۔

(بخاری، الصوم، ح:۱۹۴۵)

مسافر کے بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ اسے روزہ رکھنے اور چھوڑنے کا اختیار ہے تاہم روزہ رکھنے میں مشقت محسوس نہ ہو تو پھر روزہ رکھ لینا بہتر ہے؛ اس میں تین فائدے ہیں:

① اللہ کے رسول ﷺ کی اقتداء ہو جائے گی کہ آپ سفر میں روزہ رکھ لیتے تھے۔

② اس میں انسان کے لیے زیادہ سہولت ہے؛ کیونکہ رمضان میں تو کام معمول کے مطابق چل رہا ہے، بعد میں روزہ رکھنا مشکل ہو جائے گا۔

③ اس سے لگے ہاتھوں ذمہ داری پوری ہو جاتی ہے۔

البتہ سفر میں اگر مشقت کا سامنا ہو تو پھر روزہ نہیں رکھنا چاہیے، ایسی حالت میں دوران سفر روزہ رکھنا کوئی نیکی کا کام نہیں ہے؛ اللہ کے رسول ﷺ نے دیکھا کہ ایک آدمی کے گرد ہجوم لگا ہوا ہے اور لوگ اس پر سایہ کئے ہوئے ہیں، آپ نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا: کوئی روزہ دار ہے۔ آپ نے فرمایا:

''سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی نہیں ہے۔''

(بخاری، الصوم، قول النبی ﷺ لمن ظلل علیہ.....ح: ۱۹۴۶)

اس واقعہ سے عمومی حکم یہ نکلے گا کہ جس آدمی کی بھی حالت اس آدمی کی طرح ہوگی اس کے لیے روزے میں مشقت ہوگی۔

اسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ سفر چونکہ اس دور میں بہت آسان ہو گیا ہے اور غالباً روزہ رکھنا

مشکل نہیں رہا ہے، اس لیے بہتر یہ ہے کہ سفر میں روزہ رکھ لیا جائے۔

(فضیلة الشیخ محمد بن صالح عثیمین رحمه الله)

تاہم کسی بھی قسم کے سفر میں روزہ مؤخر کرنے والا شخص گناہ گار نہیں ہوگا۔

روزے کی حالت میں مسواک اور خوشبو وغیرہ کا استعمال

سوال روزے دار کے لیے مسواک اور خوشبو استعمال کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب مسواک اور خوشبو کا استعمال سنت ہے، اس میں روزہ دار، غیر روزہ دار اور صبح وشام کا کوئی فرق نہیں؛ کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ کا یہ فرمانِ گرامی عمومیت کا حامل ہے:

((اَلسِّوَاكُ مَطْهَرَةٌ لِّلْفَمِ مَرْضَاةٌ لِّلرَّبِّ))

(نسائی، الطهارة، الترغيب فى السواك، ح:٥)

''مسواک منہ کو پاک کرنے اور رب کو راضی کرنے کا ذریعہ ہے۔''

اور فرمان گرامی ہے:

((لَوْلَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰى اُمَّتِيْ لَاَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ مَعَ كُلِّ صَلَاةٍ))

(بخاری، الجمعة، السواك يوم الجمعة، ح:٨٨٧)

''اگر میں اپنی امت کے لیے مشقت نہ سمجھتا تو انہیں ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنے کا حکم دیتا۔''

خوشبو کا استعمال صبح وشام کسی بھی وقت جائز ہے خواہ وہ تیل کی قسم سے ہو یا بخورات وغیرہ کی قسم سے، البتہ بخورات کی دھونی کی جان بوجھ کر Inhalation نہیں کرنی چاہیے؛ کیونکہ اس کے دھوئیں میں کچھ ایسے محسوس اور نظر آنے والے اجزاء ہوتے ہیں جو زور لگا کر سونگھنے سے ناک کے ذریعے معدے میں جا سکتے ہیں، نبی ﷺ نے اسی لیے لقیط بن صبرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

((بَالِغْ فِي الْاِسْتِنْشَاقِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ صَائِمًا))

(ابوداؤد، الطهارة، فى الاستنثار، ح:١٤٢)

''روزے کی حالت میں (وضو وغیرہ کے لیے) ناک میں پانی چڑھاتے وقت

مبالغہ سے کام نہ لیں۔" (فضیلۃ الشیخ محمدبن صالح عثیمین رحمہ اللہ)

روزہ کی حالت میں ٹوتھ پیسٹ کا استعمال؟

سوال روزے کی حالت میں ٹوتھ پیسٹ استعمال کرنا کیسا ہے؟

جواب کوئی حرج نہیں، صرف یہ احتیاط رہے کہ پیسٹ حلق سے نیچے نہ چلی جائے۔ روزہ دار کے لیے مسواک کا استعمال جائز ہے اور اس میں صبح یا شام کے وقت کی کوئی شرط نہیں ہے۔ البتہ کچھ اہل علم کہتے ہیں کہ زوال کے بعد مسواک کرنا مکروہ ہے، لیکن یہ قول درست نہیں، صحیح قول یہی ہے کہ یہ عمل مکروہ نہیں، کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:

((اَلسِّوَاكُ مَطْهَرَةٌ لِّلْفَمِ مَرْضَاةٌ لِّلرَّبِّ))

(نسائی، الطھارۃ، الترغیب فی السواك، ح:۵)

"مسواک منہ کو پاک صاف اور پروردگار کو خوش کرنے کا ذریعہ ہے۔"

اس فرمانِ گرامی میں عمومیت پائی جاتی ہے، وقت کی کوئی تخصیص نہیں ہے کہ یہ کام فلاں وقت کرنا چاہیے اور فلاں وقت نہیں کرنا چاہیے۔

آپ ﷺ کا ایک اور فرمان ہے:

((لَوْلَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰى اُمَّتِيْ لَاَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ))

(بخاری، الجمعۃ، السواك یوم الجمعۃ، ح:۸۸۷؛ مسلم، ح:۲۵۲)

"میں اگر اپنی امت کے لیے مشقت محسوس نہ کرتا تو انہیں ہر نماز کے وقت وضو کرنے کا حکم دیتا۔"

كُلِّ صَلَاةٍ (ہر نماز) کے الفاظ میں ظہر اور عصر بھی آجاتی ہیں اور یہ دونوں زوال کے بعد ہیں، حتیٰ کہ مغرب کی نماز کے لیے بھی بسا اوقات پہلے وضو کر لیا جاتا ہے۔

کلی کرتے ہوئے پانی حلق سے نیچے اتر جائے تو؟

سوال کلی کرتے وقت یا ناک میں پانی چڑھاتے وقت اگر پانی حلق سے نیچے اتر جائے تو کیا اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا؟

جواب روزہ دار جب کلی کرے یا ناک میں پانی چڑھائے اور پانی حلق سے نیچے

اتر جائے تو روزہ نہیں ٹوٹے گا؛ کیونکہ اس نے ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَآ أَخْطَأْتُم بِهِۦ وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ ﴾

(۳۳/الاحزاب:۵)

''تم سے بھول چوک میں جو کچھ ہو جائے اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے البتہ گناہ وہ ہے جس کا تم ارادہ دل سے کرو۔''

(فضیلة الشیخ محمدبن صالح عثیمین رحمه الله)

البتہ روزہ دار کو تلقین نبوی ہے کہ وہ اس سلسلے میں احتیاط سے کام لے۔

روزہ افطار کرتے وقت کی خاص دعا؟

سوال کیا روزہ افطار کرتے وقت کی کوئی خاص دعا منقول ہے؟ اور اس دوران جبکہ اذان ہو رہی ہوتی ہے روزہ دار اذان کا جواب دے یا کھاتا پیتا رہے؟

جواب افطاری کا وقت ان اوقات میں سے ہے جن میں دعا قبول ہوتی ہے؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ افطار کا وقت ایک تو عبادت (روزہ) کا آخری وقت ہوتا ہے اور اس وقت انسان کمزوری سے دو چار ہو چکا ہوتا ہے، اور قاعدہ یہ ہے کہ انسان جب اپنے آپ کو بہت زیادہ کمزور محسوس کرے اس کا دل اس وقت زیادہ نرم ہوتا ہے اور یہ حالت اللہ کی طرف رجوع کے لیے زیادہ موزوں ہوتی ہے، بنابریں دعا کی قبولیت کا گمان بھی زیادہ قوی ہوتا ہے، اور منقول دعا یہ ہے:

((اَللّٰهُمَّ لَكَ صُمْتُ وَعَلٰى رِزْقِكَ اَفْطَرْتُ))

(ابوداوٗد، الصیام، القول عند الافطار، ح:۲۳۵۸، سنداً یہ روایت ضعیف ہے۔)

''اللہ! میں نے تیرے لیے روزہ رکھا اور تیرے رزق کے ساتھ افطار کیا۔''

اور نبی ﷺ سے روزہ افطار کرتے وقت یہ دعا پڑھنا بھی منقول ہے:

((ذَهَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ))

(ایضاً، ح:۲۳۵۷)

''پیاس بجھ گئی، رگیں تر ہو گئیں اور اجر، ان شاء اللہ، ثابت ہو گیا۔''

ان دونوں حدیثوں میں اگرچہ کچھ ضعف پایا جاتا ہے لیکن کچھ اہل علم نے انہیں حسن کا درجہ دیا ہے۔

(نوٹ: اول الذکر دعا کی سند مرسل ہے اور اسے مرسل بیان کرنے والا راوی معاذ بن زہرہ ہے جسے صرف ابن حبان نے ہی ثقہ کہا ہے، تقریب میں اسے مجہول کہا گیا ہے۔ ثانی الذکر دعا کی سند حسن درجے کی ہے۔ (محمد ارشد کمال)

بہر حال اگر آپ یہ دعائیں پڑھ لیں یا ان کے علاوہ کوئی دعا، جو دل سے نکلے، پڑھ لیں۔ یہ وقت دعا کی قبولیت کا ہے۔

جہاں تک افطاری کے دوران جواب دینے کا تعلق ہے تو یہ چیز مشروع ہے؛ کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمانِ گرامی:

((اِذَاسَمِعْتُمُ النِّدَاءَ فَقُوْلُوْا مِثْلَ مَا یَقُوْلُ الْمُؤَذِّنُ))

(بخاری، الاذان، ما یقول اذا سمع المنادی، ح:٦١١)

''جب تم اذان سنو تو تم بھی ویسے ہی کہو جیسے مؤذن کہتا ہے۔'' عمومیت کا حامل ہے۔ استثناء کی صورت اگر مل جائے تو ٹھیک ورنہ اذان کا جواب بہرصورت دینا چاہیے۔

(فضیلة الشیخ محمدبن صالح عثیمین رحمه الله)

روزہ کی حالت میں آنکھ اور ناک میں دواء کا استعمال

سوال روزہ دار کے لیے Nosel drops، Ear drops اور Eye drops کے استعمال کا کیا حکم ہے؟

جواب Nosel drops اگر معدہ تک چلے جائیں تو روزہ ٹوٹ جائے گا؛ کیونکہ حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے لقیط بن صبرہ سے فرمایا:

((بَالِغْ فِی الْاِسْتِنْشَاقِ اِلَّا اَنْ تَکُوْنَ صَائِمًا))

(ابو داؤد، الطهارة، فی الاستنثار، ح:١٤٢)

''ناک میں پانی چڑھانے میں مبالغہ سے کام لیں اِلَّا یہ کہ آپ روزے سے ہوں۔''

(ایسا کرنے سے پانی معدہ تک جانے سے روزہ ٹوٹنے کا خطرہ ہے۔)

اہلِ علم کہتے ہیں کہ اگر انسان کے پاؤں کا تلوا کسی ایسی چیز پر آ جائے کہ جس کا ذائقہ اس کے حلق میں محسوس ہو تو ایسی صورت میں روزہ نہیں ٹوٹے گا، وجہ یہ ہے کہ یہ چیز معدے میں غذا پہنچانے کا کوئی Wayin نہیں ہے، بنابریں آنکھ میں سرمہ لگانے سے اور کان یا ناک میں دوائی ڈالنے سے روزہ افطار نہیں ہوگا اگر چہ اس کا ذائقہ حلق میں محسوس بھی ہو، یہی حکم تیل وغیرہ کا ہے۔ (فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح عثیمین رحمہ اللہ)

کیا نکسیر سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟

سوال کیا نکسیر پھوٹنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب نہیں، کیونکہ یہ غیر اختیاری چیز ہے۔ (فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح عثیمین رحمہ اللہ)

نمک مرچ چکھنے سے روزے پر اثر

سوال کھانے کا نمک مرچ چکھنے سے روزے پر اثر پڑے گا؟

جواب نہیں، روزہ کسی چیز کے نگلنے سے ٹوٹتا ہے چکھنے سے نہیں۔ البتہ چیز کے چکھنے کے بعد تھوک دینا چاہیے تاکہ نمک، مرچ کا کوئی اثر حلق سے نیچے نہ اترے۔

(فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح عثیمین رحمہ اللہ)

دمہ کی بیماری کی spray استعمال کرنے کا حکم؟

سوال دمہ کے مریض کے لیے اس بیماری کی spray استعمال کرنے کا کیا حکم ہے؟

جواب جائز ہے اور اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ چیز بخارات بن کر اڑ جاتی ہے اور اس کا کوئی جز معدہ تک سرایت نہیں کرتا۔

(فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح عثیمین رحمہ اللہ)

کیا مسجد کی حدود سے باہر بات کرنے سے اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے؟

سوال ہم ایک مسجد میں اعتکاف کر رہے تھے، اعتکاف کرنے والے بعض لوگ مسجد کی سیڑھیوں کے پاس گفتگو کر رہے تھے جس پر ایک صاحب نے کہا کہ تمہارا اعتکاف ٹوٹ گیا ہے کیونکہ تم مسجد کی حدود سے باہر ہو اور مسجد کی حدود سے باہر بات کرنے سے اعتکاف ختم ہو جاتا ہے۔ کیا یہ بات درست ہے؟ کیا آدمی کسی ضرورت کے لیے مسجد کی حدود

سے باہر نکل سکتا ہے؟

جواب: معتکِف (اعتکاف کرنے والے) کو جن امور سے نبی ﷺ منع کیا کرتے تھے، ان کے بارے میں ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

السنة على المعتكف ان لايعود مريضا ولايشهد جنازة ولا يمس امرأة ولايباشرها ولايخرج لحاجة الا لما لابد منه ولااعتكاف الابصوم ولا اعتكاف الا في مسجد جامع

(ابوداوٗد، الصيام، المعتكف يعود المريض، ح:۲۴۷۳، اسے امام زہری (مدلس) نے عنعن سے بیان کیا ہے۔)

''اعتکاف کرنے والے کے لیے یہ سنت ہے کہ عیادت نہ کرے مریض کی اور نہ جنازہ کی نماز کے واسطے حاضر ہو (یعنی باہر مسجد کے) اور نہ عورت کو چھوئے اور نہ عورت سے مباشرت کرے اور نہ کسی کام کے لیے نکلے سوائے ضرورت کے کام (قضائے حاجت وغیرہ) کے لیے اور بغیر روزہ کے اعتکاف درست نہیں ہوتا اور نہ بغیر جامع مسجد کے۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب لفظ ''سنت'' بولتے ہیں تو اس سے نبی اکرم ﷺ کی سنت مراد ہوتی ہے۔

ولا يخرج لحاجة الا لما لابد منه سے معلوم ہوتا ہے کہ معتکف قضائے حاجت کے لیے مسجد کی حدود سے باہر نکل سکتا ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے:

وكان لا يدخل البيت الا لحاجة اذا كان معتكفاً

(بخاری، الاعتكاف، المعتكف لايدخل البيت الالحاجة، ح:۲۰۲۹)

''جب آپ (نبی ﷺ) اعتکاف کر رہے ہوتے تو بلا حاجت گھر داخل نہ ہوتے۔''

نبی ﷺ گھر والوں کو عبادت کی خاطر جگاتے بھی تھے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

كان النبي ﷺ اذا دخل العشر شد مئزره واحيا ليله وايقظ اهله

(ایضاً، فضل ليلة القدر، العمل في العشر الاواخر من رمضان، ح: ۲۰۲۴)

"جب (ماہِ رمضان کا) آخری عشرہ آتا تو نبی ﷺ اپنا تہبند مضبوط باندھتے (اپنی کمر کس لیتے) اور ان راتوں میں آپ خود بھی جاگتے اور گھر والوں کو بھی جگایا کرتے تھے۔"

جہاں تک معتکف کے گفتگو کرنے کا تعلق ہے تو وہ مسجد کی حدود میں دین وشریعت سے متعلق ہر طرح کی گفتگو کرسکتا ہے، وہ کسی شرعی مسئلے کی افہام وتفہیم کی بات کرسکتا ہے، درس و تدریس کرسکتا ہے اور جمعہ پڑھا سکتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ حالت اعتکاف میں وعظ ونصیحت بھی کیا کرتے تھے اور جمعہ کے اجتماع سے بھی خطاب فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کی ازواج آپ سے مسجد میں آ کر گفتگو بھی کر لیتی تھیں۔ صحیح بخاری میں ہے:

كان النبي ﷺ في المسجد وعنده ازواجه فرحن، فقال لصفية بنت حيي:((لَا تَعْجَلِي حَتَّى أَنْصَرِفَ مَعَكِ))، وكان بيتها في دار اسامة، فخرج النبي ﷺ معها فلقيه رجلان من الانصار، فنظرا الى النبي ﷺ ثم اجازا، وقال لهما النبي ﷺ:((تَعَالَيَا إِنَّهَا صَفِيَّةُ بِنْتُ حُيَيٍّ))، قالا:سبحان الله يا رسول الله، قال:((إِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِي مِنَ الْإِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ وَإِنِّي خَشِيتُ أَنْ يُلْقِيَ فِي أَنْفُسِكُمَا شَيْئًا))

(الاعتكاف، زيارة المرأة زوجها في اعتكافه، ح: ٢٠٣٨)

"نبی ﷺ مسجد میں (اعتکاف کر رہے) تھے، آپ کے پاس آپ کی ازواج بیٹھی ہوئی تھیں، جب وہ چلنے لگیں تو آپ نے صفیہ بنت حیی سے فرمایا: جلدی نہ کرو، مَیں تمہیں چھوڑنے چلتا ہوں۔ اُن کا حجرہ دارِ اُسامہ میں تھا۔ چنانچہ جب نبی ﷺ ان کے ساتھ نکلے تو انصار کے دو آدمی آپ سے ملے۔ ان دونوں نے نبی ﷺ کو دیکھا اور جلدی سے آگے بڑھ گئے۔ آپ نے فرمایا: ٹھہرو! ادھر آؤ! یہ صفیہ بن حیی (میری بیوی) ہیں۔ انہوں نے عرض کی: سبحان اللہ! اللہ کے رسول ﷺ! آپ نے فرمایا: شیطان خون کی طرح دوڑتا ہے اور مجھے خطرہ یہ

ہوا کہ کہیں تمہارے دلوں میں بھی کوئی (بُری) بات نہ ڈال دے۔''

اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر عسقلانی ؒ لکھتے ہیں: اس حدیث سے بہت سے نکات نکلتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ معتکف کے لیے مباح ہے کہ وہ اپنے ملنے والوں کو کھڑا ہو کر انہیں رُخصت کر سکتا ہے اور دوسرے لوگوں کے ساتھ بات بھی کر سکتا ہے اور اس کے لیے اپنی بیوی کے ساتھ خلوت بھی مباح ہے۔ اس سے تنہائی میں صرف ضروری اور مناسب بات چیت کرنا، اور اعتکاف کرنے والے کی عورت بھی اس سے ملنے آ سکتی ہے اور اس حدیث سے امت کے لیے شفقتِ نبوی کا بھی ثبوت ملتا ہے اور آپ کے ایسے ارشاد پر بھی دلیل ہے جو کہ امت سے گناہوں کے ازالے سے متعلق ہے اور اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ بدگمانی اور شیطانی مکروں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا بھی بے حد ضروری ہے۔ ابن دقیق العید نے کہا کہ علماء کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے ان کے حق میں لوگ بدگمانی پیدا کر سکیں، اگرچہ اس کام میں ان میں اخلاص ہو، مگر بدگمانی پیدا ہونے کی صورت میں ان کے علوم سے استفادہ کرنا ختم ہو جانے کا احتمال ہے۔ اسی لیے بعض علماء نے کہا ہے کہ حاکم کے لیے ضروری ہے کہ مدعی علیہ پر جو اُس نے فیصلہ دیا ہے اس کی ساری وجوہات اس کے سامنے بیان کر دے تاکہ وہ حاکم پر کوئی غلط تہمت نہ لگا سکے اور اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ کوئی شخص بطور تجربہ بھی کوئی بُرا مظاہرہ نہ کرے۔ ایسی بلائیں آج کل عام ہو رہی ہیں اور اس حدیث میں بیوت ازواج النبی کی اضافت (نسبت) کا بھی جواز ہے اور رات میں عورتوں کا گھروں سے باہر نکلنے کا بھی جواز ثابت ہوتا ہے اور تعجب کے وقت سبحان اللہ کہنے کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ (فتح الباری)

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انصار کے آدمی آپ ﷺ کو مسجد سے باہر ملے تھے تو آپ ﷺ نے انہیں بُلا کر اُن سے ضروری بات کر لی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ معتکف اگر مسجد کی حدود سے باہر بھی جائز اور ضروری بات کر لے تو اس کا اعتکاف نہیں ٹوٹتا۔ (واللہ اعلم)

اوپر بیان ہوا ہے کہ معتکف کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی کی بیمار پرسی کرے، البتہ اگر وہ کسی جائز ضروری کام کے لیے معتکف (جائے اعتکاف) سے باہر نکلا ہوا ہو حتی کہ

مسجد کی حدود سے بھی باہر ہو تو وہ چلتے چلتے (رُکے بغیر) مریض کا حال پوچھ سکتا ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

كان النبي ﷺ يمر بالمريض و هو معتكف فيمر كما هو ولا يعرج يسأل عنه

(ابو داوٗد، الصیام، المعتكف يعود المريض ، ح: ۲۴۷۲، یہ روایت ضعیف ہے۔)

''نبی ﷺ حالتِ اعتکاف میں جب بیمار کے پاس سے گزرتے تو ٹھہرے بغیر آپ اس کا حال دریافت کر لیتے۔''

رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی عبادت

سوال میرا کچھ احباب جماعت سے ایک مسئلہ میں اختلاف ہے جس کی تفصیل یہ ہے: گزشتہ رمضان المبارک کی طاق رات (۲۳ ویں شب) کو شب بیداری اور تلاشِ لیلۃ القدر کے اشتیاق میں مسجد میں معتکفین وبعض اہل محلہ نے آٹھ رکعات نمازِ تراویح ادا کرنے کے بعد کچھ دیر توقف کیا اور پھر دوبارہ قیام اللیل کی نیت سے باجماعت نوافل (۲۲ رکعات) اور تین وتر ادا کئے۔ اگلے روز مجھ سے باندازِ شکوہ کہا کہ کل تو آپ حاضر نہ تھے مگر آئندہ ساتھ رہنا ہوگا۔ جس پر میں نے کہا: قیام اللیل، تہجد اور تراویح ایک ہی عبادت کے مختلف نام ہیں اور نبی ﷺ نے تاحیات مابین عشاء وفجر گیارہ رکعات سے زائد ادا نہیں کیں لہٰذا میں اسی پر اکتفا کرنا اولیٰ اور اوثق سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک کم مگر مسنون عمل بہتر ہے ایک کثیر مگر غیر مسنون عمل سے۔ (جیسا کہ دورانِ سفر پوری نماز پڑھنے والے کی نسبت قصر کرنے والے کو زیادہ ثواب ملتا ہے کہ وہ مسنون طریقے پر ایک اہم فریضہ سے سبکدوش ہوتا ہے۔)

چونکہ ہمارے سامنے صلوٰۃ اللیل کے بارے میں نبی ﷺ کا اسوہ موجود ہے لہٰذا اسی پر اکتفا کرنا چاہیے، کہ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تُقَدِّمُواْ بَيۡنَ يَدَيِ ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ ﴾ (۴۹/الحجرٰت:۱)

''ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے قدم آگے نہ بڑھاؤ۔''

مذکورہ بالا سطور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قرآن وسنت کی روشنی میں ہماری راہنمائی

کیجیے۔ امید ہے کہ آپ اپنی پہلی فرصت میں ہماری راہنمائی کریں گے۔

جواب نبی اکرم ﷺ سب لوگوں سے بڑھ کر عبادت گزار تھے۔ جیسا کہ حدیث ترم قدماہ (آپ کے قدموں پر ورم پڑ جاتے) اور دیگر احادیث سے ثابت ہے۔ مگر آپ ﷺ رمضان میں باقی مہینوں کی بہ نسبت زیادہ عبادت کیا کرتے تھے۔ بالخصوص آخری عشرے میں تو آپ شب بیداری کرتے، گھر والوں کو بھی جگاتے اور خوب محنت کرتے۔

(بخاری، فضل لیلة القدر، العمل فی العشر الاواخر، ح:۲۰۲۴؛ مسلم، ح:۱۱۷۴)

آپ ﷺ کا معمول وتر سمیت گیارہ رکعتیں ہوتا تھا۔

(بخاری، التہجد، قیام النبی ﷺ باللیل فی رمضان......، ح:۱۱۴۷)

آپ انتہائی خوبصورت عبادت کرتے اور لمبا قیام کرتے۔

(بخاری، ح:۱۱۳۵، ۱۱۳۹، ۱۱۴۷؛ مسلم، ح:۷۷۲)

لمبے قیام والی نماز افضل ہے۔ (مسلم، ح:۷۵۶)

رات کے سب حصوں میں عبادت کرنا زیادہ پسندیدہ ہے۔ (بخاری، ح:۱۱۴۱)

اگرچہ اولیٰ و اوثق تو یہی ہے کہ نوافل میں نبوی طریق کو سامنے رکھا جائے مگر نوافل میں رکعات زیادہ پڑھنے کی اجازت چونکہ نبی اکرم ﷺ سے ہی ثابت ہے اس لیے اسے ﴿لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ کی مخالفت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور نہ زیادہ نوافل پڑھنا سیدنا محمد ﷺ کی گفتار کے خلاف ہے۔ سائل نے بھی نمازِ قصر کی مثال دے کر اسے جائز تسلیم کیا ہے، اگرچہ غیر مسنون کہہ دیا ہے۔ حالانکہ زیادہ یا کم ثواب ملنا ایک بات جبکہ ''اللہ اور اس کے رسول سے قدم آگے نہ بڑھاؤ'' دوسری مختلف بات ہے۔

مسنون تو یہ ہے کہ جب آپ (ﷺ) رات کی نماز پڑھنے لگتے تو پہلے دو رکعت مختصر پڑھتے پھر لمبی نماز شروع کرتے۔ (مسلم، ح:۷۶۷۔۷۶۸)

کیا ساری دنیا کے مسلمان سائل سمیت تراویح کا آغاز ایسے ہی کرتے ہیں؟

آٹھ رکعتیں پڑھنے کے بعد سوجانا نبی ﷺ کا عام معمول تھا۔ (بخاری، ح:۱۱۴۷)

کیا ایسا نہ کرنا اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنا ہوگا؟

وتر کی نماز آپ رات کے آخری حصے میں پڑھتے تھے۔ (بخاری، ح:۹۹۶، ۹۹۷)

زیادہ تر معمول یہی تھا۔ کیا پہلے حصے میں ہمیشہ پڑھنا غیر مسنون ہے؟ یقیناً نہیں کیونکہ آپ ﷺ نے اس کی بھی اجازت دی ہے۔ (مسلم، ح:۷۵۵)

زیادہ نوافل پڑھنے کی اجازت خود نبی ﷺ سے ثابت ہے۔ ان کی ادائیگی کو سنت کی مخالفت یا نبی کی نافرمانی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ آپ ﷺ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے فرمایا:

((صَلٰوةُ اللَّيْلِ مَثْنٰى مَثْنٰى فَإِذَا خِفْتَ الصُّبْحَ فَأَوْتِرْ بِوَاحِدَةٍ))

(بخاری، التھجد، کیف صلاۃ النبی ﷺ، ح:۱۱۳۷؛ مسلم، ح:۷۴۹، واللفظ له)

''رات کی نماز دو دو رکعت ہے جب صبح ہونے کا امکان ہو تو ایک رکعت وتر پڑھ لو۔''

قیس بن طلق فرماتے ہیں کہ طلق بن علی رضی اللہ عنہ رمضان میں ایک روز ہمارے پاس آئے، انہوں نے شام بھی ہمارے پاس کی اور روزہ بھی ہمارے پاس افطار کیا، پھر ہمیں وتر سمیت تراویح پڑھائی اور پھر اپنی مسجد کی طرف چلے گئے، وہاں جا کر اُنہوں نے اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھائی اور جب وتر کی باری آئی تو ایک شخص کو آگے کر دیا اور فرمایا:

اپنے رفقاء کو وتر پڑھاؤ، بے شک مَیں نے اللہ کے رسول ﷺ سے سنا ہے کہ ایک رات میں دوبار وتر نہیں۔ (ابوداؤد، الوتر، فی نقض الوتر، ح:۱۴۳۹)

اس روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نمازِ تراویح کے بعد بھی اگر کوئی شخص نفل پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے۔

اس کے علاوہ جن احادیث میں عصر کی نماز کے بعد غروب آفتاب تک اور فجر کی نماز کے بعد طلوع آفتاب تک نوافل پڑھنے سے منع کیا گیا ہے وہ بھی اس بات کی دلیل ہیں کہ ان اوقات کے علاوہ باقی اوقات، جن میں نماز پڑھنا منع نہیں، جتنے نوافل آدمی چاہے پڑھ سکتا ہے، شرعاً کوئی ممانعت نہیں۔

البتہ رمضان المبارک میں رات کی نماز میں دو قسم کے Setup، کہ ایک کو تراویح اور دوسرے کو قیام اللیل کا نام دیا جائے، مزاجِ شریعت کے مطابق نہیں ہیں۔ یہ ایک ہی نماز کے مختلف نام ہیں۔ نمازِ تراویح کے بعد وتر سے پہلے کوئی نوافل پڑھنا چاہے تو مذکورہ بالا احادیث

کی روشنی میں اس کی اجازت ہے۔

اگر کسی جگہ عشاء کے فوراً بعد تراویح نہ پڑھائی جاتی ہو تو نماز تراویح کو رات کے پچھلے حصے میں پڑھنا بلا اشکال درست بلکہ زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ رات کی نماز کے لیے زیادہ موزوں وقت رات کا پچھلا حصہ ہی ہے۔ قرآن میں ﴿ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ ﴾ (۳/آل عمران:۱۷) اور ﴿ وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ﴾ (۵۱/الذّٰریٰت:۱۸) کے الفاظ سے اہلِ ایمان کی صفت بیان کی گئی ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

روزہ نبھانے کے لیے فلم دیکھنا یا تاش کھیلنا؟

سوال کچھ لوگ روزہ نبھانے کے لیے رمضان المبارک میں تمام دن فلمیں اور ڈرامے دیکھتے ہیں یا تاش کھیلتے رہتے ہیں۔ اسلام میں اس کا کیا حکم ہے؟

جواب ہر مسلمان پر فرض ہے کہ کوئی کام کرتے وقت یا کسی کام کے چھوڑتے وقت، ہر وقت اور ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کا خوف نگاہ میں رکھے، اس میں روزہ دار یا غیر روزہ دار کی کوئی قید نہیں ہے۔ اور ان چیزوں کے قریب بھی نہ پھٹکے جو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دی ہیں، جیسے گندی فلمیں جو برہنہ یا نیم برہنہ تصویروں اور بیہودہ گفتگو پر مشتمل ہوتی ہیں، ٹیلیویژن کے پروگرام بھی عموماً ایسی ہی تصویروں، گانوں موسیقی اور گمراہ کن نظریات کے پروپیگنڈہ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہر مسلمان پر یہ چیز بھی فرض ہے کہ وہ تاش اور اس طرح کے دوسرے لہو ولعب پر مشتمل کھیلوں سے کنارہ کش رہے؛ کیونکہ ان تمام چیزوں میں بیہودگی اور ناپسندیدگی پائی جاتی ہے اور ان چیزوں سے دل سخت اور بیمار ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے پھر وہ اللہ کی شریعت اور اس کے احکام اور خصوصاً نماز باجماعت کی پروا نہیں کرتا، اور محرمات کا ارتکاب بھی بے دھڑک کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ ۝ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا وَلَّىٰ مُسْتَكْبِرًا كَأَنْ لَمْ يَسْمَعْهَا كَأَنَّ فِي أُذُنَيْهِ وَقْرًا فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ ﴾ (۳۱/لقمٰن:۶-۷)

''اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو لغو باتوں کو مول لیتے ہیں کہ بے علمی کے ساتھ (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے بہکائیں اور اسے ہنسی بنائیں، یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔ جب اس کے سامنے ہماری آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں تو تکبر کرتا ہوا اس طرح منہ پھیر لیتا ہے گویا اس نے انہیں سنا ہی نہیں، گویا کہ اس کے دونوں کانوں میں ڈاٹ لگے ہوئے ہیں، آپ اسے دردناک عذاب کی خبر سنا دیجیے۔''

سورۃ الفرقان میں اللہ نے ''عباد الرحمٰن'' کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا﴾

(۲۵/الفرقان:۷۲)

''اور جو لوگ جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب کسی لغو چیز پر ان کا گزر ہوتا ہے تو شرافت سے گزر جاتے ہیں۔''

لفظ الزُّور کا اطلاق ہر ناپسند بات پر ہوتا ہے، اور ﴿لَا يَشْهَدُونَ﴾ کا معنی لا یحضرون ہے یعنی وہ جھوٹ کے قریب بھی نہیں پھٹکتے، اور نبی ﷺ کا فرمان ہے:

((لَيَكُونَنَّ مِنْ أُمَّتِي أَقْوَامٌ يَسْتَحِلُّونَ الْحِرَّ وَالْحَرِيرَ وَالْخَمْرَ وَالْمَعَازِفَ)) (بخاری، الاشربۃ، ما جاء فیمن یستحل الخمر ... ، ح:۵۵۹۰)

''میری امت میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہوں گے جو بدکاری، ریشم، شراب اور آلاتِ موسیقی کو حلال کر لیں گے۔''

حِرّ سے مراد حرام کاری ہے؛ کیونکہ حِرّ اندامِ نہانی کو کہتے ہیں اور معازف سے مراد موسیقی اور دیگر لہو ولعب کے آلات ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حرام چیزوں تک پہنچانے والے وسائل کو بھی حرام قرار دیا ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ فلموں اور ٹیلیویژن پر دکھائے جانے والے بیہودہ پروگراموں کا شمار ایسے ہی وسائل میں ہوتا ہے۔ اس لیے ان سے احتراز کرنا چاہیے۔ واللہ المستعان

روزہ افطار کر لینے کے بعد سورج نکل آیا اب......

سوال اگر کسی جگہ سورج کے علاوہ وقت معلوم کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہ ہو، سورج بادلوں کی وجہ سے دکھائی نہ دیتا ہو۔ روزے دار نے یہ سمجھ کر کہ سورج غروب ہو گیا ہے روزہ افطار کر لیا پھر بادلوں کے چھٹ جانے سے معلوم ہوا کہ سورج تو ابھی غروب نہیں ہوا۔ اب کیا کیا جائے؟

جواب جمہور علماء کے نزدیک ایسے روزے کی قضا دینا واجب ہے:

فذهب الجمهور إلى إيجاب القضاء (فتح الباري ۹/ ۲۸)

ایسا ہی ایک واقعہ عہد نبوی میں رونما ہوا تھا، اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں:

أفطرنا على عهد النبي ﷺ يوم غيم ثم طلعت الشمس

(بخاری ، الصوم ، اذا أفطر فی رمضان ثم طلعت الشمس ، ح:۱۹۵۹)

''ہم نے نبی ﷺ کے زمانے میں، کہ جس دن آسمان پر بادل تھے، روزہ افطار کر لیا پھر سورج نکل آیا۔''

ہشام بن عروہ سے، جو کہ اس حدیث کے ایک راوی ہیں، پوچھا گیا کہ کیا انہیں قضا کرنے کا حکم دیا گیا تھا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ کیا اس کے بغیر بھی کوئی چارہ تھا؟ (ایضاً)

البتہ سورج ظاہر ہونے پر روزے دار کو یہی سمجھنا چاہیے کہ وہ روزے سے ہے اور غروبِ آفتاب پر روزہ افطار کیا جائے۔

صورت مسئولہ میں ایسے روزے کی قضا دینے میں ہی احتیاط ہے اگرچہ امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم رحمہما اللہ کے نزدیک ایسے روزے کی قضا نہیں ہے۔

(مذکورہ مسئلہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے أبوداؤد، الصوم، الفطر قبل غروب الشمس ، ح:۲۳۵۹؛ ابن ماجة ، الصيام، ما جاء فی من أفطر ناسيا، ح:۱۶۷۳،۱۶۷۴؛ مسند أحمد۶/ ۳۴۶ اور المغنی ، الصيام ، مسئلة ...... أو أفطر يظن أن الشمس قد غابت ولم تغب فعليه القضاء)

شرعی عذر سے چھوٹے ہوئے روزوں کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی؟

سوال میں شرعی عذر کی بنا پر رمضان المبارک کے چند روزے نہیں رکھ سکی، ان کی

قضا دینا ضروری ہے یا نہیں۔ اگر ضروری ہے تو یہ روزے کب تک رکھ سکتی ہوں؟

جواب اسلام آسان دین ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی ہے کہ اس نے رمضان کے روزوں کی ادائیگی بعض لوگوں سے مؤخر کر دی ہے۔ بیمار اور مسافر جو فرض روزے نہ رکھ سکے ہوں تو وہ انہیں بعد میں رکھ لیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ﴾ (۲/البقرۃ:۱۸۵)

یہ روزے مسلسل رکھے جا سکتے ہیں اور الگ الگ رکھنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ (قضا روزے) الگ الگ رکھنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ دوسرے دنوں میں تعداد پوری کرلو۔ لا بأس أن يفرق لقول الله تعالى: ﴿ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ﴾ (۲/البقرۃ:۱۸۵)

(بخاری، الصوم، متی یقضی قضاء رمضان......)

خواتین اگر اپنے مخصوص مسائل کی بنا پر فرض روزے نہ رکھ سکیں تو ان کی قضا دینا ضروری ہے البتہ حیض ونفاس میں نماز معاف ہے۔ ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایسی حالت میں روزے کی قضا دینے کا حکم دیا جاتا لیکن نماز کی قضا دینے کا حکم نہ دیا جاتا، فنؤمر بقضاء الصوم ولا نؤمر بقضاء الصلاة

(مسلم، الحیض، وجوب قضاء الصوم علی الحائض دون الصلاۃ، ح: ۳۳۵)

رمضان المبارک کے چھوٹے ہوئے روزے جس قدر ممکن ہو جلدی ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، البتہ فوری ادائیگی ضروری نہیں۔ آئندہ رمضان تک کسی بھی وقت ادا کیے جا سکتے ہیں۔ تاہم انہیں بلاوجہ مؤخر نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا ایسے روزے جلدی ادا نہیں کر پاتی تھیں لہٰذا وہ ماہِ شعبان میں یہ روزے رکھتی تھیں۔

(بخاری، الصوم، متی یقضی قضاء رمضان، ح:۱۹۵۰؛ مسلم، الصیام، جواز تأخیر قضاء رمضان ما لم یجیء رمضان آخر لمن أفطر بعذر مرض وسفر وحیض ونحو ذلك، ح:۱۱۴۶)

اگر کوئی شخص اگلے رمضان تک بھی قضائی نہ دے سکے تو آئندہ رمضان کے بعد قضا دینے کے ساتھ ساتھ فدیہ (ایک مسکین کا کھانا) بھی دینا ہوگا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

فطرانے میں غلہ دینا چاہیے یا اس کی قیمت؟

سوال فطرانے میں غلہ ہی دینا چاہیے یا اس کی قیمت بھی ادا کی جا سکتی ہے؟

جواب صدقۃ الفطر (فطرانہ) کے بارے میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''اللہ کے رسول ﷺ نے مسلمانوں کے ہر غلام و آزاد، مرد و عورت اور چھوٹے بڑے پر کھجور یا جو کا ایک صاع (تقریباً اڑھائی کلو) فطرانہ مقرر کیا اور یہ بھی حکم دیا کہ اسے نمازِ عید کے لیے نکلنے سے پہلے پہلے ادا کر دیا جائے۔''

(بخاري، الزكوة، فرض صدقة الفطر، ح:۱۵۰۳)

اس حدیث کی طرح بہت سی احادیث میں جنس (کھجور، منقیٰ، پنیر، جو اور دیگر اناج) ادا کرنے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ تاہم ان اشیاء کی قیمت ادا کر دینے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ صدقۃ الفطر کا ایک مقصد طعمة للمساكين (مسکینوں کا کھانا) بھی بیان ہوا ہے اور یہ مقصد قیمت سے بھی پورا ہو سکتا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے حکم دیا کہ ہر شخص سے آدھا درہم بطور صدقۂ فطر لیا جائے۔ (ابن ابی شیبہ ۳/۱۷۴، ح:۱۰۳۶۹)

بعض تابعین نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ صدقۃ الفطر میں کھانے کی قیمت دراہم میں ادا کرتے ہیں۔ (ایضاً ۳/۱۷۴، ح:۱۰۳۷۲)

نفل روزوں میں قابلِ لحاظ امور

سوال وہ کون سے امور ہیں جنہیں نفلی روزوں میں مدنظر رکھنا چاہیے؟

جواب نفلی روزہ فرض روزے سے بعض مسائل میں مختلف ہوتا ہے مثلاً نفلی روزے کی نیت فرض روزے کی طرح صبح صادق سے پہلے کرنا ضروری نہیں بلکہ (زوال آفتاب سے قبل) دن کے کسی بھی حصے میں کی جا سکتی ہے۔ نفلی روزہ دن کے کسی بھی وقت افطار کیا جا سکتا ہے۔ البتہ بہتر یہ ہے کہ روزہ پورا کیا جائے۔

(مسلم، الصيام، جواز صوم النافلة بنية من النهار قبل الزوال وجواز فطر الصائم نفلا من غير عذر والأولى اتمامه، ح:۱۱۵۴)

البتہ مستحب ہے کہ اس کی قضا دی جائے۔ اگر کسی عذر کے پیش نظر نفلی روزہ توڑ دیا جائے

تو اس کی قضا دینا ضروری نہیں۔

(بخاری، الصوم، من أقسم علی أخیه لیفطر فی التطوع ولم یر علیه قضاء إذا کان أوثق له، ح:۱۹۶۸)

نفلی روزے کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ عورت اپنے خاوند کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر روزہ نہ رکھے۔ (بخاری، النکاح، صوم المرأة بإذن زوجها تطوعا، ح:۵۱۹۲)

جمعہ کا اکیلا روزہ رکھنا منع ہے۔ اگر کوئی رکھنا چاہے تو اسے ایک دن پہلے (جمعرات کا) یا ایک دن بعد (ہفتہ کا) بھی روزہ رکھنا چاہیے۔ ہاں اگر کوئی معمول کے مطابق روزے رکھ رہا ہو تو اس میں جمعہ کا اکیلا روزہ آجائے تو یہ روزہ رکھنا جائز ہے۔

(بخاری، الصوم، صوم یوم الجمعة و إذا أصبح صائما یوم الجمعة فعلیه أن یفطر، ح: ۱۹۸۴-۱۹۸۶؛ مسلم، الصیام، کراهة افراد یوم الجمعة بصوم لا یوافق عادته، ح:۱۱۴۳)

رمضان سے پہلے شعبان کے آخری دنوں میں نفلی روزے نہیں رکھنے چاہئیں۔

(بخاری، الصوم، هل یقال رمضان...... لا تقدموا رمضان، ح:۱۹۰۲)

ان دنوں کے روزے معمول کے مطابق آجائیں تو اور بات ہے۔

شک کے دن روزہ رکھنے کی بھی ممانعت ہے۔

(ایضاً، قول النبی إذا رأیتم الهلال ...... من صام یوم الشك فقد عصی أبا القاسم، ح:۱۹۰۶)

عید کے دن روزہ رکھنا جائز نہیں۔

(ایضاً، صوم یوم الفطر، ح:۱۹۹۰، الصوم یوم النحر، ح:۱۹۹۳)

اسی طرح ایامِ تشریق (۱۱، ۱۲، ۱۳ ذوالحجہ) کے روزے رکھنا منع ہے۔ البتہ جس حاجی کے پاس قربانی نہ ہو وہ ان دنوں کے روزے رکھ سکتا ہے۔

(ایضاً، صیام أیام التشریق......کانت عائشة رضی الله عنها تصوم أیام منی وکان أبوها یصومها، ح: ۱۹۹۶)

داؤد علیہ السلام کا روزہ؟

سوال عبداللہ بن عمرو بن عاص کو نبی ﷺ نے روزے اور تلاوتِ قرآن کے بارے میں کچھ ہدایات دی تھیں۔ ان ہدایات کے بعد ان کا طرزِ عمل کیا تھا؟ کیا وہ داؤدی روزہ رکھتے تھے یا بلاناغہ روزے رکھتے تھے؟ نیز یہ بھی بتائیں کہ وہ سات دنوں میں قرآنِ مجید کی تلاوت مکمل کرتے تھے یا انہوں نے اپنا پہلا معمول باقی رکھا تھا؟ ہمارے ایک دوست اس

بات پر مُصر تھے کہ انہوں نے اپنا پہلا معمول باقی رکھا تھا،تبھی تو آخر عمر میں انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ کاش! نبی ﷺ کی دی ہوئی رخصت کو قبول کر لیتا! کیا ہمارے دوست کا استدلال درست ہے؟

جواب: اس سلسلے کی تمام احادیث کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے اپنا پہلا معمول برقرار نہیں رکھا تھا۔ان کا عمل اس آخری حد کے مطابق تھا جو نبی ﷺ نے نفلی روزے اور تلاوت کے سلسلے میں ان کے لیے مقرر کی تھی۔احادیث میں بیان کردہ رخصت،جس کے قبول کرنے کا اظہار عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کیا تھا،ہر مہینے کے تین نفلی روزے رکھنے اور مہینے میں قرآن کی تلاوت مکمل کرنے کی رخصت تھی۔عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

''اگر میں (ہر مہینے) وہ تین روزے رکھنا قبول کر لیتا،جن کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا تھا،تو یہ مجھے میرے اہل وعیال اور مال سے زیادہ محبوب ہوتا۔'' (مسلم، الصیام، النھی عن صوم الدھر، ح:۱۱۵۹)

حدیث میں یہ بھی ہے کہ جب وہ قوت حاصل کرنا چاہتے تو کچھ دن (نفلی) روزے چھوڑ دیتے اور انہیں گن لیتے اور اتنے روزے بعد میں رکھ لیتے (کیونکہ) وہ اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ وہ کوئی ایسا عمل چھوڑ دیں جو وہ نبی ﷺ کی موجودگی میں کیا کرتے تھے۔(ایضاً)

اگر وہ پہلے معمول کے مطابق مسلسل روزے رکھتے ہوتے تو جو روزے وہ طاقت حاصل کرنے کے لیے چھوڑتے تھے ان کی ادائیگی ہو ہی نہیں سکتی تھی،جبکہ یہ واضح ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ انہیں بعد میں ادا بھی کیا کرتے تھے۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا عمل نبی اکرم ﷺ کی آخری رخصت (صوم داؤدی) پر تھا۔

پورے قرآن کی تلاوت مکمل کرنے کے سلسلے میں بھی آپ کا معمول سات دنوں میں تلاوت مکمل کرنے کا تھا۔جیسا کہ اس سلسلے کی احادیث میں اس کا بیان ہے۔ایک روایت میں ہے کہ آپ (رضی اللہ عنہ) اپنے گھر والوں کو (قرآنِ مجید کا) وہ حصہ سناتے جو وہ (رات کو نوافل

میں) پڑھتے۔ دن کو اس کا دور کر لیتے تا کہ رات کو (اس کا پڑھنا) ان کے لیے آسان ہو جائے۔ (ایضاً)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نبی ﷺ کی آخری تلقین کے مطابق سات دنوں میں قرآنِ مجید کی تلاوت مکمل کیا کرتے تھے۔

شوال کا چاند دیکھنے والا شخص تیسواں روزہ چھوڑ سکتا ہے؟

سوال اگر کسی ایک مسلمان نے ۲۹ رمضان المبارک کو عید کا چاند دیکھا مگر باقی لوگوں نے نہ دیکھا ہو تو کیا چاند دیکھنے والا مسلمان اپنے مشاہدے کے مطابق یکم شوال کا روزہ رکھ سکتا ہے؟ کیا باقی لوگ اس کی رؤیتِ ہلال پر یقین کر کے عید کر سکتے ہیں؟

جواب رمضان المبارک کے چاند کی رؤیت کی گواہی کے لیے کم از کم ایک عادل گواہ جبکہ عید کے چاند کے لیے دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔ ارشادِ نبوی ہے:

((صُوْمُوْا لِرُؤْيَتِهٖ وَاَفْطِرُوْا لِرُؤْيَتِهٖ وَانْسِكُوْا لَهَا فَاِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاَكْمِلُوْا ثَلَاثِيْنَ فَاِنْ شَهِدَ شَاهِدَانِ فَصُوْمُوْا وَاَفْطِرُوْا))

(نسائی، الصیام، قبول شهادة الرجل الواحد...... ح:۲۱۱۶)

''چاند دیکھ کر روزے رکھنا شروع کرو اور اسے دیکھ کر روزے رکھنا بند کرو (یعنی عید کرو) اور قربانی کرو، اگر تم پر مطلع ابر آلود ہو تو تیس روزے پورے کرو، اگر دو گواہ شہادت دیں تو روزہ رکھو اور افطار کرو۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب تک کم از کم دو گواہوں کی گواہی ہلالِ عید دیکھنے کی نہ ہو تو عید نہیں کی جا سکتی۔ عید الفطر نہ کرنے کی صورت میں روزہ رکھا جائے گا۔

اگر چہ اکیلے آدمی کو شوال کا چاند دیکھنے کا یقین ہو مگر حکم شریعت اس اکیلے شخص کی رؤیت پر اعتبار نہیں کرتا، لہٰذا اُس کے لیے شرعی حکم کی اتباع کرنا واجب ہے اور اس رؤیت کو، جسے شریعت نے تسلیم نہیں کیا، چھوڑنا ضروری ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((اَلصَّوْمُ يَوْمَ تَصُوْمُوْنَ اَلْفِطْرُ يَوْمَ تُفْطِرُوْنَ وَالْاَضْحٰى يَوْمَ تُضَحُّوْنَ))

(ترمذي، الصوم، ما جاء ان الفطر يوم تفطرون و الاضحى يوم تضحون، ح:٦٩٧؛ ابن ماجة، الصيام، ما جاء في شهري العيد، ح:١٦٦٠)

''(رمضان المبارک کا) روزہ اسی دن ہے جب تم سب روزہ رکھو نیز عید الفطر اور عید الاضحیٰ تب کرو جب تم سب کرتے ہو۔''

ایک اور حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

((وَ فِطْرُكُمْ يَوْمَ تُفْطِرُوْنَ وَ اَضْحَاكُمْ يَوْمَ تُضَحُّوْنَ))

(ابو دؤد، الصيام، اذا اخطأ القوم الهلال، ح:٢٣٢٤)

''عید الفطر اسی دن ہے جب تم سب افطار کرو اور عید قربان اسی دن ہے جب تم قربانی کرو۔''

الشیخ عبدالرحمن ناصر سعدی لکھتے ہیں:

ابن عقیل اور بعض دیگر نے دونوں حالتوں کو جمع بھی کیا ہے، وہ کہتے ہیں: وہ (یعنی جس نے اکیلے ہلالِ عید الفطر دیکھا ہے) خفیہ طور پر روزہ چھوڑ دے گا۔ لیکن درست بات وہ ہے جو شک وشبہ سے بالا ہے وہ یہی ہے، کہ اسے روزہ چھوڑنا جائز نہیں بلکہ وہ لوگوں کے ساتھ روزہ رکھے گا، اگرچہ اس نے چاند دیکھ لیا ہو۔ واللہ اعلم (الفتاویٰ السعدیۃ، ص:٢١٦)

نماز عید جماعت کے بغیر؟

سوال اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ تاخیر ہونے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے نمازِ عید نہیں پڑھ سکتے۔ ایسی صورت حال میں نماز عید جماعت کے بغیر پڑھی جا سکتی ہے؟

جواب عید کی نماز جماعت کے ساتھ ہی ادا کرنی چاہیے، البتہ اگر کسی وجہ سے نمازِ عید چھوٹ جائے تو جماعت کے بغیر ہی ادا کر لینا درست ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے تعلیقاً یہ روایت بیان کی ہے:

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے غلام ابن ابو عتبہ زاویہ نامی گاؤں میں (بصرہ سے چھ میل کے فاصلے پر) رہتے تھے، انہیں آپ نے حکم دیا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں اور بچوں کو جمع کر کے شہر والوں کی طرح نماز عید اور تکبیریں پڑھیں۔ عکرمہ نے شہر کے قرب وجوار میں آباد لوگوں کے

لیے فرمایا کہ جس طرح امام کرتا ہے، یہ لوگ بھی عید کے دن جمع ہو کر دو رکعت نماز پڑھیں۔
عطاء نے کہا:

''اگر کسی کی نمازِ عید رہ جائے تو وہ دو رکعت اکیلا ہی پڑھے۔''

(بخاری، العیدین، اذا فاته العید یصلی رکعتین، ح: ١٦٦٠)

یہی حکم ان لوگوں کے لیے بھی ہوگا، جو کسی بیماری وغیرہ کی وجہ سے عید گاہ نہیں جا سکتے۔
(واللہ اعلم)

نمازِ عید سے پہلے تقریر کا حکم؟

سوال بعض لوگ عید کی نماز سے پہلے تقریر کرتے ہیں، تقریباً گھنٹہ آدھ گھنٹہ وعظ کرنے کے بعد عید کی نماز ادا کرتے ہیں، نماز کے بعد پھر خطبہ دیتے ہیں۔ کیا یہ عمل سنت نبوی کے مطابق ہے یا نہیں؟

جواب نبی ﷺ کی قولی اور فعلی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے نمازِ عید ادا کرنی چاہیے اور پھر خطبہ دینا چاہیے (واضح رہے کہ خطبہ اور تقریر میں کوئی فرق نہیں۔)

براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے حکم دیا کہ

ان اول ما نبدأ فی یومنا هذا ان نصلی

(بخاری، العیدین، الخطبه بعد العیدین، ح:٩٦٥)

''ہم اس دن سب سے پہلے نماز سے ابتدا کریں گے۔''

طلوعِ آفتاب کے بعد سب سے پہلا کام جو کرنا چاہیے وہ نماز عید کی ادائیگی ہے۔ خطبہ اس کے بعد ہوگا (اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سورج نکلنے کے بعد نماز کو زیادہ مؤخر نہیں کرنا چاہیے جیسا کہ بہت سے عجمی ممالک میں آج کل رواج بنتا جا رہا ہے۔)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

ان رسول الله ﷺ کان یصلی فی الاضحی والفطر ثم یخطب بعد الصلوٰة (بخاری، ایضاً، المشی و الرکوب الی العید...... ، ح: ٩٥٧)

''اللہ کے رسول ﷺ عیدالاضحیٰ اور عیدالفطر کی نماز پہلے پڑھتے اور خطبہ نماز کے بعد دیتے۔''

جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ہے:

ان النبی ﷺ خرج یوم الفطر فبدأ بالصلوٰۃ قبل الخطبة

(ایضاً، ح:۹۵۸)

''نبی ﷺ عیدالفطر کے دن (عیدگاہ کی طرف) نکلے اور خطبہ (تقریر) سے پہلے نماز شروع کی۔''

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

ان النبی ﷺ قام فبدأ بالصلاة ثم خطب الناس بعد

(بخاری، ایضاً، ح:۹۶۱)

''نبی ﷺ (عید کے دن) کھڑے ہوئے اور نماز شروع کی، پھر آپ نے اس کے بعد لوگوں سے خطاب کیا۔''

شیخین (ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما) کا عمل بھی اسی سنت کے مطابق تھا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

کان رسول اللہ ﷺ وابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما یصلون العیدین قبل الخطبة (بخاری، ایضاً، خطبة بعد العید، ح:۹۶۳)

''اللہ کے رسول ﷺ و ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما عیدین کی نماز خطبہ سے پہلے پڑھا کرتے تھے۔''

ایک روایت میں ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ عثمان رضی اللہ عنہ کا بھی تذکرہ ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

شهدت العید مع رسول اللہ ﷺ و ابی بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم فکلهم کانوا یصلون قبل الخطبة (بخاری، ایضاً، ح:۹۶۲)

''میں عید کے لیے اللہ کے رسول ﷺ، ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ گیا

ہوں، وہ سب خطبہ سے پہلے عید کی نماز پڑھتے تھے۔"

ان خلفاء کے علاوہ بھی یہ ثابت نہیں کہ کسی صحابی نے نمازِ عید سے پہلے خطبہ دیا ہو۔

ایک روایت میں ہے کہ عبداللہ بن عباس نے عبداللہ بن زبیر کے پاس، جب شروع شروع میں ان کی بیعت کی گئی تھی، ایک شخص کو (یہ بتانے کے لیے) بھیجا کہ نمازِ عید الفطر کے لیے اذان نہیں دی جاتی تھی اور خطبہ نماز کے بعد ہوتا تھا۔

(بخاری، ایضاً، المشی والرکوب الی العید والصلاۃ قبل الخطبۃ..... ح: ۹۵۹)

نماز کے بعد خطبہ دینے کی سنت کو مروان بن حکم نے اپنے عہد حکومت میں بدلا تھا۔

ابوسعید خدری بیان کرتے ہیں:

کان النبیﷺ یخرج یوم الفطر والاضحی الی المصلی، فأول شیء یبدأ به الصلاة، ثم ینصرف فیقوم مقابل الناس والناس جلوس علی صفوفهم- فیعظهم، ویوصیهم، ویا مرهم- فان کان یرید ان یقطع بعثا قطعه او یامر بشیء امر به، ثم ینصرف......

(بخاری، ایضاً، الخروج الی المصلی بغیر منبر، ح:۹۵۶)

"نبی ﷺ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن (مدینہ کے باہر) عید گاہ تشریف لے جاتے تو سب سے پہلے آپ نماز پڑھاتے، نماز سے فارغ ہو کر آپ لوگوں کے سامنے کھڑے ہوتے۔ تمام لوگ اپنی صفوں میں بیٹھے رہتے، آپ انہیں وعظ و نصیحت فرماتے، اچھی باتوں کا حکم دیتے۔ اگر جہاد کے لیے کہیں لشکر بھیجنے کا ارادہ ہوتا تو اسے الگ کرتے۔ کسی اور بات کا حکم دینا ہوتا تو وہ حکم بھی دیتے۔ اس کے بعد شہر کو واپس تشریف لاتے۔ ابوسعید خدری نے بیان کیا کہ لوگ برابر اسی سنت پر قائم رہے لیکن معاویہ کے زمانے میں مروان، جو مدینہ کا حاکم تھا، مَیں اس کے ساتھ عید الفطر یا عید الاضحیٰ کی نماز کے لیے نکلا، ہم جب عید گاہ پہنچے تو وہاں مَیں نے کثیر بن صلت کا بنا ہوا ایک منبر دیکھا۔ جاتے ہی مروان نے چاہا کہ نماز سے پہلے اس منبر پر (خطبہ دینے کے لیے) چڑھے، اس لیے مَیں

نے اس کا دامن پکڑ کر کھینچا لیکن وہ جھٹک کر اوپر چڑھ گیا اور نماز سے پہلے خطبہ دیا۔ میں نے اسے کہا:

غیرتم واللہ

''اللہ کی قسم! تم نے (نبی ﷺ کی سنت کو) بدل دیا۔''

مروان نے کہا: ابوسعید! اب وہ زمانہ گزر گیا جسے تم جانتے ہو، ابوسعید نے کہا: اللہ کی قسم! میں جس زمانہ کو جانتا ہوں اس زمانہ سے بہتر ہے جو میں نہیں جانتا۔ مروان نے کہا: ہمارے دور میں لوگ نماز کے بعد نہیں بیٹھتے، لہٰذا میں نے خطبہ کو نماز سے پہلے کر دیا ہے۔''

معلوم ہوا کہ وفات النبی ﷺ کے تقریباً آدھی صدی سے بعد تک نمازِ عید سے پہلے خطبہ دینے کی رسم کا وجود تک نہیں تھا۔ تیس سالہ خلافتِ راشدہ کے بعد بیس سال (۴۱ھ سے ۶۰ھ) تک معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت رہی۔ ۶۰ھ سے ۶۴ھ تک ان کا بیٹا یزید حکمران رہا۔ البتہ مکہ مکرمہ میں اس کی حکومت قائم نہ ہوئی، وہاں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ حکمران تھے۔ یزید کی وفات کے بعد اس کا بیٹا معاویہ ثانی حکمران بنا مگر وہ تین ماہ بعد ہی حکومت سے دستبردار ہوگیا۔ اس کی وفات کے بعد چھ سات ماہ تک تنہا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہی خلیفہ تھے۔ تمام عمال و حکام نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو تسلیم کر لیا تھا۔ چھ سات ماہ کے بعد مروان بن حکم بھرپور کوشش سے ملک شام پر قابض ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ مروان ۶۴ھ کے آخر سے لے کر ۶ رمضان ۶۵ھ (اپنی وفات) تک حکمران رہا۔ یہی مروان تھا جس نے نبی ﷺ کی سنت کو تبدیل کر دیا جس پر ابوسعید رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

غیرتم واللہ

''اللہ کی قسم! تم نے (سنتِ رسول کو) بدل دیا ہے۔''

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے حاکمِ مدینہ کا دامن کھینچا اور اسے خلافِ سنت عمل کرنے سے روکا، کاش! آج بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کی سوچ رکھنے والے افراد ہوں جو لوگوں کو سنت کے خلاف چلنے سے روکیں۔

نوٹ: الناس جلوس علی صفوفهم (لوگ اپنی صفوں میں بیٹھے ہوتے) سے معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ رسالت میں لوگ خطبہ عید سننے سے پہلے نہ جاتے بلکہ جیسے صفیں باندھ کر نماز پڑھتے اسی طرح صفوں میں بیٹھ کر خطبہ عید سنتے تھے۔ اللہ ہمیں توفیق عطا کرے کہ ہم نبی ﷺ کی سنت اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے زندگی گزاریں۔

خواتین کی عیدگاہ حاضری

سوال کیا خواتین کو بھی عیدگاہ جانے کا حکم ہے؟

جواب عہدِ نبوی میں خواتین عید کے لیے عیدگاہ حاضر ہوتی تھیں۔ جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ عید کے دن کھڑے ہوئے، پہلے نماز پڑھائی، پھر خطبہ دیا۔ خطبہ سے فارغ ہو کر اس جگہ سے چلے۔ بلال رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ٹیک لگا کر عورتوں کے پاس تشریف لائے، انہیں نصیحت کی۔ بلال رضی اللہ عنہ اپنا کپڑا پھیلائے ہوئے تھے، خواتین اس میں صدقہ و خیرات (انگوٹھیاں، چھلے، بالیاں، ہار وغیرہ) ڈالنے لگیں۔

(بخاری، العیدین، موعظة الامام النساء یوم العید، ح:٩٧٨)

ایک خاتون نے نبی ﷺ سے پوچھا: اللہ کے رسول ﷺ! اگر ہم میں سے کسی عورت کے پاس چادر نہ ہو تو وہ اگر عید کے لیے نہ نکلے تو کچھ قباحت تو نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

((لِتُلْبِسْهَا صَاحِبَتُهَا مِنْ جِلْبَابِهَا فَلْيَشْهَدْنَ الْخَيْرَ وَ دَعْوَةَ الْمُسْلِمِيْنَ))

(بخاری، العیدین، اذا لم یکن لها جلباب فی العید، ح:٩٨٠)

''اس کی سہیلی اپنی (اضافی) چادر اسے پہنا دے، عورتوں کو لازم ہے کہ خیر (ثواب) کے کام اور مسلمانوں کی دعا میں شامل ہوں۔''

اس حدیث سے عورتوں کو عید کی نماز کے لیے نکلنے کی تاکید معلوم ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ جب عورتیں باہر جائیں تو پردہ کر کے جائیں۔

تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ (پردے کا حکم آ جانے کے بعد) عہدِ نبوی میں اس بات کا تصور نہیں تھا کہ مسلمان عورت چادر کے بغیر گھر سے باہر نکل سکتی ہے، تبھی تو خواتین نے اپنا عذر پیش کیا تھا کہ اگر کسی عورت کے پاس چادر نہ ہو تو وہ کیونکر عید کے لیے جائے؟ اس پر آپ ﷺ

نے فرمایا کہ وہ اپنی سہیلی سے لے لے۔

عورتوں کو عید میں شرکت کی اس قدر تاکید کی گئی ہے کہ نبی ﷺ نے ان مستورات کو بھی عید کے لیے نکلنے کا حکم دیا جنھوں نے اپنے نسوانی عذر کی وجہ سے عید کی نماز نہیں پڑھنا ہوتی۔ ام عطیہ فرماتی ہیں:

''ہمیں اللہ کے رسول ﷺ کا حکم تھا کہ ہم (عید کے دن) نکلیں، پھر ہم حیض والیوں، جوانوں اور پردے والیوں سب کو نکالتے۔ ابن عون نے کہا: یا یوں فرمایا: جوان، پردے والیوں کو مگر ایام ماہواری والی عورتیں صرف مسلمانوں کے گروہ اور دعا میں شریک ہوں اور نماز کی جگہ سے الگ رہیں۔''

(بخاری، العیدین، اعتزال الحیض المصلی، ح:۹۸۱)

اس حدیث سے مسلمانوں کے عید کے اجتماع کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

صوم عاشورہ کے احکام و مسائل

سوال عاشوراء کے روزہ کے بارے میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ منسوخ کر دیا گیا ہے، لہٰذا یہ روزہ رکھنا مکروہ ہے، کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ عاشوراء سے مراد نو محرم ہے۔ لہٰذا اَب نو محرم کا ہی روزہ رکھنا چاہیے۔ بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ دس محرم کے روزے کے ساتھ ساتھ نو محرم کا روزہ بھی رکھنا چاہیے، ان میں سے کون سی بات درست ہے؟

جواب احادیثِ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صوم عاشوراء کا آغاز موسیٰ علیہ السلام سے ہوا تھا، انہیں اس دن اللہ تعالیٰ نے فرعون سے نجات عطا کی تھی تو اُنہوں نے شکرانے کے طور پر روزہ رکھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ مدینہ آئے، آپ نے یہود کو دیکھا کہ وہ یوم عاشوراء کا روزہ رکھتے ہیں، آپ نے ان سے معلوم کیا تو انہوں نے بتایا کہ یہ ایک اچھا دن ہے، اس دن اللہ نے بنی اسرائیل کو اُن کے دشمن سے نجات دی تھی، اس لیے موسیٰ علیہ السلام نے (بطورِ شکر) اس دن کا روزہ رکھا تھا۔ آپ نے فرمایا:

((اَنَا اَحَقُّ بِمُوْسٰی مِنْکُمْ)) فصامه و امر بصيامه

''موسیٰ کا میں تم سے زیادہ حق دار ہوں، لہٰذا آپ نے خود اس دن کا یہ روزہ رکھا

اور یہ روزہ رکھنے کا حکم بھی دیا۔"

(بخاری، الصوم، صیام یوم عاشوراء، ح:۲۰۰۴؛ مسلم، ح:۱۱۳۰؛ ابوداؤد، ح:۲۴۴۴؛ ابن ماجۃ، ح:۱۷۳۴)

احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں قریش بھی یوم عاشوراء کا روزہ رکھتے تھے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ عاشوراء کے دن زمانہ جاہلیت میں قریش روزہ رکھتے تھے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس دن کا روزہ رکھتے۔ جب آپ مدینہ تشریف لائے تو بھی آپ نے یہ روزہ رکھا اور اس کا لوگوں کو بھی حکم دیا مگر جب رمضان فرض ہوا تو یہ دن چھوڑ دیا گیا، اب جس کا جی چاہے اس دن کا روزہ رکھے اور جو چاہے نہ رکھے۔

(بخاری، ایضاً، ح:۲۰۰۲؛ مسلم، ح:۱۱۲۵؛ ابوداؤد، ح:۲۴۴۲، ۲۴۴۳؛ ترمذی، ح:۷۵۳؛ ابن ماجۃ، ح:۱۷۳۷)

احادیث میں اس روزہ کی بہت فضیلت بیان کی گئی ہے، ارشادِ نبوی ہے:

((صِیَامُ یَوْمِ عَاشُوْرَاءَ اَحْتَسِبُ عَلَی اللّٰهِ اَنْ یُّکَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِیْ قَبْلَهٗ)) (مسلم، الصیام، استحباب صیام ثلاثۃ ایام......، ح: ۱۱۶۲)

ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عاشوراء کے روزے کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

((یُکَفِّرُ السَّنَةَ الْمَاضِیَةَ)) (ایضاً)

"یہ روزہ گزرے ہوئے ایک سال کا کفارہ ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ جو اس دن کا روزہ رکھتا ہے اس کے پچھلے ایک سال کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

یہودی اس دن کو عید اور تہوار کے طور پر مناتے تھے جبکہ مسلمانوں کو اس دن کا روزہ رکھنے کا ہی حکم ملا۔ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اہلِ خیبر (یہود) یوم عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے اور اس دن کو عید کا دن بنا لیتے، اپنی عورتوں کو زیورات پہناتے اور انہیں سنوارتے اور سنگارتے تھے تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((فَصُوْمُوْهُ اَنْتُمْ))

(بخاری، الصوم، صوم یوم عاشوراء، ح: ۲۰۰۵؛ مسلم، ح: ۱۱۳۱)

"تم لوگ اس دن کا روزہ (ہی) رکھو۔"

نبی اکرم ﷺ نے نو محرم کا روزہ رکھنے کا بھی عزم ظاہر کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((فَإِذَا كَانَ الْعَامُ الْمُقْبِلُ- إِنْ شَاءَ اللّٰهُ- صُمْنَا الْيَوْمَ التَّاسِعَ))

(مسلم، الصیام، ای یوم یصام فی عاشوراء، ح: ۱۱۳۴، ابوداوٗد، ح: ۲۴۴۵)

"جب آئندہ سال آئے گا تو ہم ان شاء اللہ نو تاریخ کا (بھی) روزہ رکھیں گے۔"

مگر اگلا سال آنے سے پہلے ہی اللہ کے رسول ﷺ کی وفات ہوگئی۔

ایک اور حدیث میں ہے:

((لَئِنْ بَقِيتُ إِلَى قَابِلٍ لَأَصُومَنَّ التَّاسِعَ))

(مسلم، ح: ۱۱۳۴، ابن ماجة، ح: ۱۷۳۶)

"اگر میں آئندہ سال تک زندہ رہا تو نو تاریخ کا ضرور روزہ رکھوں گا۔"

حکم بن اعرج کہتے ہیں: میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا تو آپ زمزم کے کنارے اپنی چادر کا تکیہ بنائے تشریف فرما تھے، میں نے آپ سے عاشوراء کے روزے کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: جب ماہ محرم کا چاند دیکھو تو دن شمار کرتے رہو جب نویں تاریخ ہو تو روزہ رکھو۔ (مسلم، ح: ۱۱۳۳؛ ابوداود، ح: ۲۴۴۶؛ ترمذی، ح: ۷۵۴)

ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس فرمان کا صحیح مفہوم یہی معلوم ہوتا ہے کہ نو محرم کا روزہ رکھا جائے، اس فرمان اور دیگر کسی بھی حدیث میں دس تاریخ کا روزہ منسوخ قرار نہیں دیا گیا۔ بلکہ احادیث سے بالصراحت ثابت ہے کہ عاشوراء کے ساتھ نو محرم کا روزہ بھی شامل کر لیا جائے۔ دریں صورت یہود سے مشابہت نہیں ہوگی۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

((صُومُوا التَّاسِعَ وَالْعَاشِرَ وَ خَالِفُوا الْيَهُودَ))

"نو اور دس محرم کا روزہ رکھو اور یہود کی مخالفت کرو۔"

(السنن الآثار للبیہقی: ۸۹۲۶، ۲/ ۳۵۰، الفتح الربانی ۱/ ۱۸۹، الشیخ احمد عبدالرحمٰن البنا نے اس موقوف روایت کی سند کو صحیح کہا ہے۔)

اس روایت کی وجہ سے امام شوکانی رحمہ اللہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ جو شخص عاشوراء کا روزہ رکھنا چاہتا ہو وہ نو محرم کا روزہ بھی رکھ لے۔ (السیل الجرار ۲/۱۴۸)

بہت سے علماء نے لکھا ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما عاشوراء سے مراد نو محرم لیتے تھے جبکہ یہ غلط فہمی ہے کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما خود فرماتے ہیں:

امر رسول الله ﷺ بصوم عاشوراء یوم العاشر

''اللہ کے رسول ﷺ نے عاشوراء یعنی دسویں تاریخ کو روزہ رکھنے کا حکم دیا تھا۔''

(ترمذی، الصوم، ماجاء فی عاشوراء ای یوم ہو؟ ح:۷۵۵، ترمذی نے اس روایت کو حسن صحیح کہا ہے۔)

جمہور علمائے سلف وخلف اس بات کے قائل ہیں کہ عاشوراء سے مراد محرم کی دسویں تاریخ ہے۔ امام قرطبی نے اس مسئلہ کو کافی وضاحت سے بیان کیا ہے، ان کا میلان اس قول کی طرف ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا پوچھنے والے سے یہ کہنا کہ ''تاریخیں گن لو اور نویں دن روزہ رکھو'' اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ دسویں دن کا روزہ چھوڑ دیا جائے بلکہ اس فرمان کا مقصد یہ تھا کہ دس کے ساتھ ساتھ نو کا روزہ بھی رکھا جائے۔ علماء کا کہنا ہے کہ دونوں دنوں کا روزہ رکھنے سے احادیث میں جمع وتطبیق بھی ہو جاتی ہے۔ (تفسیر القرطبی تفسیر البقرۃ:۵۰)

ابن قدامہ رحمہ اللہ احادیث اور فرامین ابن عباس بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''یہی وجہ ہے کہ نو اور دس تاریخ کا روزہ مستحب ہے......''

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر کسی کو مہینے کی ابتداء کے بارے میں اشتباہ یا شک پایا جاتا ہو تو وہ تین دن کے روزے رکھے، ایسا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ نویں اور دسویں تاریخ کا روزہ یقینی طور پر رکھا جا سکے۔'' (المغنی ۴/۲۳۹، دار الحدیث، القاہرۃ)

اکثر شارحین حدیث اور علماء نے بھی نو اور دس کے روزے کو ترجیح دی ہے:

① امام نووی رحمہ اللہ شرح مسلم (ح:۱۱۳۳) میں لکھتے ہیں: مشاہیر علمائے سلف وخلف کا موقف یہ ہے کہ عاشوراء دسویں تاریخ ہے اور سعید بن مسیب، حسن بصری، امام احمد اور اسحاق رحمہم اللہ کا یہی قول ہے، ظاہر احادیث سے اور مقتضائے لفظ سے یہی ثابت ہوتا ہے، اس

لیے کہ عاشوراء عشر سے مشتق ہے اور عشر دس کو کہتے ہیں اور امام شافعی، ان کے اصحاب، امام احمد، اسحاق رحمۃ اللہ علیہم اور دوسرے علماء کا قول ہے کہ نویں اور دسویں دونوں کا روزہ مستحب ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دسویں کا روزہ رکھا تھا اور نویں تاریخ کو روزہ رکھنے کی نیت کی تھی۔ اتنے میں آپ کی وفات ہوگئی اور حدیث مسلم میں گزرا ہے کہ افضل صیام بعد رمضان کے صیام ((شَهْرُ اللّٰهِ الْمُحَرَّمُ)) ہے اور علماء نے کہا ہے کہ نویں تاریخ کا روزہ ملا لینے سے غرض یہ تھی کہ صرف دسویں کے روزے میں یہود کی مشابہت تھی۔

② حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"بعض اہل علم کے بقول مسلم کی حدیث (آئندہ سال اگر میں زندہ رہا تو نو محرم کا ضرور روزہ رکھوں گا) کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: دس محرم کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نو تاریخ کا روزہ بھی مقرر کرنا چاہتے تھے مگر آپ کسی بھی صورت کو متعین کرنے سے پہلے وفات پا گئے۔ لہٰذا احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ نو اور دس دونوں دنوں کا روزہ رکھا جائے۔" (فتح الباری ۴/۲۷۳)

③ ابوداؤد (۲/۸۵۳، دارالسلام) کے محشی ابو عمار عمر فاروق سعیدی لکھتے ہیں:

"اس فرمان مبارک کا یہ مفہوم ہے کہ ہم نویں تاریخ کا بھی روزہ رکھیں گے، دیگر روایات کی روشنی میں یہی معنی درست ہے......"

جناب عطاء ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں:

"نویں اور دسویں کا روزہ رکھو اور یہود کی مخالفت کرو۔" (البیہقی ۴/۲۸۷)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ کہنا کہ

"جب تم محرم کا چاند دیکھو تو شمار کرو، جب نویں تاریخ آئے تو روزہ رکھو" اس سے مراد یہ نہیں کہ عاشوراء نویں تاریخ کو کہتے ہیں بلکہ ان کی مراد یہ ہے کہ دسویں سے پہلے نویں تاریخ کا روزہ بھی رکھو۔" (از افادات امام ابن قیم)

④ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان بھی دو روزے رکھنے کے موقف کی طرف ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ عاشورے کے دن کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، بعضوں نے کہا نویں تاریخ ہے، بعضوں نے کہا دسویں اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا:

''نویں اور دسویں کو روزہ رکھو اور یہود کی مخالفت کرو۔''

امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور امام اسحاق (رحمہم اللہ) اسی کے قائل ہیں۔

(ترمذی ۱/۲۸۵، اسلامی کتب خانہ لاہور)

⑤ ابن ماجۃ (۱/۶۹۷، ایضا) کی شرح میں مولانا احمد یار لکھتے ہیں:

عاشورہ محرم کا دسواں دن ہے جمہور کا یہی قول ہے اور بعض نے گیارھواں دن کہا ہے۔ محرم کا دسواں دن ہونے کی وجہ سے اسے عاشورہ کہتے ہیں۔ محرم کی نویں اور دسویں تاریخ کو روزہ رکھنا مستحب ہے کیونکہ صرف عاشورہ کا روزہ رکھنے میں یہود کی مشابہت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر اللہ نے چاہا (ان شاء اللہ) تو آئندہ سال نویں تاریخ کو بھی روزہ رکھیں گے لیکن سال آئندہ آنے سے پہلے آپ ﷺ کی وفات ہوگئی، فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ صرف عاشورہ کے دن اکیلا روزہ رکھنا مکروہ ہے اور امامیہ عاشورہ کا روزہ مکروہ جانتے ہیں اور کہتے ہیں امام حسین رضی اللہ عنہ کے غم میں اس دن فاقہ کرنا چاہیے اور ہم کہتے ہیں کہ روزہ رکھنا غم کے خلاف نہیں پس 'ہم خرما وہم ثواب' پر عمل کیوں نہیں کرتے؟

⑥ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کہتے ہیں:

''عاشورہ کا روزہ تین طرح پر ہے ایک افضل وہ یہ کہ نویں سے گیارہویں تک تین روزے رکھے، دوسرے اس سے کم درجے میں، وہ یہ کہ نویں اور دسویں کو رکھے، تیسرے سب سے کم وہ یہ کہ صرف عاشورہ کے دن رکھے۔''

(دیکھیے شرح ابن ماجۃ ۱/۶۹۸)

⑦ مسجد نبوی کے مدرس شیخ ابوبکر جابر جزائری نے بھی محرم کی نو اور دس تاریخ کا روزہ مستحب لکھا ہے اور اس سلسلے میں پیش کی گئی احادیث میں سے ایک کا ترجمہ منہاج المسلم کے مترجم شیخ الحدیث مولانا محمد رفیق اثری نے یوں کیا ہے:

''ان شاء اللہ ہم اگلے سال نو محرم کا (بھی) روزہ رکھیں گے۔''

(منهاج المسلم، ص: ۳۴۸)

بہت سے شارحین اور مترجمین نے دیگر احادیث کو مدنظر رکھتے ہوئے اور احادیث میں تطبیق دینے کے لیے بریکٹوں میں ''بھی'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس حدیث کی شرح میں

شارحین حدیث نے عربی میں جوای معه اور یعنی معه وغیرہ الفاظ استعمال کئے ہیں، یہ ''بھی'' انہی کا ترجمہ ہے۔

⑧ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ نے ریاض الصالحین کی شرح میں یہی موقف اختیار کیا ہے کہ اب دو روزے رکھنے چاہئیں، ۹، ۱۰ محرم یا ۱۰، ۱۱ محرم کا روزہ۔ افسوس کہ مسلمان اس سنت پر تو عمل نہیں کرتے لیکن اپنی طرف سے گھڑی ہوئی بہت سی بدعات پر نہایت سختی سے عمل کرتے ہیں۔ ((لَئِنْ بَقِيتُ إِلَى قَابِلٍ لَأَصُومَنَّ التَّاسِعَ)) والی حدیث کی شرح میں حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

بعض لوگ اس کا مفہوم یہ بیان کرتے ہیں کہ صرف نو محرم کا روزہ رکھوں گا۔ لیکن دوسری حدیث کی رو سے یہ مفہوم صحیح نہیں کیونکہ آپ نے یہود کی مخالفت اختیار کرنے کے لیے دس محرم کے روزے کے ساتھ ایک اور روزہ رکھنے کا عزم ظاہر کیا اور اس کا حکم بھی دیا، جیسا کہ مسند احمد (۲۱/۴) کی روایت ہم نے بیان کی ہے۔ اس لیے اس کا وہی مفہوم صحیح ہے جو ہم نے ترجمے میں اختیار کیا ہے۔

((لَأَصُومَنَّ التَّاسِعَ)) کا ترجمہ محترم حافظ صلاح الدین یوسف نے ''۹، ۱۰ محرم کا روزہ (بھی) ضرور رکھوں گا'' کیا ہے۔ (شرح ریاض الصالحین ۲/۳۴۴)

⑨ امام نووی رحمہ اللہ نے ریاض الصالحین میں عاشوراء کے ساتھ ساتھ تاسوعاء (نویں محرم) کا لفظ بھی استعمال کیا ہے جیسا کہ اس باب سے واضح ہے:

باب فضل صوم يوم عرفة و عاشوراء و تاسوعاء

(ریاض الصالحین: ۲/۳۳۳)

''یوم عرفہ، عاشوراء اور نویں محرم کے روزے کی فضیلت۔''

⑩ آخر میں سابق مفتی اعظم (سعودی عرب) عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ پیش کیا جاتا ہے۔ اُن سے عاشوراء اور ماہِ محرم کے روزوں کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا:

''اللہ کے مہینہ محرم کے متعلق اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں کہ ''رمضان کے

بعد افضل ترین روزے محرم کے ہیں جو کہ اللہ کا مہینہ ہے۔" اس لیے اگر کوئی شخص پورے مہینے کے روزے رکھتا ہے تو بہتر ہے یا نویں اور دسویں یا دسویں اور گیارہویں محرم کے روزے رکھے تو یہ بھی بہتر ہے۔"

(فتاویٰ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمہ اللہ، ص:۳۵۸، دارالداعی، ریاض)

ملاحظہ: صوم عاشوراء کے متعلق روایات کو سامنے رکھتے ہوئے ان سے اس روزے کی چار حالتیں معلوم ہوتی ہیں:

① نبی ﷺ نے مکہ میں یہ روزہ رکھا لیکن لوگوں کو حکم نہیں دیا نیز قریش بھی یہ روزہ رکھتے تھے۔ (بخاری، ح:۲۰۰۲)

② مدینہ آ کر اہلِ کتاب کو یوم عاشورا کی تعظیم میں روزہ رکھتے دیکھا تو اُن کی موافقت میں خود بھی یہ روزہ رکھا اور صحابہ کو بھی حکم دیا کیونکہ جن چیزوں میں اللہ کی طرف سے کوئی حکم نہیں اُترا تھا اُن میں آپ اہلِ کتاب کی موافقت پسند کرتے تھے۔

(بخاری، ح:۲۰۰۴؛ مسلم، ح:۱۱۳۰۔۱۱۳۱)

③ جب ماہِ رمضان کے روزے فرض ہوئے تو آپ نے یہ روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کا اختیار دے دیا۔ (بخاری، ح:۱۸۹۲؛ مسلم، ح:۱۱۲۵)

④ حیاتِ طیبہ کے آخری دَور میں عاشوراء کا روزہ رکھنے والے کے لیے یہود کی مخالفت کا اعلان کیا یعنی اگر کسی نے یہ روزہ رکھنا ہے تو وہ نو محرم کا بھی رکھے۔ واللہ اعلم

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "اسلامی مہینے اور اُن کا تعارف" (محمد ارشد کمال)

شوال کے چھ روزے مسلسل رکھیں یا......

سوال ایک آدمی کے رمضان میں کچھ روزے چھوٹ گئے ہیں۔ اب وہ شوال کے چھ روزے بھی رکھنا چاہتا ہے، کیا پہلے رمضان کے چھوٹے ہوئے روزوں کی قضائی دے گا یا پہلے شوال کے روزے رکھے گا؟

جواب صحیح بات یہی ہے کہ جو فرض روزے چھوٹ گئے ہیں ان کی قضا کسی بھی نفلی روزے سے پہلے دے دی جائے؛ کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمانِ گرامی ہے:

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ اَتْبَعَهُ سِتًّا مِّنْ شَوَّالٍ كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ))

(مسلم، الصیام، استحباب صوم ستة ایام من شوال، ح: ۱۱۶۴)

"جس نے رمضان کے روزے رکھ کر بعد میں شوال کے چھ روزے بھی رکھے اس کا یہ عمل ایسے ہوگا جیسے وہ ہمیشہ روزے دار رہا ہو۔"

حدیث میں ((ثُمَّ اَتْبَعَهُ)) کے الفاظ ہیں۔ جن کا معنی ہے کہ ان چھ روزوں کو رمضان کے روزوں کے پیچھے لگا دیا، اب جس نے شوال کے چھ روزے پہلے رکھ لیے اور رمضان کے روزوں کی قضا بعد میں دی اس نے شوال کے چھ روزوں کو رمضان کے روزوں کے پیچھے نہیں لگایا بلکہ کچھ روزوں کے آگے کر دیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ قضا فرض ہوتی ہے جبکہ شوال کے روزے نفل ہیں، اور فرض کا اہتمام نفل کی بہ نسبت زیادہ ہونا چاہیے۔

(فتاویٰ علامہ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمہ اللہ)

شوال کے چھ روزوں کا وقت

سوال شوال کے چھ روزے پورے مہینے میں جب بھی چاہے رکھے جا سکتے ہیں یا کہ ان کا کوئی خاص وقت ہے؟

جواب اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان گرامی ہے:

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ اَتْبَعَهُ سِتًّا مِّنْ شَوَّالٍ كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ))

(مسلم، الصیام، استحباب صوم ستة ایام من شوال، ح: ۱۱۶۴)

"جس نے رمضان کے روزے رکھے پھر اس کے بعد چھ روزے شوال کے بھی رکھے، اس کا یہ عمل ایسے ہو جائے گا جیسے اس نے ہمیشہ روزے رکھے۔"

ان روزوں کے لیے کوئی خاص دن مقرر نہیں ہیں بلکہ پورے مہینے میں جن دنوں چاہے رکھ سکتا ہے، چاہے آغاز میں رکھ لے، چاہے درمیان میں رکھ لے، چاہے آخر میں رکھ لے، پھر چاہے مسلسل رکھ لے، چاہے تو متفرق طور پر رکھ لے، اس میں الحمدللہ ہر طرح کی گنجائش ہے۔ البتہ اگر مہینے کے شروع ہی میں اس سے جلدی جلدی سبکدوش ہونا چاہے تو یہ زیادہ بہتر ہے، کیونکہ یہ روش نیکیوں میں سبقت کے ضمن میں آجاتی ہے۔

(فتاویٰ علامہ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمہ اللہ)

ایک دفعہ شوال کے روزے رکھنے سے ان کی فرضیت!

سوال اگر کوئی ایک دفعہ شوال کے چھ روزے رکھ لے تو کیا یہ اس پر فرض ہو جاتے ہیں؟

جواب ایک دفعہ رکھنے سے پھر ہمیشہ کے لیے فرض نہیں ہو جاتے بلکہ اگر کسی سال چھوڑنا بھی چاہے تو چھوڑ سکتا ہے، لیکن یہاں زیادہ بہتر چیز دیکھنی پڑے گی، اور وہ ہے دوام اور استمرار؛ کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمانِ گرامی ہے:

((اَحَبُّ الْعَمَلِ اِلَى اللّٰهِ مَا دَاوَمَ عَلَيْهِ صَاحِبُهُ اِنْ قَلَّ))

(مسلم ، الصیام ، صیام النبی ﷺ فی غیر رمضان ، ح: ۷۸۲)

''اللہ کے نزدیک پسندیدہ ترین عمل وہ ہے جس پر صاحبِ عمل ہمیشگی کرے اگرچہ وہ کم ہی کیوں نہ ہو۔'' (فتاویٰ علامہ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمہ اللہ)

شوال کے چھ روزوں کی عید؟

سوال ہمارے محلے کی بعض خواتین شوال کے چھ روزے رکھنے کے بعد سات شوال کو عید کرتی ہیں، عید کی نماز تو نہیں پڑھتیں مگر سویاں اور پھوینیاں وغیرہ پکا کر عید کا سا رنگ ڈھنگ اپناتی ہیں، ان کا یہ طرزِ عمل کیسا ہے؟

جواب عیدالفطر کے بعد شوال کے چھ روزوں کی بہت زیادہ فضیلت احادیث میں بیان ہوئی ہے مگر یہ لگاتار رکھنا ضروری نہیں ہیں، مزید برآں یہ روزے نفل ہیں فرض نہیں۔ شریعت میں نفل روزوں کے بعد عید کرنے کا تصور ہی نہیں نیز عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے علاوہ کوئی تیسری عید نہیں۔

حج بیت اللہ
کے
احکام ومسائل

قبلہ کی طرف پاؤں کرنا؟

سوال کیا بیت اللہ کی طرف پاؤں کر کے بیٹھنا یا لیٹنا بے ادبی ہے جیسا کہ پاک وہند میں عام طور پر لوگوں کا خیال ہے؟ کیا یہ شرعی طور پر ممنوع ہے؟

جواب اگر کوئی شخص نفرت کی وجہ سے بیت اللہ کی طرف پاؤں پھیلاتا ہے تو یہ شعائر اللہ کی تعظیم کے خلاف ہے۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو بیت اللہ کی طرف پاؤں کرنے یا ہو جانے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ بے ادبی کے زُمرے میں نہیں آتا۔ ہاں اگر کوئی تقویٰ کی وجہ سے بیت اللہ کی طرف پاؤں نہ کرے تو اور بات ہے۔

قبلہ کی طرف پاؤں کرنا بے ادبی ہوتا تو کسی بھی صورت میں اس کی طرف پاؤں کرنے کی اجازت نہ ہوتی حالانکہ بعض دفعہ نماز پڑھتے وقت پاؤں کعبہ کی طرف کیے جاتے ہیں۔ کعبہ کے اندر نماز پڑھنا سنت ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بیت اللہ کی طرف پاؤں کرنا بے ادبی نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو کعبہ میں نماز پڑھنا ہرگز جائز نہ ہوتا۔

نماز کھڑے ہو کر پڑھنی چاہیے، اگر آدمی کھڑا نہ ہو سکتا ہو تو بیٹھ کر پڑھے، اگر بیٹھ کر بھی نہ پڑھ سکتا ہو تو لیٹ کر پڑھے۔

(بخاری، التقصیر، اذا لم یطق قاعدا فصلی علی جنب، ح:۱۱۱۷)

اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ نمازی دائیں پہلو پر لیٹتا ہے اور اس کا منہ قبلہ کی طرف ہوتا ہے۔ اگر وہ ایک پہلو پر نہ لیٹ سکتا ہو تو گدّی کے بل سیدھا لیٹ کر نماز پڑھے۔

اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ چت لیٹنے کی وجہ سے آدمی کے پاؤں قبلے کی طرف ہوتے ہیں۔

(فقہ السنۃ از سید سابق)

ٹانگیں قبلے کی جانب بچھی ہوئی ہوتی ہیں اور سر کو تھوڑا سا اونچا کیا جاتا ہے تاکہ چہرہ بھی قبلہ کی جانب ہو جائے۔

حکومتی خرچ یا بنولنٹ فنڈ سے ادا کیے گئے حج کا حکم

سوال حکومت کسی فرد کو حج پر بھیجتی ہے یا پھر سرکاری ملازمین کے فلاحی فنڈ (بنولنٹ فنڈ برائے گورنمنٹ سرونٹس) سے حکومت ہر سال چند ملازمین کے حج کے لیے اخراجات دیتی

ہے۔ یاد رہے یہ فلاح و بہبود فنڈ ہر ملازم کی تنخواہ سے ۲% کے حساب سے ماہانہ کٹوتی کیا جاتا ہے۔ کیا حکومتی بہبود فنڈ سے ادا کئے ہوئے حج سے فریضہ حج ادا ہو جاتا ہے؟ یہ فنڈ ملازمین کا مشترکہ ہوتا ہے۔ تمام ملازمین کی رضامندی شامل نہیں ہوتی۔

جواب حکومت اگر کسی کو حج پر بھیجتی ہے تو اس شخص کا حج ادا ہو جاتا ہے۔ البتہ حکومت کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ امانت و دیانت کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھے اور ایسے افراد کو اپنے خرچ سے حج پر نہ بھیجے جو اپنی استطاعت سے حج کر سکتے ہوں یا حج کرنا ہی نہ چاہتے ہوں محض سیر و تفریح کی غرض سے جانا چاہتے ہوں جیسے ڈیلیگیشن (Delegation) حج میں عموماً ہوتا ہے۔ مگر جو لوگ حج کی تڑپ دلوں میں لیے ہوئے ہوں لیکن استطاعت نہ رکھتے ہوں تو ایسے افراد زیادہ استحقاق رکھتے ہیں کہ انہیں حج کروایا جائے اور ان کا حج صحیح ہوگا۔

اگر کوئی ادارہ اپنے قواعد و ضوابط کے مطابق ہر ملازم کی تنخواہ سے فلاحی فنڈ کی مد میں ۲ فیصد کٹوتی کرتا ہے اور پھر اس فنڈ سے بعض ملازمین کو حج پر روانہ کر دیتا ہے تو اس سے فریضہ حج ادا ہو جاتا ہے۔ رہی یہ بات کہ افراد کا چناؤ کیسے کیا جائے؟ اس کے لیے کوئی بھی مناسب طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ قرعہ اندازی بھی کی جا سکتی ہے۔ بعض ادارے سروس میں یا عہدے کے اعتبار سے اعلیٰ ترین اشخاص کو حج پر بھیجتے ہیں بشرطیکہ انہوں نے پہلے حج نہ کیا ہو۔ اس بات سے فریضہ حج کی ادائیگی میں فرق نہیں پڑتا کہ اس میں تمام ملازمین کی رضامندی شامل نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ بات تو معاہدے (Agreement) میں داخل ہوتی ہے۔ مزید برآں بنولنٹ فنڈ (BF) کے مصارف متعین ہیں اور ہر ملازم کو تقرری کے وقت سے علم ہوتا ہے۔ اور سروس کے لیے Join کرنا ہی ادارے کے قواعد و ضوابط پر رضامندی ہے۔ یا یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جب ایک بات پہلے سے طے ہے اور ملازم نے اس پر اتفاق بھی کیا ہے تو پھر اس کی رضامندی کا شامل نہ ہونا چہ معنی دارد؟

پیر کے حج نہ کرنے سے مرید سے حج کا سقوط؟

سوال میں نے ایک صاحب سے کہا: آپ مالدار ہیں مگر حج نہیں کرتے؟ موصوف نے جواب دیا: چونکہ میرے پیر و مرشد نے (استطاعت ہونے کے باوجود) ابھی تک حج نہیں

کیا اس لیے مجھ پر حج فرض نہیں! پیر اگر حج نہ کرے تو کیا اس کے صاحبِ استطاعت مریدوں پر بھی حج فرض نہیں ہوتا؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں راہنمائی کریں۔

جواب صاحبِ استطاعت مسلمان پر حج فرض ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فِيهِ ءَايَٰتٌۢ بَيِّنَٰتٌ مَّقَامُ إِبْرَٰهِيمَ ۖ وَمَن دَخَلَهُۥ كَانَ ءَامِنًا ۗ وَلِلَّهِ عَلَى ٱلنَّاسِ حِجُّ ٱلْبَيْتِ مَنِ ٱسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۚ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ ٱللَّهَ غَنِىٌّ عَنِ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴾ (۳/آل عمرٰن:۹۷)

''اس میں واضح نشانیاں ہیں، مقامِ ابراہیم ہے، اس میں جو آ جائے امن والا ہو جاتا ہے، اللہ نے ان لوگوں پر جو اس کی طرف راہ پا سکتے ہوں اس گھر کا حج فرض کر دیا ہے، اور جو کوئی کفر کرے تو اللہ (اس سے بلکہ) تمام دنیا سے بے پرواہ ہے۔''

استطاعت میں پیرومرشد کا حاجی ہونا شامل نہیں۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

((أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ فُرِضَ عَلَيْكُمُ الْحَجُّ فَحُجُّوا))

(مسلم، الحج، فرض الحج مرة فى العمر، ح:۱۳۳۷)

''لوگو! تم پر حج فرض کیا گیا ہے لہٰذا تم حج کرو۔''

ایک لمبی حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں:

((وَتَحُجَّ الْبَيْتَ إِنِ اسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيلًا)) (ایضاً، الایمان، ح:۸)

''اگر تجھے بیت اللہ کی طرف جانے کی طاقت ہے تو اس کا حج کر۔''

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ أَرَادَ الْحَجَّ فَلْيَتَعَجَّلْ فَإِنَّهُ قَدْ يَمْرَضُ الْمَرِيضُ وَتَضِلُّ الضَّالَّةُ وَتَعْرِضُ الْحَاجَةُ)) (ابن ماجة، المناسك، الخروج الى الحج، ح:۲۸۸۳)

''جو حج کرنے کا ارادہ رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ جلدی کرے کیونکہ آدمی بیمار بھی ہو سکتا ہے، سواری ہاتھوں سے نکل سکتی ہے یا کوئی اور حاجت رکاوٹ بن

سکتی ہے۔"

امام ابن قدامہ نے لکھا ہے:

واجمعت الامة على وجوب الحج على المستطيع فى العمر مرة واحدة (المغنى ٥/٦)

"صاحبِ استطاعت پر عمر میں ایک بار حج واجب ہے، اس پر امت کا اجماع ہے۔"

یہ بات بھی ثابت ہے کہ جس سال حج فرض ہوا۔ (حج ۹ھ کو فرض ہوا۔ مرعاۃ المفاتیح) تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امارت میں حج ادا کیا۔

(نسائی، مناسك الحج، الخطبة قبل يوم التروية، ح:٢٩٩٣)

جب کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حج (حجۃ الوداع) ۱۰ھ میں ادا کیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ سمیت بہت سے صحابہ کرام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے حج کر چکے تھے۔ ان استطاعت رکھنے والے صحابہ نے تو یہ نہ کہا کہ ہم پر ابھی حج فرض نہیں ہوا۔ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم حج کریں گے تب ہم کریں گے۔

سید الاولین والآخرین کے مقابلے میں ان پیروں کی حیثیت ہی کیا ہے؟ لہٰذا ان بے عملوں کے حج نہ کرنے سے مریدوں سے حج ساقط نہیں ہوتا۔

فرضیتِ حج کی شرائط

سوال مسلمان پر حج فرض ہونے کی کیا شرائط ہیں؟

جواب قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں حج اس شخص پر فرض ہوتا ہے جو استطاعت رکھتا ہو۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ (۳/آل عمران:۹۷)

"لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس کے گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں وہ اس کا حج کریں۔"

(اللہ تعالیٰ کا حق لوگوں کا فرض بنتا ہے۔) یعنی حج صاحبِ استطاعت پر فرض ہے۔

استطاعت میں زادِ راہ سرِ فہرست ہے یعنی آدمی کے پاس اتنی دولت ہو کہ وہ مکہ مکرمہ کی

آمد و رفت اور وہاں پر قیام کے اخراجات کے لیے کافی ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ ﴾ (۲/البقرۃ:۱۹۷)

''اور سفر خرچ اپنے ساتھ رکھو۔ بہتر زادِ راہ تقویٰ ہے۔''

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

كان اهل اليمن يحجون ولايتزودون ويقولون نحن المتوكلون فاذا قدموا مدينة سالوا الناس فانزل الله تعالىٰ: ﴿ وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ ﴾

(بخاری ، الحج ، قول الله تعالىٰ: ﴿ وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ ﴾)

''یمن کے لوگ راستہ کے خرچ ساتھ لائے بغیر حج کے لیے آجاتے تھے، کہتے تو یہ تھے کہ ہم توکل کرتے ہیں لیکن جب مدینہ آتے تو لوگوں سے مانگنے لگتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: ﴿ وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ ﴾ ''اور توشہ لے لیا کرو کہ سب سے بہتر توشہ تو تقویٰ ہی ہے۔''

اس آیت میں تقویٰ سے مراد سوال کرنے سے بچنا مراد ہے۔

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قيل يا رسول الله ما السبيل قال: ((الزَّادُ وَالرَّاحِلَةُ))

(دار قطنی ۲/ ۲۱۷؛ ابن ماجة ، ح:۲۸۹۷)

''اللہ کے رسول سے پوچھا گیا کہ السبیل سے کیا مراد ہے؟ (ارشاد باری تعالیٰ ﴿ وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ﴾ (۳/ آل عمرٰن:۹۷) کی طرف اشارہ ہے) آپ نے فرمایا: زادِ راہ اور سواری۔''

سواری اپنی ہو یا کرائے کی یا کار، بس، بحری جہاز اور ہوائی جہاز وغیرہ کا خرچ برداشت کر سکتا ہو۔

حج کے لیے جانے والی اگر عورت ہو تو اس کے خاوند یا اس کے کسی محرم کا اس کے ساتھ

ہونا ضروری ہے،عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: میں نے نبی ﷺ کو خطبہ دیتے ہوئے سنا،آپ فرمارہے تھے:

((لَا يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إِلَّا وَمَعَهَا ذُو مَحْرَمٍ وَلَا تُسَافِرِ الْمَرْأَةُ إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ))

"مرد کسی غیر عورت کے ساتھ اس کے محرم کی موجودگی کے بغیر ہرگز تنہائی میں نہ ہو اور نہ کوئی عورت بغیر کسی ذی محرم کو ساتھ لیے سفر ہی کرے۔"

ایک آدمی کھڑا ہو کر عرض کرنے لگا: اللہ کے رسول! میرا نام مجاہدین کی فہرست میں آیا ہے اور میری بیوی حج کے لیے جارہی ہے؟ آپ نے فرمایا:

((انْطَلِقْ فَحُجَّ مَعَ امْرَأَتِكَ))

(مسلم، الحج، سفر المرأة مع محرم الى الحج وغيره، ح:١٣٤١)

"جاؤ تم اپنی اہلیہ کے ساتھ حج کرو۔"

بیوہ کے لیے ایک شرط یہ ہے کہ اس کی عدت ختم ہو تو پھر حج کرے، دورانِ عدت حج نہ کرے۔سعید بن مسیب بیان کرتے ہیں:

ان عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ كان يرد المتوفى عنهن ازواجهن من البيداء يمنعهن الحج

(موطاامام مالك ، الطلاق، مقام المتوفى عنها زوجها ......، ح:١٢٥٥)

"عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ان بیواؤں کو جن کی عدت وفات پوری نہ ہوئی ہوتی تھی، بیداء سے واپس بھیج دیتے تھے۔آپ انہیں حج سے روک دیتے تھے۔"

اسی طرح راستے کا پُرامن ہونا بھی استطاعت میں شامل ہے۔بیت اللہ تک جانے اور آنے کا سفر پُرامن ہو، کسی جانی یا مالی نقصان کا خطرہ غالب نہ ہو۔

جسمانی معذوری یا بیماری کی شکل میں صاحبِ استطاعت حجِ بدل کروا سکتا ہے۔

مزدلفہ کی رات کنکریاں مارنا؟

سوال: کیا مزدلفہ کی رات سورج نکلنے سے پہلے جمرات کو کنکریاں مار لینا درست ہے؟

جواب: مزدلفہ سے منیٰ کی طرف فجر کی نماز پڑھ کر طلوعِ آفتاب سے پہلے پہلے روانہ ہو جانا سُنّت ہے۔ طلوعِ آفتاب کے بعد چلنا زمانہ جاہلیت کے لوگوں کا طریقہ تھا۔

خواتین اور دیگر معذور افراد کو اجازت ہے کہ وہ تھوڑی دیر مزدلفہ میں ٹھہریں اور پھر منیٰ کی طرف روانہ ہو جائیں، وہ لوگ جو خواتین اور دیگر معذوروں کے ساتھ ہوتے ہیں انہیں پہلے روانہ ہو جانے کی اجازت ہے۔ یہ سب لوگ اگر رات کو ہی منیٰ پہنچ کر کنکریاں مار لیں تو ان کی رمی درست ہوگی۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنے گھر کے کمزور افراد کو پہلے ہی بھیج دیا کرتے تھے اور وہ رات ہی کو مزدلفہ میں مشعر الحرام کے پاس آ کر ٹھہرتے اور اپنی استطاعت کے مطابق اللہ کا ذکر کرتے۔ پھر امام کے ٹھہرنے اور لوٹنے سے پہلے ہی (منیٰ) آ جاتے تھے۔ بعض تو فجر کی نماز کے وقت منیٰ پہنچتے اور بعض اس کے بعد۔ جب وہ منیٰ پہنچتے تو کنکریاں مارتے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب لوگوں کے لیے یہ اجازت دی ہے۔

(بخاري، الحج، من قدم ضعفة اهله بليل ...، ح:١٦٧٦)

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

مَیں ان لوگوں میں سے تھا جنہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر کے کمزور افراد کے ساتھ مزدلفہ کی رات ہی میں منیٰ بھیج دیا تھا۔ (ایضاً، ح:١٦٧٨)

اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہما بھی رات کو کنکریاں مار کر واپس آ گئی تھیں۔ اس سلسلے میں صحیح بخاری کے مذکورہ بالا باب میں رمت الجمرة کے الفاظ موجود ہیں۔

جمرات کے پاس دعا مانگنا

سوال: جمرات میں سے کس کس جمرہ کے پاس دعا کرنا مشروع ہے؟

جواب: جمرہ اولیٰ اور جمرہ وسطیٰ کو کنکریاں مارنے کے بعد تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر دعا کرنا مسنون ہے۔ چنانچہ حدیثِ نبوی ہے کہ اللہ کے رسول جب اس جمرہ کی رمی کرتے جو منیٰ کی

مسجد کے قریب ہے تو سات کنکریوں سے رمی کرتے اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہتے۔ پھر آگے بڑھتے اور قبلہ رُخ کھڑے ہوکر دونوں ہاتھ اٹھا کر دعائیں کرتے تھے۔ پھر دوسرے جمرے (وسطیٰ) کے پاس آتے، یہاں بھی سات کنکریوں سے رمی کرتے اور ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہتے۔ پھر بائیں طرف نشیبی جگہ اتر جاتے اور وہاں بھی قبلہ رُخ کھڑے ہوتے اور ہاتھوں کو اُٹھا کر دعا کرتے رہتے۔ پھر جمرہ عقبہ کے پاس آتے، یہاں بھی سات کنکریوں سے رمی کرتے اور ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہتے۔ اس کے بعد واپس ہوجاتے۔ یہاں آپ دعا کے لیے ٹھہرتے نہیں تھے۔ زہری کہتے ہیں: میں نے سالم سے سنا، وہ بھی اسی طرح اپنے والد (ابن عمر رضی اللہ عنہ) سے نبی ﷺ کی حدیث بیان کرتے تھے اور یہ کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما خود بھی اسی طرح کیا کرتے تھے۔ (بخاری، الحج، الدعاء عند الجمرتین، ح:۱۷۵۳)

اس حدیث میں ہر کنکری مارتے وقت تکبیر کہنے کی مشروعیت کا ذکر ہے اور اس پر اجماع ہے کہ اگر کسی نے اسے ترک کردیا تو اس پر کچھ لازم نہیں آئے گا، مگر ثوری کہتے ہیں کہ وہ مسکینوں کو کھانا کھلائے گا اور اگر دم (کفارہ) دے تو زیادہ بہتر ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سات کنکریوں سے رمی کرنا مشروع ہے۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ رمی کے بعد قبلہ رُخ ہوکر کافی دیر تک کھڑے کھڑے دعا مانگنا بھی مشروع ہے۔ یہاں تک کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما دونوں جمروں کے نزدیک اتنی دیر تک کھڑے رہتے جتنی دیر میں سورۃ البقرۃ کی تلاوت کی جاتی ہے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس وقت دعا میں ہاتھ اٹھانا بھی مشروع ہے اور یہ بھی کہ جمرہ عقبہ کے پاس نہ تو قیام کیا جاتا ہے اور نہ دعا کرنا ثابت ہے۔ وہاں سے کنکریاں مارتے ہی واپس ہوجانا چاہیے۔ (فتح الباری)

قربانی کرنے سے پہلے سرمنڈانا؟

سوال اگر حاجی قربانی کرنے سے پہلے سرمنڈالے تو کیا اس پر فدیہ لازم آتا ہے؟

جواب صورتِ مسئولہ میں حاجی اگر لاعلمی یا بھول کر ایسا کرلے تو اس پر فدیہ یا گناہ نہیں ہوگا۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ سے قربانی

کے دن منیٰ میں مسائل پوچھے جاتے اور آپ فرماتے جاتے کہ کوئی حرج نہیں۔ ایک شخص نے پوچھا: مَیں نے قربانی کرنے سے پہلے سر منڈالیا ہے تو آپ نے فرمایا:

((اذْبَحْ وَلَا حَرَجَ))

''(اب) قربانی کرلو، کوئی حرج نہیں۔''

اس نے (یہ بھی) پوچھا: مَیں نے کنکریاں شام ہونے سے بعد ہی ماری ہیں تو بھی آپ نے فرمایا:

((لَا حَرَجَ)) ''کوئی حرج نہیں۔''

(بخاری، الحج، اذا رمی بعد ما امسی او حلق قبل ان یذبح ناسیا او جاھلا، ح:۱۷۳۵)

حجِ بدل کا ثبوت اور شرائط

سوال کیا شریعت میں حجِ بدل کا کوئی ثبوت ملتا ہے؟ نیز اس کے لیے کیا شرائط ہیں؟

جواب حج بدل کئی احادیث سے ثابت ہے، خثعم قبیلہ کی عورت کا ذکر حدیث میں موجود ہے، اس نے نبی اکرم ﷺ سے حجۃ الوداع کے موقع پر سوال کیا:

یا رسول اللہ ان فریضۃ اللہ علی عبادہ فی الحج ادرکت ابی شیخا کبیرا لایستطیع ان یستوی علی الراحلۃ فھل یقضی عنہ ان احج عنہ؟ قال: ((نَعَمْ))

(بخاری، جزاء الصید، الحج عمن لا یستطیع الثبوت عنی الراحلۃ، ح:۱۸۵۴، حج المرأۃ عن الرجل، ح: ۱۸۵۵)

''اللہ کے رسول ﷺ! اللہ کی طرف سے فریضہ حج، جو اس کے بندوں پر ہے، اس نے میرے بوڑھے والد کو پالیا ہے لیکن ان میں اتنی سکت نہیں کہ وہ سواری پر بھی بیٹھ سکیں۔ اگر مَیں ان کی طرف سے حج کرلوں تو کیا ان کا حج ادا ہو جائے گا؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔''

ابنِ عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں ایک آدمی نبی ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا: میری

بہن نے نذر مانی تھی کہ حج کرے گی لیکن اس کا انتقال ہو گیا ہے؟ نبی ﷺ نے فرمایا:

((لَوْ كَانَ عَلَيْهَا دَيْنٌ أَكُنْتَ قَاضِيَهُ؟)) قال: نعم قال: ((فَاقْضِ اللّٰهَ فَهُوَ أَحَقُّ بِالْقَضَاءِ))

(بخاری، الایمان والنذور، من مات وعلیه نذر، ح:٦٦٩٩)

''اگر اس پر کوئی قرض ہوتا تو کیا تم اسے ادا کرتے؟ اس نے عرض کی: ضرور ادا کرتا۔ آپ نے فرمایا: اللہ کا قرض بھی ادا کرو کیونکہ وہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کا قرض پورا ادا کیا جائے۔''

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی مروی ایک روایت میں ہے:

جہینہ قبیلہ کی ایک عورت نبی ﷺ کے پاس آئی اور عرض کرنے لگی: میری والدہ نے حج کی نذر مانی تھی مگر حج کرنے سے پہلے ہی فوت ہو گئی، کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا:

((نَعَمْ حُجِّي عَنْهَا أَرَأَيْتِ لَوْ كَانَ عَلَى أُمِّكِ دَيْنٌ أَكُنْتِ قَاضِيَةً؟ اِقْضُوا اللّٰهَ فَاللّٰهُ أَحَقُّ بِالْوَفَاءِ))

(بخاری، جزاء الصید، الحج والنذور عن المیت والرجل یحج عن المرأة، ح:١٨٥٢)

''ہاں آپ اس کی طرف سے حج کریں۔ اگر آپ کی ماں پر قرض ہوتا تو کیا آپ اسے ادا نہ کرتیں؟ اللہ کا قرض ادا کرو۔ اللہ وفا کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔''

عبداللہ بن بریدہ اپنے باپ (بریدہ رضی اللہ عنہ) سے بیان کرتے ہیں:

میں ایک دفعہ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عورت آپ کے پاس آئی اور عرض گزار ہوئی:

میں نے ایک لونڈی بطور صدقہ اپنی والدہ کو دی تھی۔ اب والدہ وفات پا گئی ہیں۔ آپ نے فرمایا:

((وَجَبَ أَجْرُكِ وَرَدَّهَا عَلَيْكِ بِالْمِيرَاثِ))

''آپ کو اجر بھی مل گیا ہے۔ اور بطور وراثت وہ لونڈی آپ کو دوبارہ مل

چکی ہے۔"

اس عورت نے کہا: میری والدہ کے ذمے ایک ماہ کے روزے بھی ہیں۔ کیا میں اس کی طرف سے روزے رکھ لوں؟ آپ نے فرمایا:

((صُومِي عَنْهَا))

"اس کی طرف سے روزے رکھ لو۔"

وہ عورت عرض کرتی ہے: اس نے تو حج بھی نہیں کیا، کیا میں اس کی طرف سے حج کر لوں؟ آپ نے فرمایا:

((حُجِّي عَنْهَا)) (مسلم ، الصيام ، قضاء الصوم عن الميت ، ح:١١٤٩)

"اس کی طرف سے تم حج کر لو۔"

ابورزین بن عقیلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا:

اللہ کے رسول! میرے والد بہت بوڑھے ہیں، وہ حج وعمرہ ادا نہیں کر سکتے کیونکہ وہ سواری نہیں کر سکتے۔ آپ نے فرمایا:

((حُجَّ عَنْ أَبِيكَ وَاعْتَمِرْ))

(نسائي ، الحج ، العمرة عمن لا يستطيع الحج ، ح:٢٦٣٧)

"تم اپنے باپ کی طرف سے حج اور عمرہ ادا کرو۔"

ایک اور حدیث میں ہے:

نبی ﷺ نے ایک شخص کو سنا وہ لبیک پکارتے وقت شبرمہ نامی آدمی کی طرف سے لبیک کہہ رہا ہے۔ آپ نے اس سے پوچھا:

((مَنْ شُبْرُمَةُ؟))

"شبرمہ کون ہے؟"

اس نے کہا: شبرمہ میرا بھائی یا عزیز ہے۔ آپ نے اس سے دریافت کیا:

((حَجَجْتَ عَنْ نَفْسِكَ؟))

"تم نے کبھی اپنا حج ادا کیا ہے؟"

اس نے کہا: نہیں آپ نے فرمایا:

((حُجَّ عَنْ نَفْسِكَ ثُمَّ حُجَّ عَنْ شُبْرُمَةَ))

(ابوداوٗد، المناسك، الرجل يحج عن غيره، ح:۱۸۱۱)

"پہلے اپنا حج ادا کر لو پھر (آئندہ سال) شبرمہ کی طرف سے ادا کرنا۔"

مذکورہ بالا احادیث سے درج ذیل مسائل معلوم ہوتے ہیں:

① حج بدل معتبر احادیث سے ثابت ہے۔

② عہد نبوی میں صحابہ رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں حج بدل کیا کرتے تھے۔

③ وہ امیر آدمی جو استطاعت رکھتا ہو مگر سفر کرنے سے معذور ہو اُس کی طرف سے حج ادا کرنے کا حکم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے۔

④ حج بدل جس طرح زندہ شخص کی طرف سے ادا کیا جاتا ہے اسی طرح فوت شدہ کی طرف سے بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔

⑤ مرد مرد کی طرف سے، عورت عورت کی طرف سے، عورت مرد کی طرف سے اور اسی طرح مرد عورت کی طرف سے حج ادا کر سکتا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تبویب میں بھی اسے واضح کیا ہے۔

⑥ جس کی طرف سے حج کیا جا رہا ہو تلبیہ میں اسی کا نام پکارا جائے گا جیسا کہ لبيك عن شبرمة سے ظاہر ہے۔

⑦ حج بدل کے لیے ایک اہم شرط یہ ہے کہ حج بدل کرنے والا پہلے خود حج کر چکا ہو۔

حجِ بدل کون کر سکتا ہے؟

سوال حج بدل کرنے والے کے لیے کیا ضروری ہے کہ اس نے پہلے حج کیا ہوا ہو؟

جواب وہ لوگ جو کسی جسمانی عذر کی وجہ سے حج نہ کر سکتے ہوں وہ دوسرے شخص سے حجِ بدل کروا سکتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص انتہائی ضعیف ہے، وہ ضعف کی وجہ سے خود حج نہیں کر سکتا تو اس کی طرف سے حجِ بدل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایک عورت نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حجۃ الوداع میں سوال کیا:

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ کی طرف سے فریضہ حج، جو اُس کے بندوں پر ہے، اس نے

میرے بوڑھے باپ کو بھی پالیا ہے لیکن ان میں اتنی سکت نہیں کہ وہ سواری پر بھی بیٹھ سکیں۔کیا میں اُن کی طرف سے حج کرسکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا:

((نَعَمْ)) ''ہاں۔''

(بخاری، جزاء الصید، الحج عمن لا یستطیع الثبوت علی الراحلة، ح:۱۸۵۴)

مگر حجِ بدل کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ اس نے پہلے اپنا فرض حج ادا کرلیا ہو۔کیونکہ جب وہ وہاں پہنچے گا تو اس پر حج فرض ہوجائے گا،لہٰذا وہ اپنے اوپر عائد ہونے والے فرض کی ادائیگی کرلے گا تو پھر دوسرے کی طرف سے حج کرسکتا ہے۔اور ایک سال میں ایک حج ہی ہوسکتا ہے۔چنانچہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو سنا کہ وہ شبرمہ نامی آدمی کی طرف سے لبیک کہہ رہا ہے۔آپ نے پوچھا:

((مَنْ شُبْرُمَةُ؟))

''یہ شبرمہ کون ہے؟''

اس نے کہا:شبرمہ میرا بھائی یا عزیز ہے۔

آپ نے اس سے دریافت کیا:

((حَجَجْتَ عَنْ نَفْسِكَ؟))

''تم نے کبھی اپنا حج ادا کیا ہے؟''

اس نے کہا:نہیں۔

آپ نے فرمایا:

((حُجَّ عَنْ نَفْسِكَ ثُمَّ حُجَّ عَنْ شُبْرُمَةَ))

(ابو داود، المناسك، الرجل يحج عن غيره، ح:۱۸۱۱)

''پہلے اپنا حج ادا کرلو پھر (آئندہ سال) شبرمہ کی طرف سے ادا کرلینا۔''

لہٰذا حجِ بدل کے لیے ایسے شخص کو متعین کرنا چاہیے جو خود فرض حج پہلے ادا کرچکا ہو۔کسی ایسے شخص سے حجِ بدل کروانا بہتر ہے جو حج کرنے کا بہت زیادہ مشتاق ہو۔

قربانی
کے
احکام و مسائل

ذبحِ اسماعیل۔ حکم یا اشارہ؟

سوال منکرِ حدیث مسٹر پرویز اور اس کی پارٹی یہ سمجھتی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو ذبحِ اسماعیل کا حکم نہ تھا، یہ صرف اشارہ تھا جسے غلطی سے ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھ بیٹھے۔ مسٹر پرویز کہتے ہیں کہ یہ مجاز تھا حقیقت نہ تھی۔ اس لیے انہوں نے آیت ﴿ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ﴾ کا مفہوم ''جس بات کا اشارہ آپ کو ملا ہے، اسے بلا تامل کر گزریئے'' بیان کیا ہے۔ یہ مؤقف کہاں تک درست ہے؟ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مینڈھا ذبح کرنے کا واقعہ قرآن میں نہیں ہے!

جواب منکرینِ حدیث قرآن کے بہانے حدیث سے بالکل ''آزاد'' ہو گئے ہیں۔ اور الفاظِ قرآنی کو تلعب وتصریف (ہیرا پھیری) کے ذریعے اپنی مرضی کے معانی پہنانے کی مذموم کوشش کرتے رہتے ہیں۔ الفاظ اور آیات کو سیاق وسباق سے کاٹ کر معانی پہنانا نیز حقیقت کو مجاز اور مجاز کو حقیقت بنانا ان کا مرغوب مشغلہ ہے۔

قرآن سے پوری صراحت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو یہی حکم تھا کہ وہ اسماعیل (علیہ السلام) کو ذبح کریں۔ ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام اسے حکمِ الٰہی سمجھتے تھے۔ ابراہیم علیہ السلام اللہ کے پیغمبر تھے اگر انہیں منشاءِ الٰہی سمجھنے میں اجتہادی غلطی لگی ہوتی تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی تصحیح کر دیتے۔ نہ کہ ''غلط فہمی'' کے نتیجے میں کیے جانے والے عمل کی تحسین کی جاتی اور نہ اسے ﴿ أَسْلَمَا ﴾ کہہ کر فرمانبرداری قرار دیا جاتا۔ اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کی تحسین ﴿ مَا تُؤْمَرُ ﴾ (جس کا تجھے حکم دیا گیا) پر عمل کرنے پر ہی کی تھی۔ ﴿ مَا تُؤْمَرُ ﴾ سے اشارہ مراد لینا مسٹر پرویز کی جہالت ہے۔ امر کا معنی لغتِ عرب میں ''حکم'' ہوتا ہے۔ نہ کہ ''اشارہ''۔ اور مجازی معنی اسی صورت میں مراد لیا جاتا ہے جب حقیقی معنی متعذر (محال) ہو۔

مسٹر پرویز کبھی ﴿ مَا تُؤْمَرُ ﴾ کا مفہوم ''اگر'' سے بدل دیتے ہیں، لکھتے ہیں:

آپ نے سمجھا کہ یہ اشارہ غیبی ہے۔ اس لیے اس کی تعمیل ضروری ہے۔ بیٹے سے ذکر کیا تو اس نے بھی کہا کہ اگر یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے تو اس کی تعمیل میں قطعاً تامل نہ کیجئے میں ذبح ہونے کو تیار ہوں۔ (قرآنی فیصلے ص:۴)

''اگر یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے'' قرآن کے کن الفاظ کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ کرنے کے

پرویزی قائل ہی نہیں ہیں۔ ''اگر'' کس لفظ کا ''مفہوم'' ہے۔ کیا یہ کھلی تحریف قرآن نہیں؟ یہ ''اگر'' صریحاً قرآنی فیصلے کے خلاف ہے۔ مسٹر پرویز کی یہ بھی دیدہ دلیری اور سینہ زوری ہے کہ اپنی من پسند تحریفات کو ''قرآنی فیصلے'' کا نام دیتے ہیں۔ مذکورہ بالا ''اگر'' اس کی ایک دلیل ہے۔

مسٹر پرویز جو یہ کہتے ہیں کہ مینڈھا ذبح کرنے کا ذکر قرآن میں نہیں ہے یہ بھی ان کی ایک جہالت ہے۔ ان کی باقیات سے دریافت کیا جائے کہ ارشاد باری تعالیٰ ﴿ وَفَدَيْنَٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ۝ ﴾ (۳۷/الصّٰفّٰت: ۱۰۷) سے کیا مراد ہے؟ عربی لغت اور سیاق و سباق کو ملحوظ خاطر رکھ کر جواب دیا جائے۔

اس یادگار واقعے کی پوری تفصیل قرآن مجید نے بیان کی ہے۔ سیاق و سباق کو مدِ نظر رکھ کر اگر اس پر ایک سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو مسٹر پرویز کے تمام جھوٹ آشکار ہو جاتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ رَبِّ هَبْ لِى مِنَ ٱلصَّٰلِحِينَ ۝ فَبَشَّرْنَٰهُ بِغُلَٰمٍ حَلِيمٍ ۝ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ ٱلسَّعْىَ قَالَ يَٰبُنَىَّ إِنِّىٓ أَرَىٰ فِى ٱلْمَنَامِ أَنِّىٓ أَذْبَحُكَ فَٱنظُرْ مَاذَا تَرَىٰ ۚ قَالَ يَٰٓأَبَتِ ٱفْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۖ سَتَجِدُنِىٓ إِن شَآءَ ٱللَّهُ مِنَ ٱلصَّٰبِرِينَ ۝ فَلَمَّآ أَسْلَمَا وَتَلَّهُۥ لِلْجَبِينِ ۝ وَنَٰدَيْنَٰهُ أَن يَٰٓإِبْرَٰهِيمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ ٱلرُّءْيَآ ۚ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِى ٱلْمُحْسِنِينَ ۝ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ ٱلْبَلَٰٓؤُا۟ ٱلْمُبِينُ ۝ وَفَدَيْنَٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِى ٱلْءَاخِرِينَ ۝ سَلَٰمٌ عَلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ ۝ كَذَٰلِكَ نَجْزِى ٱلْمُحْسِنِينَ ۝ إِنَّهُۥ مِنْ عِبَادِنَا ٱلْمُؤْمِنِينَ ۝ ﴾ (۳۷/الصّٰفّٰت: ۱۰۰۔۱۱۱)

''میرے رب! مجھے نیک بخت اولاد عطا کر۔ تو ہم نے اسے ایک بردبار بچے کی بشارت دی۔ پھر جب وہ (بچہ) اتنی عمر کو پہنچا کہ اس کے ساتھ چلے پھرے، تو اُس (ابراہیم علیہ السلام) نے کہا: میرے پیارے بیٹے! مَیں خواب میں اپنے آپ کو تجھے ذبح کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ اب تو بتا کہ تیری کیا رائے ہے؟ بیٹے نے جواب دیا کہ ابو جی! جو حکم ہوا ہے اسے بجا لائیے، ان شاء اللہ! آپ مجھے صبر

کرنے والوں میں سے پائیں گے۔تو جب دونوں مطیع ہوگئے اور اُس (باپ) نے اُس (بیٹے) کو پیشانی کے بل گرادیا۔تو ہم نے آواز دی کہ اے ابراہیم! یقیناً آپ نے اپنے خواب کو سچا کر دکھایا، بے شک ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں۔درحقیقت یہ کھلا امتحان تھا۔اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے فدیہ میں دے دیا۔اور ہم نے ان کا ذکرِ خیر پچھلوں میں باقی رکھا۔ابراہیم پر سلام ہو۔ہم نیکوکاروں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔بے شک وہ ہمارے ایماندار بندوں میں سے تھے۔"

ان آیات میں آنے والے الفاظ ﴿يَٰٓأَبَتِ ٱفۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ﴾، ﴿أَسۡلَمَا﴾، ﴿وَتَلَّهُۥ لِلۡجَبِينِ﴾، ﴿صَدَّقۡتَ ٱلرُّءۡيَآ﴾، ﴿نَجۡزِي ٱلۡمُحۡسِنِينَ﴾، ﴿ٱلۡبَلَٰٓؤُاْ ٱلۡمُبِينُ﴾، ﴿فَدَيۡنَٰهُ بِذِبۡحٍ عَظِيمٖ﴾ اور ﴿وَتَرَكۡنَا عَلَيۡهِ فِي ٱلۡأٓخِرِينَ﴾ مسٹر پرویز کے غلط دعاوی اور جھوٹ کا پول کھول دیتے ہیں۔

قربانی کا حکم حُجاجِ کرام سے مختص نہیں

سوال کیا قربانی صرف حاجیوں کو کرنی چاہیے؟

جواب قربانی کا حکم حاجیوں کے ساتھ خاص نہیں بلکہ سب مسلمانوں کے لیے ہے۔وہ جہاں کہیں بھی رہ رہے ہوں۔حج پر کی جانے والی قربانی کو ھدی اور نسک کہا جاتا ہے جبکہ حج کے موقع پر کی جانے والی قربانی کو اضحیۃ کہا جاتا ہے جس کی جمع اضاحی ہے۔اسی وجہ سے قربانی والی عید کو عیدالاضحیٰ کہا جاتا ہے۔لہٰذا یہ بات درست نہیں کہ قربانی کرنے کا حکم صرف حجاجِ کرام کے لیے ہے۔حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

قربانی کرنے کا مطلق حکم بھی دوسرے مقام پر موجود ہے:

﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَٱنۡحَرۡ﴾ (۱۰۸/الکوثر:۲)

"اپنے رب کے لیے نماز پڑھیں اور قربانی کریں۔"

اس کی عملی تبیین وتشریح نبی ﷺ نے اس طرح فرمائی کہ آپ ﷺ خود مدینے میں ہر سال ۱۰ ذوالحجہ کو قربانی کرتے رہے اور مسلمانوں کو بھی قربانی کرنے کی تاکید کرتے رہے۔

چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی قربانی کرتے رہے۔علاوہ ازیں آپ ﷺ نے قربانی کی بابت جہاں دیگر بہت سی ہدایات دیں،وہاں یہ بھی فرمایا کہ ۱۰ ذوالحجہ کو ہم سب سے پہلے (عید کی) نماز پڑھیں اور اس کے بعد جا کر جانور ذبح کریں،فرمایا:

''جس نے نماز (عید) سے قبل اپنی قربانی کر لی،اس نے گوشت کھانے میں جلدی کی،اس کی قربانی نہیں ہوئی۔''

(بخاري، العيدين ، التكبير الى العيد،مسلم، الاضاحي ، ......وقتها)

اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ قربانی کا حکم ہر مسلمان کے لیے ہے وہ جہاں بھی ہو۔ کیونکہ حاجی تو عیدالاضحیٰ کی نماز ہی نہیں پڑھتے۔جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حکم غیر حاجیوں کے لیے ہی ہے۔تاہم یہ واجب نہیں ہے سنتِ مؤکدہ ہے۔ (احسن البیان تفسیر سورۃ الحج:۳۶)

اونٹ کی قربانی کا طریقہ

سوال کیا قربانی کے اونٹ کو لٹا کر ذبح کرنا درست ہے؟

جواب قربانی کے اونٹ کو بٹھایا یا لٹایا نہیں جاتا بلکہ اسے کھڑے کھڑے ہی نحر کیا جاتا ہے۔چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ (۲۲/الحج:۳۶)

''قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لیے اللہ کی نشانیوں میں شامل کر دیا ہے،ان میں نفع ہے۔انہیں کھڑا کر کے ان پر اللہ کا نام لو۔پھر جب ان کے پہلو زمین سے لگ جائیں ان میں سے (خود بھی) کھاؤ اور مسکین سوال سے رکنے والے اور سوال کرنے والے کو بھی کھلاؤ۔اسی طرح ہم نے چوپایوں کو تمہارے ماتحت کر دیا ہے تاکہ تم شکر کرو۔''

اس آیت میں آنے والے لفظ ﴿ صَوَآفَّ ﴾ کا معنی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے قیاما (کھڑے) بیان کیا ہے۔ (بخاري، الحج، نحر البدن قائمة)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

سنة محمد صلی اللہ علیہ وسلم (ایضا)

"یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔"

انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز مدینہ میں چار رکعتیں پڑھی اور عصر کی ذوالحلیفہ میں دو رکعت۔ آپ نے رات وہیں گزاری، پھر جب صبح ہوئی تو آپ اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر تہلیل و تسبیح کرنے لگے۔ جب بیداء پہنچے تو آپ نے دونوں (حج و عمرہ) کے لیے ایک ساتھ تلبیہ کہا۔ جب آپ مکہ پہنچے (اور عمرہ ادا کر لیا) تو لوگوں کو حکم دیا کہ حلال ہو جائیں (احرام کھول دیں۔) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ہاتھ سے سات اونٹ کھڑے کر کے نحر کیے اور مدینہ میں دو چتکبرے، سینگوں والے مینڈھے ذبح کیے۔" (ایضا، ح:۱۷۱۴)

زیاد بن زبیر کہتے ہیں: میں نے دیکھا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ایک شخص کے پاس آئے جو اپنا اونٹ بٹھا کر نحر کر رہا تھا، آپ رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

اسے کھڑا کر اور باندھ دے، پھر نحر کر کہ یہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔

(ایضاً، نحر الابل مقیدة، ح:۱۷۱۳)

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ اونٹ کو کھڑا کر کے ہی نحر کرنا مسنون ہے۔

قربانی کا جانور بائیں ہاتھ سے ذبح کرنا

سوال قربانی کے جانور کو بائیں ہاتھ سے ذبح کرنا درست ہے؟

جواب چند کاموں کو چھوڑ کر اکثر امور میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دایاں ہاتھ استعمال کرتے تھے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

كان النبی صلی اللہ علیہ وسلم يعجبه التيمن فی تنعله وترجله وطهوره وفی شأن كله (بخاری، الوضوء، التيمن فی الوضوء والغسل، ح:١٦٨)

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم جوتا پہننے، کنگھی کرنے، وضو کرنے اور اپنے ہر کام میں داہنی طرف

سے کام کی ابتدا کرنے کو پسند کیا کرتے تھے۔"

امام نووی رحمہ اللہ نے ریاض الصالحین میں ایک باب استحباب تقدیم الیمین فی کل ماھو من باب التکرم (ہر باعزت کام میں دائیں کو مقدم کرنا مستحب ہے) قائم کیا ہے۔ جس سے مذکورہ بالا حدیث کے الفاظ شأن کله کی وضاحت ہوتی ہے۔ مثلاً وضو، غسل اور تیمم کرنے، کپڑے، جوتے، موزے اور شلوار پہننے، مسجد میں داخل ہونے، مسواک کرنے، سرمہ لگانے، ناخن کاٹنے، مونچھیں کترنے، بغل کے بال اکھیڑنے، سر کے بال مونڈنے، نماز کا سلام پھیرنے، کھانے پینے، مصافحہ کرنے، حجر اسود کو چومنے، بیت الخلاء سے نکلنے، کوئی چیز لینے دینے اور اس کے علاوہ اس قسم کے دوسرے کاموں میں دائیں طرف کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس دوسرے کاموں میں بائیں ہاتھ پاؤں کو مقدم کرنا مستحب ہے۔ ناک صاف کرنا، بائیں طرف تھوکنا، بیت الخلاء میں داخل ہونا، مسجد سے نکلنا، موزے، جوتے، شلوار اور کپڑے اتارنا، استنجا کرنا، صفائی اور اس قسم کے کام کرنا۔ فی شان کله اور مذکورہ بالا وضاحت کو سامنے رکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ ذبح کرنے اور بالخصوص قربانی کا جانور ذبح کرتے وقت دایاں ہاتھ ہی استعمال کرنا چاہیے، جو کہ اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ البتہ دوسرے ہاتھ کو مدد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ چھری وغیرہ دائیں ہاتھ میں ہی پکڑ کر جانور کو ذبح کیا جانا چاہیے۔

خصی جانور کی قربانی

سوال کیا خصی جانور کی قربانی دی جاسکتی ہے؟ مجھے ایک آدمی نے کہا کہ خصی جانور کی قربانی نہیں دینی چاہیے کیونکہ جانور کا خصی ہونا ایک طرح کا نقص ہے جب کہ قربانی ایسے جانور کی کرنی چاہیے جو ہر طرح کے نقص اور عیب سے پاک ہو، تو کیا جانور کا خصی ہونا ان عیوب میں شمار ہوتا ہے جن کی بنا پر جانور کی قربانی درست نہیں ہوتی؟

جواب خصی و غیر خصی ہر دو قسم کے جانوروں کی قربانی کرنا جائز ہے، نبی اکرم ﷺ عام طور پر غیر خصی جانور کی قربانی کرتے تھے، ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

كان رسول الله ﷺ يضحي بكبش اقرن فحيل

(ابو داؤد، الضحایا، ما یستحب فی الضایا، ح:۲۷۹۶)

"رسول اللہ ﷺ سینگوں والے غیر خصی مینڈھے کی قربانی کیا کرتے تھے۔"

خصی جانور کی قربانی کرنا بھی جائز ہے، جس کا ثبوت درج ذیل حدیث ہے، جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

ان رسول اللهﷺ اتی بکبشین اقرنین املحین عظیمین موجوئین فاضجع احدهما وقال:((بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ عَنْ مُحَمَّدٍ وَاُمَّتِهٖ مَنْ شَهِدَ لَكَ بِالتَّوْحِيْدِ وَ شَهِدَ لِيْ بِالْبَلَاغِ))

(مجمع الزوائد، الضحایا، اضحیة رسول اللهﷺ)

"اللہ کے رسول ﷺ کے پاس دو چتکبرے، سینگوں والے، فربہ، خصی مینڈھے لائے گئے، آپ نے ان میں سے ایک کو لٹایا اور پڑھا: ((بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ ...... بِالْبَلَاغِ)): اللہ کے نام کے ساتھ اور اللہ سب سے بڑا ہے، (یہ قربانی) محمد کی طرف سے اور اس کی امت میں سے ہر اُس شخص کی طرف سے ہے جس نے (اے اللہ) تیری توحید کی شہادت دی اور میرے پیغام پہنچانے کی گواہی دی۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خصی کرنے سے جانور معیوب نہیں ہوتا کہ جس سے اس کی قربانی کرنا جائز نہ رہتی ہو، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خصی جانور زیادہ محفوظ ہوتے ہیں اور غیر خصی جانوروں کی بہ نسبت زیادہ موٹے اور قوی ہو جاتے ہیں۔ نیز ان کا گوشت بھی زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔

قربانی کے جانور پر سواری کرنا

سوال قربانی کے جانوروں کو شعائر اللہ میں سے قرار دیا گیا ہے۔ کیا قربانی کے جانور پر سواری کرنا جائز ہے؟

جواب قربانی کے وہ جانور جو سواری کے لیے استعمال ہوتے ہیں ان پر بوقتِ ضرورت سوار ہونے میں کوئی حرج نہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک شخص کو قربانی کا جانور لے جاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا:

((اِرْكَبْهَا)) ''اس پر سوار ہو جاؤ!''

اس نے کہا کہ یہ قربانی کا جانور ہے۔

آپ نے پھر فرمایا:

((اِرْكَبْهَا)) ''اس پر سوار ہو جاؤ!''

اس نے کہا کہ یہ تو قربانی کا جانور ہے!

آپ نے پھر فرمایا:

((اِرْكَبْهَا وَيْلَكَ))

''(مَیں تمھیں کہہ رہا ہوں) اس پر سوار ہو جاؤ! افسوس تم پر!''

((وَيْلَكَ)) دوسری یا تیسری بار فرمایا۔ (بخاری، الحج، رکوب البدن، ح:۱۶۸۹)

پھر وہ آدمی سوار ہو گیا تھا جیسا کہ باب تقلید النعل (ح:۱۷۰۶) میں ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں عرب لوگ سائبہ وغیرہ جانوروں پر، جو وہ نذر و نیاز کے طور پر چھوڑ دیتے تھے، سوار ہونا معیوب سمجھتے تھے۔ نبی ﷺ نے اصرار کے ساتھ حکم دیا کہ اس پر سواری کرو تاکہ راستہ کی تھکن سے بچ سکو۔ قربانی کے جانور ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انہیں بیکار چھوڑ دیا جائے۔ اسلام اسی لیے دینِ فطرت ہے کہ اس نے قدم قدم پر انسانی ضروریات کا خیال رکھا ہے اور ہر جگہ عین انسانی ضروریات کو مدِنظر رکھ کر احکام صادر کیے ہیں۔

(شرح بخاری از مولانا محمد داؤد راز رحمہ اللہ)

قربانی کا گوشت بطور اجرت دینا

سوال عام طور پر دیہاتوں میں یہ بات رائج ہے کہ قربانی کا گوشت، سری پائے یا کھال قصاب کو قربانی کا جانور ذبح کرنے اور گوشت بنانے کی اُجرت کے طور پر دے دی جاتی ہے، کیا ان کا ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب ایسا کرنا درست نہیں کیونکہ قربانی میں سے کوئی بھی چیز کسی کو بطور اجرت دینا درست نہیں، کیونکہ نبی ﷺ نے اس سے منع کیا ہے (گوشت بنانے کی مزدوری اپنی جیب سے دینی چاہیے، نہ کہ قربانی کے گوشت سے) سیدنا علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

ان النبی ﷺ امرہ ان یقوم علی بدنہ وان یقسم بدنہ کلھا، لحومھا وجلودھا وجلالھا ولا یعطی فی جزارتھا شیئا

(بخاری، الحج، مایتصدق بجلود الھدی)

''نبی ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ وہ آپ کی قربانی کے اونٹوں اوران کے گوشت تقسیم کرنے کی نگرانی کریں، ان کے گوشت، کھالیں، اور جھولیں سب تقسیم کردیں، ان کے ذبح کرنے کے عوض (ان میں سے قصاب کو) کچھ نہ دیں۔''

قربانی کا جانور گم ہونے کی صورت میں......

سوال قربانی کا جانور گم ہونے کی صورت میں کیا دوسرا جانور خریدنا ضروری ہے؟

جواب استطاعت ہو تو دوسرا جانور خرید لینا چاہیے۔ بصورتِ دیگر دوسرا جانور خریدنا ضروری نہیں۔

قربانی کا جانور مرنے کی صورت میں؟

سوال قربانی کا جانور مرجائے تو دوسرا جانور خریدنا ضروری ہے یا قربانی ادا ہوگئی؟

جواب استطاعت ہو تو دوسرا جانور خرید کر قربانی کرنی چاہیے۔

قربانی کا گمشدہ جانور اگر مل جائے تو؟

سوال قربانی کا گم شدہ جانور اگر اس وقت ملے کہ دوسرا جانور بھی خرید لیا گیا ہو تو کیا دونوں جانور قربان کرنا ہوں گے یا کوئی ایک؟

جواب دونوں جانور قربانی کرنا ضروری نہیں، ایک جانور ہی کافی ہے۔

قربانی کے گوشت کے تین حصے؟

سوال کیا قربانی کے گوشت کو تین حصوں میں تقسیم کرنا چاہیے؟

جواب قربانی کا گوشت خود بھی کھانا چاہیے اور دوسروں کو بھی (بالخصوص غرباء و مساکین کو) کھلانا چاہیے لیکن اس کی حد کہ کتنا خود کھایا جائے اور کتنا تقسیم کردیا جائے کسی صحیح دلیل سے ثابت نہیں البتہ اہلِ علم کا کہنا ہے کہ گوشت کے تین حصے کرلیے جائیں۔ ایک اپنے لیے، دوسرا احباب و متعلقین کے لیے اور تیسرا فقراء و مساکین کے لیے (تفسیر ابن کثیر تفسیر سورۃ الحج

آیت: ﴿ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ﴾ ۲۲/الحج:۳۶)

قربانی کا گوشت تقسیم کرنے کی بجائے فریز رمیں؟

سوال بعض لوگ گوشت تقسیم کرنے کی بجائے فریزر میں رکھ لیتے ہیں اور پھر ہفتوں خود ہی کھاتے ہیں۔

جواب شروع شروع میں نبی کریم ﷺ نے قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ ذخیرہ کرنے اور اسے کھانے سے منع کیا تھا۔ بعد میں، جب تقریباً ہر شخص قربانی کرنے لگا، تو آپ ﷺ نے گوشت پس انداز کرنے کی اجازت دے دی لیکن غرباء اور مساکین کو فراموش کر دینا مزاجِ اسلام کے منافی ہے۔ سورۃ الحج کی آیت ۲۸ اور ۳۶ میں خود کھانے اور دوسروں (محتاجوں) کو کھلانے کی تلقین موجود ہے۔ جن احادیث میں آپ ﷺ نے قربانی کا گوشت ذخیرہ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے ان میں بھی قربانی کا گوشت دوسروں کو کھلانے کی تلقین ساتھ ساتھ موجود ہے۔ مثلاً صحیح بخاری میں ہے:

((كُلُوْا وَأَطْعِمُوْا وَادَّخِرُوْا))

"خود کھاؤ، دوسروں کو کھلاؤ اور ذخیرہ کرلو۔ (اب اجازت ہے۔)"

(الاضاحی، ما یوکل من لحوم الاضاحی وما یتزود منها، ح:۵۵۶۹)

قربانی کا گوشت غیر مسلم کو دیا جا سکتا ہے؟

سوال کیا قربانی کا گوشت غیر مسلم کو بھی دیا جا سکتا ہے؟

جواب قربانی کا گوشت غیر مسلم کو بھی دیا جا سکتا ہے۔ ممانعت کی کوئی صریح دلیل موجود نہیں ہے۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم کے عمومی حکم کو مدنظر رکھتے ہوئے غیر مسلم کو قربانی کا گوشت دینا جائز ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ﴾ (۲۲/الحج:۳۶)

"قربانی کے گوشت سے خود کھاؤ اور خوددار محتاج اور سوالی کو بھی کھلاؤ۔"

یعنی اگر غیر مسلم سوالی بن کر آئے، وہ ہمسایہ ہو یا تالیفِ قلبی مقصود ہو تو اُسے بھی قربانی کا گوشت دیا جا سکتا ہے، بالخصوص اہلِ کتاب کو دینے میں کوئی حرج نہیں، اُن کے لیے

مسلمانوں کا ذبیحہ حلال ہے۔

کیا قربانی کا گوشت محرم سے پہلے پہلے ختم کرنا ضروری ہے؟

سوال بعض لوگ کہتے ہیں کہ قربانی کا گوشت ماہِ محرم سے پہلے پہلے ختم کر دینا چاہیے، اس کے بارے میں وضاحت کر دیں۔

جواب اس تحدید پر شریعت میں کوئی صراحت نہیں ملتی لہٰذا یہ کہنا درست نہیں کہ محرم سے پہلے پہلے قربانی کا گوشت ختم کرنا ضروری ہے۔ غرباء و مساکین کو کھلا دینے اور اُن کا حق ادا کر دینے کے بعد اگر گوشت تا دیر بھی رکھ لیا جائے تو کوئی قباحت نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((كُلُوْا وَاَطْعِمُوْا وَادَّخِرُوْا))

(بخاری ، الاضاحی ، مایوکل من لحوم الاضاحی ویتزودمنها، ح:۵۵۶۹)

"خود کھاؤ، دوسروں کو کھلاؤ اور ذخیرہ بھی کر سکتے ہو۔"

قربانی کے جانور کے بعض حصوں سے عقیقہ کرنا کیسا ہے؟

سوال ایک شخص گائے خریدتا ہے اس کے دو حصے برائے قربانی اور پانچ حصے برائے عقیقہ رکھتا ہے، کیا یہ حدیث کے مطابق صحیح ہے؟ وضاحت فرما کر (ماہنامہ) دعوۃ التوحید میں شائع کریں۔

جواب قربانی اور عقیقہ دو الگ الگ چیزیں ہیں، قربانی کا ایک بکرا سب گھر والوں کے لیے کافی ہے، خواہ ان کی تعداد کتنی ہی ہو، آپ جو بھی قربانی کریں گے اس میں سب گھر والے برابر کے شریک ہوں گے، لہٰذا جو جانور بطور قربانی کے ذبح کیا گیا ہو اُس کے کسی حصے کو عقیقہ شمار نہیں کیا جا سکتا۔ جس جانور کی آپ نے قربانی دے دی ہے اب اس میں سے کوئی حصہ باقی نہیں بچا، خواہ ایک ہی شخص نے کئی گائے اونٹ وغیرہ ذبح کیے ہوں۔ نیز قربانی میں مرد و عورت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہوتا جبکہ عقیقے میں لڑکے اور لڑکی کا فرق کیا جاتا ہے، لڑکے کے عقیقے کے دو بکرے جبکہ لڑکی کے عقیقے کے لیے ایک بکرا ذبح کیا جاتا ہے۔ مزید برآں قربانی کے جانور میں سے عقیقے کے لیے حصے الگ کرنا سنت مطہرہ سے ثابت نہیں۔

ذبح کرنے کے مسائل

ذبح شدہ جانور کے پیٹ کا مردہ بچہ حلال ہے؟

سوال بھینس، گائے اور بکری ذبح کی جاتی ہے تو ان کے پیٹ سے اگر مردہ بچہ برآمد ہو تو وہ کس زمرے میں آئے گا؟ حلال یا حرام؟

جواب اگر بچہ پورا ہو گیا ہو اور اس کے جسم پر بال نکل آئے ہوں تو وہ حلال تصور ہو گا اور اگر وہ بچہ زندہ برآمد ہوتا ہے تو اسے ذبح کیا جائے گا تا کہ اس کا خون بہہ جائے۔

(مؤطا امام مالك، الذبائح، ذكاة ما فى بطن الذبيحة، ح:١٠٦١)

کیا لکڑی یا پتھر سے بھی جانور ذبح کیا جا سکتا ہے؟

سوال چھری نہ ہونے کی صورت میں جانور کن کن اشیاء سے ذبح کیا جا سکتا ہے؟

جواب چاقو یا چھری وغیرہ نہ ہونے کی صورت میں کسی بھی ایسی چیز سے جانور ذبح کیا جا سکتا ہے جس سے جانور کا خون بہہ جائے حتیٰ کہ دھار والی لکڑی یا کوئی نوکیلا پتھر ہی کیوں نہ ہو۔

''ایک انصاری شخص اُحد میں اپنی اونٹنی چرا رہا تھا۔ یکا یک اس پر موت طاری ہونے لگی تو اس نے ایک دھاری دار لکڑی سے اسے ذبح کر دیا۔ آپ ﷺ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَيْسَ بِهَا بَأْسٌ فَكُلُوْهَا))

(مؤطا امام مالك، الذبائح، مايجوز من الذكاة فى حال الضرورة، ح:١٠٥٦)

''کوئی حرج نہیں، اسے کھالو۔''

اس سے ملتا جلتا واقعہ ایک اور حدیث میں بھی ملتا ہے۔ ایک عورت نے بکری کو پتھر سے ذبح کر ڈالا کیونکہ بکری مرنے لگی تھی تو جب رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((فَكُلُوْهَا)) (بخارى، الذبائح والصيد، ذبيحة المرأة والأمة، ح:٥٥٠٥)

''تو اسے کھالو۔''

عورت کا ذبیحہ

سوال ہمارے معاشرے میں اس بات کو معیوب سمجھا جاتا ہے کہ کوئی عورت جانور

ذبح کرے، تو کیا شریعت مطہرہ اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ عورت اپنے ہاتھ سے کسی جانور کو ذبح یا قربانی کرے؟

جواب عورت اگر کسی جانور کو ذبح کرے تو درست ہے۔ اس کا ذبیحہ حلال ہے، کعب بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

ان امراء ة ذبحت شاة بحجر فسئل النبی ﷺ عن ذلك فامر باكلها

(بخاری، الذبائح والصيد، ذبيحة المراة والامة، ح:۵۵۰۴)

''ایک عورت نے (تیز دھار والے) پتھر سے ایک بکری ذبح کی، نبی ﷺ سے اس کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے اس کے کھانے کا حکم دیا۔''

اس حدیث سے جہاں یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ کسی بھی تیز دھار والی چیز سے جانور ذبح کیا جا سکتا ہے، وہاں یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ عورت کے ذبح شدہ جانور کا کھانا حلال ہے۔ صحابہ کے عمل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ بخاری، الاضاحی، من ذبح ضحیۃ غیرہ میں ہے:

امر ابو موسی رضی اللہ عنہ بناته ان يضحين بايديهن

''ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹیوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی قربانیاں اپنے ہاتھ سے (خود) ذبح کریں۔''

لہٰذا عورت اگر ذبح کرنا جانتی ہو تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ ذبح کرے۔

کیا عورت کا ذبیحہ حلال ہے؟

سوال عورتیں اگر جانور ذبح کریں تو آج کل اسے معیوب سمجھا جاتا ہے۔ کیا شریعتِ اسلامیہ عورت کو منع کرتی ہے کہ وہ جانور ذبح کرے؟ کیا عورت کا ذبیحہ حلال ہے؟

جواب عورت کا ذبیحہ بالکل جائز اور حلال ہے۔ مسلمانوں کے لیے تو اہل کتاب کا ذبیحہ بھی حلال ہے مسلمان عورت کا ذبیحہ کیونکر حلال نہیں ہوگا! عورت اگر جانور ذبح کر سکتی ہو تو اس کا ذبیحہ حلال ہے۔ ابن کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اپنے والد سے بیان کرتے ہیں:

ان کے پاس بکریوں کا ایک ریوڑ تھا۔ جو سلع پہاڑی پر چرنے جاتا تھا۔ (انہوں نے بیان کیا کہ) ہماری ایک باندی نے ہمارے ہی ریوڑ کی ایک بکری کو (جب وہ چر رہی تھی) دیکھا کہ مرنے کے قریب ہے۔ اس نے ایک پتھر توڑ کر اس سے بکری کو ذبح کر دیا۔ انہوں

نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ جب تک میں نبی ﷺ سے اس کے بارے میں پوچھ نہ لوں اس کا گوشت نہ کھانا۔ یا (یوں کہا کہ) جب تک میں کسی کو نبی ﷺ کی خدمت میں اس کے بارے میں پوچھنے کے لیے نہ بھیجوں، چنانچہ انہوں نے نبی ﷺ سے اس کے بارے میں پوچھا، یا کسی کو (پوچھنے کے لیے) بھیجا۔ اور نبی ﷺ نے اس کا گوشت کھانے کے لیے حکم دیا۔ عبیداللہ نے کہا کہ مجھے یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ باندی (عورت) ہونے کے باوجود اس نے ذبح کردیا۔ (بخاری، الوکالة، اذا ابصر الراعی ...... ح: ۲۳۰۴)

حدیث کی عربی عبارت (فامرہ باکلھا) کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا ذبح کردہ جانور حلال ہے۔ اس حدیث کی شرح میں مولانا محمد داؤد راز رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

اس حدیث سے کئی ایک مسائل کا ثبوت ملتا ہے کہ بوقتِ ضرورت مسلمان عورت کا ذبیحہ بھی حلال ہے اور عورت اگر لونڈی ہو تب بھی اس کا ذبیحہ حلال ہے اور یہ بھی ثابت ہوا کہ چاقو، چھری پاس نہ ہونے کی صورت میں تیز دھار پتھر سے بھی ذبیحہ درست ہے۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ کوئی حلال جانور اگر اچانک کسی حادثہ کا شکار ہو جائے تو مرنے سے پہلے اس کا ذبح کر دینا ہی بہتر ہے۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ کسی مسئلہ کی تحقیق مزید کر لینا بہر حال بہتر ہے۔ یہ بھی ظاہر ہوا کہ ریوڑ کی بکریاں سلع پہاڑی پر چرانے کے لیے ایک عورت (باندی) بھیجی جاتی تھی۔ جس سے بوقتِ ضرورت جنگلوں میں پردہ اور ادب کے ساتھ عورتوں کا جانا بھی ثابت ہوا۔ عبیداللہ کے قول سے معلوم ہوا کہ اس دور میں بھی باندی عورت کے ذبیحہ پر اظہار تعجب کیا جایا کرتا تھا کیونکہ دستور عام ہر قرن میں مردوں ہی کے ہاتھ سے ذبح کرنا ہے۔ (شرح بخاری ۳/۴۵۱)

بعض صحابیات رضی اللہ عنہن بھی اپنے جانوروں کو خود ذبح کیا کرتی تھیں:

امر ابو موسی بناته ان یضحین بایدیھن

(بخاری، الاضاحی، من ذبح ضحیة غیرہ)

"ابوموسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) نے اپنی بیٹیوں کو حکم دیا کہ وہ (اپنے جانوروں کی) قربانی اپنے ہاتھ سے کریں۔"

شکار کے مسائل

شکاری کتے کے شکار کے مسائل

سوال شکاری کتا بوقت شکار کس طرح چھوڑا جاتا ہے؟ اگر کتا شکار کیے ہوئے جانور کا کچھ حصہ کھا جائے تو اس جانور کے بارے میں کیا حکم ہے؟ نیز شکاری کتے کے ساتھ کوئی دوسرا کتا بھی شامل ہو گیا تو ایسے شکار کا کیا حکم ہے؟

جواب شکاری یا سدھایا ہوا کتا بسم اللہ پڑھ کر شکار پر چھوڑا جائے۔

(بخاری، الذبائح والصید، ما جاء فی التصید، ح: ۵۴۸۸)

شکاری کتا اگر شکار کر کے اپنے مالک کے لیے رکھ چھوڑے، اسی کا انتظار کرے، اُس کے پاس لے آئے اور خود نہ کھائے، حتی کہ اگر اس نے اس شکار کو مار بھی ڈالا ہو تو تب بھی وہ شکار شدہ جانور حلال ہوگا۔ اگر کتا اس سے کچھ کھا لے تو پھر ایسے جانور کا گوشت استعمال کرنا جائز نہ ہوگا۔ ارشاد نبوی ہے:

((اِذَا اَرْسَلْتَ كِلَابَكَ الْمُعَلَّمَةَ وَذَكَرْتَ اسْمَ اللّٰهِ فَكُلْ مِمَّا اَمْسَكْنَ عَلَيْكَ وَاِنْ قَتَلْنَ اِلَّا اَنْ يَّاْكُلَ الْكَلْبُ))

(ایضاً، اذا اکل الکلب...... ح: ۵۴۸۳)

ایک اور حدیث میں ہے:

((فَكُلْ مِمَّا اَمْسَكْنَ عَلَيْكَ اِلَّا اَنْ يَّاْكُلَ الْكَلْبُ فَلَا تَاْكُلْ))

(ایضاً، ما جاء فی التصید، ح: ۵۴۸۷)

"اگر وہ (شکاری کتے) شکار پکڑ کر تمہارے لیے روک رکھیں تو اسے کھالو مگر اس شکار میں سے کتا کھا لے تو پھر تم نہ کھاؤ۔"

قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَكُلُوا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ ﴾ (۵/المائدۃ:۴)

"جس شکار کو وہ تمہارے لیے پکڑ کر روک رکھیں تو اسے کھالو۔"

ایسا شکار جس میں شکاری کتے کے، جسے بسم اللہ پڑھ کر چھوڑا گیا ہو، علاوہ کوئی دوسرا کتا بھی شامل ہو جائے تو ایسا شکار کھانے کی اجازت نہیں ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

((وَإِنْ خَالَطَهَا كِلَابٌ مِّنْ غَيْرِهَا فَلَا تَأْكُلْ))

(بخاری، الذبائح والصید، اذا اکل الکلب، ح: ۵۴۸۳)

ایک اور حدیث میں ہے:

((لَا تَأْكُلْ فَإِنَّمَا سَمَّيْتَ عَلَى كَلْبِكَ وَلَمْ تُسَمِّ عَلَى غَيْرِهِ))

(ایضاً، اذا وجد مع الصید کلب آخر، ح: ۵۴۸۶)

حدود و تعزیرات

کھوجی کتے کی نشاندہی پر چور کا ہاتھ کاٹنا؟

سوال چور کو تلاش کرنے اور چوری کا سامان برآمد کرنے کے لیے کھوجی کتوں سے راہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔ کیا ایسا کرنا درست ہے؟ کیا کتوں کی نشاندہی پر اعتبار کیا جائے گا؟

جواب ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ کھوجی کتوں کی نشاندہی کو سامنے رکھ کر تحقیق وتفتیش کی جائے گی۔ کھوجی کتوں کا کھرا نکالنے سے قرائن وشواہد تو حاصل کیے جاسکتے ہیں لیکن کتے کی نشاندہی پر حد جاری نہیں کی جائے گی یعنی چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

حقوقِ نسواں بل کے خلافِ اسلام پہلو

سوال حقوقِ نسواں بل ۲۰۰۶ء کے وہ کون سے پہلو ہیں جو خلافِ اسلام ہیں؟

جواب اس بل کے درج ذیل پہلو خلافِ اسلام ہیں:

① زنا کی شرعی سزا کو بدل کر ۵ سال قید اور دس ہزار روپے جرمانہ مقرر کرنا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے، کیونکہ حدود اللہ میں ترمیم کا اختیار اللہ تعالیٰ نے کسی کو بھی نہیں دیا۔

② تہمتِ زنا کی سزا کو ۵ سال قید اور دس ہزار روپے جرمانہ مقرر کرنا حدود اللہ میں ترمیم ہے۔

③ سولہ برس سے کم عمر لڑکی کے ہر زنا کو زنا بالجبر کا نام دے کر اسے سزا سے مستثنیٰ قرار دینا اسلام کے خلاف ہے۔

④ دفعہ ۳۷۵ کی رُو سے بیوی کی مرضی کے بغیر جماع کرنا زنا بالجبر قرار پاتا ہے جو صریحاً خلافِ اسلام ہے۔

⑤ زنا کی بعض صورتوں کو زنا بالجبر کا نام دے کر شرعی سزا سے نکالنا اور انہیں تعزیر میں لے آنا اسلام کے خلاف ہے۔

⑥ زنا بالجبر کی سزا موت قرار دینا خلافِ اسلام ہے۔

⑦ حدود آرڈیننس سے اقدامِ زنا یا مبادیاتِ زنا کی سزاؤں کی منسوخی غیر اسلامی ہے۔

⑧ حدود اللہ کی دیگر قوانین پر برتری کا خاتمہ اسلام سے بغاوت، دستور سے انحراف اور حلف سے غداری ہے۔

⑨ زنا کی شرعی سزا صرف نمائشی ہے، متوازی اور متضاد قانون سازی کے بعد اس پر عمل ہونا

ممکن نہیں۔

⑩ شرعی سزاؤں کے معاف کرنے کا اختیار صوبائی حکومت یا صدر کو دینا غیر اسلامی ہے۔

⑪ زنا کے ثبوت کے لیے پانچ گواہ مقرر کرنا غیر اسلامی ہے۔

⑫ ملزم کے اعترافِ جرم کو ثبوتِ جرم میں تسلیم نہ کرنا اور اسے حدود آرڈیننس سے خارج کرنا غیر اسلامی ہے۔

⑬ لعان کی کارروائی مکمل نہ کرنے پر شوہر کی سزا کا خاتمہ بیوی کو معلق چھوڑ دیتا ہے، یہ غیر اسلامی ہے۔

⑭ ''لعان کی صورت میں بیوی کا اعتراف اس پر شرعی حد عائد کر دیتا ہے۔'' اس شق کا خاتمہ اسلام کے خلاف ہے۔

ماہِ رواں (جنوری ۲۰۰۷ء) لاہور میں تحفظ حدود اللہ کنونشن منعقد ہوا جس میں تمام مکاتبِ فکر کے نمائندہ جید علمائے کرام، شیوخ الحدیث، مذہبی جماعتوں کے قائدین اور دینی مدارس کے مہتمم حضرات شریک ہوئے۔

اس کنونشن کے اعلامیہ میں حقوقِ نسواں ایکٹ کے درج ذیل نکات کو خلافِ شریعت قرار دیا گیا:

① زنا بالجبر کی اصطلاح غیر اسلامی ہے، اسلام میں زنا کی سزا کی تقسیم شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کے حوالے سے کی گئی ہے۔

② زنا کی شرعی سزا کو بدل کر پانچ سال قید اور دس ہزار روپے جرمانہ مقرر کرنا خلافِ اسلام ہے، اسلام میں شادی شدہ زانیہ/زانی کی سزا سنگسار کرنا اور غیر شادی شدہ زانیہ/زانی کی سزا سو کوڑے مقرر ہے۔

③ زنا کی تہمت کی سزا پانچ سال قید اور دس ہزار روپے جرمانہ کرنا بھی حدود اللہ میں ترمیم ہے، شریعت میں اس کے لیے ۸۰ کوڑوں کی حد مقرر ہے۔

④ سولہ سال سے کم عمر لڑکی کے ہر زنا کو زنا بالجبر کا نام دے کر اسے شرعی سزا سے مستثنیٰ کرنا خلافِ اسلام ہے۔

⑤ دفعہ ۳۷۵ کی رُو سے بیوی کی مرضی کے بغیر اس سے جماع کرنا زنا بالجبر قرار پاتا ہے جو صریحاً خلافِ اسلام ہے۔

⑥ زنا کی بعض صورتوں کو زنا بالجبر کا نام دے کر شرعی سزا سے نکالنا اور انہیں تعزیرات میں لے آنا اسلام کے خلاف ہے۔

⑦ زنا بالجبر کی سزا موت قرار دینا خلافِ اسلام ہے۔ اس جرم کی وہی سزا ہوگی جو شریعت میں زنا کی مقرر کی گئی ہے یعنی شادی شدہ زانی کو سنگسار کرنا اور غیر شادی شدہ زانی کو سو کوڑے لگانا (نہ کہ سزائے موت۔)

⑧ حدود آرڈیننس سے اقدامِ زنا یا مبادیاتِ زنا کی سزاؤں کی منسوخی غیر اسلامی ہے۔

⑨ حدود اللہ کی دیگر قوانین پر برتری کا خاتمہ اسلام سے بغاوت، دستور سے انحراف اور حلف سے غداری ہے۔

⑩ زنا کی شرعی سزا صرف نمائشی ہے، متوازی اور متضاد قانون سازی کے بعد اس پر عمل ہونا ممکن نہیں۔

⑪ شرعی سزاؤں میں کسی کو معافی کا اختیار نہیں، صوبائی حکومت یا صدر کا یہ اختیار حاصل کرنا غیر اسلامی ہے۔

⑫ زنا کے ثبوت کے لیے پانچ گواہ مقرر کرنا غیر اسلامی ہے۔ نیز ملزم کے اعترافِ جرم کو ثبوتِ جرم میں تسلیم نہ کرنا اور اسے حدود آرڈیننس سے خارج کرنا غیر اسلامی ہے۔

⑬ لعان کی کارروائی مکمل نہ کرنے پر شوہر کی سزا کا خاتمہ بیوی کو معلق چھوڑ دیتا ہے، یہ امر غیر اسلامی ہے۔

⑭ "لعان کی صورت میں بیوی کا اعتراف اس پر شرعی حد عائد کر دیتا ہے۔" اس شق کا خاتمہ اسلام کے خلاف ہے۔

⑮ حدود آرڈیننس میں غیر شادی شدہ کی سزا کے لیے "سو کوڑوں تک" کے الفاظ درج ہیں جو شریعت کے خلاف ہے۔ شریعت میں سزا پورے سو کوڑے ہے، نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔ اس میں "تک" کا لفظ استعمال کر کے تحریف کی گئی ہے۔

⑯ دفعہ ۴۹۶ (ب) میں زنا کی جو تعریف درج ہے وہ شرعی اور عقلی (ہر دو) اعتبار سے غیر جامع ہے۔ اس میں "غیر منکوحہ، غیر مملوکہ" کے الفاظ استعمال ہونے چاہئیں کیونکہ اللہ تعالیٰ مملوکہ عورتوں (لونڈیوں) سے جنسی استمتاع کو جائز قرار دیتے ہیں۔

نکاح
کے
مسائل

شادی کے موقع پر دُولھا کو سونے کی انگوٹھی پہنانا؟

سوال آج کل یہ رواج بن گیا ہے کہ شادی کے موقع پر دُولھا کو سونے کی انگوٹھی پہنائی جاتی ہے۔کیا دُولھا کے لیے سونے کی انگوٹھی پہننا جائز ہے؟ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ تحفہ ہوتا ہے لہٰذا اسے قبول کر لینا چاہیے۔تحفہ مسترد کرنا درست نہیں!

جواب خواتین کو سونا پہننا جائز ہے۔

(ترمذی، اللباس، ما جاء فی الحریر و الذھب، ح: ۱۷۲۰)

جبکہ مَردوں کے لیے سونا پہننا منع ہے۔براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سات چیزوں سے روکا تھا۔آپ نے ہمیں سونے کی انگوٹھی سے یا راوی نے کہا کہ سونے کے چھلّے سے،ریشم سے،استبرق سے،دیباج سے،سرخ میثرہ سے، قسّی سے اور چاندی کے برتنوں سے منع کیا تھا،اورہمیں آپ نے سات چیزوں یعنی بیمار کی مزاج پرسی کرنے،جنازہ کے پیچھے چلنے،چھینکنے والے کا جواب دینے،سلام کا جواب دینے، دعوت کرنے والے کی دعوت قبول کرنے،(کسی بات پر) قسم کھا لینے والے کی قسم پوری کرانے اور مظلوم کی مدد کرنے کا حکم دیا تھا۔(بخاری، اللباس، خواتیم الذھب، ح: ۵۸۶۳)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سونے کی انگوٹھی پہننے سے منع کیا۔''

انه نهى عن خاتم الذهب (ایضاً، ح: ۵۸٦٤)

علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،وہ فرماتے ہیں:

ان رسول الله ﷺ نهى عن لبس القسي و المعصفر و عن تختم الذهب و عن قراء ة القرآن في الركوع

(مسلم، اللباس و الزینة، النھی عن لبس الرجل الثوب المعصفر، ح: ۲۰۷۸)

''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے قسّی (ایک ریشمی کپڑا) پہننے،کسم میں رنگا ہوا کپڑا پہننے،سونے کی انگوٹھی پہننے سے اور رکوع میں قرآن پڑھنے سے منع کیا۔''

مَردوں کے لیے سونے کے زیور(انگوٹھی وغیرہ) پہننے کی ممانعت درجِ ذیل حدیث سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھی تو آپ نے اسے اتار کر پھینک دیا اور فرمایا:

((يَعْمِدُ اَحَدُكُمْ اِلٰى جَمْرَةٍ مِّنْ نَّارٍ فَيَجْعَلُهَا فِيْ يَدِهٖ))

''تم میں سے ایک شخص آگ کے انگارے کا ارادہ کرتا ہے اور اسے اپنے ہاتھ میں رکھ لیتا ہے۔''

اللہ کے رسول ﷺ کے جانے کے بعد اس آدمی سے کہا گیا: اپنی انگوٹھی پکڑلو اور اس (کو بیچ کر اس) سے فائدہ اٹھالو، اس نے جواب دیا: اللہ کی قسم! میں اس چیز کو کبھی نہیں لوں گا جسے اللہ کے رسول ﷺ نے پھینک دیا ہے۔

(ایضاً، تحریم خاتم الذهب علی الرجال و نسخ ما کان من اباحته فی اول الاسلام، ح: ۲۰۹۰)

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ مردوں کے لیے سونے کی انگوٹھی پہننا جائز نہیں۔ جہاں تک کسی کا تحفہ قبول کرنے کا مسئلہ ہے تو اگر شرعی عذر نہ ہو تو قبول کیا جا سکتا ہے۔ مرد سونے کی انگوٹھی تحفے کے طور پر قبول کر سکتے ہیں مگر ان کے لیے اس کا پہننا جائز نہیں۔ اسے کسی جائز مصرف میں استعمال کیا جائے۔ انگوٹھی فروخت بھی کی جا سکتی ہے یا خواتین کو پہننے کے لیے دی جا سکتی ہے۔ جس طرح ریشم پہننا مردوں کے لیے عام طور پر جائز نہیں مگر اس کا کاروبار کیا جا سکتا ہے۔ حسبِ ضرورت ریشم پہننا جائز ہے، مثلاً اگر کسی کو خارش ہو تو بطورِ علاج ریشم پہن سکتا ہے۔ خواتین کے ریشم پہننے کی کوئی ممانعت نہیں۔ لہٰذا مرد ریشم کا تحفہ قبول کر سکتا ہے حالانکہ ریشم پہننا اس کے لیے جائز نہیں۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ایک روز دیبا کی قبا پہنی جو آپ کے پاس تحفہ میں آئی تھی۔ پھر آپ نے اسی وقت نکال ڈالی اور عمر بن خطاب کو بھیج دی۔ لوگوں نے عرض کیا:

اللہ کے رسول ﷺ! آپ نے تو نکال ڈالی ہے؟

آپ نے فرمایا:

((نَهَانِيْ عَنْهُ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَ السَّلَامُ))

''جبریل علیہ الصلاۃ والسلام نے اس سے مجھے منع کر دیا ہے۔''

عمر رضی اللہ عنہ روتے ہوئے آپ کے پاس آئے اور عرض کرنے لگے:

اللہ کے رسول ﷺ! جس چیز کو آپ نے ناپسند کیا وہ مجھے دے دی تو میرا کیا حال ہو

گا! آپ نے فرمایا:

((اِنِّی لَمْ اَعْطِکَهُ لِتَلْبَسَهُ اِنَّمَا اَعْطَیْتُكَ تَبِیْعُهُ))

''مَیں نے تمہیں پہننے کے لیے نہیں دی مَیں نے تمہیں اس لیے دی تھی کہ تم اسے فروخت کردو۔''

اس پر انہوں نے اسے دو ہزار درہم میں فروخت کردیا۔

(ایضاً، تحریم لبس الحریر و غیر ذلك للرجال، ح : ۲۰۷۰)

علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کے لیے تحفہ میں حریر (ریشم) کی ایک قبا آئی، آپ نے اسے پہنا اور اس میں نماز پڑھی۔ پھر آپ واپس ہوئے تو اسے زور سے اتار پھینکا جیسے اسے بُرا جانتے ہوں۔ پھر فرمایا:

((لَا یَنْبَغِی هٰذَا لِلْمُتَّقِیْنَ))(ایضاً، ح : ۲۰۷۵)

''یہ پرہیزگاروں کے لائق نہیں ہے۔''

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ جو چیزیں صرف مَردوں کے لیے ممنوع ہیں ان کی خرید وفروخت جائز ہے۔

شادی کے دوسرے دن کا لازمی سفر؟

سوال آج کل یہ رواج بن گیا ہے کہ لڑکی کی شادی کے دوسرے دن لڑکی کے والدین آجاتے ہیں اور لڑکی کو اُس کے سسرال سے میکے لے جاتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا سنت ہے؟

جواب ایک مسلمان کے لیے زندگی گزارنے کا نمونہ اوراسوہ رسول کریم ﷺ ہیں، آپ کی سیرت ہمارے لیے ہر مسئلے میں راہنمائی کا کام دیتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے خود اپنی شادیاں بھی کیں اور اپنی بیٹیوں کی بھی۔ یہ جو مکلاوے کا رواج ہمارے معاشرے میں پایا جاتا ہے، قرآن وسنت میں اس کی کوئی دلیل موجود نہیں، لڑکی اور لڑکا شادی کے بعد اپنی مرضی سے جب چاہیں اپنے سسرال یا عزیز واقارب کو ملنے جائیں، دنوں کی کوئی قید اور پابندی شرع میں وارد نہیں۔ اس پابندی کو توڑنا چاہیے، شادی بیاہ کی بہت سی رسوم ایسی ہیں جن کا

سلف صالحین کے ہاں کوئی تصور نہ تھا، بارات، جہیز، مکلاوہ، سہرے وغیرہ سب ہندوانہ رواج ہیں، جو برصغیر پاک و ہند میں مسلم ہندو اختلاط کی وجہ سے پھیل چکے ہیں۔ ہمیں ہر قسم کی بدعات وخرافات سے اپنے ماحول کو پاک وصاف کرنا چاہیے۔ (از ابوالحسن مبشر احمد ربانی)

انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

من السنة اذا تزوج الرجل البكر على الثيب اقام عندها سبعا و قسم و اذا تزوج الثيب على البكر اقام عندها ثلاثا ثم قسم

(بخاری، ح: ۲۰۷۰)

لہٰذا مناسب یہی ہے کہ دُولھن اگر کنواری ہو تو سات دن بعد اور اگر ثیبہ (مطلقہ، بیوہ) ہو تو تین دن بعد والدین لینے کے لیے آئیں، دوسرے دن ہی مکلاوہ لے جانا خلاف سنت معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم (محمد ارشد کمال)

کیا ماہِ محرم میں شادی کرنا جائز نہیں؟

سوال ان دنوں (ذوالحجہ میں) لوگ دھڑا دھڑ شادیاں رچا رہے ہیں، جس کی ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ محرم میں شادیاں روک دی جاتی ہیں۔ کیا ماہِ محرم میں شادی نہیں کرنی چاہیے؟

جواب اسلام میں کوئی مہینہ ایسا نہیں جس میں شادی کرنا جائز نہ ہو۔ اگر شہادت یا حادثہ کی وجہ سے کسی مہینے میں شادی کرنا جائز نہ ہوتا تو پھر کوئی شادی منعقد ہی نہ ہو سکتی کیونکہ تاریخ اسلام کا کوئی مہینہ، کوئی ہفتہ بلکہ کوئی دن ایسا نہیں جس میں کوئی نہ کوئی صدمہ مسلمانوں کو نہ پہنچا ہو۔

اگر کہا جائے کہ شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ کی وجہ سے محرم میں شادی بیاہ کرنا جائز نہیں تو کوئی کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ صفر کے مہینے میں بھی شادی کرنا جائز نہیں کیونکہ اس ماہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے اس دارِفانی سے رختِ سفر باندھا۔ ماہ صفر کا ایک اور سانحہ واقعہ رجیع (۴ ہجری) بھی ہے قریش نے قبیلہ عضل اور قارہ کے ساتھ آدمیوں کو ملا کر ایک وفد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا کہ ہمارے قبائل مشرف بہ اسلام ہونے کو تیار ہیں، آپ

ہمارے ساتھ چند معلم روانہ کردیں جو ہمیں اسلام کی تعلیم دیں۔ آپ ﷺ نے دس معلم ان کے ہمراہ کردیے جنہیں بعدازاں دھوکے سے قتل کردیا گیا۔ اسی ماہ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایک اور صدمے سے دوچار ہونا پڑا قبیلہ بنی کلاب کے سردار عامر بن مالک کے مطالبے پر آپ نے ستر صحابہ کرام تعلیم دین کے لیے بھیجے جنہیں بنی عامر نے اپنے علاقے میں لے جاکر بئر معونہ کے مقام پر قتل کردیا۔ نبی اکرم ﷺ کو اِس سانحے کا اتنا صدمہ ہوا کہ کبھی اتنا صدمہ نہیں پہنچا تھا۔ آپ ﷺ ایک ماہ تک فرض نمازوں میں قاتلوں کے لیے قنوت نازلہ (کفار کے لیے بددعا) کرتے رہے۔ لہٰذا اِس مہینے میں بھی شادی کرنا ناجائز ٹھہرا! کیا کوئی اس کا قائل ہے؟

اسی طرز پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ذوالحجہ میں بھی شادی جائز نہیں کیونکہ اس مہینے میں خلیفہ سوم عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت واقع ہوئی تھی، مزید برآں اسی مہینے جنگ صفین کا المناک حادثہ وقوع پذیر ہوا، اس معرکہ میں صحابہ کرام کی کثیر تعداد خاک وخون میں لت پت ہوگئی، یہ سانحہ کسی صورت بھی سانحہ کربلا سے کم نہیں بلکہ صدمہ کے اعتبار سے واقعہ کربلا سے کہیں بڑھ کر ہے، واقعہ کربلا میں مسلمان باہم دست وگریباں ہوئے تھے اسی طرح جنگ صفین میں بھی مسلمانوں کے مقابلے میں مسلمان ہی تھے۔

جنگ جمل میں جو ماہِ جمادیٰ ثانیہ میں پیش آئی تھی، عشرہ مبشرہ میں سے طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما سمیت تیرہ ہزار کے لگ بھگ مسلمان شہید ہوئے۔ اس افسوسناک حادثے کی بناپر کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ جمادی ثانیہ میں شادی کرنا جائز نہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ خلیفۂ اول ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات بھی اسی مہینے میں ہوئی تھی۔ رمضان المبارک میں خلیفۂ چہارم سیدنا رضی اللہ عنہ کی شہادت کا سانحہ پیش آیا تھا۔

ماہ شوال میں غزوہ احد پیش آیا تھا جس میں اہل اسلام کا کافی جانی نقصان ہوا، تقریباً ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جام شہادت نوش کرگئے۔

رجب کے مہینے میں مسلمانوں کو کتنے صدمے سہنے پڑے۔ نبی ﷺ کے صحابی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا، ام المومنین حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہما اور ملت اسلامیہ

کے عظیم سپوت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اسی ماہ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

اگر کسی المیہ کی وجہ سے کسی مہینے میں شادی کرنا ناجائز ہوتا تو وہ ربیع الاول کا مہینہ ہوتا کہ جس میں سید الانبیاء والمرسلین خاتم النبیین ﷺ وفات پا گئے، اس سانحہ عظیم نے مسلمانوں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) کے ہوش وحواس اڑا دیے تھے۔ خلیفہ دوم عمر رضی اللہ عنہ جیسے جری جوان شدتِ غم والم، فرطِ محبت وعقیدت اور عالمِ وارفتگی میں اپنے ہوش کھو بیٹھے تھے جگر گوشہ رسول فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا پر رنج والم کی بجلیاں ٹوٹ پڑی تھیں۔ آپ ﷺ کی وفات کی وجہ سے ان پر اس قدر مصائب وآلام کے پہاڑ گر پڑے کہ اگر وہ دنوں پر پڑتے تو دن سیاہ ہو کر راتوں میں بدل جاتے۔ کوئی اندازہ کر سکتا ہے غم کی شدت کا! واقعہ کربلا کا الم تو اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ جب ایسے مہینے میں شادیاں کرنا درست ہیں تو اس کے مقابلے میں کسی اور مہینے یا حادثے کی حیثیت ہی کیا ہے؟

امِ حبیبہ اور صفیہ رضی اللہ عنہما سے نبی ﷺ نے محرم میں شادی کی۔

محرم کو ماتمی مہینہ سمجھ کر شادیاں بند نہیں کرنی چاہئیں۔ اس خیالِ فاسد کو دل ودماغ سے نکال دینا چاہیے کہ محرم الحرام میں شادی کرنا درست نہیں۔ اس کے لیے عوام الناس کی سوچ کو صحیح رخ پر ڈالیں۔ محرم ماتمی مہینہ نہیں ہے۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت پر جو ماتم کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اسلام میں اس کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں، شریعت مطہرہ میں کسی بھی موت پر تین دن سے زیادہ سوگ منانا جائز نہیں۔ عورت اپنے شوہر کی وفات پر اسلام کی حدود میں رہتے ہوئے چار مہینے دس دن سوگ کر سکتی ہے، صدیاں بیت جانے کے بعد بھی سوگ مناتے رہنا اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔

کیا کسی عورت کا نکاح اس کی رضامندی کے بغیر منعقد کیا جا سکتا ہے؟

سوال کیا کسی عورت کا نکاح اس کی رضامندی کے بغیر منعقد کیا جا سکتا ہے؟

جواب کسی بھی عورت کا نکاح اس کی رضامندی کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ احادیث میں ایسے نکاح کو مردود قرار دیا گیا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی حفظہ اللہ لکھتے ہیں: اگر کوئی والد یا اس کی عدم موجودگی کی صورت میں ولی بیٹی کا نکاح اس کی مرضی کے خلاف کر دے تو وہ نکاح

مردود ہوگا، خواہ بیٹی بیوہ ہو یا دوشیزہ۔

ذیل میں دونوں کے متعلق ایک ایک حدیث ملاحظہ فرمائیے:

1 بیوہ کی اجازت کے خلاف نکاح کا مردود ہونا

امام بخاری نے خنساء بنت خدام انصاریہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے:

ان اباها زوجها، وهی ثیب، فكرهت ذلك، فاتت رسول الله ﷺ فرد نكاحها (بخاری، النكاح، ح: ۵۱۳۸، ۹/ ۱۹۴)

''ان کے والد نے ان کا نکاح کر دیا اور تب وہ بیوہ تھیں، انہیں یہ (نکاح) پسند نہ تھا۔ اس لیے وہ اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، تو آپ نے اس نکاح کو فسخ کر دیا۔''

امام بخاری نے اس پر درج ذیل عنوان تحریر کیا ہے:

باب اذا زوج الرجل ابنته، وهی كارهة، فنكاحه مردود

(المرجع السابق ۹/ ۱۹۴)

''(اس بارے میں) باب، کہ جب آدمی اپنی بیٹی کا نکاح اس کی مرضی کے خلاف کر دے، تو اس کا کیا ہوا نکاح مردود ہوگا۔''

امام بخاری نے اس حدیث پر ایک دوسرے مقام پر درج ذیل عنوان لکھا ہے:

باب لا یجوز نكاح المكره

(المرجع السابق، کتاب الاکراہ ۱۲/ ۳۱۸)

''(اس بارے میں) باب، کہ جبر کیے ہوئے شخص کا نکاح جائز نہیں۔''

2 دوشیزہ کی اجازت کے خلاف کیا ہوا نکاح

حضرات ائمہ احمد، ابوداود اور ابن ماجہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے:

ان جارية بكرا اتت النبی ﷺ فذكرت ان اباها زوجها، وهی كارهة، فخير ها النبی ﷺ

(المسند، ح: ۲۴۶۹، ۴/ ۱۵۵ (ط۔مصر) ؛ابو داؤد، النكاح، فی البكر يزوجها ابوها ولا يستامرها، ح: ۲۰۹۶، ۶/ ۸۳؛ ابن ماجة، النكاح، من زوج ابنته وهی كارهة، ح: ۱۸۸۰)

''بلاشبہ ایک دوشیزہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ اس کے والد نے اس کا نکاح کیا ہے اور وہ اسے ناپسند کرتی ہے تو نبی ﷺ نے اسے اختیار دے دیا۔''

بیوہ اور دوشیزہ کے بارے میں آنحضرت ﷺ کے فیصلہ کے متعلق امام ابن قیم تحریر کرتے ہیں:

وموجب هذا الحكم انه لاتجبر البكر البالغ على النكاح، ولا تزوج الابرضاها، وهذا قول جمهور السلف، ومذهب ابى حنيفة واحمد فى احدى الروايتين عنه، وهو القول الذى ندين الله به، ولا نعتقد سواه وهوالموافق لحكم رسول اللهﷺ وامره ونهيه، وقواعد الشريعة ومصالح امته

(زادالمعاد ۵/ ۹۲، نیز ملاحظہ ہو: المرجع السابق ۵/ ۹۲-۹۹، و سبل السلام ۳/ ۲۳۶- ۲۳۸، ونيل الاوطار ۶/ ۲۵۵)

''یہ اس بات کو واجب کرتا ہے کہ دوشیزہ کو (اس کی مرضی کے خلاف جگہ) نکاح کرنے پر مجبور نہ کیا جائے اور اس کا نکاح اس کی رضا مندی کے بغیر نہ کیا جائے۔ یہی جمہور سلف کا قول، ابوحنیفہ اور ایک روایت کے مطابق احمد کا مذہب ہے۔ اور ہم اللہ کے لیے اس قول کو بطور دین اختیار کرتے ہیں اور اس کے علاوہ دوسری رائے نہیں رکھتے اور یہی اللہ کے رسول ﷺ کے فیصلہ، امر و نہی، قواعد شریعت اور مصالح امت کے موافق ہے۔''

ضروری تنبیہ: بعض باپ اور ولی دوشیزہ کی مرضی کے خلاف نکاح کرتے وقت کہتے ہیں کہ:

''جو رشتہ مل رہا ہے وہ بہت ہی مناسب ہے اور بچی ناسمجھ ہے اور ہمارا مقصود صرف بچی کی خیر خواہی ہے۔''

ایسے نکاح کی شرعی حیثیت جاننے کے لیے درج ذیل ثابت شدہ واقعہ پر غور کرنا ان شاءاللہ مفید ہوگا: امام احمد نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا:

عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ فوت ہوئے اور انہوں نے خویلہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا کے بطن سے ایک بیٹی چھوڑی۔ انہوں نے اپنے بھائی قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ کو (اپنی بیٹی کا) نگران مقرر کیا۔

عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا:

وہ دونوں (عثمان اور قدامہ رضی اللہ عنہما) میرے ماموں ہیں۔ مَیں نے عثمان بن مظعون کی بیٹی کا رشتہ قدامہ بن مظعون سے طلب کیا تو انہوں نے اس کا نکاح میرے ساتھ کر دیا۔

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اس کی ماں کے پاس آئے اور مال کے ذریعہ اسے ترغیب دی تو ماں کا میلان ان (کے ساتھ بیٹی کا نکاح کرنے) کی طرف ہو گیا۔ بیٹی بھی اپنی ماں کے پیچھے لگی تو اُن دونوں نے (اسے) نامنظور کیا۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے رُوبرُو دونوں کا معاملہ پیش کیا گیا تو قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ نے کہا:

یارسول اللہ! ابنة اخی اوصی بھا الی، فزوجتھا ابن عمتھا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فلم اقصر بھا فی الصلاح ولا فی الکفاءة، ولکنھا امرأة، وانما حطت الی ھوی امھا

"اللہ کے رسول! (وہ) میرے بھائی کی بیٹی ہے، اس نے اس کا معاملہ مجھے سونپا، تو مَیں نے اس کا نکاح اس کے پھوپھی زاد عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے کیا۔ مَیں نے اس کے لیے نیک اور ہم پلہ رشتہ تلاش کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، لیکن وہ تو عورت (زاد) ہے اور وہ یقیناً اپنی ماں کی خواہش کے پیچھے چل پڑی ہے۔"

انہوں (عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما) نے بیان کیا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((ھِیَ یَتِیمَةٌ وَلَا تُنْکَحُ اِلَّا بِاِذْنِھَا))

"وہ یتیم بچی ہے اور اس کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح نہ کیا جائے گا۔"

(یَتِیمَةٌ سے یہاں مراد بالغہ ہے، کیونکہ اجازت تو بالغہ عورت ہی سے لی جاتی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اس کی سابقہ حیثیت کے پیش نظر اسے یتیمہ کہا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم)

انہوں (ابن عمر رضی اللہ عنہما) نے بیان کیا:

''اس کے مالک ہونے (یعنی اس کے ساتھ نکاح ہونے) کے بعد وہ مجھ سے چھینی گئی، تو انہوں نے مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے اس کا نکاح کر دیا۔''

(المسند، ح:۶۱۳۶، ۲/ ۹۷۔۸ باختصار، دار قطنی، النکاح، ح:۳۴۲۷/۳، ۲۳۰، بیہقی، النکاح، ماجاء فی انکاح الیتیمة، ح: ۱۳۶۹۲، ۷/ ۱۹۵؛ المستدرك على الصحيحين، النكاح ۲/ ۱۶۷)

اگر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ایسی عظیم شخصیت کے ساتھ دوشیزہ کی اجازت کے بغیر کیا ہوا نکاح باقی نہ رہا تو اور کسی شخص کے ساتھ دوشیزہ کی مرضی کے خلاف نکاح کرنے کی اجازت کیونکر ہو سکتی ہے؟

تنبیہ: بیٹی کے سابقہ نکاح کے باوجود آنحضرت ﷺ نے مغیرہ رضی اللہ عنہ کے اسی بیٹی کا رشتہ طلب کرنے پر احتساب نہ کیا، کیونکہ بیٹی کی اجازت کے بغیر کیا ہوا نکاح شرعاً مردود ہوتا ہے۔ (بیٹی کی شان وعظمت ص: ۴۴۔۴۸)

کیا بیٹی کا نکاح اس کی رضا مندی کے بغیر نہیں کیا جا سکتا؟

سوال کیا باپ اپنی بیٹی کا نکاح اس کی رضا مندی کے بغیر کر سکتا ہے۔ اگر نہیں تو کیوں؟

جواب کسی باپ کو بیٹی کی رضا مندی کے بغیر اس کا نکاح کرنے کی اجازت نہیں، اس سلسلے میں تین احادیث شریفہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔

① امام بخاری اور امام مسلم نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے روایت نقل کی ہے، کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((لَا تُنْكَحُ الْاَيِّمُ حَتّٰى تُسْتَأْمَرَ وَلَا تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتّٰى تُسْتَأْذَنَ))

''بیوہ کا نکاح اس کا حکم لیے بغیر نہ کیا جائے اور دوشیزہ کا نکاح اس کی اجازت لیے بغیر نہ کیا جائے۔''

انہوں (صحابہ) نے عرض کیا:

يا رسول الله ، وكيف اذنها؟

''اللہ کے رسول ﷺ! اس (یعنی دوشیزہ) کی اجازت کیسے ہے؟''

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((اَنْ تَسْكُتَ))

''یہ کہ وہ خاموش رہے۔''

(بخاری، النکاح، لاینکح الاب وغیرہ ..... ح: ۵۱۳۶؛ مسلم، النکاح، ح:۱۴۱۹)

امام بخاری نے اس پر درج ذیل عنوان تحریر کیا ہے:

باب لاینكح الاب وغيره البكر والثيب الا برضاهما

''(اس بارے میں) باب کہ باپ یا کوئی اور (ولی) دوشیزہ یا بیوہ کا نکاح ان کی رضامندی کے بغیر نہ کرے۔''

امام نووی نے مسلم کی روایت پر درج ذیل عنوان تحریر کیا ہے:

باب استيذان الثيب فی النكاح بالنطق والبكر بالسكوت

''بیوہ سے نکاح میں بول کر اور دوشیزہ سے خاموش رہ کر اجازت لینے کے متعلق باب۔''

ب: امام بخاری نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((الْبِكْرُ تُسْتَأْذَنُ))

''دوشیزہ سے (اس کا نکاح کرنے کے لیے) اجازت طلب کی جائے گی۔''

مَیں نے عرض کیا:

ان البكر تستحيى

''دوشیزہ تو شرماتی ہے۔''

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((اِذْنُهَا صَمَاتُهَا))

"اس کی اجازت اس کا سکوت ہے۔"

(بخاری، الحیل، فی النکاح، ح: ۶۹۷۱؛ مسلم، النکاح، استیذان الثیب فی النکاح، والبکر بالسکوت، ح: ۱۴۲۰)

ج: حضرات ائمہ ابوداؤد، ترمذی اور ابن حبان نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((تُسْتَأْمَرُ الْيَتِيمَةُ فِي نَفْسِهَا فَإِنْ سَكَتَتْ فَهُوَ إِذْنُهَا، وَإِنْ أَبَتْ فَلَاجَوَازَ عَلَيْهَا))

"یتیم بچی سے اس کی جان (یعنی اس کے نکاح) کے متعلق حکم طلب کیا جائے گا۔ پس اگر وہ خاموش رہے تو یہی اس کی طرف سے اجازت ہے اور اگر وہ انکار کردے تو اس پر کوئی زبردستی نہیں۔"

(أبوداؤد، النکاح، فی الاستمار، ح: ۲۰۹۳؛ ترمذی، النکاح، ماجاء فی اکراہ الیتیمة علی التزویج، ح: ۱۱۰۹؛ ابن حبان، النکاح، الولی، ح: ۴۰۷۹، الفاظ حدیث ابوداؤد کے ہیں۔)

(یتیم بچی سے مراد وہ بالغہ دوشیزہ ہے، جس کا باپ اس کے سن بلوغت کو پہنچنے سے پہلے فوت ہو گیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی سابقہ حالت کے پیش نظر اسے 'یتیمہ' کہا۔)

(ملاحظہ ہو: معالم السنن للامام الخطابی ۳/ ۲۰۲، وعون المعبود ۶/ ۸۳، و تحفة الاحوذی ۴/ ۲۰۴)

امام ابن حبان نے اس حدیث پر درج ذیل عنوان تحریر کیا ہے:

ذکر الاخبار عما یجب علی الاولیاء من استمار النساء اذا ارادوا عقد النکاح علیهن

"عورتوں کے نکاح کا ارادہ کرتے وقت اولیاء (سرپرستوں) پر ان سے اجازت لینے کے وجوب کے متعلق احادیث کا ذکر۔"

(الاحسان فی تقریب ابن حبان ۹/ ۳۹۲)

دو قابلِ توجہ باتیں

① بیٹی سے کب اجازت لی جائے؟

عام طور پر تقریب نکاح کے موقع پر بیٹی کے والد یا ماموں وغیرہ اس سے اجازت طلب کرنے کی غرض سے جاتے ہیں۔ اگر اس سے پیشتر بیٹی سے اجازت لی جا چکی ہے تو شاید اس موقع پر طلب کردہ اجازت کی حیثیت ایک رسمی کارروائی سے زیادہ نہ ہو گی۔ لیکن اگر اس سے پیشتر اجازت نہ لی ہو تو یہ موقع اجازت طلب کرنے کے لیے مناسب نہیں، کیونکہ رشتہ کی ناپسندیدگی کی بنا پر اگر لڑکی اس وقت انکار کر دے تو یہ والد اور خاندان کے لیے بہت بڑی پریشانی کا موجب ہو گا اور اگر وہ اپنی ناپسندیدگی کے باوجود اظہار نہ کرے تو اس کا حق مجروح ہو گا۔

درست طریقہ یہ ہے کہ رشتہ طے کرنے سے پیشتر بیٹی سے اجازت لی جائے۔ اس کی طرف سے اجازت ملنے پر ہی معاملہ کو آگے بڑھایا جائے ورنہ وہیں ختم کر دیا جائے۔

① دوشیزہ کی خاموشی کا معنیٰ اس کے لیے واضح کرنا

دوشیزہ کی خاموشی سے اس کی اجازت سمجھے جانے کے بارے میں علامہ قرطبی نے ایک خوبصورت بات تحریر کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ہمارے بعض علماء نے اس بات کو مستحب قرار دیا ہے کہ دوشیزہ کو بتلایا جائے، کہ اس کی خاموشی کو اس کی اجازت سمجھا جائے گا، تاکہ وہ صورت حالت سے اچھی طرح آگاہ ہو جائے۔

ہمارے بعض شناسا فقہاء ایسے موقع پر دوشیزہ کو کہا کرتے تھے:

''اگر تم اس پر راضی ہو تو چپ رہو اور اگر ناپسند ہے تو پھر بولو'' اور یہ یاددہانی اچھی ہے۔''

(المفہم ۴/ ۱۱۸) [بیٹی کی شان وعظمت، از پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی حفظہ اللہ]

کیا سرپرست (ولی) کے بغیر عورت کا نکاح کیا جا سکتا ہے؟

سوال کیا سرپرست (ولی) کی رضامندی کے بغیر عورت کا نکاح کیا جا سکتا ہے؟

جواب جس طرح سرپرست کو قطعی طور پر اس بات کا حق نہیں، کہ وہ کسی عورت کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر کرے، اسی طرح کسی بیٹی کو بھی اس بات کا حق نہیں، کہ وہ اپنے باپ یا ولی سے بالا بالا خود ہی اپنا نکاح کروا لے۔ ارشاد نبوی ہے:

((لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ))

"ولی کے بغیر نکاح ہی نہیں۔"

(ابو داؤد، النکاح، فی الولی، ح: ۲۰۸۵؛ ترمذی، النکاح، ح: ۱۱۰۱؛ ابن ماجۃ، النکاح، ح: ۱۸۸۷)

ایک اور ارشاد نبوی ہے:

((أَيُّمَا امْرَأَةٍ نَكَحَتْ بِغَيْرِ إِذْنِ وَلِيِّهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ))

"جس کسی عورت نے بھی اپنے ولی کے بغیر نکاح کیا تو اُس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے۔"

(ابوداؤد، النکاح، فی الولی، ح: ۲۰۸۳؛ ترمذی، النکاح، ماجاء لا نکاح الا بولی، ح: ۱۱۰۲؛ ابن ماجۃ، النکاح، لا نکاح الا بولی، ح: ۱۸۷۹)

خود کئے گئے نکاح کے لیے نبی اکرم ﷺ کا تین دفعہ "باطل" کا لفظ بولنا اس جرم کی شدت پر دلالت کرتا ہے۔ مزید برآں عہد رسالت اور عہد صحابہ سے کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ کسی عورت نے اپنا نکاح خود ہی، بغیر کسی سرپرست کے کر لیا ہو اور وہ برقرار رہنے دیا گیا ہو۔ ایک دفعہ ایک عورت نے اصلی ولی اور سرپرست کی بجائے کسی اور کو اپنا ولی بنا لیا جس نے اس عورت کا نکاح کروا دیا۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے نکاح کرنے اور کروانے والوں کو درے مارے اور اس عورت کا نکاح ختم کر دیا۔

(مصنف عبدالرزاق، النکاح، النکاح بغیر ولی، ح: ۱۰۴۸۶؛ مصنف ابن ابی شیبۃ، النکاح، فی المرأۃ اذا تزوجت بغیر ولی، ح: ۱۶۱۹۱)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

لا تنکح المراۃ نفسھا، فان الزانیۃ تنکح نفسھا

"عورت اپنا نکاح خود نہ کروائے، کیونکہ بدکار عورت اپنا نکاح خود کرواتی ہے۔"

(مصنف عبدالرزاق، النکاح، النکاح بغیر ولی، ح: ۱۰۴۹۴)

اسی سے ملتا جلتا فرمان عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔ (ایضاً، ح: ۱۰۴۸۱)

نکاح میں ولی کی شرط کیوں ضروری ہے؟ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”نکاح میں سرپرست کی شرط ان کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے اور عورتوں کا نکاح کو اپنے ہاتھ میں لینے میں بے غیرتی ہے، جس کی وجہ حیاء کی کمی، سرپرستوں پر دست درازی اور ان سے لاپرواہی برتنا ہے۔ علاوہ ازیں تشہیر کے ذریعہ نکاح اور بدکاری میں فرق کرنا واجب ہے اور نکاح کی تشہیر میں سب سے اہم بات لڑکی کے سرپرستوں کا بوقتِ نکاح حاضر ہونا ہے۔“ (حجۃ اللہ البالغۃ ۲/۱۲۷)

قرآن کے سائے میں دُولھن کی رخصتی؟

سوال آج کل بعض گھرانوں میں یہ رواج ہے کہ دُولھن کو قرآن کے سائے میں رخصت کیا جاتا ہے اور یہ اعتقاد رکھا جاتا ہے کہ اگر ہم اس کے سر پر قرآن کا سایہ کریں گے تو وہ سکھی رہے گی۔ کیا یہ عمل اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے؟

جواب ایسا کرنا کتاب وسنت سے ثابت نہیں۔ نبی ﷺ اور صحابہ واہلِ بیت بھی تو اپنی بیٹیوں کو رخصت کرتے تھے مگر انہوں نے کبھی یہ کام نہیں کیا۔ دُولھن کو دعا دیں اور کتاب و سنت کی تعلیمات پر عمل کرنے کی تلقین کریں تا کہ اللہ اسے سکھ اور چین نصیب کرے۔ قرآن اس لیے نازل نہیں ہوا کہ اس سے سَروں پر سایہ کیا جائے یا قَسم کے وقت اٹھایا جائے۔ یہ تو پڑھنے اور عمل کرنے کے لیے ہے۔ اگر سر پر کرنے سے سُکھ چین نصیب ہوتا ہوتو کیا دُولھا کو سُکھ اور چین کے حصول کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی! افافھم و تدبر!

البتہ دُولھن کو رخصت کرتے وقت مسافر کو رخصت کرنے والی دعائیں پڑھ دی جائیں تو درست ہوگا۔ اللہ کے رسول ﷺ مسافر کو وداع کرتے وقت یہ دعا پڑھتے تھے:

((اَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكَ وَاَمَانَتَكَ وَخَوَاتِيْمَ عَمَلِكَ))

(ترمذی، الدعوات عن رسول اللہ ﷺ، ما یقول الانسان اذا ودع انسانا، ح:۳۴۴۲، ۳۴۴۳)

”مَیں تیرا دین، تیری امانت (اہل وعیال وغیرہ) اور تیرا انجامِ کار اللہ کی حفاظت میں دیتا ہوں۔“

ایک حدیث میں اٰخِرَ کی جگہ پر خَوَاتِيْمَ ہے۔ (ایضاً)

مفہوم دونوں کا ایک ہے۔

رخصت ہونے والا دوسروں سے دعا بھی کرواسکتا ہے جیسے کہ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کرنے لگا: اللہ کے رسول! مَیں سفر پر جانا چاہتا ہوں، مجھے زادِراہ دیجیے۔ آپ نے دعا کی:

((زَوَّدَكَ اللّٰهُ التَّقْوٰی))

''اللہ تجھے تقویٰ کا زادِراہ عطا کرے۔''

اس نے عرض کیا اور زیادہ کیجیے۔ آپ نے دعا کی:

((وَ غَفَرَ ذَنْبَكَ))

''اللہ تیرے گناہ بخش دے۔''

اس نے پھر عرض کیا، میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں! اور زیادہ کیجیے۔ آپ نے مزید دعا دی:

((وَ يَسَّرَ لَكَ الْخَيْرَ حَيْثُ مَا كُنْتَ)) (ایضاً، ح:۳۴۴۴)

''تو جہاں کہیں بھی ہو اللہ تیرے لیے خیر (بھلائی) آسان کر دے۔''

جنت میں بیویوں کی تعداد؟

سوال معتبر علماء کرام بیان کرتے ہیں کہ جنت میں مرد کی دو بیویاں ہوں گی، ستر بیویوں والی روایت صحیح نہیں۔ اگر کسی شخص کی دنیا میں ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو کیا اسے جنت میں صرف اس کی دو بیویاں ہی ملیں گی یا سبھی؟ کیا کوئی ایسی صورت بھی ہوگی کہ کسی شخص کو دو سے زیادہ بیویاں ملیں؟

جواب جو مومن عورت جس مومن مرد کے نکاح میں فوت ہوگی وہ جنت میں اسی مرد کی بیوی ہوگی۔ خواہ ان عورتوں کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً ایک شخص کی دنیا میں چار بیویاں تھیں وہ چاروں وفات پاگئیں، اب اس شخص نے ان بیویوں کی وفات کے بعد اور عورتوں سے شادی کر لی تو ایسی صورت میں اس کی پہلی چار بیویاں اور باقی مومن بیویاں بھی جنت میں اسی شخص کی بیویاں ہوں گی۔ اگر کوئی خاوند پہلے فوت ہو جائے تو جنت میں یہ اسی شخص کی بیویاں ہوں گی جن کے نکاح میں فوت ہوئی ہوں گی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ۝﴾ (۴۳/الزخرف:۷۰)

''تم اور تمہاری بیویاں ہشاش بشاش جنت میں چلے جاؤ۔''

ایک حدیث نبوی میں ہے:

((اَلْمَرْأَةُ لِاٰخِرِ اَزْوَاجِهَا))(سلسلہ صحیحہ للالبانی:۱۲۸۱)

''جنت میں عورت اپنے آخری خاوند کی بیوی ہوگی۔''

اس کے علاوہ ہر جنتی کو دو دو حوریں عطا کی جائیں گی، ارشاد نبوی ہے:

((لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ زَوْجَتَانِ مِنَ الْحُوْرِ الْعِيْنِ))

(بخاری، بدء الخلق، ما جاء فی صفة الجنة.....ح:۳۲۵۴؛ مسلم، ح:۲۸۳۴)

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دو سے زیادہ بیویاں بھی ملیں گی، حدیث نبوی ہے:

((اِنَّ لِلْمُؤْمِنِ فِي الْجَنَّةِ لَخَيْمَةً مِّنْ لُؤْلُؤَةٍ وَاحِدَةٍ مُجَوَّفَةٍ طُوْلُهَا سِتُّوْنَ مِيْلًا لِلْمُؤْمِنِ فِيْهَا اَهْلُوْنَ فَيَطُوْفُ عَلَيْهِمُ الْمُؤْمِنُ فَلَا يَرٰى بَعْضُهُمْ بَعْضًا)) ۔

(مسلم، الجنة، فی صفة خیام الجنة وما للمؤمنین فیها من اهلین، ح:۲۸۳۸؛ بخاری، ح:۳۲۴۳)

''مومن کو جنت میں ایک خیمہ ملے گا جو ایک ہی خولدار موتی کا ہوگا اور اُس کی لمبائی ساٹھ میل ہوگی، اس میں اُس کی بیویاں ہوں گی، وہ ان پر چکر لگائے گا، وہ ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکیں گے۔''

البتہ اگر کسی کی خواہش زیادہ کی ہوگی تو یقیناً اسے زیادہ بیویاں ملیں گی کیونکہ اللہ تعالیٰ جنتیوں کی ہر خواہش پوری کریں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ﴾ (۱۶/النحل:۳۱)

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝﴾ (۴۱/حٰم السجدۃ:۳۱)

ایک آیت یوں ہے:

﴿ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ﴾ (۴۳/الزخرف:۷۱)

طلاق کے احکام ومسائل

عورت طلاق دینے کا حق رکھتی ہے؟

سوال مغربی معاشرے میں عورتیں اپنے خاوندوں کو طلاق دے دیتی ہیں۔ کیا عورت اپنے شوہر کو طلاق دے سکتی ہے؟

جواب قرآن مجید میں جہاں جہاں طلاق کا تذکرہ ہوا ہے وہاں طلاق دینے کی نسبت مرد یعنی شوہر کی طرف کی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ (۲/البقرۃ:۲۳۱،۲۳۲/۶۵/الطلاق:۱)۔

﴿اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ (۲/البقرۃ:۲۳۶)۔

﴿طَلَّقْتُمُوْهُنَّ﴾ (۲/البقرۃ:۲۳۷،۳۳/الاحزاب:۴۹)۔

﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا﴾ (۲/البقرۃ:۲۳۰)۔

﴿طَلَّقَكُنَّ﴾ (۶۶/التحریم:۵)۔

﴿وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ﴾ (۲/البقرۃ:۲۲۷)

قرآن کریم میں ﴿اَلْمُطَلَّقٰتُ﴾ (طلاق یافتہ عورتیں) کا لفظ تو آیا ہے مگر المطلقون (طلاق یافتہ مرد) یا اس معنی کا کوئی بھی لفظ استعمال نہیں ہوا۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ...... ﴾ (۲/البقرۃ:۲۲۸)

"طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو روک کر رکھیں......"

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ﴾ (۲/البقرۃ:۲۴۱)

"طلاق شدہ عورتوں کو اچھی طرح فائدہ دینا پرہیز گاروں پر لازم ہے۔"

قرآن اور احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کی گرہ خاوند کے ہاتھ میں ہے۔

بیواؤں کی عدت کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ڛ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ

اَجَلَهٗ﴾ (۲/البقرة:۲۳۵)

''تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اگر تم اشارتاً کنایتاً ان عورتوں سے نکاح کی بابت کہو یا اپنے دل میں پوشیدہ ارادہ کرو، اللہ کو علم ہے کہ تم ضرور انہیں یاد کرو گے لیکن تم ان سے پوشیدہ وعدے نہ کرلو، ہاں یہ اور بات ہے کہ تم بھلی بات کہو، جب تک عدت ختم نہ ہوجائے عقدۂ نکاح پختہ نہ کرلیا کرو۔''

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ (۲/البقرة:۲۳۷)

''اور اگر تم عورتوں کو اس سے پہلے طلاق دے دو کہ تم نے انہیں ہاتھ لگایا ہو اور تم نے ان کا مہر بھی مقرر کردیا ہو تو مقررہ مہر کا آدھا مہر دے دو، یہ اور بات ہے کہ وہ خود معاف کردیں یا وہ شخص معاف کردے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔ تمہارا معاف کردینا تقویٰ سے بہت نزدیک ہے اور آپس کے فضل و احسان کو فراموش نہ کرو، یقیناً اللہ تمہارے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے۔''

﴿بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ﴾ کے بارے میں حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ایک حدیث میں ہے:

((وَلِيُّ عُقْدَةِ النِّكَاحِ الزَّوْجُ))

(دار قطنی ۳/ ۲۷۹، ح:۳۶۷۶، سند میں ابن لہیعہ ضعیف راوی ہے۔)

''نکاح کی گرہ کا مالک خاوند ہے۔''

علی رضی اللہ عنہ سے سوال ہوا کہ اس سے مراد کیا عورت کے اولیاء ہیں؟ فرمایا:

لا بل هو زوج (ایضاً:۳۶۷۱)

''نہیں بلکہ اس سے مراد خاوند ہے۔''

اور بھی بہت سے مفسرین سے یہی مروی ہے، امام شافعی کا جدید قول بھی یہی ہے، امام ابوحنیفہ اور دیگر کا بھی یہی مذہب ہے اس لیے کہ حقیقتاً نکاح کو باقی رکھنا توڑ دینا وغیرہ یہ سب خاوند کے ہی اختیار میں ہے اور جس طرح ولی کو اُس کی طرف سے جس کا وہ ولی ہے اس کے مال کا دے دینا جائز نہیں، اسی طرح اس کا مہر معاف کر دینے کا بھی اختیار نہیں۔ (ابن کثیر)

﴿ بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ﴾ سے بعض مفسرین نے عورت کے سرپرست بھی مراد لیے ہیں۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں: دوسرا قول اس بارے میں یہ ہے کہ اس سے مراد عورت کے باپ بھائی اور وہ لوگ ہیں جن کی اجازت کے بغیر عورت نکاح نہیں کر سکتی، ابن عباس رضی اللہ عنہ، علقمہ، حسن، عطا، طاؤس، زہری، ربیعہ، زید بن اسلم، ابراہیم نخعی، عکرمہ، محمد بن سیرین سے بھی یہی مروی ہے کہ ان دونوں بزرگوں کا بھی ایک قول یہی ہے، امام مالک کا اور امام شافعی کا قول قدیم بھی یہی ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ ولی نے ہی اس حق کا حقدار اسے کیا تھا تو اس میں تصرف کرنے کا بھی اسے اختیار ہے گو اور مال میں ہیر پھیر کرنے کا اختیار نہ ہو، عکرمہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے معاف کر دینے کی رخصت عورت کو دی اور اگر وہ بخیلی اور تنگ دلی کرے تو اس کا ولی بھی معاف کر سکتا ہے گو وہ عورت سمجھدار ہو، شریح بھی یہی فرماتے ہیں لیکن جب شعبی نے انکار کیا تو آپ نے اس سے رجوع کر لیا اور فرمانے لگے کہ اس سے مراد خاوند ہی ہے بلکہ وہ اس بات پر مباہلہ کرنے کو تیار رہتے تھے۔ (ایضاً)

اگر دوسرا قول بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی طلاق دینے کا حق عورت کو منتقل نہیں ہوتا۔ پھر یہ دوسرا قول مرجوح ہے، قابل ترجیح وہی قول ہے جس میں ﴿ بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ﴾ سے مراد شوہر لیا گیا ہے۔ کیونکہ مذکورہ بالا آیت میں حق مہر معاف کرنے کی بات کی گئی ہے اور مہر عورت کا حق اور اس کا مال ہے، اسے معاف کرنے کا حق عورت کے ولی (سرپرست) کو نہیں ہوتا، اسی کو امام شوکانی نے صحیح قرار دیا ہے۔ (دیکھیے فتح القدیر)

﴿ يَعْفُوَنَ أَوْ يَعْفُوَا الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ﴾ کے بارے میں مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد خاوند ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ﴾ (۲/البقرۃ:۲۳۵)

''جب تک عدت ختم نہ ہو نکاح کی گرہ کو پختہ نہ کرو۔'' (تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن)

یہاں مخاطب نکاح کرنے والے ہیں۔ لہٰذا طلاق دینے کا حق صرف اور صرف خاوند کو حاصل ہے بیوی اپنے شوہر کو یا خود اپنے آپ کو طلاق نہیں دے سکتی، البتہ عورت خلع کا حق رکھتی ہے جس کی وجہ سے مرد طلاق دے دیتا ہے یا عدالت نکاح فسخ کر دیتی ہے۔ (واللہ اعلم)

جبری طلاق کا حکم

سوال کیا زبردستی دلائی گئی طلاق واقع ہو جاتی ہے؟

جواب زبردستی دلائی گئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ لِیْ عَنْ اُمَّتِی الْخَطَأَ وَالنِّسْیَانَ وَمَا اسْتُكْرِهُوْا عَلَیْهِ))

''اللہ نے میری خاطر میری امت سے خطا، بھول اور جبر کی حالت میں کیا ہوا کام معاف کر دیا ہے۔''

(ابن ماجة، الطلاق، طلاق المکرہ و الناسی، ح:۲۰۴۳)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ طلاق جبراً واقع نہیں ہوتی۔

(فتاویٰ نذیریہ ۳/۹۱؛ فتاویٰ اہل حدیث ص:۴۹۷)

دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:

((اِنَّ اللّٰهَ وَضَعَ عَنْ اُمَّتِی الْخَطَأَ وَالنِّسْیَانَ وَمَا اسْتُكْرِهُوْا عَلَیْهِ))

(ابن ماجة، الطلاق، طلاق المکرہ و الناسی، ح:۲۰۴۵)

یعنی یہ تینوں مذکورہ کام امت سے معاف کر دیے گئے ہیں۔

جبری طلاق واقع نہیں ہوتی لہٰذا مطلقہ عورت کا نکاح آگے نہیں کیا جا سکتا، ایسی صورت میں نکاح خواں کو نکاح پڑھانے سے انکار کر دینا چاہیے۔ اگر لاعلمی کی وجہ سے نکاح پڑھا بھی دیا جائے تو وہ غیر شرعی ہے، یہ ایسے ہی ہوگا کہ کسی عورت کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کا آگے نکاح کر دیا جائے۔

صحابہ کرام میں سے عمر، عبداللہ بن عمر، علی، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اور ائمہ میں سے امام مالک، امام شافعی، امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک جبری طلاق واقع نہیں ہوتی۔

خواتین کے مخصوص مسائل

کیا عورت کا کان اور ناک چھیدنا جائز ہے؟

سوال: عورتیں زیورات پہننے کے لیے کان اور ناک چھید لیتی ہیں۔ کیا اسلام میں اس کی کوئی اصل ہے؟ نیز عورتوں کا انگوٹھیاں اور گلے میں ہار پہننا شریعت کی نظر میں کیسا ہے؟

جواب: عورتوں کے لیے زیورات پہننا جائز ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں زیور کی نسبت عورتوں کی طرف کی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَوَمَن يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ ﴾ (۴۳/الزخرف:۱۸)

''کیا (اللہ کی اولاد لڑکیاں ہیں) جو زیورات میں پلیں اور جھگڑے میں (اپنی بات) واضح نہ کر سکیں؟''

جبکہ عورتوں کے زیورات پہننے کی صراحت احادیث میں موجود ہے۔ نبی ﷺ عید الفطر کے دن کھڑے ہوئے، پہلے نماز پڑھی پھر خطبہ دیا، خطبہ سے فارغ ہو کر عورتوں کے پاس آئے اور انہیں نصیحت کی، فرمایا:

((فَتَصَدَّقْنَ)) فبسط بلال ثوبه ثم قال: هلم لكن فداء ابي وامي فيلقين الفتخ والخواتيم فى ثوب بلال

''خیرات کرو۔ تو بلال نے اپنا کپڑا پھیلایا اور کہا: لاؤ ڈالو۔ تم پر میرے ماں باپ قربان! تو عورتیں چھلے اور انگوٹھیاں بلال کے کپڑے میں ڈالنے لگیں۔''

(بخاری، العیدین، موعظة الامام النساء یوم العید، ح:۹۷۹)

جبکہ صحیح مسلم میں خرص (بالیاں) کا لفظ آیا ہے۔ آپ ﷺ نے عید کا خطبہ دیا۔ آپ ﷺ کو محسوس ہوا کہ عورتوں نے نہیں سنا۔ آپ ان کے پاس گئے، وعظ و نصیحت کی اور صدقہ کا حکم دیا۔ بلال رضی اللہ عنہ کپڑا پھیلائے ہوئے تھے:

فجعلت المرأة تلقى الخاتم والخرص والشيء

''تو ایک عورت انگوٹھی، بالیاں اور دیگر زیور ڈالنے لگی۔'' (مسلم، العیدین)

ایک حدیث میں ہے کہ جب آپ ﷺ نے عورتوں سے کہا کہ تم گلے شکوے کی کثرت اور خاوندوں کی ناشکری کرنے کی وجہ سے اکثر جہنم کا ایندھن بنو گی،

فجعلن يتصدقن من حليهن فيلقين فى ثوب بلال من اقرطهن وخواتيمهن

''تو عورتیں اپنے زیورات صدقہ کرنے لگیں۔ بلال کے کپڑے میں اپنی بالیاں اور انگوٹھیاں ڈالتی تھیں۔'' (ایضاً)

ایک حدیث میں سخاب (ہار) کا لفظ بھی آتا ہے:

فجعلن يلقين تلقى المراة خرصها وسخابها

''وہ خیرات دینے لگیں، کوئی عورت اپنی بالیاں پھینکتی اور کوئی ہار۔''

(بخاری، العیدین، الخطبة بعد العید، ح:۹۶۴)

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ عورتوں کے کان اور ناک، جو کہ محلِ زیور ہیں، چھیدنا درست ہے۔

(تفصیل کے لیے دیکھیے فتاوی المرأة المسلمة ۱/ ۴۸۰، مكتبة اضواء السلف)

اسی طرح انگوٹھیاں اور گلے میں ہار پہننا بھی جائز ہے۔

تنبیہ: بعض مرد بھی اپنے ناک اور کان چھید لیتے ہیں۔ یہ عورتوں سے مشابہت ہے۔ لہٰذا اِن کے لیے ایسا کرنا حرام ہے۔ اگر وہ کسی بزرگ وغیرہ کی نشانی، منت یا کسی آفت سے بچنے کے نظریے سے ایسا کرتے ہیں تو مزید قبیح جرم ہے۔ اس سے پرہیز کرنا از حد ضروری ہے۔

اکیلی عورت کا اجنبی ڈرائیور کے ساتھ سفر؟

سوال کیا عورت اجنبی ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوسکتی ہے؟

جواب اکیلی عورت کا اجنبی ڈرائیور کے ساتھ سوار ہونا جائز نہیں ہے۔ الا یہ کہ عورت کا محرم اس کے ساتھ ہو، ارشادِ نبوی ہے:

((لَا يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَاَةٍ اِلَّا مَعَ ذِيْ مَحْرَمٍ))

(بخاری، النکاح، لا یخلون رجل......ح:۵۲۳۳)

''کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ تنہائی اختیار نہ کرے۔ مگر یہ کہ اس کے ساتھ محرم ہو۔''

شیخ محمد بن صالح عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اگر ڈرائیور کے ساتھ دو یا زیادہ عورتیں ہوں تو پھر کوئی حرج نہیں کیونکہ اس طرح خلوت نہیں ہوتی اور اس میں بھی شرط یہ ہے کہ ڈرائیور قابل اعتماد ہو اور حالت بھی سفر کی نہ ہو (کیونکہ عورت کا محرم کے بغیر سفر کرنا ممنوع ہے۔)

عورت کا مرد ڈاکٹر سے علاج معالجہ؟

سوال کیا مسلمان عورت مرد ڈاکٹروں سے علاج معالجہ کرواسکتی ہے؟ نیز بتایئے کہ کیا شریعت مطہرہ مرد ڈاکٹروں سے ایکسرے اور زچگی کروانے کی اجازت دیتی ہے؟

جواب اگر لیڈی ڈاکٹر دستیاب ہو تو عورت کو چاہیے اس سے علاج کروائے۔ لیڈی ڈاکٹر کی دستیابی پر مرد ڈاکٹر سے علاج کروانا جائز نہیں تاہم ایسی صورت حال پیدا ہوسکتی ہے کہ کسی عورت کو اُس کے کیس کی پیچیدگی کی وجہ سے کس ماہر اور قابل ڈاکٹر سے زچگی کروانے کا مشورہ دیا جائے اور مطلوبہ قابلیت کا صرف مرد ڈاکٹر ہی دستیاب ہو تو اس صورت میں مرد ڈاکٹر سے علاج کروانا بامر مجبوری جائز ہے۔ واضح رہے یہ اجازت مخصوص حالات کے لیے ہے۔ یاد رکھیں علاج کرواتے وقت بھی ڈاکٹر کے ساتھ خلوت نہ ہو، تا کہ شریعت کے بتائے ہوئے آداب کی پاسداری کی جاسکے۔

عورت اور ملازمت؟

سوال کیا عورت اپنے گھر سے باہر کام کاج اور ملازمت وغیرہ کرسکتی ہے؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو ایسی صورت میں عورت کو کن کن پابندیوں کا لحاظ کرنا ہوگا؟

جواب عورت پر کمانے کی شرعاً کوئی ذمہ داری نہیں۔ نان ونفقہ کی تمام ذمہ داریاں مرد کے کندھوں پر ہیں۔ اگر کوئی کمانے والا نہ ہو تو ایسی صورت میں معاشی مجبوری کی وجہ سے عورت کے ملازمت کرنے پر کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔

لیکن اگر اقتصادی مجبوری نہ ہو اور عورت کے اخراجات برداشت کرنے والا کوئی مرد ہو تو ایک طبقہ ''روشن خیال'' عورت کی ملازمت کو لازمی قرار دیتا ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ اگر مردوں کے ساتھ عورتیں بھی گھر سے باہر نکل کر کام کریں گی تو ایک طرف تو اس سے قوی

دولت میں اضافہ ہوگا جبکہ دوسری طرف عورت مصروفیت کی وجہ سے بہت سے لایعنی کاموں سے محفوظ رہے گی۔ لیکن اگر درج ذیل حقائق کو مدنظر رکھا جائے تو اس دلیل کا کھوکھلا پن واضح ہو جائے گا:

① ملازمت کے میدان میں عورتوں کی شرکت سے مردوں کے اندر بے روزگاری کی عام شکایت ہے۔ اور اس سے اقتصادی حالت پر یقیناً بُرا اثر پڑتا ہے۔

② قوموں کے مفاد کو ہمیشہ مادی پیمانہ سے ناپنا غلط ہے۔ مادی خسارہ پر نظر رکھنے والے لوگ اس معنوی اور معاشرتی فساد کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو عورت کے گھر چھوڑنے سے خاندان اور اس کی اولاد کو لاحق ہوتا ہے، کیا یہ خسارہ ملک وملت کا خسارہ نہیں؟

③ قومی ثروت میں اضافہ کی دلیل سے کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ فوج کے ہر فرد کو اُس کی ذمہ داری سے ہٹا کر کام میں لگا دیا جائے تاکہ قومی ثروت اور پیداوار میں اضافہ ہو۔ جس طرح فوج کے افراد کی اہم ذمہ داری ہے اسی طرح عورت بھی خاندان کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہوئے ایک اہم ملی خدمت سرانجام دے رہی ہے جو اقتصادی خدمت سے کسی طرح بھی کم نہیں۔

④ خانگی امور کی انجام دہی اور اولاد کی تربیت اور نگرانی کے بعد عورت کے پاس اتنا وقت ہی نہیں بچ سکتا کہ وہ کسی لایعنی کام میں مصروف ہو جس سے بچانے کے لیے اسے گھر سے باہر کسی کام میں مصروف رکھنے کی ضرورت پیش آئے۔ یہ زیادتی کی بات ہے کہ گھریلو اُمور کی ذمہ داری کے بعد عورت کے اوپر مزید کوئی بوجھ ڈالا جائے۔

مغربی ممالک میں، جن کی تقلید میں عورتوں کو ملازمتوں میں لانے کا مطالبہ کیا جاتا ہے، عورتیں درج ذیل کام بھی کرتی ہیں: اخبارات بیچنا، سڑکوں کی صفائی کرنا، چوکیداری کرنا، ٹیکسی چلانا، لوہے اور اسٹیل کے کارخانوں میں بھاری بھاری صندوق اٹھانا۔ اب قابل غور بات یہ ہے کہ اس طرح کی ملازمت اختیار کرنے کے بعد عورت اپنے بچوں اور خاندان کے لیے کیا کر سکتی ہے؟ اسی وجہ سے یورپ کے لوگ اب تقریباً اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ خاندانی نظام کی خرابی کا تنہا سبب عورتوں کا ملازمت کے لیے گھروں سے نکلنا ہے۔ اگر عورت ملازمت کے لیے گھر سے باہر نکلتی ہے تو اسے درج ذیل آداب وشرائط کو ملحوظ رکھنا

چاہیے:

① جو کام بھی اختیار کیا جائے وہ ایسا نہ ہو کہ اس سے عورت کی ان گھریلو ذمہ داریوں پر اثر پڑے جو ایک ماں یا خانگی امور کی نگراں کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتی ہیں۔

② مردوں کے ساتھ اختلاط نہ ہو اور جسم کے جن حصص کا پردہ کرنا ضروری ہے ان کے کھولنے کی نوبت نہ آئے۔

③ کام کی ذمہ داری کو ادا کرنے کے دوران عورت کو کسی مرد کے ساتھ کسی کمرہ میں تنہا نہ رہنا پڑے کیونکہ ایسی تنہائی کے نتائج خطرناک ہوتے ہیں۔

④ عورت مردوں کے سامنے اپنی زینت اور آراستگی کا اظہار نہ کرے۔ لگاوٹ کے انداز میں بات نہ کرے اور نہ ایسا طریقہ ہی اختیار کرے جس سے شک وشبہ پیدا ہو۔

⑤ اخلاق وآداب کے تحفظ کے لیے اسلام نے جو اصول مقرر کیے ہیں ان کی پابندی کی جائے۔

⑥ عورتوں پر ملازمت یا کام کا بوجھ ڈالتے ہوئے ان کی ذہنی وجسمانی صلاحیتوں کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جائے بلا تفریق ہر طرح کے مشکل اور آسان کام میں عورتوں کو لگا دینا ان کی اور خود معاشرہ کی مصلحت کے بھی خلاف ہے۔ بہت سے کام ایسے ہیں جنھیں عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر طور پر انجام دے سکتی ہیں مثلاً عورتوں اور بچوں کا علاج و تیمارداری، بچوں اور خواتین کی تعلیم وتربیت، سماجی خدمت کے مختلف شعبے۔ عورتوں کو اگر ان شعبوں میں ملازمت دی جائے تو یقیناً وہ مردوں سے بہتر خدمت انجام دے سکتی ہیں۔ اور ان کی صلاحیتوں سے ملک وملت کو اہم فائدے پہنچ سکتے ہیں۔ (خاتون اسلام، چوتھی فصل)

منہ بولی بہن؟

سوال بعض لوگ عورتوں کو اپنی بہنیں بنا لیتے ہیں؟ کیا ان کا یہ طرزِ عمل درست ہے؟

جواب بہنیں حقیقی ہوتی ہیں یا رضاعی (دودھ شریک) یا پھر ایمان واسلام کی بنیاد پر یہ رشتہ اخوت قائم ہوتا ہے۔ دو اول الذکر تو آدمی کے لیے محرم ہیں جبکہ مؤخر الذکر کا محرم ہونا ضروری نہیں۔ کسی عورت کو بہن کہنے سے وہ بہن نہیں بن جاتی جیسے بیوی کو ماں کہہ دیں تو وہ ماں نہیں بن جاتی۔ لہٰذا کسی خاتون کو بہن کہہ لینے سے حجاب و معاشرت کی شرعی پابندیاں

کالعدم نہیں ہو جاتیں، بہن بنانے کا عمل بھی دھوکہ دہی پر مبنی ہے۔ مشاہدہ ہے کہ بعض لوگ خواتین کو بہن بنا کر گپ شپ کے ذریعے محظوظ ہوتے ہیں۔ بسا اوقات معاملہ خطرناک حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اور دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض تو ''بہن'' کو اغوا کر لیتے ہیں اور بعض منہ بولی بہن سے شادی بھی کر لیتے ہیں۔

اس طرح کے طرزِ عمل سے بہن کے رشتے کا تقدس بھی مجروح ہوتا ہے نیز ''بہن'' اور ''بھائی'' کو آپس میں لطف اندوزی کے مواقع بھی خوب میسر آتے ہیں جبکہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ''گھریلو تعلقات'' ہیں۔

مرد اور عورت کی آپس میں محبت؟

سوال کیا کوئی مرد اللہ تعالیٰ کی خاطر کسی عورت سے محبت کر سکتا ہے؟

جواب دوسروں کے بارے میں خیر خواہی کے پاکیزہ جذبات کا نام محبت ہے اور یہ جذبات تمام مسلمانوں سے ہونے چاہئیں۔ لیکن انفرادی طور پر ناممکن ہے کہ اس قسم کا تعلق ایک مرد اور عورت میں پیدا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان پائی جانے والی طاقتور فطری کشش اس قسم کے پاکیزہ تعلق کو قائم ہونے ہی نہ دے گی۔ اگر ایک مرد اور عورت میں قلبی لگاؤ پیدا ہو جائے تو فطری خواہشات اپنا رنگ دکھائیں گی۔ مزید یہ کہ فریقین میں سے کوئی ایک یا دونوں شادی شدہ ہوں تو یہ تعلق نہ ختم ہونے والے مسائل کو جنم دے گا۔ مرد و عورت میں اس کے نتیجے میں باہمی ملنے جلنے یا سماجی رابطوں کی نوبت نہیں آنی چاہیے۔

ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان اللہ کی خاطر خالص تعلق قائم ہونے کا امکان نہیں ہے۔ کیونکہ اس قسم کی محبت جذباتی تعلقات تک لے جاتی ہے جبکہ شریعت ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان ایسے تعلقات کی اجازت نہیں دیتی۔

ملازمہ کا پردہ؟

سوال کیا گھریلو خادمہ یا ملازمہ پر اپنے مالک سے پردہ کرنا واجب ہے؟

جواب اسی نوعیت کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے شیخ ابن باز رحمہ اللہ نے فرمایا تھا، گھریلو ملازمہ پر اپنے مالک سے پردہ کرنا واجب ہے، وہ اس کے سامنے بناؤ سنگھار نہیں کر

سکتی نیز اس لیے بھی کہ اس کا بے پردہ ہونا اور مالک کے سامنے حسن کی نمائش کرنا فتنے کو بھڑکانے کا سبب ہے، اسی طرح خادمہ کا مالک کے ساتھ خلوت میں رہنا مالک کے لیے شیطانی گمراہی کا باعث بن سکتا ہے۔ (فتاویٰ برائے خواتین، ص:۲۶۶)

فتنہ وفساد سے بچنے کے لیے مالک کے لیے ضروری ہے کہ وہ خادمہ سے الگ رہے، اسے کسی ایسے کام کا مکلف نہ بنائے جس کی وجہ سے مالک کو ملازمہ کے ساتھ خلوت کا موقع ملے۔

غیر محرم عورتوں سے مصافحہ؟

سوال آج کل مسلم معاشروں میں بھی یہ رواج عام ہو رہا ہے کہ لوگ غیر محرم رشتہ دار عورتوں (کزن وغیرہ) سے مصافحہ کرتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا درست ہے؟

جواب ایسا کرنا قطعاً جائز نہیں۔ کسی بھی غیر محرم عورت سے ہاتھ ملانا درست نہیں اور نہ کسی عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی غیر محرم سے مصافحہ کرے خواہ وہ اس کا رشتے دار ہی کیوں نہ ہو۔

نبی اکرم ﷺ نے اپنی پاک نفسی کے باوجود کبھی کسی غیر محرم عورت سے مصافحہ نہیں کیا۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ بیعت لیتے وقت بھی ہاتھ نہیں ملاتے تھے۔ صرف زبانی بیعت لیتے تھے۔ جب آپ ﷺ نے عورتوں سے بیعت لی تو عورتوں نے گزارش کی:

آیئے ہم (آپ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر) آپ کی بیعت کریں تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((إِنِّيْ لَا أُصَافِحُ النِّسَاءَ إِنَّمَا قَوْلِيْ لِمِائَةِ امْرَأَةٍ كَقَوْلِيْ لِامْرَأَةٍ وَّاحِدَةٍ أَوْمِثْلَ قَوْلِيْ لِامْرَأَةٍ وَّاحِدَةٍ))

(ترمذی ، السیر عن رسول اللہ ﷺ ، ماجاء فی بیعۃ النساء ، ح:۱۵۹۷؛ نسائی ، البیعۃ ، بیعۃ النساء ، ح:۴۱۸۱)

''میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا ، میرا کہنا سو عورتوں کے لیے بھی ویسا ہے جیسا ایک عورت کے لیے ہے۔''

بیعت کرتے وقت آپ نے کبھی اپنا ہاتھ کسی عورت کے ساتھ مَس نہیں کیا۔
(مسلم ، الامارة، كيفية بيعة النساء ، ح:١٨٦٦)

ہمارے ہادی ﷺ کا یہ پاکیزہ کردار ہے جبکہ پیری مریدی کا جھانسا دے کر جاہل پیر دیوث مریدوں کی بیویاں اپنے پاس رکھتے ہیں۔ان سے ہاتھ ملاتے ہیں،خلوت میں ان سے ملاقاتیں کرتے ہیں ،مذہب کے نام پر ان کی عزت لوٹتے ہیں۔عصمت دری کے واقعات آئے روز اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں مگر جہالت کی انتہا ہے کہ لوگ پھر بھی اسلام کی پاکیزہ تعلیمات کی طرف پلٹنے کا نام نہیں لیتے!

یورپی معاشرے کی اندھی تقلید میں جو مسلمان غیر محرم عورتوں سے ہاتھ ملاتے ہیں انہیں اپنے اس غیر شرعی عمل سے توبہ کر لینا چاہیے۔اسی طرح عورتوں کو بھی غیر محرم مردوں سے مصافحہ کرنے سے توبہ کرنی چاہیے، بالخصوص جب مسلمان عورتیں غیر مسلم مردوں سے ہاتھ ملاتی ہیں تو اِس سے اسلامی غیرت وحمیت کو نقصان پہنچتا ہے اور ملک وقوم کا وقار بھی مجروح ہوتا ہے۔

صحابیات رضی اللہ عنہن کے حالاتِ زندگی کے بارے میں کتب؟

سوال صحابیات رضی اللہ عنہن کے حالات زندگی کون کون سی کتابوں سے معلوم ہو سکتے ہیں؟ صحابیات رضی اللہ عنہن سے متعلق لکھی گئی مستقل کتب کے بارے میں بھی راہنمائی کریں؟

جواب اسماء الرجال کی تمام کتب میں صحابیات رضی اللہ عنہن کے حالات زندگی مل جاتے ہیں۔ابن مندہ (م ۳۹۵ ھ)،ابونعیم (م ۴۰۳)،قاضی ابن عبدالبر (م ۴۶۳)اور ابوموسیٰ اصفہانی (م ۵۸۱ ھ) کی کتب میں صحابیات کے حالات زندگی کی تفصیلات لکھی گئی ہیں۔

قاضی ابن عبدالبر کی ایک کتاب الاستيعاب فی اسماء الاصحاب ہے،جس کے ایک حصے کتاب النساء و كناهن میں ۳۹۸صحابیات رضی اللہ عنہن کا حروف تہجی کی ترتیب سے تذکرہ کیا گیا ہے۔جو صحابیات ناموں سے مشہور ہیں ان کا تذکرہ ان کے ناموں کے حروف تہجی کی ترتیب سے کیا گیا ہے اور جو صحابیات رضی اللہ عنہن کنیتوں سے مشہور ہیں ان کا تذکرہ کنیتوں کے ضمن میں کیا گیا ہے۔

الطبقات الكبرى لابن سعد کی آٹھویں جلد صالحات وصحابیات رضی اللہ عنہن کے

حالات زندگی کے بارے میں مخصوص ہے۔ محمد بن سعد (م ۲۳۰ھ) کی اس کتاب کا اردو ترجمہ طبقات ابن سعد کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اس کتاب میں ۶۲۷ صحابیات رضی اللہ عنہن کا تذکرہ ہے۔

حصہ ہشتم میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دادیوں، نانیوں، والدہ محترمہ، ازواج مطہرات، آپ کی چار صاحبزادیوں اور دیگر صحابیات رضی اللہ عنہن کے تذکرے ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں، پھوپھیوں اور ان کی بیٹیوں اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے حالات بیان کئے گئے ہیں، پھر قریشی خواتین اور عام مہاجرات رضی اللہ عنہن کا تذکرہ ہے۔ مہاجرات رضی اللہ عنہن کے بعد انصاریات رضی اللہ عنہن کے حالات بیان کئے گئے ہیں اور ہر خاندان کی عورتوں کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ کیا گیا ہے۔

علامہ ابن اثیر جزری رحمہ اللہ (م ۶۳۰ھ) نے ایک ضخیم کتاب أسد الغابة في معرفة الصحابة کے نام سے لکھی ہے، جس کے ایک حصہ میں صحابیات کے حالات بیان کئے گئے ہیں، اس کتاب میں صحابیات کا تذکرہ ان کے ناموں اور پھر مشہور کنیتوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ جن میں حروف تہجی کی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں ۱۰۲۲ صحابیات کے حالات لکھے گئے ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ (م ۸۵۲ھ) کی اسماء الرجال پر ایک ضخیم کتاب الاصابة في تمييز الصحابة ہے جس کا آخری حصہ کتاب النساء کے نام سے ہے، جس میں مکررات اور کنیتوں سمیت ۱۵۴۵ صحابیات رضی اللہ عنہن کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس قدر صحابیات رضی اللہ عنہن کا تذکرہ کسی اور کتاب میں نہیں کیا گیا۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی ایک اور کتاب تہذیب التہذیب کے نام سے ہے، جس میں بعض تابعیات اور مکررات سمیت ۳۲۲ صحابیات رضی اللہ عنہن کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

امام شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان ذہبی رحمہ اللہ (م ۷۴۸ھ/۱۳۷۴ء) نے اپنی ضخیم کتاب سیر اعلام النبلاء کے پہلے تین حصوں میں بعض صحابیات رضی اللہ عنہن کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔

صحابیات رضی اللہ عنہن کے حالات زندگی اور سیرت سے متعلق کتب لکھنے کا سلسلہ تا حال جاری ہے۔عصرِ حاضر میں ایک کتاب ''صحابیات'' علامہ نیاز فتحپوری نے اردو زبان میں تحریر کی ہے۔ سیر الصحابیات مولانا سعید انصاری کی تالیف ہے۔

اسوۂ صحابیات مولانا عبدالسلام ندوی کی کاوش ہے، اس کتاب میں مختلف موضوعات کے تحت صحابیات رضی اللہ عنہن کی سیرت بیان کی گئی ہے۔

بعض عرب علماء نے صحابیات رضی اللہ عنہن کے حالات سے متعلق بہت عمدہ کتب تالیف کی ہیں۔ان میں سے جن کتب کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے وہ یہ ہیں:

صحابیات الرسول صلی اللہ علیہ وسلم (گلشنِ رسالت کی مہکتی کلیاں) از ابوعمار محمود مصری۔صحابیات طیبات رضی اللہ عنہن از احمد خلیل جمعہ،سمیر المومنات از عبداللہ بدران محی الدین بوابیجی۔

مخصوص صحابیات رضی اللہ عنہن کے تذکروں سے متعلق کتب بھی لکھی جارہی ہیں۔ایسی ہی ایک کتاب نساء اھل البیت (خواتینِ اہل بیت) از احمد خلیل جمعہ ہے۔مولانا محمود احمد غضنفر رحمہ اللہ (جنھوں نے صحابیات رضی اللہ عنہن سے متعلق بہت سی عربی کتب کا اردو ترجمہ کیا ہے) نے ایک کتاب صحابیات مبشرات رضی اللہ عنہن کے نام سے لکھی ہے۔

ایک کتاب ''حیاتِ صحابیات کے درخشاں پہلو'' بھی مارکیٹ میں آ چکی ہے۔

''مظلوم صحابیات رضی اللہ عنہن'' کے عنوان سے ایک کتاب راقم الحروف کی بھی مطبوع ہے۔

کیا بچی کا نام 'رملہ' رکھا جا سکتا ہے؟

سوال ''یہ آپ نے کس طرح کا نام رکھا ہے؟ یہ عجیب نام رکھنے کی بجائے آپ کسی صحابیہ کے نام پر نام رکھتے۔'' ایک دوست دوسرے دوست سے نومولود بچی کے نام کے سلسلے میں گفتگو کر رہا تھا۔سوال یہ ہے کہ یہ نام پہلے کبھی سنا نہیں، کیا مسلمان بچی کا نام رملہ رکھنا جائز ہے؟

جواب بہت سے نام ایسے ہیں جنھیں سن سن کر ہم ان سے مانوس ہو چکے ہوتے ہیں جبکہ بعض نام ایسے بھی ہوتے ہیں جو فی الواقع درست ہوتے ہیں مگر ہمارے کان ان سے آشنا نہیں ہوتے،لہٰذا پہلی مرتبہ سننے کے موقع پر ایسے نام اجنبی محسوس ہو سکتے ہیں۔

رَمْلة عربی میں ایسی زمین کو کہتے ہیں جس کے اوپر ریت ہو، ریتلی زمین (جو کہ نرم ہوتی ہے) اور ریت کے ٹیلے کو رملہ کہا جاتا ہے۔ ایک ام المؤمنین کا نام بھی رملہ تھا، بعض صحابیات رضی اللہ عنہن کا نام "رملہ" تھا مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کا بھی نام تبدیل نہ کیا اور نہ تبدیل کرنے کا حکم ہی دیا، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم برے ناموں کو بدل دیا کرتے تھے۔ معلوم ہوا کہ رملہ نام رکھنے میں کوئی حرج اور قباحت نہیں۔

مشہور مؤرخ امام ابن اثیر رحمہ اللہ نے چھ ایسی صحابیات کا تذکرہ کیا ہے جن کا نام "رملہ" تھا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے رملہ نامی سات صحابیات کا تذکرہ کیا ہے۔

(الاصابة فی تمییز الصحابة ۴/ ۲۹۸-۳۰۱)

اسد الغابة فی معرفة الصحابة (۸۲۸/۳ _ ۸۳۰) کے حوالے سے ان صحابیات کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے:

1 رملہ بنت حارث بن ثعلبہ بن زید انصاریہ نجاریہ رضی اللہ عنہا

رملہ بنت حارث رضی اللہ عنہا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی تھی یعنی آپ رضی اللہ عنہا صحابیہ ہیں۔ جب سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے بنوقریظہ کے بارے میں اپنا فیصلہ سنایا تھا تو وہ گھبرا گئے اور رملہ بنت حارث کے مکان میں جا چھپے تھے۔

2 ام المؤمنین ام حبیبہ رملہ بنت ابوسفیان صخر بن حرب قریشیہ امویہ رضی اللہ عنہا

یہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور صفیہ بنت ابوالعاص کی دختر ہیں۔ آپ حبشہ میں تھیں جب ان کا نکاح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا گیا تھا، اس طرح انہیں ام المؤمنین بننے کا شرف حاصل ہوا۔ چھ ہجری میں ان کا نکاح پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا اور آٹھ ہجری فتح مکہ کے موقع پر ان کے والد ابو سفیان اور بھائی معاویہ رضی اللہ عنہما مسلمان ہو گئے۔

ام المؤمنین ام حبیبہ رملہ رضی اللہ عنہا کی وفات ۴۴ھ میں ہوئی۔

3 رملہ بنت شیبہ بن ربیعہ قریشیہ عبشمیہ رضی اللہ عنہا

رملہ بنت شیبہ قدیم الاسلام ہیں۔ بعض نے ان کا نام رملہ کی بجائے رمیلہ ذکر کیا ہے۔

ان کا نکاح خلیفہ ثالث عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا۔

جب رملہ بنت شیبہ رضی اللہ عنہا نے اسلام قبول کیا تو ان کی عم زاد بہن ہند بنت عتبہ نے ان کے اسلام لانے کا بُرا منایا اور انہیں شیبہ کے بدر میں قتل ہو جانے پر عار دلائی ۔

تَدِيْنُ لمعشر قتلوا اباها   اَقَتْلَ ابيك جاء ك باليقين

''اس (رملہ بنت شیبہ) نے اس گروہ کا دین پسند کیا جنھوں نے اس کے باپ (شیبہ) کو قتل کر دیا ہے۔اے رملہ! کیا تجھے واقعی اپنے باپ کے قتل کا یقین ہے؟''

4 رملہ بنت عبداللہ بن ابی بن سلول انصاریہ رضی اللہ عنہا

یہ رملہ رئیس المنافقین (منافقین کے سردار) عبداللہ بن ابی کی بیٹی ہیں۔اس خاتون نے بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کرنے کا شرف حاصل کیا۔

5 رملہ بنت ابوعوف بن صبیرہ رضی اللہ عنہا

رملہ بنت ابوعوف اور ان کے شوہر مطلب بن ازہر بن عوف کا شمار مکہ میں اسلام قبول کرنے والے مسلمانوں میں کیا جاتا ہے،ان دونوں میاں بیوی نے حبشہ کی ہجرت کی تھی اور ان کے ہاں وہاں عبداللہ نامی ایک بیٹا پیدا ہوا۔اسی عبداللہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے آدمی ہیں جو اسلام میں اپنے والد کے وارث ہوئے۔

6 رملہ بنت وقیعہ بن حرام بن غفار غفاریہ رضی اللہ عنہا

ان کے بارے میں خلیفہ بن خیاط نے کہا ہے کہ یہ ابوذر کی والدہ ہیں۔ایک روایت میں انہیں ام عمرو بن عبسہ لکھا گیا ہے۔

7 رملہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے رملہ نامی صحابیات کے تذکرے میں دوسرے نمبر پر رملہ بنت خطاب نامی صحابیہ کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

خرید وفروخت
اور
حلال وحرام
کے مسائل

فکسڈ ڈیپازٹ پر رقم کی وصولی؟

سوال کچھ لوگ بینک میں ایک مقررہ رقم رکھ کر مثلاً پچاس ہزار یا لاکھ، دو لاکھ رکھ کر ہر ماہ اس رقم پر پانچ ہزار یا دس ہزار روپے لیتے ہیں اور اس کا جواز یہ بتاتے ہیں کہ بینک ہمارے روپے سے کاروبار کرتا ہے، اس واسطے ہمارے لیے ہر ماہ یہ رقم لینی جائز ہے جبکہ اصل رقم، جو کہ جمع کی گئی ہے، وہ جوں کی توں قائم رہتی ہے اور مقررہ مدت کے بعد وہ تمام رقم جو کہ جمع کی گئی تھی، واپس مل جاتی ہے تو کیا شرعی اعتبار سے ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب ایسا کرنا جائز نہیں، اس لیے کہ اس رقم پر وہ ہر ماہ جو پانچ یا دس ہزار روپے لیتا ہے وہ شرعی نقطہ نظر سے سود ہے۔ گویا اس نے ایک رقم دی ہے اور ماہانہ یا سالانہ اس رقم پر جو سود ملتا ہے اسے لے کر وہ استعمال کرتا ہے تو یہ شرعی نقطہ نظر سے سود خوری ہوئی اور یہ جائز نہیں ہے۔ (سود اور اس کے احکام و مسائل، ص:91، از ڈاکٹر فضل الرحمن مدنی)

کیا نقد اور ادھار کی قیمت میں فرق کرنا درست ہے؟

سوال ایک شخص مختلف سامان پنکھا، گھڑی، کولر اور سائیکل وغیرہ قسط وار فروخت کرتا ہے، مثلاً جو سائیکل بازار میں چھ ہزار روپے میں ملتی ہے وہ شخص اس سائیکل کو سات ہزار روپے میں بیچتا ہے اور روپے کی ادائیگی کا یہ طریقہ ہے کہ وہ دو ہزار روپے اول وقت لیتا ہے اور اس کے بعد پانچ سو روپے ماہوار ادا کرنے ہوتے ہیں، تو کیا یہ طریقہ شرعی اعتبار سے درست ہے؟ کیا ہم ہزار روپے زائد دے کر اس سے سائیکل خرید سکتے ہیں؟

جواب خرید سکتے ہیں بشرطیکہ ان شرائط کو بعد میں تبدیل نہ کیا جائے جو خریدتے وقت طے ہوئی تھیں، ڈاکٹر فضل الرحمن مدنی لکھتے ہیں:

اگر پہلے سے وہ بتا دیتا ہے کہ اس سائیکل کی قیمت سات ہزار روپے ہے اور اس میں سے دو ہزار روپے پہلی قسط میں جمع کروانا پڑیں گے، اس کے بعد پانچ سو یا ہزار روپے ہر ماہ جمع کروانا پڑیں گے اور اسی پر دونوں فریق متفق ہو جاتے ہیں اور بات طے کر لیتے ہیں تو بیع و شراء کا یہ طریقہ جائز ہے اور اس میں کوئی قباحت یا حرمت کی بات نہیں ہے۔ اس واسطے کہ ادھار سامان کا بیچنا جائز ہے۔ یہاں اس نے ادھار بیچا ہے اور اس کی قیمت پہلے مقرر کر دی ہے اور

اس کے ادا کرنے کا طریقہ بھی طے ہو گیا ہے، رہا ادھار کی صورت میں قیمت میں اضافہ کا مسئلہ تو آپ نقد بیچنے کی صورت میں بھی دیکھتے ہیں کہ تاجر حضرات مختلف گاہکوں سے کم وبیش قیمت پر سامان بیچتے رہتے ہیں، ایک تاجر ایک سامان یا ایک چیز نقد بیچتا ہے اور ایک گاہک کو پچاس روپے میں دیتا ہے، پھر دوسرا گاہک آتا ہے تو وہی سامان اسے پچپن روپے میں دیتا ہے اور تیسرے کو ساٹھ روپے میں دیتا ہے تو جیسے نقد بیچنے میں کمی بیشی کر سکتے ہیں ادھار بیچنے میں بھی کمی بیشی ہو سکتی ہے، بس شرط یہ ہے کہ پہلے سے ہی طے ہونا چاہیے کہ یہ ادھار ہے اور اس کی قیمت اتنی ہے، یہ نہ ہو کہ بیچنے والا کہے کہ نقد لو گے تو یہ سامان چھ ہزار میں دیں گے اور ادھار لو گے تو سات ہزار میں اور اس کی ادائیگی کی یہ شکل ہوگی۔ اور خریدار اس وقت کچھ نہ طے کرے اور سامان لے کر چلا جائے۔ یہ شکل جائز نہیں، اس لیے کہ اس کے بعد اگر دوبارہ سو روپے دینے کے لیے جائے گا تو ممکن ہے تاجر کہے کہ ہم نے تو آپ کو ادھار سمجھ کر دیا ہے اور خریدار کہے کہ نہیں ہم نے تو نقد سمجھ کر لیا ہے۔ آپ یہ روپیہ لیجئے اور حساب صاف۔ اس کے بعد دونوں میں جھگڑا ہو، اس واسطے پہلے ہی سے تمام باتیں واضح طور سے طے ہو جانی چاہئیں کہ نقد ہے یا ادھار، دونوں صورتوں میں کیا قیمت ہے، ادھار کی شکل میں کب تک اور کس طرح قیمت ادا کرنا ہے تاکہ بعد میں کوئی نزاع اور اختلاف اس کی بنا پر نہ ہو۔

(سود اور اس کے احکام ومسائل، ص: ۹۱-۹۳)

اکثر عرب علماء، مفتی اعظم سعودی عرب ﷫ سمیت کا موقف ایسے کاروبار کے جواز کا ہے۔ (فتاویٰ اسلامیہ ۲/۴۴۴-۴۴۶، فتاویٰ علامہ عبدالعزیز بن باز ﷫، ص: ۳۱۱-۳۱۳، ۳۱۵، ۳۱۶)

سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی ﷫ (فتاویٰ نذیریہ ۲/۱۶۲-۱۶۸)، حافظ عبداللہ محدث روپڑی ﷫ (فتاویٰ اہلِ حدیث ۲/۲۶۳-۲۶۴)، استاذِ محترم ڈاکٹر حافظ عبدالرشید اظہر شہید ﷫ (متوفی ۲۴ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ/۱۷ مارچ ۲۰۱۲ء)، شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ (ماہنامہ محدث، اگست ۲۰۰۵ء) اور مفتی حافظ عبدالستار الحماد ﷾ (فتاویٰ اصحاب الحدیث ۱/۲۳۰-۲۳۶) کے نزدیک بھی نقد اور اُدھار کی قیمت میں فرق کرنا جائز ہے۔ حنفی علماء بھی ایسے کاروبار کو جائز قرار دیتے ہیں۔ (آپ کے مسائل اور اُن کا حل از مولانا محمد یوسف لدھیانوی ﷫ ۶/۱۴۶-۱۵۵)

تاہم بعض علماء اس قسم کے کاروبار کو ناجائز اور سُودی قرار دیتے ہیں۔

(دیکھیے احکام ومسائل ۱/۳۷۶_۳۷۹، ۲/۲۵۲_۵۵۶، ۵۶۵_۵۸۶، از شیخ الحدیث حافظ عبدالمنان نورپوری رحمہ اللہ؛ فتاویٰ علمیہ المعروف توضیح الاحکام ۲/۲۲۰_۲۲۱، از حافظ زبیر علیزئی حفظہ اللہ؛ احکام ومسائل ۱/۵۹۹_۶۱۶، از مفتی مبشر احمد ربانی حفظہ اللہ؛ رسائل ومسائل ۱/۲۵۱، از سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ)

نوٹ: استاذِ محترم ڈاکٹر حافظ عبدالرشید اظہر شہید رحمہ اللہ کی اس مسئلے میں مدلل اور تفصیلی رائے مَیں نے اُن کی شہادت کے تقریباً پچیس دن قبل فون پر معلوم کی تھی۔ دورانِ گفتگو مَیں نے حافظ عبدالمنان نورپوری رحمہ اللہ کے موقف کا بھی حوالہ دیا تھا۔ علم وعمل کا یہ روشن چراغ بھی اسی سال حافظ عبدالرشید اظہر شہید رحمہ اللہ سے صرف تین ہفتے قبل ۴ ربیع الثانی (۲۶ فروری) کو گُل ہوگیا تھا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

بینک کے شیئرز پر منافع کی شرعی حیثیت؟

سوال بینک کے شیئرز پر جو منافع کے نام پر رقم دی جاتی ہے کیا وہ جائز ہے؟

جواب شیئرز کا مسئلہ ایسا ہے کہ جب بینک کا پورا نظام ہی سودی کاروبار پر مبنی ہے تو آپ بینک سے جو شیئرز پر نفع حاصل کریں گے ظاہر ہے کہ اس میں بھی سودی رقم آئے گی۔ اس واسطے بینکوں کے شیئرز خریدنا اور اس پر منافع کے نام سے رقم لینا جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر مسلمان کوئی ایسی کمپنی قائم کریں جو مضاربہ کے اصول پر کام کرے، مضاربہ کے اصول کا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ دار اپنا سرمایہ لگائیں اور کمپنی میں جو لوگ محنت کرنے والے، کاروبار کرنے والے ہوں وہ اپنی محنت، اپنی عقل ورائے اس میں صرف کریں، علاوہ ازیں جب سرمایہ لگائیں تو فریقین (یعنی کمپنی اور جو لوگ سرمایہ لگاتے ہیں) اسی وقت یہ طے کرلیں کہ ایک کی رقم رہے گی اور دوسرے کی محنت اور پھر دونوں کی محنت اور رقم سے جو نفع حاصل ہوگا اسے اتنے فیصد کے حساب سے آپس میں بانٹ لیں گے اور نفع ونقصان میں دونوں فریق شامل ہوں گے۔ نیز یہ کمپنی سودی کاروبار یا کوئی ایسا کاروبار نہیں کرے گی جو جائز نہیں ہے مثلاً شراب سازی اور شراب کی خرید وفروخت کا کاروبار نہیں کرے گی، فلم سازی کا کام نہیں کرے گی، جوا وغیرہ ناجائز کاروبار میں رقم نہیں لگائے گی، اسی طرح اور کوئی حرام کاروبار نہیں کرے

گی تو جب اس طرح کی کمپنیوں کا شیئر اور اس کا نفع ہو تو جائز ہے، اگر اس طرح کی کمپنی قائم ہو جائے (اور ایسا کرنا آسان ہے کوئی محال چیز نہیں ہے، صرف تھوڑی سی محنت کرنے کی ضرورت ہے) تو اس کا شیئر لینا جائز ہے اور اس پر جو نفع ملے گا وہ نفع بھی جائز ہوگا۔ لیکن آج کل جو بھی کمپنیاں اور بینک شیئر کا کاروبار کرتے ہیں وہ تقریباً سارے ادارے اپنا کاروبار سودی بنیاد پر کرتے ہیں، وہ اپنی رقم سود پر دیتے ہیں، لوگوں سے سود پر رقم لیتے ہیں، اس واسطے ان کا شیئر لینا جائز نہیں۔ (سود اور اس کے احکام ومسائل، ص: ۹۵-۹۶)

بینک سے لی گئی سودی رقم کہاں استعمال کی جائے؟

سوال ہم کسی مجبوری کی بنا پر بینک میں روپیہ جمع کرواتے ہیں اور اس پر سود ملتا ہے تو اسے کیا کرنا چاہیے؟ اگر نہیں لیں گے تو بینک یہ روپیہ رکھ لے گا اور سودی کاروبار فروغ پائے گا؟

جواب اگر ایسی بات ہو کہ سودی رقم بینک میں چھوڑ دی جائے تو اس کے اسلام کے خلاف یا مسلمانوں کے خلاف استعمال ہونے کا اندیشہ ہے یا بینک والے خود استعمال کریں گے اور اس سے سودی کاروبار کو فروغ حاصل ہوگا، تو وہ رقم بینک سے نکال لینی چاہیے، لیکن وہ رقم لے کر اپنے اوپر صرف کرنی چاہیے اور نہ کسی مسلمان کی مصلحت میں اسے صرف کرنا چاہیے، بلکہ اسے کسی ایسے کافر کو جس کے بارے میں آپ جانتے ہوں کہ وہ اسلام کا دشمن نہیں ہے، مسلمان کا دشمن نہیں ہے، اسے دے سکتے ہیں اور اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں وارد ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مسجد کے دروازے پر ایک حُلّہ (جُبّہ) بکتے ہوئے دیکھا جس میں ریشم ملا ہوا تھا تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کاش! آپ یہ حلہ خرید لیتے اور اسے جمعہ کے دن اور جب کوئی وفد آتا تو زیب تن کرتے، آپ نے فرمایا: اسے وہ شخص زیب تن کرے گا جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، پھر اس کے بعد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ ریشمی حلے آئے تو اس میں سے ایک حلہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر رضی اللہ عنہ کو عطا کیا تو عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے مجھے یہ پہننے کے لیے دیا ہے حالانکہ آپ نے حلہ عطارد کے بارے میں ایسا ایسا فرمایا تھا، اللہ کے

رسول ﷺ نے فرمایا: میں نے اسے آپ کے اپنے استعمال کے لیے نہیں دیا تھا، پھر عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اپنے ایک مشرک بھائی کو دے دیا جو مکہ میں تھا۔

(بخاری ، الھبة ، ھدیة ما یکرہ لبسھا، ح:۲۶۱۲)

تو جیسے ریشم کا حلہ مسلمان مرد کے لیے حلال نہیں مگر وہ کسی کافر کو دے سکتا ہے اسی طرح سود کی رقم بھی خود استعمال نہیں کر سکتے اور نہ کسی مسلمان کو دے سکتے ہیں مگر ایسے کافر کو جس سے تعلق ہو اور یہ معلوم ہو کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کا دشمن نہیں ہے، اسے دینا جائز ہے۔

(سود اور اس کے احکام و مسائل ،ص:۱۰۳۔۱۰۴)

پرانے زیورات کا نئے زیورات سے تبادلہ؟

سوال کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس بارے میں کہ سنار کے یہاں پرانے زیورات کو دے کر نئے زیورات لیتے وقت وہ وزن میں فرق کرتے ہیں، مثلاً ہم ایک کلو چاندی کے پرانے زیورات دیں تو وہ نئے زیورات نو سو گرام ہی دیں گے۔ کیا اس طرح زیورات کی خرید و فروخت جائز ہے؟

جواب جب چاندی کو چاندی سے یا سونے کو سونے سے بیچنا یا خریدنا ہو تو برابر برابر اور نقد خرید و فروخت کرنا ضروری ہے، کمی بیشی کے ساتھ بیچنا یا خریدنا یا ایک کو نقد دینا اور دوسرے کو ادھار رکھنا جائز نہیں۔ کمی بیشی کرنے کی صورت میں سود ہو جائے گا۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''سونے کو سونے سے اور چاندی کو چاندی سے برابر برابر اور نقد بیچا جائے، زیادہ لینے یا دینے کی صورت میں سُود ہو جائے گا۔

(الارواء ۱۸۸/۵، ۱۹۴، ۱۹۵)

ایک مرتبہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے سونے یا چاندی کے کچھ برتن ان کے وزن سے زیادہ کے بدلے فروخت کیے تو ابو درداء رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا:

''میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو اس سے منع فرماتے ہوئے سنا ہے، مگر یہ کہ برابر برابر ہو۔''

پھر ابو درداء رضی اللہ عنہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور اس کا تذکرہ کیا تو عمر رضی اللہ عنہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو لکھا:

((لَا تَبِعْ ذٰلِكَ اِلَّا مَثَلًا بِمَثَلٍ وَزْنًا بِوَزْنٍ)) (المغنی ۴/۱۰)

''اسے فروخت نہ کرو مگر برابر برابر اور ہم وزن۔''

اس لیے یا تو پرانے زیورات پہلے فروخت کر دیں پھر ان کی قیمت سے نئے زیورات خریدیں یا پرانے زیورات کو پھر سے گلا کر اور صاف کر کے نئے زیورات بنانے کے لیے دیں اور بنانے کی جو اُجرت ہو وہ دے دیں۔ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں، کیونکہ پہلی صورت میں سونے کو سونے سے یا چاندی کو چاندی سے خریدنا یا فروخت کرنا نہیں پایا گیا اور دوسری صورت میں خرید و فروخت ہے ہی نہیں بلکہ اجرت دے کر اپنی چاندی یا سونے کا زیور بنوانا ہے اور یہ حرام نہیں۔ (سود اور اس کے احکام و مسائل، ص:۱۲۹)

کرنسی کی قیمت گرنے پر قرض کی ادائیگی کا مسئلہ

سوال ایک شخص نے پانچ ہزار روپے کسی دوسرے شخص کو بطور قرض دیے۔ اس وقت اس رقم کی قوتِ خرید ایک تولہ سونا کے برابر تھی، کچھ عرصہ بعد جب مقروض نے قرض واپس کیا تو پانچ ہزار کی قوت مزید کم ہو کر دس ماشے کے برابر رہ گئی۔ اب مقروض کیا اتنی ہی مقدار میں کرنسی ادا کرے گا جتنی اس نے لی تھی یا ان کی قیمتِ خرید کا لحاظ کرتے ہوئے اتنے نوٹ دے گا جن کی قوت ایک تولہ کے برابر ہے؟ حالانکہ قرض کے لین دین کے وقت ایسی کوئی شرط نہیں رکھی گئی تھی۔

جواب بشرطِ صحتِ سوال مقروض صرف ۵۰۰۰ روپے ادا کرے گا۔ یہی عرفِ عام کے مطابق ہے البتہ اگر کوئی جائز شرط رکھی گئی ہوتی تو اس کا لحاظ کیا جاتا۔ (واللہ اعلم)

دودھ روکے ہوئے جانور کی فروخت کا حکم

سوال دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ جب گائے، بھینس اور بکری وغیرہ بیچنا چاہتے ہیں تو انہیں منڈی میں لانے سے پہلے چند دن ان کا دودھ نہیں دوہتے۔ اسلام کا اس سلسلے میں کیا حکم ہے؟

جواب اسلام خیر خواہی کا دین ہے، ایسے معاملات جن میں ضرر و غرر (دھوکہ) پایا جاتا ہو اسلام نے ان سے منع کیا ہے جیسے ہوا میں اڑتے ہوئے پرندوں کی بیع، دریا میں موجود

مچھلیوں کی بیع، جانور کے پیٹ میں موجود بچہ کی خرید و فروخت اسی اصول کے پیش نظر جائز نہیں، عام طور پر مشاہدہ میں آیا ہے کہ جو بیوپاری دودھ دینے والے جانوروں کو منڈی میں لاتے ہیں تو وہ کچھ دن قبل جانور کا دودھ نہیں نکالتے تا کہ تھن بھرے بھرے دکھائی دیں اور خریدار سمجھے کہ یہ جانور زیادہ دودھیلہ ہے۔ لیکن جب وہ ایسے جانور کو اپنے ہاں لے جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے اس کے ساتھ تو فراڈ ہو گیا ہے۔ جانور کا دودھ تو اتنا نہیں جتنا ظاہراً لگ رہا تھا۔ اصطلاح شریعت میں اسے بیع مصراۃ کا نام دیا جاتا ہے۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو اس بیع سے روکا ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

((لَا تَصُرُّوا الْإِبِلَ وَالْغَنَمَ))

(بخاری ، البیوع ، النهی للبائع ان لا یحفل الإبل والبقر والغنم وکل محفلة ، ح: ۲۱۴۸)

"اونٹوں اور بکریوں (کو بیچنے کی غرض سے ان) کا دودھ تھنوں میں نہ روک رکھو۔"

دوسری حدیث میں آتا ہے:

((وَلَا تَصُرُّوا الْغَنَمَ)) (ایضاً، ح: ۲۱۵۰)

اگر کسی نے ایسا جانور خرید لیا ہو تو اسے اختیار ہو گا کہ چاہے تو رکھ لے یا تین دن کے اندر اندر واپس کر دے، ساتھ (از راہِ تالیفِ قلب یا احسان) ایک صاع کھجور بھی دے۔ ارشاد نبوی ہے:

((فَمَنِ ابْتَاعَهَا بَعْدُ فَإِنَّهُ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ بَيْنَ أَنْ يَحْتَلِبَهَا إِنْ شَاءَ أَمْسَكَ إِنْ شَاءَ رَدَّهَا وَصَاعَ تَمْرٍ)) (ایضاً، ح: ۲۱۴۸)

دوسری حدیث میں ہے:

((إِذَا مَا أَحَدُكُمُ اشْتَرٰى لِقْحَةً مُصَرَّاةً أَوْ شَاةً مُصَرَّاةً فَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ بَعْدَ أَنْ يَحْلُبَهَا إِمَّا هِيَ وَإِلَّا فَلْيَرُدَّهَا وَصَاعًا مِنْ تَمْرٍ))

(مسلم، البیوع، حکم بیع المصراة، ح: ۱۵۲٤)

ایک حدیث میں تین دن کا بھی ذکر ہے، ارشاد نبوی ہے:

((مَنِ ابْتَاعَ شَاةً مُصَرَّاةً فَهُوَ فِيهَا بِالْخِيَارِ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ......)) (ایضاً)

بعض راویوں نے ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے ((وَهُوَ بِالْخِيَارِ ثَلَاثًا)) کے الفاظ بھی نقل کیے ہیں۔ (بخاری، ح:۲۱۴۸)

اگر خریدار کو ایسی صورت حال کا تین دن سے پہلے پتا چل جائے تو اسی وقت واپس کر دے مزید تاخیر نہ کرے۔

یہاں ایک مسئلہ قدرے وضاحت طلب ہے کہ کیا کھجور کے علاوہ کسی اور جنس کا غلہ بھی دیا جا سکتا ہے یا صرف کھجور ہی دینی چاہیے۔ زیادہ تر احادیث میں ((صَاعًا مِّنْ تَمْرٍ)) (کھجور کا ایک صاع) کا ذکر ملتا ہے، اور ان احادیث کے اولین مخاطب عرب تھے کہ جن کی زیادہ تر گزر بسر کھجور پر ہوتی تھی۔ کھجور ایک طرح کا تیار شدہ کھانا ہے۔ ابن سیرین سے ((صَاعًا مِّنْ طَعَامٍ)) (کھانے کا ایک صاع) کے الفاظ بھی بعض نے نقل کیے ہیں۔

(بخاری ، البیوع ، النهی للبائع ...... ، ح: ۲۱۴۸)

مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنِ اشْتَرٰى شَاةً مُصَرَّاةً وَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ بَعْدَ أَنْ يَّحْلِبَهَا إِمَّا هِيَ وَ إِلَّا فَلْيَرُدَّهَا وَصَاعًا مِّنْ تَمْرٍ))

((مَنِ اشْتَرٰى شَاةً مُصَرَّاةً وَهُوَ بِالْخِيَارِ ثَلٰثَةَ أَيَّامٍ فَإِنْ رَدَّهَا رَدَّ مَعَهَا صَاعًا مِّنْ طَعَامٍ لَا سَمْرَاءَ)) (البیوع ، حکم بیع المصراة ، ح: ۱۵۲۴)

"وہ جس نے ایسی بکری خریدی جس کا دودھ تھنوں میں روکا گیا ہو، اسے تین دن تک واپس کرنے کا اختیار ہوگا۔ اگر واپس کرے تو ایک صاع کھانا بھی دے نہ کہ اناج (گندم وغیرہ)"

جبکہ بعض علماء نے ملکی رائج الوقت خوراک کا ایک صاع دینا بھی جائز قرار دیا ہے۔ جیسا کہ امام نووی شارح صحیح مسلم فرماتے ہیں:

وقال بعض أصحابنا يرد صاعا من قوت البلد ولا يختص بالتمر۔

اسی طرح ایک صاع کے مطابق قیمت بھی ادا کی جا سکتی ہے۔ (واللہ اعلم)

ملاحظہ: ایک صاع (حجازی) کا وزن دو سیر گیارہ چھٹانک ہوتا ہے جو کہ رائج الوقت کلوگرام

کے پیمانے کے محتاط حساب سے اڑھائی کلوگرام بنتا ہے۔

ٹریفک ہڑتال پر زیادہ کرایہ لینا؟

سوال ہڑتال کے مواقع پر دیکھنے میں آیا ہے کہ گاڑیوں والے مسافروں کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کرایہ زیادہ وصول کرتے ہیں۔ کیا ان کے لیے ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ کسی کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی شریعت میں ممانعت آئی ہے۔ نیز یہ اسلامی اخوت اور انسانی ہمدردی کے تقاضوں کے بھی منافی ہے۔ لیکن اگر گاڑیاں دستیاب نہیں اور ایک آدھ گاڑی ملتی ہے مگر عام معمول کے مطابق اس کا خرچہ پُورا نہ ہوتا ہو تو کرایہ (معروف طریقے سے) بڑھایا بھی جا سکتا ہے۔

برائلر مرغی کا گوشت اور انڈے؟

سوال کیا برائلر مرغی اور اس کے انڈے کھانا جائز ہے؟

جواب حرام ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔ حرام ہونے کے لیے واضح دلیل چاہیے۔ اگر کوئی اسے 'شبہات' کی قبیل سے قرار دے کر اس سے بچے تو یہ اس کا تقویٰ ہے۔

یہ بات بھی مدِنظر رکھنی چاہیے کہ ان فارمی مرغیوں کی خوراک صحت افزا نہیں ہوتی۔ اسی بنا پر دل کی بیماریاں بھی جنم لے رہی ہیں۔

غیر اخلاقی کال کی کمائی؟

سوال بعض لوگ ہمارے P.C.O پر آ کر اپنی سہیلیوں کو فون کرتے ہیں یا کسی کو دھمکی آمیز کال کرتے ہیں۔ ہمیں اس کا بعض دفعہ پیشگی علم بھی ہوتا ہے۔ کیا ایسی کمائی حلال ہے؟

جواب آپ اپنے کال پوائنٹ پر کسی کو ایسا فون کرنے کی اجازت نہ دیں بلکہ اگر ممانعت کا نوٹس لگا دیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ اگر کسی کے بارے میں آپ جانتے ہیں کہ وہ غیر اخلاقی فون کرتا ہے تو آپ اپنے P.C.O پر ایسا کرنے کی ہرگز اجازت نہ دیں۔ جانتے بوجھتے بھی ایسا کرنا گناہ کے ساتھ تعاون ہے جبکہ گناہ پر کسی سے تعاون کرنا جائز نہیں۔ جیسا کہ قرآن میں ﴿وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (۵/المائدۃ:۲) کے الفاظ آئے ہیں۔ لیکن اگر آپ کو اس کا علم نہیں تو اس صورت میں آپ قصور وار نہیں ہوں گے۔

اصلاح عقائد واعمال

اور

رسومات

سورج واپس آ گیا؟

سوال بعض لوگ کہتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی نمازِ عصر رہ گئی تھی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تو سورج واپس لوٹ آیا۔ کیا یہ بات درست ہے یا یونہی لوگوں میں مشہور ہو گئی ہے؟

جواب اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اس سلسلے میں کوئی بھی روایت آئمہ حدیث کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔

اتنا بڑا واقعہ رونما ہوا ہو اور لوگوں کو اس کا علم تک نہ ہو محال سی بات ہے۔ سورج کا غروب کے بعد مغرب سے نکلنا تو قربِ قیامت کی بڑی نشانی ہے۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں کہ ظاہر ہو کر گزر جائے اور کسی کو علم بھی نہ ہو۔ عہدِ نبوی میں شق القمر (چاند دو ٹکڑے ہونے) کا واقعہ رونما ہوا تھا، وہ تو تواتر کے ساتھ احادیث میں بیان ہوا ہے۔

پھر یہ کہ سورج جب ایک دفعہ غروب ہو گیا تو عصر کا وقت تو ختم ہو گیا۔ اب اگر سورج بالفرض دوبارہ واپس بھی پلٹ آئے تو نماز تو اصل وقت پر ادا نہیں ہو سکتی۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ غروب آفتاب پر روزہ دار روزہ کھول سکتا ہے اور نماز مغرب پڑھی جا سکتی ہے۔ کیا دوبارہ سورج نکلنے پر وہ نماز اور روزہ باطل ہو گیا، یہ مفروضہ ناممکن ہے۔

اس پر مستزاد یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض غزوات میں مشغولیت کی وجہ سے نماز قضا ہو گئی، ان غزوات میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور دیگر جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی موجود تھے مگر اللہ تعالیٰ نے سورج کو لوٹا کر رات کو دن میں تبدیل نہیں کیا بلکہ نماز بعد میں ہی ادا کی گئی۔

(اس مسئلے کی تفصیل کے لیے دیکھیے شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب منتقی منهاج السنة النبوية، فصل ثالث، عنوان: خرافة ردالشمس لعلى مرتين بعد غروبها اور حافظ ابن کثیر کی کتاب البداية والنهاية، جلد:٦)

کیا سورج رکنے کا واقعہ درست ہے؟

سوال کیا یہ درست ہے کہ کسی نبی کے لیے اللہ تعالیٰ نے سورج کو روک دیا تھا یا اس کی رفتار کو کم کر دیا تھا؟ یہ کون سے نبی تھے؟

جواب ہاں یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک نبی (یوشع بن نون علیہ السلام) کے لیے سورج کو روک دیا تھا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(بنی اسرائیل کے) پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر (یوشع بن نون علیہ السلام) نے جہاد کیا، انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا: میرے ساتھ کوئی ایسا شخص جہاد کے لیے نہ جائے جس نے کسی عورت سے عقد کیا ہو اور ابھی اس سے صحبت نہ کی ہو یا جس نے گھر بنائے ہوں ان کی چھتیں نہ ڈالی ہوں (ابھی صرف دیواریں تیار کی ہوں) یا جس نے (حاملہ) بکریاں یا اونٹنیاں خریدی ہوں ان کے جننے کا منتظر ہو۔ خیر وہ جہاد کے لیے گئے اور ایک گاؤں (اریحا) کے قریب اس وقت پہنچے کہ عصر کا وقت ہو گیا تھا یا نزدیک تھا، انہوں نے سورج کو مخاطب کر کے کہا:

((إِنَّكِ مَأْمُورَةٌ وَأَنَا مَأْمُورٌ اَللّٰهُمَّ احْبِسْهَا عَلَيْنَا فَحُبِسَتْ حَتّٰى فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْهِ))

(بخاری ، الجهاد والسیر ، قول النبی ﷺ احلت لکم الغنائم......ح:٣١٢٤)

''تو بھی (اللہ کا) تابع فرمان ہے اور میں بھی اسی کا تابع فرمان ہوں۔ پھر یوں دعا کی: یا اللہ! سورج کو روک دے! وہ روک دیا گیا یہاں تک کہ انہوں نے فتح حاصل کی۔''

''اس کی حرکت موقوف کر دے'' سے معلوم ہوا کہ زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد حرکت کرتا ہے جیسے اگلے فلاسفہ کا قول تھا، حال کے سائنس دان یہ کہتے ہیں کہ سورج مرکزِ عالم ہے اور زمین اور سب سیارے اس کے گرد گھومتے ہیں اور اس کی کشش اور اپنے ثقل کی وجہ سے اپنی اپنی جگہ قائم ہیں، اگر یہ موقف صحیح ہو تو سورج کو روک دینے سے یہ مطلب ہو گا کہ زمین کو ساکن کر دے اور اس کا ساکن کرنا گویا سورج کو روک دینا ہے کیونکہ سورج ایک ہی مقام پر نظر آئے گا اور زمین کی تیز حرکت کی وجہ سے جو چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے وہ بات نہ رہے گی۔ (تیسیر الباری شرح صحیح بخاری)

(قرآن وحدیث کے دلائل سے واضح ہے کہ سورج متحرک اور زمین ساکن ہے۔

(حافظ مقصود احمد)

کیا انفرادی اصلاح سے کچھ فرق نہیں پڑتا؟

سوال بعض لوگ انفرادی اصلاح کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے کہ ایک دو یا چند اشخاص کی اصلاح ہونے یا نیک بننے سے ایک بگڑے ہوئے معاشرے پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ ان افراد کی ایسی سوچ کی اصلاح کے لیے راہنمائی کریں۔

جواب تمام افراد معاشرے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ انفرادی اصلاح سے ہی اجتماعی اور معاشرتی اصلاح کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ تاریخ انسانی ایسے افراد سے بھری پڑی ہے جنھوں نے اکیلے یا کم ہونے کے باوجود کایا پلٹ کر رکھ دی۔ انبیاء و رسل کی دعوت اسی حقیقت کی غماز ہے۔ جو تربیت و اصلاح کا علم اٹھائے ﴿إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۚ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ﴾ (ہود:۸۸) کی صدا بلند کرتے رہے۔ یہ ایک ہی شخص تھا جس کے بارے میں الطاف حسین حالی مسدس میں لکھتے ہیں:

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
مسِ خام کو جس نے کندن بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا
پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رخ ہوا کا

انفرادی اصلاح کے کس قدر دُور رس نتائج برآمد ہوتے ہیں، اس سلسلے میں درج ذیل باتیں ملحوظ رکھنا ضروری ہیں:

① جو لوگ اسلامی تعلیمات پر عمل کر کے معاشرے میں اچھے فرد بنیں گے وہ خود دنیا میں بھی

سکون کی زندگی گزاریں گے اور آخرت میں بھی اجر وثواب کے مستحق ہوں گے۔

② برائی کرکے جو وہ شر پھیلاتے اس سے بچیں گے اور اس طرح لوگ ان کے شر سے محفوظ رہیں گے۔

③ نیکی کی مثال ایک روشنی کی سی ہے۔ اگر چند لوگ بھی نیکیاں کریں گے تو گو مدھم ہی سہی مگر نیکیوں کی روشنی ضرور پھیلے گی۔ اس روشنی یعنی نیکی سے لوگ فائدہ اٹھائیں گے۔

④ ہوسکتا ہے ان کی دیکھا دیکھی کچھ اور لوگ بھی اچھے عمل کرنے لگیں۔ اسی طرح دیے سے دیا جلتا آیا ہے۔ بہر حال ایک شخص بھی اگر یہ تہیہ کرلے کہ اسلامی تعلیمات کو اپنے اوپر نافذ کرے گا تو اس کے بھی بہت سے فائدے ہیں۔

اس دور میں عموماً رواج ہوگیا ہے کہ جب کچھ لوگ مل کر بیٹھتے ہیں تو معاشرے پر تنقید کرتے ہیں۔ ہر شخص کو دوسروں کی اصلاح کی فکر رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو، جو خود بھی کسی نہ کسی برائی میں مبتلا ہوتے ہیں، دوسروں کی برائیاں زیادہ بھیانک دکھائی دیتی ہیں اور جو کچھ وہ خود کرتے ہیں وہ انہیں بہت ہلکی بات معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً جو رشوت خور ہے وہ دواؤں اور غذاؤں میں ملاوٹ کرنے والے کو بُرا کہتا ہے۔ جو ملاوٹ کرنے کا مجرم ہے وہ ذخیرہ اندوزی کرنے والوں پر برہم ہوتا ہے۔ جو ذخیرہ اندوز ہے وہ ان سرکاری ملازمین سے نالاں ہے جو اپنے فرائض منصبی سے غفلت برتتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے مجرم بھی اپنے سے مختلف جرم کرنے والوں کو برا بھلا کہتے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر محض دوسروں کی اصلاح کی بجائے ہر ایک کو اپنی اصلاح کی فکر ہوجائے تو معاشرہ درست ہوسکتا ہے۔ انسان کے اختیار میں سب سے زیادہ اس کی اپنی ذات ہے۔ جو شخص اپنی ذات پر اسلام نافذ نہیں کر سکتا وہ دوسروں پر کیا نافذ کرے گا۔ (مجلّہ فکر ونظر، مارچ اپریل ۱۹۸۳ء، نفاذِ شریعت نمبر)

کیا قیامت کے دن ماں کے نام سے پکارا جائے گا؟

سوال کیا لوگوں کو قیامت کے دن ماں کے نام سے بلایا جائے گا؟

جواب قیامت کے روز ہر ایک کو اُس کی ماں کے نام سے نہیں بلکہ اس کے باپ

کے نام سے بلایا جائے گا۔ اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں:

((إِنَّ الْغَادِرَ يُنْصَبُ لَهُ لِوَاءٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُقَالُ هٰذِهِ غَدْرَةُ فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ)) (بخاری، الادب، یدعی الناس بابائھم، ح:٦١٧٨)

''قیامت کے دن ہر دھوکے باز کی دبر میں ایک جھنڈا ہوگا اور کہا جائے گا کہ یہ دھوکے باز فلاں ہے، جو فلاں شخص کا بیٹا ہے۔''

ایک اور حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّكُمْ تُدْعَوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِأَسْمَاءِكُمْ وَأَسْمَاءِ آبَاءِكُمْ فَأَحْسِنُوْا أَسْمَاءَكُمْ)) (ابو داؤد، الادب، فی تغییر الاسماء، ح:٤٩٤٨)

''تم روز قیامت اپنے اور اپنے باپ کے نام کے ساتھ بلائے جاؤ گے اس لیے نام اچھے رکھا کرو۔''

کیا خنزیر کا نام لینے سے زبان گندی ہو جاتی ہے؟

سوال کیا خنزیر کا نام لینے سے زبان گندی ہو جاتی ہے جیسا کہ بعض لوگوں میں یہ بات مشہور ہے؟

جواب یہ بات درست نہیں اگر ایسا ہوتو ہر اس شخص کی زبان گندی ہو جائے جو اس کی حرمت لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہو، اس طرح تو پہلے تو اس شخص کی زبان گندی ہوگی جو کہے کہ خنزیر کا نام لینے سے زبان ناپاک ہو جاتی ہے۔ جب کہ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید، احادیث نبویہ اور دیگر بہت سی اسلامی کتب میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔

آنتوں میں آواز پیدا ہو تو کیا کوئی پریشانی لاحق ہوتی ہے؟

سوال لوگوں میں مشہور ہے کہ اگر کسی کی انتڑیوں سے آواز پیدا ہو رہی ہو تو ایسے آدمی کو کوئی پریشانی لاحق ہوتی ہے۔ کیا یہ بات درست ہے؟

جواب عموماً بھوک کی وجہ سے انتڑیوں میں آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس کے لیے اُردو زبان میں محاورات بھی ہیں۔ مثلاً انتڑیاں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ انتڑیاں جل رہی ہیں۔ انتڑیوں کو آگ لگی ہوئی ہے یعنی بھوک لگی ہوئی ہے۔ بعض دفعہ پیٹ میں خرابی کی وجہ

سے بھی انتڑیوں میں آواز پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ بات درست نہیں کہ جس کی انتڑیوں میں آواز پیدا ہو رہی ہو اسے ضرور کوئی پریشانی لاحق ہوتی ہے۔ عین ممکن ہے کسی کو کوئی پریشانی ہو اور اس کی انتڑیوں سے کسی وجہ سے آواز بھی پیدا ہو رہی ہو۔ ہوسکتا ہے بھوک کی پریشانی کی وجہ سے انتڑیوں میں آواز پیدا ہو رہی ہو۔ ان دو صورتوں میں انتڑیوں کی آواز بھوک ہوگی نہ کہ پریشانی۔

مرغی 'بانگ' دے تو اسے ذبح کرنا ضروری ہے؟

سوال اگر مرغی اذان (بانگ) دینا شروع کر دے تو کیا اسے ذبح کر لینا ضروری ہے؟ بعض لوگ اسے منحوس خیال کرتے ہیں، کہتے ہیں: اگر اسے ذبح نہ کیا جائے تو کوئی نہ کوئی آفت ضرور آجاتی ہے!

جواب ایسی مرغی کو ذبح کرنا ضروری نہیں۔ یہ لوگوں کے توہمات ہیں کہ اگر اس مرغی کو ذبح نہ کیا جائے تو اس گھر میں کوئی نہ کوئی آفت ضرور آجاتی ہے جبکہ یہ مشاہداتی طور پر بھی غلط ہے۔ کیونکہ بعض دفعہ دیکھا گیا ہے کہ ایسی مرغیاں ذبح نہیں کی جاتیں لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کوئی آفت وغیرہ نہیں آتی۔

اس کے 'بانگ' دینے کی وجہ کوئی بھی ہوسکتی ہے۔ بعض چیزیں اگر خلافِ معمول ظہور پذیر ہو جائیں تو کوئی نحوست کی بات نہیں ہوتی مثلاً اگر کسی عورت کو داڑھی آجائے تو کیا ایسی عورت کو منحوس سمجھنا چاہیے؟ اسی طرح بعض مردوں کو ساری زندگی داڑھی آتی ہی نہیں تو کیا ایسے مردوں کو منحوس جان کر گھر سے نکال دینا چاہیے؟ روزمرہ زندگی میں اس طرح کے عجوبے منظر عام پر آتے رہتے ہیں لیکن کبھی کسی نے انہیں منحوس قرار نہیں دیا۔ آخر بیچاری مرغی ہی منحوس کیوں؟

لوگوں کی بھی عجیب عجیب توہمات ہیں جو کسی کے ذہن میں آتا ہے کہہ دیتا ہے۔

نوٹ: مرغ کے بارے میں نبی ﷺ نے فرمایا: جب تم مرغ کی آواز سنو تو اللہ سے فضل مانگو کیونکہ مرغ نے فرشتہ دیکھا ہے۔ (ابوداؤد، ح:۵۱۰۲)

یعنی مرغ کی اذان سن کر اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ جیسے کلمات کہیں۔

اسی طرح دوسری حدیث میں ہے کہ مرغ کو گالی نہ دو، وہ تو نماز کے لیے جگاتا ہے۔

(ایضاً، ح:۵۱۰۲)

سبحان اللہ! مرغ کا اذان دینا احادیث میں تو گویا اِسے رحمت کہا گیا ہے لیکن ہمارے ہاں کے جہلاء اسے نحوست کہتے ہیں۔ (محمد ارشد کمال)

آیا محرم الحرام کی حرمت واقعہ کربلا کی وجہ سے ہے؟

سوال ماہ محرم کی حرمت وفضیلت کس وجہ سے ہے؟ جو لوگ دین کا صحیح علم نہیں رکھتے وہ سمجھتے ہیں کہ اس کا سبب سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت ہے!

جواب محرم سن ہجری کا پہلا مہینہ ہے اور حرمت والے مہینوں میں سے ایک ہے۔ رجب، ذوالقعدۃ، ذوالحجۃ اور محرم حرمت والے مہینے ہیں۔ عاشوراء (دس محرم) کا روزہ رکھنے کی بہت فضیلت ہے۔ احادیث کی روشنی میں محرم میں روزہ کے سوا کوئی اضافی عمل ثابت نہیں یہ خیال قطعی غلط ہے کہ ماہِ محرم اس لیے قابل احترام ہے کہ اس میں شہادت حسین رضی اللہ عنہ کا دل گداز حادثہ پیش آیا تھا۔ یہ سانحہ تو وفاتِ رسول ﷺ سے تقریباً پچاس برس بعد پیش آیا تھا جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ سے نصف صدی پہلے تکمیلِ دین کا اعلان کر دیا تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾ (۵/المائدۃ:۳)

’’آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا، تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور دین اسلام کو تمہارے لیے پسند کیا۔‘‘

اپریل فول منانے والے احمق

سوال اپریل فول منانے میں کوئی شرعی قباحت تو نہیں؟

جواب اپریل فول (April Fool) کی تاریخی حیثیت کوئی بھی ہو، اس کا منانا ایک مسلمان کے لیے قطعاً جائز نہیں ہے۔ اس کی درج ذیل وجوہات ہیں:

① اس میں جھوٹ بولا جاتا ہے اور جھوٹ کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ جھوٹ بولنا مومن کو زیب نہیں دیتا۔

② اس سے مسلمانوں کا مالی اور بعض دفعہ جانی نقصان بھی ہو جاتا ہے۔ مسلمان کا جانی و مالی نقصان کرنا حرام ہے۔

③ ایک مسلمان اپنے ساتھ دھوکا اور فراڈ کیے جانے کو پسند نہیں کرتا، اسے دوسرے بھائیوں کے لیے بھی پسند نہیں کرنا چاہیے۔

④ ایک آدمی اپنے ساتھ استہزاء کو پسند نہیں کرتا، ایمان کا تقاضا ہے کہ دوسروں کے ساتھ استہزاء نہ کرے۔

⑤ اس میں دوسروں کے ساتھ استہزاء کیا جاتا ہے۔ اسلام میں استہزاء کی ممانعت ہے (دیکھیے ۴۹/ الحجرٰت:۱۱)

⑥ اس سے کفار کی مشابہت ہوتی ہے۔ اسلام نے غیر مسلموں کی مشابہت اختیار کرنے سے منع کیا ہے۔ مسلم کو زیب نہیں دیتا کہ اہلِ کفر کا کلچر اختیار کرے۔

⑦ اس سے رنجشیں، کدورتیں اور عداوتیں پیدا ہوتی ہیں۔

کالی بلی اور حادثہ

سوال ہمارے معاشرے میں بعض لوگ ایسے بھی پائے جاتے ہیں جن کا خیال ہے کہ اگر دورانِ سفر کالی بلی راستہ کاٹ دے تو حادثہ ہو جاتا ہے۔ میں موٹر سائیکل پر سفر کر رہا تھا، کچھ فاصلے پر میرے آگے آگے دو نوجوان بھی موٹر سائیکل پر سوار جا رہے تھے، اچانک ان کے آگے سے سڑک کو کراس کرتے ہوئے کوئی جانور گزرا تو وہ گھبراہٹ کے عالم میں سڑک سے نیچے اتر آئے، اتنے میں میں بھی ان کے پاس پہنچ گیا تو میں نے ان سے پوچھا: بیٹا کیا وجہ ہے آپ پریشان دکھائی دے رہے ہیں؟ تو انہوں نے کالی بلی کا ماجرا بیان کیا۔ اس سلسلے میں ہماری راہنمائی کریں۔

جواب زمانہ جاہلیت میں لوگ چڑیا اور جانور کے راستہ کاٹنے کو منحوس سمجھا کرتے تھے۔ شریعت نے اس طرح کی خرافات کی تردید کی ہے۔

مولودِ کعبہ کون ہے؟

سوال لوگوں میں مشہور ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کعبہ میں پیدا ہوئے۔ایک فرقے کے لوگ ''مولودِ کعبہ کا جشن'' کے نام سے اشتہارات بھی شائع کرتے ہیں۔بعض پنجابی قوال ''جتھے تیرا جنم ہووے اوتھے علی جمیا'' کی رٹ بھی لگاتے ہیں؛ تو کیا ایسی کوئی ٹھوس دلیل موجود ہے جس کی وجہ سے علی رضی اللہ عنہ کو ''مولودِ کعبہ'' کہا جاتا ہے؟

جواب کسی مستند دلیل سے یہ بات ثابت نہیں ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کعبہ میں پیدا ہوئے تھے۔البتہ ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے حکیم بن حزام کعبہ میں پیدا ہوئے تھے۔علماء نے ان کی یہ خصوصیت بیان کی ہے جو کسی اور میں نہیں پائی جاتی حکیم بن حزام کی والدہ چند خواتین کے ساتھ کعبہ کی زیارت کے لیے گئیں، وہ کعبہ کے اندر تھیں کہ انہیں دردِ زہ شروع ہو گیا لہٰذا وہیں انہوں نے بیٹے کو جنم دیا۔(حاکم ۳/۴۸۲)

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ولد حكيم بن حزام في جوف الكعبة وعاش مئة وعشرين سنة

(مسلم ، ثبوت خيار المجلس للمتبايعين)

''حکیم بن حزام کی ولادت کعبہ کے اندر ہوئی اور انہوں نے ایک سو بیس برس عمر پائی۔''

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

حکیم رضی اللہ عنہ کی ولادت کعبہ کے اندر ہوئی۔کوئی دوسرا شخص اس کے اندر پیدا نہیں ہوا۔سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو ایسی بات بیان کی جاتی ہے وہ اہل علم کے نزدیک ضعیف قول ہے۔(تہذیب الاسماء واللغات ۱/۱۶۶)

مصعب بن عبداللہ نے حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا ہے:

ان کی والدہ نے انہیں کعبہ کے اندر جنم دیا۔ان سے پہلے یا بعد کوئی بھی کعبہ کے اندر پیدا نہیں ہوا۔(حاکم ۳/۴۸۳)

امام حاکم نے مصعب کی اس بات کو اُن کا وہم قرار دیا ہے کہ حکیم رضی اللہ عنہ کے بعد بھی کوئی

کعبہ میں پیدا نہیں ہوا اور کہا کہ متواتر روایات سے ثابت ہے کہ علی بن ابوطالب رضی اللہ عنہ کی ولادت بھی کعبہ کے اندر ہوئی تھی۔ (ایضاً)

جب کہ نامور علماء وائمہ نے اس قسم کے دعویٰ کو کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کعبے میں پیدا ہوئے ضعیف قرار دیا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یہ خصوصیت ان (حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ) کے علاوہ کسی بھی شخص کو حاصل نہیں۔ مستدرک (حاکم) میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو لکھا ہے وہ ضعیف ہے۔

(تدریب الراوی ۲/۳۶۰)

ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ حکیم رضی اللہ عنہ کی ولادت کعبہ کے اندر ہوئی تھی۔ ان کے علاوہ کوئی دوسرا شخص کعبہ کے اندر پیدا نہیں ہوا۔ سیدنا علی بن ابوطالب رضی اللہ عنہ کے متعلق جو ایسا دعویٰ کیا جاتا ہے وہ اہلِ علم کے نزدیک ضعیف ہے۔

(الاستیعاب بمعرفۃ الاصحاب۱/ ۳۶۳)

مصطفیٰ بن محمد بن عبدالعلوی رقم طراز ہیں کہ حکیم رضی اللہ عنہ کی ولادت کعبہ کے اندر ہوئی ،کوئی دوسرا شخص اس خصوصیت میں ان کا شریک نہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے متعلق ایسا دعویٰ اہلِ علم کے نزدیک ضعیف ہے۔

(عنوان النجابۃ فی معرفۃ الصحابۃ من مات بالمدینۃ من الصحابۃ، ص:۶۲)

(نوٹ: حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کے حالات وکمالات اور مذکورہ بالا بیانات کی مزید تفصیلات کے لے دیکھیے ہفت روزہ الاعتصام ۰۵/۷/۵ میں محترم پروفیسر سعید مجتبیٰ سعیدی حفظہ اللہ کا مضمون۔)

کیا دجال سے مراد امریکہ یا اسرائیل ہے؟

سوال بعض جدید علماء کا یہ دعویٰ ہے کہ دجال سے مراد امریکہ یا اسرائیل ہے۔ ان سکالرز کی بات میں کتنی صداقت ہے؟

جواب دجال یہود کا ایک آدمی ہے جو اِس امت کے آخر میں قیامت کی نشانی کے طور پر ظاہر ہوگا۔ دجال کا ظہور قیامت کی دس علامات کبریٰ (بڑی نشانیوں) میں سے ایک نشانی ہے۔ دجال خراسان کی بستی یہودا ہ سے نکلے گا۔

دجال کے ساتھ ستر ہزار یہودی ہوں گے۔

(مسلم ، الفتن ، فی بقیۃ من احادیث الدجال ، ح:۲۹۴۴)

دجال کی جو شکل و صورت احادیث میں بیان کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دجال ایک آدمی ہی ہے جس کی حمایت یہودی کریں گے۔

دجال ایک آنکھ سے کانا ہوگا۔ (بخاری ، الفتن ، ذکر الدجال ، ح:۷۱۲۳)

ارشاد نبوی کے مطابق اس کی آنکھوں کے درمیان ک ف ر (کافر) لکھا ہوگا جسے ہر مسلمان پڑھ لے گا۔(مسلم ، الفتن ، ذکر الدجال ، ح:۲۹۳۳)

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

اس کے پاس جنت اور آگ ہوگی اس کی آگ درحقیقت جنت ہے اور اس کی جنت درحقیقت آگ ہے۔(ایضاً،ح:۲۹۳۴)

ایک اور حدیث میں اس کے لیے رَجُلٌ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ مَسِیْحَ الدَّجَّالِ رَجُلٌ قَصِیْرٌ اَفْحَجُ جَعْدٌ اَعْوَرُ مَطْمُوْسُ الْعَیْنِ لَیْسَ بِنَاتِئَةٍ وَلَا جَحْرَاءَ))

(ابو داوٗد ، الملاحم ، خروج الدجال ، ح:۴۳۲۰)

”مسیح دجال چھوٹے قد والا آدمی ہوگا، اس کے بال گھنگریالے ہوں گے، کانا ہوگا اور اس کی ایک آنکھ مٹائی گئی ہوگی نہ بہت ابھری ہوئی اور نہ بہت دھنسی ہوئی ہوگی۔“

دجال مکہ، مدینہ اور بیت المقدس میں داخل نہیں ہو سکے گا۔

(مسند احمد ۲/ ۲۱۳، ۵/ ۲۲؛ المعجم الکبیر ۷/ ۲۲۴)

دجال کو عیسیٰ علیہ السلام خود قتل کریں گے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((فَیَنْزِلُ عِیْسَی بْنُ مَرْیَمَ فَاَمَّهُمْ فَاِذَا رَاٰهُ عَدُوُّاللّٰهِ ذَابَ کَمَا یَذُوْبُ الْمِلْحُ فِی الْمَاءِ فَلَوْ تَرَکَهٗ لَا تَذَابُ حَتّٰی یَهْلِكَ وَلٰکِنْ یُقْتِلُهُ اللّٰهُ بِیَدِهٖ فَیُرِیْهِمْ دَمَهٗ فِیْ حَرْبَتِهٖ))

(مسلم ، الفتن ، في فتح قسطنطينية ..... ، ح:۲۸۹۷)

''عیسیٰ بن مریم نازل ہوں گے اور مسلمانوں کی امامت کروائیں گے، پھر جب اللہ کا دشمن دجال عیسیٰ کو دیکھے گا تو یوں گھلنے لگے گا جس طرح نمک پانی میں گھلتا ہے، اگر عیسیٰ اسے چھوڑ دیتے تب بھی گھل کر مر جاتا لیکن اللہ اسے عیسیٰ کے ہاتھوں قتل کروائے گا اور عیسیٰ اپنے نیزے پر دجال کا خون لوگوں کو دکھائیں گے۔''

مذکورہ بالا تمام احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دجال جو قیامت کی نشانیوں میں سے ہے، اس سے مراد امریکہ یا اسرائیل نہیں، البتہ یہ ظہورِ دجال کے وقت اس کے لاؤ لشکر ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح کانے دجال سے کیمرے کی آنکھ مراد لینا بھی تکلف ہی ہے۔

دجال ایک سال اڑھائی ماہ تک دنیا میں رہے گا؟

سوال دجال بڑا فتنہ ہے۔ یہ فتنہ کتنی دیر رہے گا؟ کیا یہ درست ہے دجال اپنے ظہور کے بعد ہمارے عام دنوں کے برابر چالیس دن تک دنیا میں رہے گا لیکن یہ چالیس دن مصائب وتکالیف کی وجہ سے ایک سال سے بھی زیادہ عرصہ معلوم ہوں گے؟

جواب اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((يَمْكُثُ الدَّجَّالُ أَرْبَعِينَ صَبَاحًا))

(مسند احمد ۵/ ۵۴۱، مجمع الزوائد ۷/ ۶۵۹)

''دجال (اپنے ظہور کے بعد) چالیس دن تک زمین میں ٹھہرے گا۔''

ایک اور حدیث میں ہے:

((إِنَّمَا فِتْنَتُهُ أَرْبَعُونَ يَوْمًا)) (ابن ابی شیبة ۷/ ۴۹۳)

''اس کا فتنہ چالیس دن ہوگا۔''

البتہ یہ بات درست نہیں کہ وہ تمام دن ہمارے عام دنوں کے برابر ہوں گے۔ بلکہ ان چالیس دنوں میں سے پہلا دن ہمارے سال کے برابر، دوسرا دن ہمارے مہینہ کے برابر اور تیسرا دن ہمارے ہفتہ (Week) کے برابر ہوگا اور باقی ۳۷ دن ہمارے عام دنوں کے برابر

ہوں گے۔ پہلے دنوں کی بیان کردہ مدت حقیقی اعتبار سے ہوگی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان چالیس دنوں میں سے پہلا دن سال کے برابر ہوگا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی اکرم ﷺ سے نمازوں کے بارے میں استفسار کیا کہ ہم اس دن میں سال کی نمازیں پڑھیں گے یا ایک دن کی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ایک دن کی نہیں بلکہ اندازے سے پوری نمازیں ادا کرنا۔ نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک روز اللہ کے رسول ﷺ نے دجال کا تذکرہ کیا اور فرمایا:

اللہ کے بندو! ثابت قدم رہنا۔ ہم نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! دجال کتنی مدت تک زمین میں رہے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَرْبَعُوْنَ يَوْمًا يَوْمٌ كَسَنَةٍ وَيَوْمٌ كَشَهْرٍ وَيَوْمٌ كَجُمُعَةٍ وَسَائِرُ اَيَّامِهِ كَاَيَّامِكُمْ))

”چالیس دن، جن میں سے پہلا دن ایک سال کے برابر ہوگا، دوسرا دن ایک مہینے کے برابر ہوگا اور تیسرا دن ایک ہفتے کے برابر ہوگا اور باقی (۳۷) دن عام دنوں کے برابر ہوں گے۔“

ہم نے عرض کیا: اللہ کے رسول! پہلا دن جو سال کے برابر ہوگا اس میں ہمیں ایک دن کی نمازیں ہی کافی ہوں گی؟ تو آپ نے فرمایا:

((لَا اُقْدُرُوْا لَهُ قَدْرَهُ)) (مسلم ، الفتن ، ذكر الدجال ، ح:۲۹۳۷)

”بلکہ اس روز اندازہ کرکے (ایک سال کی) نمازیں پڑھنا“

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دجال کے ظہور کے وقت چالیس دن ہمارے ایک سال اور اڑھائی ماہ کے برابر ہوں گے۔ جن کی ترتیب یوں بنتی ہے:

ایک سال + ایک ماہ + ایک ہفتہ + سینتیس دن (ایک ماہ اور ایک ہفتہ) = ایک سال دو ماہ اور چودہ دن۔

دجال سے بچاؤ کے ہتھیار کیا ہوں گے؟

سوال یوں محسوس ہوتا ہے کہ دجال کا ظہور قریب آپہنچا ہے۔ بعض قرائن سے اس

بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر دجال کا ظہور ہمارے ہوتے ہوئے ہو جائے تو ہمیں اس فتنے سے بچاؤ کے لیے کیا راستہ اختیار کرنا چاہیے تاکہ ہمارا ایمان سلامت رہ سکے؟

جواب دجال کے فتنے سے بچاؤ کا بنیادی اور مضبوط ہتھیار تو ایمان کا مضبوط ہونا ہے۔ اسی ایمان کی بنیاد پر کچھ احتیاطی تدابیر بھی اس سلسلے میں کار آمد ہو سکتی ہیں۔

دجال کا انکار اور اللہ تعالیٰ پر توکل بھی دجال اکبر سے محفوظ رہنے کا ایک سبب ہوگا۔

نبی اکرم ﷺ نے فتنہ دجال سے پناہ مانگنے کا حکم بھی دیا ہے آپ ﷺ خود بھی نماز کے دوسرے (آخری) تشہد میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے جس میں فتنہ دجال سے بچاؤ کا تذکرہ بھی ہے:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْیَا وَ فِتْنَةِ الْمَمَاتِ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْمَاْثَمِ وَالْمَغْرَمِ))

(بخاری، الاذان، الدعاء قبل السلام، ح:۸۳۲؛ مسلم، ح:۵۹۰)

''اللہ! میں عذاب قبر، فتنہ مسیح دجال، موت وحیات کے فتنے، گناہ اور تاوان سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔''

ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ النَّارِ وَعَذَابِ النَّارِ وَفِتْنَةِ الْقَبْرِ وعَذَابِ الْقَبْرِ وَشَرِّفِتْنَةِ الْغِنٰی وَشَرِّفِتْنَةِ الْفَقْرِ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ))

(بخاری، الدعوات، التعوذ من فتنة الفقر، ح:۶۳۷۷)

''اللہ! میں آگ کے فتنے اور جہنم کے عذاب سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور قبر کے فتنے اور عذابِ قبر سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور امیری وفقیری کے فتنے سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ اللہ! میں مسیح دجال کے فتنے کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔''

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا فَرَغَ اَحَدُكُمْ مِنَ التَّشَهُّدِ الْاٰخِرِ فَلْيَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنْ اَرْبَعٍ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ وَمِنْ شَرِّ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ))

(مسلم ، المساجد ، ما يستعاذ فی الصلاۃ ، ح:۵۸۸)

”جب تم آخری تشہد پڑھ لوتو (سلام پھیرنے سے قبل) چار چیزوں سے اللہ کی پناہ طلب کرو، جہنم، قبر کے عذاب اور زندگی اور موت کے فتنے اور مسیح دجال کے شر سے پناہ مانگو۔“

جو مومن شخص سورۃ الکھف کی ابتدائی دس آیات حفظ کرلے اور دجال کا سامنا ہونے پر ان کی تلاوت کرے تو ان آیات کی برکت سے وہ شخص فتنہ دجال سے محفوظ ہوجائے گا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ حَفِظَ عَشْرَ اٰيَاتٍ مِّنْ اَوَّلِ سُوْرَةِ الْكَهْفِ عُصِمَ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ))

(مسلم ، صلاۃ المسافرین ، فضل سورۃ الکھف و آیۃ الکرسی ، ح:۸۰۹)

”جس نے سورۃ الکھف کی ابتدائی دس آیات حفظ کرلیں اسے فتنہ دجال سے بچالیا جائے گا۔“

ایک اور حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((فَمَنْ اَدْرَكَهُ مِنْكُمْ فَلْيَقْرَاْ عَلَيْهِ فَوَاتِحَ سُوْرَةِ الْكَهْفِ فَاِنَّهَا جَوَارُكُمْ مِنْ فِتْنَتِهِ)) (ابوداؤد ، الملاحم ، ذکر الدجال ، ح:۴۳۲۱)

”تم میں سے جو بھی دجال کو پائے تو اس پر سورہ کہف کی ابتدائی آیات تلاوت کرے کیونکہ یہ آیات تمہیں اس کے فتنے سے بچانے کا ذریعہ ہوں گی۔“

وہ اہل ایمان جو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں رہائش پذیر ہوں گے وہ بھی دجال کے فتنہ سے مامون ہوں گے، ان مقدس شہروں میں دجال داخل نہیں ہوسکے گا۔ (اسی طرح وہ بیت المقدس میں بھی داخل نہیں ہوسکے گا)۔ ارشاد نبوی ہے:

((لَايَدْخُلُ الدَّجَّالُ مَكَّةَ وَلَاالْمَدِيْنَةَ)) (مسند احمد ۶/ ۲۴۱)

''دجال مکہ میں داخل ہو سکے گا نہ مدینہ میں۔''

دجال نہ تو خود مدینہ میں داخل ہو سکے گا اور نہ اس کا رعب و دبدبہ۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکم سے مدینہ کے تمام راستوں پر صفیں باندھ کر پہرہ دے رہے ہوں گے۔ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلْمَدِيْنَةُ يَأْتِيْهَا الدَّجَّالُ فَيَجِدُ الْمَلَائِكَةَ يَحْرُسُوْنَهَا فَلَايَقْرَبُهَا الدَّجَّالُ)) (بخاری ، الفتن ، لایدخل الدجال المدینة ، ح:۷۱۳۴)

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَايَدْخُلُ الْمَدِيْنَةَ رُعْبُ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ وَلَهَا يَوْمَئِذٍ سَبْعَةُ اَبْوَابٍ عَلٰى كُلِّ بَابٍ مَلَكَانِ)) (ایضا ، ذکر الدجال ، ح:۷۱۲۵)

''مدینہ پر دجال کا رعب نہیں پڑے گا۔ اس دن مدینہ کے سات دروازے ہوں گے اور ہر دروازے پر دو فرشتے پہرہ دے رہے ہوں گے۔''

البتہ کفار و منافقین کو مدینہ کی رہائش اختیار کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ مدینہ میں اس وقت تین جھٹکے لگیں گے اور ایسے لوگ مدینہ سے نکل کر دجال کے قبضے میں آ جائیں گے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((يَجِيْءُ الدَّجَّالُ حَتّٰى يَنْزِلَ فِيْ نَاحِيَةِ الْمَدِيْنَةِ ثُمَّ تَرْجُفُ الْمَدِيْنَةُ ثَلَاثَ رَجَفَاتٍ فَيَخْرُجُ اِلَيْهِ كُلُّ مُنَافِقٍ))(ایضا، ح:۷۱۲۴)

''دجال مدینہ کی ایک جانب پڑاؤ ڈالے گا پھر مدینہ میں تین جھٹکے آئیں گے کہ ہر منافق اس کی طرف نکل جائے گا۔''

دجال کے فتنہ سے بچنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کا سامنا نہ کیا جائے۔ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ سَمِعَ بِالدَّجَّالِ فَلْيَنْأَ عَنْهُ فَوَاللّٰهِ اِنَّ الرَّجُلَ لَيَأْتِيْهِ وَهُوَيَحْسَبُ اَنَّهُ مُؤْمِنٌ فَيَتَّبِعُهُ مِمَّا يُبْعَثُ بِهِ مِنَ الشُّبُهَاتِ ......))

(ابوداؤد، الملاحم ، خروج الدجال، ح:۴۳۱۹)

''جو شخص دجال کی خبر سنے وہ اس کے سامنے نہ آئے، اللہ کی قسم! جب آدمی اس کے پاس آئے گا تو اپنے آپ کو مومن سمجھتا ہوگا مگر جو شبے کی چیزیں دجال دے کر بھیجا گیا ہوگا انہیں دیکھ کر وہ اس کی پیروی کرنے لگے گا۔''

دجال پر وہ لوگ غالب آئیں گے جو اُس کے خلاف مسلح جہاد کریں گے۔

(مسلم ، الفتن ، مایکون من فتوحات المسلمین قبل الدجال، ح:۲۹۰۰)

دجال کے خلاف ہونے والا معرکہ اہل حق کا آخری معرکہ ہوگا۔

(ابوداؤد، الجهاد، فی دوام الجهاد، ح:۲۴۸۴)

موسیقی روح کا روگ یا غذا؟

سوال لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ موسیقی روح کی غذا ہے! کیا یہ بات صحیح ہے؟

جواب موسیقی روح کے لیے غذا نہیں بلکہ نقصان دہ ہے۔ اگر کسی چیز سے انسان کو لطف حاصل ہو تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ چیز واقعتاً انسان کے لیے مفید بھی ہے جیسے شراب اور دیگر منشیات سے انسان کو وقتی طور پر سرور حاصل ہوتا ہے مگر یہ چیزیں انسان کے لیے نقصان دہ ہیں۔ موسیقی کے نقصانات تو واضح ہیں۔ موسیقی میں انہماک انسان کو احکامِ الٰہی سے غافل کر دیتا ہے۔ عربی زبان میں آلاتِ موسیقی کو ''ملاھی'' یعنی غفلت میں ڈالنے والی چیزیں کہا جاتا ہے، مشاہدہ بھی یہی ہے کہ گانے بجانے کے رسیا لوگ اکثر دینی فرائض سے غافل رہتے ہیں، موسیقی گناہ کی طرف میلان پیدا ہوتا ہے۔ گانے بجانے کی وجہ سے انسان کی غیرت پر بھی حرف آتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں مقبول گانے وہی ہوتے ہیں جن میں شہوانی جذبات کو خوب بھڑکایا گیا ہو، جس کی وجہ سے بدکاری بھی پھیلتی ہے۔ فحش گانوں کی آواز مسلسل کانوں میں پڑنے کی وجہ سے نئی نسل میں جنسی شعور وقت سے بہت پہلے بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں جو مشاہدے سے تعلق رکھتی ہیں، ان کا انکار ممکن نہیں۔ جس چیز کے نقصانات ہی نقصانات ہوں اسے ایک عقلمند آدمی کیونکر کہہ سکتا ہے کہ وہ روح کی غذا ہے!

مزید برآں جسے قرآن نے لَهْوَ الْحَدِيثِ (غافل کر دینے والی چیز) کہا ہو وہ روح کی غذا کیسے ہو سکتی ہے! سورۃ لقمٰن (آیت ۶) میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ﴾

''اور بعض لوگ ایسے ہیں جو غافل کرنے والی چیزیں خریدتے ہیں تاکہ بے علمی کے ساتھ اللہ کی راہ سے (لوگوں کو) گمراہ کریں اور اسے مذاق بنائیں، یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے رُسواکن عذاب ہے۔''

مذکورہ بالا آیت میں لَهْوَ الْحَدِيثِ سے مراد موسیقی ہے جیسا کہ عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اور دیگر کئی مشہور مفسرین نے بیان کیا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ۳/۴۸۶)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَيَكُونَنَّ مِنْ أُمَّتِي أَقْوَامٌ يَسْتَحِلُّونَ الْحِرَ وَ الْحَرِيرَ وَالْخَمْرَ وَالْمَعَازِفَ)) (بخاری ، الاشربة ، ما جاء فیمن یستحل ..... ح:۵۵۹۰)

''میری امت میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو زنا، ریشم، شراب اور آلاتِ موسیقی حلال ٹھہرائیں گے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ گانے بجانے کے آلات کا استعمال حرام ہے۔ بعض احادیث میں الكُوبة (طبلہ، ڈھول) (ابوداؤد، الاشربة، فی الاوعیة، ح:۳۶۹۶) اور القنين (سارنگی) (مسند احمد ۲/۱۷۲، و فیه ابن لهيعة) کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔

گناہانِ کبیرہ

گناہوں کی صغائر و کبائر میں تقسیم

سوال کبیرہ گناہوں کے بارے میں چند سوالات کے بارے میں راہنمائی مطلوب ہے۔کیا یہ بات درست ہے کہ بعض گناہ کبیرہ ہوتے ہیں اور بعض صغیرہ؟ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہر گناہ کبیرہ ہوتا ہے!

جواب کتاب وسنت کی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ کبیرہ بھی ہوتے ہیں اور صغیرہ بھی۔صغیرہ گناہ کا انکار قرآن وحدیث کی تعلیمات کے منافی ہے۔گناہوں کی کبائر و صغائر میں تقسیم قرآن مجید کی آیات سے ثابت ہے۔

① ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِن تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُم مُّدْخَلًا كَرِيمًا ۝﴾ (۴/النساء:۳۱)

''اگر تم ان بڑے گناہوں سے بچتے رہو گے جن سے تمہیں منع کیا جاتا ہے تو ہم تمہارے چھوٹے گناہ دور کر دیں گے اور عزت و بزرگی کی جگہ داخل کریں گے۔''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کبائر اور سیئات (صغیرہ گناہوں) میں فرق ہے۔

② اللہ تعالیٰ نے ان نیک لوگوں کو اچھا بدلہ دینے کا اعلان کیا ہے جن کی صفت اس آیت میں بیان کی گئی ہے:

﴿الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا اللَّمَمَ﴾ (۵۳/النجم:۳۲)

''جو لوگ کبیرہ گناہوں سے بچتے ہیں اور بے حیائی سے بھی سوائے کسی چھوٹے سے گناہ کے۔''

اللمم سے مراد صغیرہ گناہ ہیں۔(زبدة التفسير من فتح القدير)

③ کبیرہ گناہوں سے بچنا اہل ایمان کی ایک صفت ہے،ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ ۝﴾ (۴۲/الشوریٰ:۳۷)

''اور جو کبیرہ گناہوں سے اور بے حیائی سے بچتے ہیں اور غصے کے وقت بھی

معاف کردیتے ہیں۔"

ان آیات میں کبائر ، کبائر الاثم والفواحش ، سیئات اور اللمم کے الفاظ سے گناہوں کا صغیرہ اور کبیرہ میں تقسیم ہونا واضح ہوتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے بھی بعض گناہوں کو موبقات (مہلک) اور کبائر قرار دیا ہے۔ایسی احادیث، جن میں کبائر وغیرہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، بکثرت ہیں۔ چند احادیث درج ذیل ہیں:

① ارشادِ نبوی ہے:

((اَلصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ وَالْجُمُعَةُ إِلَى الْجُمُعَةِ وَرَمَضَانُ إِلَى رَمَضَانَ مُكَفِّرَاتٌ مَابَيْنَهُنَّ إِذَا اجْتُنِبَ الْكَبَائِرَ))

(مسلم، الطهارة، الصلوات الخمس و الجمعة......، ح:۲۳۳)

"پانچوں نمازیں، جمعہ آئندہ جمعہ تک اور رمضان اگلے رمضان تک درمیان میں ہونے والے گناہوں کا کفارہ ہیں بشرطیکہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کیا جائے۔"

② ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اِجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوْبِقَاتِ))

"ان گناہوں سے بچو جو ہلاک کردینے والے ہیں۔"

لوگوں نے پوچھا: اللہ کے رسول! وہ کون سے گناہ ہیں؟ آپ نے فرمایا:

((اَلشِّرْكُ بِاللّٰهِ وَالسِّحْرُ وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَكْلُ الرِّبَا وَأَكْلُ مَالِ الْيَتِيْمِ وَالتَّوَلِّيْ يَوْمَ الزَّحْفِ وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْغَافِلَاتِ))

(بخاری، الوصایا، قول الله تعالیٰ: ﴿ان الذین یاکلون اموال......﴾، ح:۲۷۶۶؛ مسلم ، الایمان، بیان الکبائر ، ح:۸۹؛ابو داوٗد، الوصایا، ما جاء فی التشدید فی اکل مال الیتیم، ح:۲۸۷۴)

"اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادو کرنا، جس کا قتل حرام ہوا سے قتل کرنا، ہاں کسی شرعی وجہ سے اس کا خون حلال ہوگیا تو اور بات ہے، سود کھانا، یتیم کا مال ہڑپ کرجانا، میدانِ جنگ سے کفار سے مقابلے کے وقت راہِ فرار اختیار کرنا اور

یا کدامن مسلمان بھولی بھالی عورتوں پر تہمت لگانا۔"

③ عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ مِنْ اَكْبَرِ الْكَبَائِرِ شَتْمُ الرَّجُلِ وَالِدَيْهِ......))

"آدمی کا اپنے والدین کو سب وشتم کرنا کبیرہ گناہوں میں سے ہے......"

(بخاری ، الادب ، لا یسب الرجل والدیه ، ح:۵۹۷۳؛ مسلم ، الایمان ، الکبائر واکبرھا ، ح:۹۰)

④ عبدالرحمٰن بن ابوبکرہ اپنے والد سے بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: ہم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے تو آپ نے فرمایا:

((اَلَا اُنَبِّئُكُمْ بِاَكْبَرِ الْكَبَائِرِ (ثلاثا): اَلْاِشْرَاكُ بِاللّٰهِ وَعُقُوقُ الْوَالِدَيْنِ وَشَهَادَةُ الزُّوْرِ اَلَا وَقَوْلُ الزُّوْرِ))

(ایضاً، عقوق الوالدین ...... ، ح:۵۹۷۶؛ مسلم ، ح:۸۷)

"کیا میں تمہیں سب سے بڑے گناہوں کے بارے میں نہ بتاؤں؟ (تین بار فرمایا) اللہ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کو تنگ کرنا اور جھوٹی گواہی دینا اور جھوٹ بولنا۔"

⑤ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا:

ای الذنب اعظم عندالله؟

"اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟"

آپ نے فرمایا:

((اَنْ تَجْعَلَ لِلّٰهِ نِدًّا وَهُوَ خَلَقَكَ))

"یہ کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو برابر ٹھہراؤ حالانکہ اسی نے تجھے پیدا کیا ہے۔"

میں نے عرض کیا: یہ تو واقعی سب سے بڑا گناہ ہے۔ اس کے بعد کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

((وَاَنْ تَقْتُلَ وَلَدَكَ تَخَافُ اَنْ يَّطْعَمَ مَعَكَ))

"یہ کہ تم اپنی اولاد کو اس خوف سے مار ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گی۔"

میں نے پوچھا کہ پھر اس کے بعد؟ فرمایا:

((اَنْ تُزَانِیَ بِحَلِیْلَةِ جَارِكَ))

''یہ کہ تم اپنے پڑوسی کی عورت سے زنا کرو۔''

(بخاری، التفسیر، قوله تعالیٰ: ﴿فلا تجعلوا لله اندادا وانتم تعلمون﴾، ح:۴۴۷۷)

⑥ خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی ﷺ نے فرمایا:

لوگو! سن لو، اللہ کے ولی صرف نمازی ہی ہیں جو پانچوں وقت کی فرض نمازوں کو باقاعدہ بجالاتے ہیں، جو ثواب حاصل کرنے کی نیت سے رمضان کے روزے رکھتے ہیں اور فرض جان کر خوشی سے زکوۃ ادا کرتے ہیں اور ان تمام کبیرہ گناہوں سے دُور رہتے ہیں جن سے اللہ نے روک دیا ہے۔

ایک شخص نے پوچھا: اللہ کے رسول! وہ کبیرہ گناہ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا:

شرک، قتل، میدان جنگ سے بھاگنا، یتیم کا مال کھانا، سُود خوری، پاکدامنوں پر تہمت لگانا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، بیت اللہ الحرام کی، جو زندگی اور موت میں تمہارا قبلہ ہے، حرمت کو توڑنا۔ سنو! جو شخص مرتے دم تک ان بڑے گناہوں سے اجتناب کرتا رہے اور نماز و زکوۃ کی پابندی کرتا رہے، وہ نبی (ﷺ) کے ساتھ جنت میں سونے کے محلات میں ہوگا۔

(حاکم ۱/ ۵۹؛ ابوداؤد، الوصایا، ماجاء فی التشدید فی اکل مال الیتیم، ح:۲۸۷۵)

⑦ ارشاد نبوی ہے کہ جو اللہ کا بندہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے، نماز قائم رکھے، زکوۃ ادا کرے، رمضان کے روزے رکھے اور کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرے، وہ جنتی ہے۔ ایک شخص نے پوچھا: کبائر کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا:

اللہ کے ساتھ شرک کرنا، مسلمان کو قتل کرنا، جنگ والے دن راہِ فرار اختیار کرنا۔

(مسنداحمد ۵/ ۴۱۳،۴۱۴؛ نسائی، تحریم الدم، ذکر الکبائر، ح:۴۰۰۹)

مذکورہ بالا احادیث اور محدثین کی تبویب سے معلوم ہوا کہ بعض گناہ کبیرہ ہوتے ہیں۔

کتاب وسنت کے دلائل کی روشنی میں حافظ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

کتاب وسنت، صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین کے اجماع سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صغیرہ اور کبیرہ دونوں ہی قسم کے گناہ ہوتے ہیں۔

(معاشرہ کی مہلک بیماریاں اوران کا علاج از شیخ احمد بن حجرص:۳۱، ط:۱، ۱۹۸۵ء، بمبئی)

مفسرین نے بھی آیات واحادیث کی روشنی میں گناہوں کو کبائر وصغائر میں تقسیم کیا ہے۔
مفتی محمد شفیع صاحب سورۃ النساء کی آیت ۳۱ ﴿ إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ ...... ﴾ کے معارف ومسائل کے تحت ''گناہوں کی دوقسمیں'' کا عنوان قائم کرتے ہیں اور پھر لکھتے ہیں:

آیت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ گناہوں کی دوقسمیں ہیں۔ کچھ کبیرہ یعنی بڑے گناہ اور کچھ صغیرہ یعنی چھوٹے گناہ، اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگر کوئی شخص ہمت کر کے کبیرہ گناہوں سے بچ جائے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اس کے صغیرہ گناہوں کو وہ خود معاف فرمادیں گے۔
(معارف القرآن ۲/۳۸۳)

ایک عنوان انہوں نے یوں قائم کیا ہے:
گناہ اوراس کی دوقسمیں: صغائر، کبائر۔ (ایضاً ۴/۲۸۲)

سید ابوالاعلیٰ مودودی سورۃ النجم کی آیت ۳۲ ﴿ الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ ﴾ کی تفسیر میں صحابہ وتابعین کی تفسیری روایات بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

بعد کے مفسرین اور ائمہ وفقہاء کی اکثریت اس بات کی قائل ہے کہ یہ آیت اور سورۃ النساء کی آیت ۳۱ صاف طور پر گناہوں کو دوبڑی اقسام پر تقسیم کرتی ہیں، ایک کبائر، دوسرے صغائر...... کبائر اور صغائر کا فرق ایسی چیز ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ جن ذرائع معلومات سے احکام شریعت کا علم حاصل ہوتا ہے وہ سب اس کی نشاندہی کرتے ہیں۔
(تفہیم القرآن ۳/۲۱۲، ۲۱۳)

کبائر کی تقسیم کے اصول ومبادی

سوال کسی گناہ کے بارے میں کیسے پتا چلتا ہے کہ وہ کبیرہ ہے؟ کیا یہ پہچان ضروری ہے؟

جواب کبائر سے چونکہ بچنا ضروری ہے اس لیے ان کی معرفت حاصل کرنا بھی لازمی ہے۔ اس سلسلے میں حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

كان الناس يسئلون رسول الله ﷺ عن الخير وكنت أساله عن

الشر مخافة ان یدرکنی

(بخاری ، الفتن ، الامر اذا لم تکن جماعة ، ح:۷۰۸۴)

''لوگ اللہ کے رسول ﷺ سے خیر کے بارے میں سوال کرتے تھے جبکہ میں شر کے بارے میں آپ سے پوچھتا تاکہ کہیں اس کا مرتکب نہ ہو جاؤں۔''

بقول شاعر ؎

عرفت الشر لا لشر لکن لتوقیه

ومن لم یعرف الخیر من الشر یقع فیه

''میں نے شر کو بری نیت سے نہیں پہچانا بلکہ اس سے بچنے کے لیے پہچانا ہے، جو خیر و شر کا فرق نہیں کر سکتا وہ شر کا مرتکب ہو جاتا ہے۔''

(مختصر کتاب الکبائر از امام ذهبی ، ص:۷(مقدمه)ط:۴، المکتب التعاونی ، ریاض)

کبیرہ گناہوں کی درج ذیل تعریفات بیان کی گئی ہیں:

① کبیرہ گناہ وہ ہے جس کی معرفت نص قرآنی سے ثابت ہو اور جس سے اللہ کے رسول ﷺ منع کر دیں وہ صغیرہ ہے۔

② جن چیزوں کی حرمت پر تمام آسمانی شریعتوں کا اتفاق ہو وہ کبیرہ ہیں اور جو گناہ کسی شریعت میں حرام اور کسی میں حرام نہ ہوں وہ صغیرہ ہیں۔ (معاشرہ کی مہلک بیماریاں، ص:۳۳)

③ جن کے ارتکاب سے معرفت الٰہی کا دروازہ بند ہو جائے۔

④ جن کے ارتکاب سے مال و جان کا تحفظ ختم ہو جائے۔

⑤ کبائر صغائر کے لحاظ سے ہیں۔

⑥ ہمیں ان کا علم نہیں وہ لیلۃ القدر کی طرح مخفی ہیں۔

⑦ جس کے ارتکاب پر حد کا نفاذ ہوتا ہے یا دوزخ کی وعید آئی ہے یا اسے لعنت یا غضب الٰہی کا سبب قرار دیا ہے۔

(شرح عقیدہ طحاویہ از علامہ ابن عبدالعز الحنفی (ترجمہ: مولانا محمد صادق خلیل رحمہ اللہ) ص:۲۷۱، ضیاء السنہ، فیصل آباد)

⑧ اگر غلطی غیر معمولی ہو مثلاً کسی کی حق تلفی (حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد)، اللہ تعالیٰ کے

احکام کی نافرنی یا ان تعلقات کو توڑنے یا خراب کرنے کی شکل میں ہوں جن پر انسانی زندگی کا امن اور قرار منحصر ہے تو یہ کبیرہ گناہ ہیں۔ (کبیرہ گناہوں کی حقیقت، ص:۱۳)

⑨ کبیرہ گناہ وہ ہے کہ جس گناہ پر وعید آئی ہے جیسے قتلِ ناحق، زنا اور چوری کرنا وغیرہ۔ (مواھب الرحمٰن ۱۹/۲)

ان تعریفات پر تبصرہ اور صحیح تعریف (definition)

ان تعریفات میں سے بعض تو کلیۃً غلط ہیں اور بعض جزوی طور پر غیر صحیح ہیں۔ پہلی تعریف اس لیے غلط ہے کہ بہت سی احادیث میں بعض گناہوں کو کبائر کہا گیا ہے اور ان پر کوئی اختلاف نہیں۔ دیگر تعریفات پر تبصرہ کرتے ہوئے شارح عقیدہ طحاویہ لکھتے ہیں:

یہ قول (کہ جس کی حرمت پر تمام شرائع کا اتفاق ہے) اس کا تقاضا یہ ہے کہ شراب نوشی، میدانِ جہاد سے بھاگنا، بعض محرمات سے نکاح کرنا ان سب کو کبائر کی فہرست سے خارج کر دیا جائے اور یتیم کے مال سے ایک دانہ چوری کرنا، ہلکا سا جھوٹ بولنا وغیرہ کبائر کی فہرست میں داخل ہو جائیں حالانکہ یہ درست نہیں اور جس شخص نے کبائر کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ جس سے معرفت باللہ کا دروازہ بند ہو جائے یا مال اور جان ضائع ہو جائے اس کی بات کا مطلب یہ ہوگا کہ شراب نوشی، خنزیر، مردار اور خون کھانا اور پاکدامن عورتوں کو متہم کرنا کبائر میں شمار نہ ہوں۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے اور جس شخص نے کہا کہ انہیں اضافی لحاظ سے کبائر کہا ہے یا جس کام سے اللہ نے روکا ہے وہ کبیرہ ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گناہوں کو صغائر، کبائر میں تقسیم نہ کیا جائے حالانکہ یہ غلط ہے، اس لیے کہ یہ بات ان نصوص کے خلاف ہے جو گناہوں کو صغائر، کبائر دو قسموں میں تقسیم کرتی ہیں اور یہ قول کہ کبائر کا علم ہی نہیں ہے یا کبائر مبہم ہیں، یہ درست نہیں، وہ اپنے عدمِ علم کی بنا پر حقیقت کا انکار نہیں کر سکتے۔ (شرح عقیدہ طحاویہ، ص:۴۷۲)

حد، جہنم کی وعید اور لعنت وغضبِ الٰہی کا تذکرہ جس تعریف میں کیا گیا ہے اس کے بارے میں موصوف لکھتے ہیں:

یہ قول مناسب معلوم ہوتا ہے۔ آگے چل کر اس تعریف کی وجوہِ ترجیح بیان کرتے ہوئے

لکھتے ہیں:

یہ ایسا قاعدہ ہے جو اُن تمام اعتراضات سے بالکل محفوظ ہے جو اُس کے غیر پر ہو رہے ہیں۔اس قاعدہ میں ہر وہ گناہ داخل ہے جس کا کبیرہ ہونا نص کے ساتھ ثابت ہے جیسے شرک قتل، زنا، جادو، پاک دامن بھولی بھالی مومن عورتوں کو متہم کرنا، اس طرح اور گناہ بھی ہیں جیسے میدانِ جنگ سے بھاگنا، یتیم کے مال کو کھانا، سُود کھانا، والدین کی نافرمانی کرنا، جھوٹی قسم اٹھانا، جھوٹی گواہی دینا وغیرہ۔اس قول کے راجح ہونے کے کچھ اسباب ہیں، ایک سبب تو یہ ہے کہ یہ سلف صالحین، ابن عباس، ابن عیینہ، ابن حنبل وغیرھم سے منقول ہے، دوسرا سبب ارشادِ خداوندی ہے:

﴿إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُدْخَلًا كَرِيمًا﴾ (۴/النساء:۳۱)

''تم بڑے بڑے گناہوں سے، جن سے تمہیں منع کیا جاتا ہے، اجتناب رکھو گے تو ہم تمہارے (چھوٹے چھوٹے) گناہ معاف کر دیں گے اور تمہیں عزت کے مکانوں میں داخل کریں گے۔''

اس کریمانہ وعدہ کا وہ انسان حقدار نہیں جسے اللہ کے غضب اور لعنت کی دھمکی دی گئی ہے، اسی طرح جو شخص اس قابل ہے کہ اس پر حدِ شرعی قائم کی جائے۔صرف کبائر گناہوں سے احتراز کرنا اس کی برائیوں کا کفارہ نہ ہوگا۔تیسرا سبب یہ ہے کہ اس قاعدے کا تعلق ان گناہوں کے ساتھ ہے جن کا ذکر کتاب اللہ اور سنت میں ہے ان گناہوں پر حد کا نفاذ شارع سے معلوم ہو رہا ہے۔چوتھا سبب بیان کردہ قاعدہ سے کبائر اور صغائر میں فرق ممکن ہے دیگر اقوال سے فرق ممکن نہیں۔(ایضاً ص:۴۷۱۔۴۷۲)

علامہ ابن عبدالعزحنفی کے علاوہ بھی بہت سے علماء اور مفسرین نے اسی قاعدہ کو ترجیح دی ہے اور اسی کی تحسین کی ہے۔نیز اس پر کچھ اضافے بھی کیے ہیں۔عبدالرحمٰن صالح محمود لکھتے ہیں:

ہر وہ معصیت کبیرہ گناہ ہے جس پر دنیا میں حد اور عذابِ آخرت کی وعید ہو۔شیخ الاسلام

(امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ) نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے:
یا جس پر ایمان کی نفی کی گئی ہو یا جس کے ارتکاب پر لعنت کی گئی ہو یا اس طرح کے گناہ۔ ابن نحاس دمشقی نے اس پر یہ اضافہ کیا:
جس پر عذابِ جہنم کی وعید ہو یا جس کے مرتکب کو قرآن وحدیث میں فاسق کہا گیا ہو۔
(المحرمات و المنهيات ، ص:٦٣، المكتب التعاوني للدعوة والارشاد، حي المنار، رياض)
جس گناہ کی بابت یہ ذکر ہو کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی طرف دیکھے گا بھی نہیں یا اس سے کلام نہ کرے گا یا اس پر غصے ہوگا وہ بھی کبیرہ گناہ ہے۔ (تیسیر القرآن ۱/ ۳۷۴)
امام نووی نے جس تعریف کو ترجیح دی ہے وہ یہ ہے:
ہر وہ معصیت کبیرہ گناہ ہے جس پر حد لاگو ہوتی ہو یا جس پر جہنم کی وعید یا لعنت وغضب ہو۔ یہ تعریف ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔
(شرح مسلم للنووی ۲/ ۸۵ المطبة المصرية)
شیخ احمد بن حجر لکھتے ہیں:
زیادہ جامع اور مستحسن تعریف یہ ہے کہ کبیرہ وہ گناہ ہے جس پر کوئی حد، سخت وعید، اللہ کی لعنت یا اس کے غضب کا اظہار ہو۔ (معاشرہ کی مہلک بیماریاں، ص:۳۳)
شیخ عبدالرحمٰن بن ناصر سعدی اپنی تفسیر میں ﴿إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ﴾ کے بارے میں لکھتے ہیں: کبائر سے اجتناب میں فرائض کی ادائیگی بھی شامل ہے کیونکہ ان فرائض جیسے نمازِ پنجگانہ، نمازِ جمعہ اور صیامِ رمضان کا تارک کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ آگے لکھتے ہیں: کبیرہ گناہوں کی تعریفات یا اس کے مرتکب سے ایمان کی نفی کی گئی ہو یا اس پر لعنت مترتب ہوتی ہو یا غضب۔
(تيسير الكريم الرحمن في تفسير كلام المنان ٢/٢٧، ط:١٣٩٨، موسسة مكة، مكه مكرمه)
حد اور وعید والی تعریف کے بارے میں سید امیر علی لکھتے ہیں:
یہ تفسیر کبیرہ کی پسندیدہ تعریف ہے۔ (مواہب الرحمٰن ۲/۲۰)
مفتی محمد شفیع لکھتے ہیں:
کبیرہ گناہ کی تعریف قرآن وحدیث اور اقوالِ سلف کی تشریحات کے ماتحت یہ ہے کہ

جس گناہ پر قرآن میں کوئی شرعی حد یعنی سزا دنیا میں مقرر کی گئی ہے یا جس پر لعنت کے الفاظ وارد ہوئے ہیں، یا جس پر جہنم وغیرہ کی وعید آئی ہے وہ سب گناہ کبیرہ ہیں، اسی طرح ہر وہ گناہ بھی کبیرہ میں داخل ہوگا جس کے مفاسد اور نتائجِ بد کسی کبیرہ گناہ کے برابر یا اس سے زائد ہوں، اسی طرح جو گناہ جرأت اور بے باکی کے ساتھ کیا جائے یا جس پر مداومت کی جائے تو وہ بھی کبیرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ (معارف القرآن ۲/۳۸۵)

ایسی ہی تعریف کو سید مودودی نے ترجیح دی ہے، لکھتے ہیں:

اس معاملہ میں جس بات پر ہمارا اطمینان ہے وہ یہ ہے کہ ''ہر وہ فعل گناہ کبیرہ ہے جسے کتاب وسنت کی کسی نص نے حرام قرار دیا ہو یا اس کے لیے اللہ اور اس کے رسول نے دنیا میں کوئی سزا مقرر کی ہو یا اس پر آخرت میں عذاب کی وعید سنائی ہو یا اس کے مرتکب پر لعنت کی ہو یا اس کے مرتکبین پر نزولِ عذاب کی خبر دی ہو۔'' (تفہیم القرآن ۵/۲۱۳)

مرتکب کبیرہ اور خلود فی النار؟

سوال کیا کبیرہ گناہوں کے مرتکب ہمیشہ یا عارضی طور پر جہنم میں رہیں گے؟ کیونکہ کبیرہ گناہ کرنے والے بعض لوگوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے؟

جواب کفر وشرک کے علاوہ کسی بھی کبیرہ گناہ کا مرتکب مومن ابدی جہنمی نہیں ہے۔

امام طحاوی رحمہ اللہ (م ۳۲۱ھ) لکھتے ہیں:

واهل الكبائر من امة محمدﷺ في النار لا يخلدون اذا ماتوا وهم موحدون وان لم يكونوا تائبين بعد ان لقوا الله عارفين وهم في مشيئته وحكمه

''امت محمد ﷺ کے وہ لوگ جو کبائر کے مرتکب ہیں وہ دوزخ میں جائیں گے لیکن اس میں ہمیشہ نہیں رہیں گے جب وہ توحید پر فوت ہوئے اور کبائر گناہوں سے تائب بھی نہیں ہوئے البتہ جب ان کی ملاقات اللہ سے ہوئی (یعنی جب وہ فوت ہوئے) تو وہ اللہ کی معرفت رکھتے تھے، ایسے لوگ اللہ کی مشیت میں ہیں۔''

(شرح عقيدة طحاوية، ص: ۴۶۹، ۴۷۰)

مشیت کا ذکر درج ذیل آیات میں ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا﴾ (۴/النساء:۴۸)

''یقیناً اللہ اپنے ساتھ شریک کیے جانے کو نہیں بخشتا اور اس کے سوا جسے چاہے بخش دیتا ہے اور جو اللہ کے ساتھ شریک مقرر کرے اس نے بہت بڑا گناہ اور بہتان باندھا۔''

دوسری آیت میں فرمایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا﴾ (ایضا:۱۱۶)

''اسے اللہ قطعاً نہ بخشے گا کہ اس کے ساتھ شریک مقرر کیا جائے، ہاں شرک کے علاوہ گناہ جس کے چاہے معاف کر دیتا ہے اور اللہ کے ساتھ شریک کرنے والا بہت دُور کی گمراہی میں جا پڑا۔''

اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء (سعودی عرب) کے فتاوی میں بھی یہی موقف کتاب وسنت کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے، شیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ قرآنی الفاظ ﴿وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ﴾ کے بارے میں فرماتے ہیں:

یہ فرمانِ الٰہی اس مومن کے بارے میں ہے جو شرک کے علاوہ گناہوں کا مرتکب ہونے کی حالت میں فوت ہو جبکہ اس نے توبہ نہ کی ہو، اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے، چاہے اسے معاف کر دے اور اگر اس کی مشیت ہو تو اسے عذاب دے، اور اگر اسے سزا بھی دی جائے گی تو کفار کی طرح اسے دائمی طور پر جہنم میں نہیں رکھا جائے گا جیسا کہ خوارج، معتزلہ یا ان کی ڈگر پر چلنے والے کہتے ہیں، بلکہ (گناہوں کی سزا پا کر) پاک وصاف ہو کر لازمی طور پر وہ دوزخ سے نکلے گا۔ جس کا ثبوت اللہ کے رسول ﷺ کی متواتر احادیث ہیں اور اس پر اسلافِ امت کا اجماع ہے۔ (شبهات وأشكالات حول بعض الاحاديث والآيات، ص:٦٦، ط:۱۴۲۲/۱ھ/۲۰۰۱ء، دارالشبات، ریاض)

جب تک ایک شخص مومن رہتا ہے اور دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہوتا وہ اگرچہ کبائر کا مرتکب ہو وہ اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر جنت میں داخل ہو جائے گا کیونکہ اہلِ ایمان سے اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ (۹/التوبۃ:۷۲)

''ان ایمان دار مردوں اور عورتوں سے اللہ نے اُن جنتوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں اور ان عمدہ پاکیزہ محلات کا، جو اُن ہمیشگی والی جنتوں میں ہیں، اور اللہ کی رضا مندی سب سے بڑی چیز ہے، یہی زبردست کامیابی ہے۔''

اسی طرح قرآن مجید میں ہے:

﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ﴾ (۹۹/الزلزال:۷)

''جو ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا۔''

اور ایمان چونکہ عمل خیر ہے جب تک وہ باقی ہے اس کی جزا بھی باقی ہے اگرچہ مومن معاصی کا مرتکب ہو۔ اس لیے مومن مخلد فی النار (دائمی جہنمی) نہیں۔

(اسی طرح دیکھیں درج ذیل آیات: ۲۱/الانبیاء:۴۷؛ ۷/الاعراف:۸۔۹؛ ۳/آل عمرٰن:۳۰؛ ۲/البقرۃ:۲۸۱)

بہت سی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ گار اہلِ ایمان کو بالآخر جہنم سے ان کے ایمان کی وجہ سے نکال لیا جائے گا۔ طوالت سے بچتے ہوئے صرف ایک حدیث ذکر کی جاتی ہے:

ارشادِ نبوی ہے کہ جب اہلِ جنت جنت میں اور اہلِ جہنم جہنم میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا:

((مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ إِيْمَانٍ فَاَخْرِجُوْهُ فَيُخْرَجُوْنَ))

(بخاری، الرقاق، صفۃ الجنۃ والنار، ح: ۶۵۶۰، الایمان، تفاضل اھل الایمان فی الاعمال، ح: ۲۲)

''جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو تو اسے (دوزخ سے) نکال لو تو وہ (فرشتے) انہیں نکال لیں گے۔''

کبائر کے ارتکاب کے باوجود بھی اہلِ ایمان کو قرآن و حدیث میں مومن ہی کہا گیا ہے۔ مثلاً مسلمانوں کی وہ جماعتیں جو باہم برسرِ پیکار ہو جائیں قرآن کریم نے ان کے اس جرم کے باوجود ان کا تذکرہ مومن کہہ کر کیا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سورۃ الحجرات (آیت: ۹) ﴿وَإِن طَآئِفَتَانِ مِنَ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ ٱقۡتَتَلُواْ فَأَصۡلِحُواْ بَيۡنَهُمَا﴾ سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اللہ نے انہیں مومن ہی کہا ہے۔

(بخاری، الایمان، ﴿وَإِن طَآئِفَتَانِ مِنَ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ ....﴾)

اسی طرح حدیث میں ہے:

((اِذَا الْتَقَى الْمُسْلِمَانِ بِسَيْفَيْهِمَا فَالْقَاتِلُ وَالْمَقْتُولُ فِي النَّارِ))

(ایضاً، ح: ۳۰)

''جب دو مسلمان اپنی اپنی تلواریں لے کر بھڑ جائیں تو قاتل اور مقتول دونوں دوزخی ہیں۔''

حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی کرتے ہوئے فرمایا:

((اِنَّ ابْنِي هٰذَا سَيِّدٌ وَلَعَلَّ اللّٰهَ اَنْ يُّصْلِحَ بِهِ بَيْنَ فِئَتَيْنِ عَظِيْمَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ))

(ایضاً، الصلح، قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم للحسن بن علی: ((اِنَّ ابْنِي هٰذَا سَيِّدٌ ....))، ح: ۲۷۰۴)

''میرا یہ بیٹا سید ہے اور امید ہے کہ اس کے ذریعے اللہ مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں میں صلح کرا دے گا۔''

یہ بڑی جماعتیں جو جمل وصفین میں باہم برسرِ پیکار ہوئیں، انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مومنوں کی دو جماعتیں ہی کہا ہے نہ کہ کفار کی جماعتیں۔ مزید برآں قاتل کو مقتول کے ورثاء کا بھائی کہا گیا ہے:

﴿فَمَنۡ عُفِيَ لَهُۥ مِنۡ أَخِيهِ شَيۡءٞ﴾ (۲/البقرۃ: ۱۷۸)

مسلمان کو قتل کرنا کبیرہ گناہ ہے مگر اس کے باوجود مومنوں کی، جو آپس میں ایک دوسرے کے بھائی ہیں، باہمی اخوت ختم نہیں ہوتی۔

تو جب تک کوئی شخص مومن رہے گا خواہ وہ کبیرہ گناہوں کا مرتکب بھی ہو جائے وہ ابدی جہنمی نہیں ہے، تو جن آیات (۲/البقرۃ:۸۱؛ ۴/النساء:۱۴،۹۳؛ ۲۵/الفرقان:۶۹؛ ۷۲/الجن:۲۳ وغیرھا) میں خالدون، خالدین، خالدا اور یخلد جیسے الفاظ آئے ہیں انہیں علمائے محققین اور مفسرین نے مشروط قرار دیا ہے۔ مثلاً مومن کے قاتل کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا﴾ (۴/النساء:۹۳)

''اور جو کوئی کسی مومن کو قصداً قتل کر ڈالے، اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اس پر اللہ کا غضب ہے، اسے اللہ نے لعنت کی ہے اور اس کے لیے بڑا عذاب تیار رکھا ہے۔''

آیت کا مطلب یہ ہے: ﴿وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا﴾ لکونہ مومنا کہ جو شخص کسی مومن کو اُس کے مومن ہونے کی وجہ سے قتل کرے وہ مخلد فی النار ہے اور ظاہر ہے کہ کسی مومن کو اس وجہ سے قتل کرنا کہ وہ مومن ہے یہ کفر ہے کیونکہ یہ ایمان سے نفرت اور عداوت کی دلیل ہے اور ایمان سے عداوت و نفرت رکھنا کفر ہے، وجہ اس تاویل کی یہ ہے کہ جب کسی حکم کو کسی مشتق پر مرتب کیا جاتا ہے تو اس مشتق کا مصدر ترتّب حکم کی علت ہوتا ہے یہاں پر قتل مرتب ہو رہا ہے مومن پر جو کہ مشتق ہے پس اس کا مصدر یعنی ایمان قتل کی علت بن جائے گا کہ یہ شخص ایمان کی وجہ سے اسے قتل کر رہا ہے جیسے کہا جائے: ضربت السارق اس کا مطلب یہ ہوتا ہے: ضربت السارق لکونہ سارقا۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا﴾ (۵/المائدۃ:۳۸) اس کا مطلب ہے:

﴿فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا﴾ لکونہما سارقین (مشکلات القرآن (گ) ص:۳۳)

یعنی ان کے چور ہونے کی بنا پر ان کے ہاتھ کاٹے جائیں۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ نے بھی اپنی تفاسیر میں یہی مفہوم اختیار کیا ہے۔

﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا﴾ کی تفسیر میں ان کے الفاظ ہیں:

من حيث انه مؤمن لا يرضى ايمانه یعنی اس لیے مومن کو کوئی قتل کرے وہ اس کے ایمان لانے سے خوش نہیں۔

(تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن، ص:۱۳۸، ط:۱، ۱۴۲۳ھ/۲۰۰۲ء دارالسلام، ریاض)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ مومن کے قاتل کے بارے میں لکھتے ہیں:

وہ ہمیشہ جہنم میں نہ رہے گا بلکہ یہاں خلود سے مراد بہت دیر تک رہنا ہے جیسا کہ متواتر حدیثوں سے ثابت ہے کہ جہنم میں سے وہ بھی نکل آئیں گے جن کے دل میں رائی کے چھوٹے سے چھوٹے دانے برابر بھی ایمان ہوگا۔

مرتکبِ کبیرہ کی توبہ؟

سوال کبیرہ گناہوں کا مرتکب اگر توبہ کرلے تو کیا اس کی توبہ مقبول ہوگی؟

جواب قرآن وحدیث کے صریح دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ سے تمام قسم کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔اس سلسلے کی چند آیات درج ذیل ہیں:

① توبۃ النصوح کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾

(۶۶/التحریم:۸)

”ایمان والو! تم اللہ کے سامنے سچی خالص توبہ کرو۔قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے گناہ دُور کردے اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔جس دن اللہ نبی کو اور ایمان داروں کو، جو اُن کے ساتھ ہیں، رُسوا نہ کرے گا۔اُن کا نور اُن کے سامنے اور اُن کے دائیں دوڑ رہا ہوگا۔یہ دعائیں کرتے ہوں گے: ہمارے رب! ہمیں کامل نور عطا کر اور ہمیں بخش دے

یقیناً تو ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔"

② کبیرہ گناہوں کے مرتکبین کی سزا بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ﴾ (۲۵/الفرقان:۷۰)

"مگر وہ لوگ جو توبہ کریں اور ایمان لائیں اور نیک کام کریں، ایسے لوگوں کے گناہوں کو اللہ نیکیوں سے بدل دیتا ہے، اللہ بہت بخشنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے۔"

③ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ مَغْفِرَةٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ۝ ﴾ (۳/آل عمران:۱۳۵۔۱۳۶)

"جب ان سے کوئی ناشائستہ کام ہو جائے یا کوئی گناہ کر بیٹھیں تو فوراً اللہ کا ذکر اور اپنے گناہوں کے لیے استغفار کرتے ہیں، فی الواقع اللہ کے سوا اور کون گناہوں کو بخش سکتا ہے؟ اور وہ لوگ باوجود علم کے کسی برے کام پر اڑ نہیں جاتے، انہیں کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے اور جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، ان عمل کرنے والوں کا ثواب کیا ہی اچھا ہے۔"

④ گناہ سے توبہ کرنے والے جنت میں داخل ہوں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ ۖ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝ إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئًا ۝ ﴾ (۱۹/مریم:۵۹۔۶۰)

"پھر ان کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوئے کہ انہوں نے نماز ضائع کر دی اور

نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے، تو عنقریب انہیں گمراہی (کی سزا) ملے گی، بجزان کے جوتوبہ کرلیں اور ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ایسے لوگ جنت میں جائیں گے اوران کی ذراسی بھی حق تلفی نہ کی جائے گی۔''

⑤ قاذف کی سزا ۸۰ کوڑے بیان کرنے اور اس کی گواہی کے غیر مقبول ہونے کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾

(۲۴/النور:۵)

''ہاں جولوگ اس کے بعد توبہ اور اصلاح کرلیں تو اللہ بہت بخشنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

⑥ کتمانِ حق کے مجرم جنہیں قرآن میں ملعون کہا گیا ہے، اگر توبہ کرلیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان ہے:

﴿ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴾ (۲/البقرۃ:۱۶۰)

''مگر وہ لوگ جوتوبہ کرلیں، اصلاح کرلیں اور بیان کردیں تو میں ان کی توبہ قبول کرلیتا ہوں اور میں بہت توبہ قبول کرنے والا اور بہت رحم کرنے والا ہوں۔''

⑦ مومن کے قاتل کی سزا جہنم تب ہوگی جب اس نے توبہ نہیں کی ہوگی۔

(تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن،ص:۱۳۸)

مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ نے دلیل میں اصحاب الاخدود کی سزا والی آیت پیش کی ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ ﴾ (۸۵/البروج:۱۰)

''بے شک جن لوگوں نے مسلمان مردوں اور عورتوں کو ستایا پھر توبہ (بھی) نہ کی

تو ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور جلنے کا عذاب ہے۔''

⑧ انسان خواہ کتنا ہی قصور وار کیوں نہ ہو توبہ کی بنیاد پر اس کی فلاح حتمی اور یقینی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَتُوبُوٓا۟ إِلَى ٱللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ ٱلْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ ﴾ (۲۴/النور:۳۱)

''تم سب اللہ کی طرف توبہ کرو مومنو! تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

⑨ توبہ کرنے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَإِنِّى لَغَفَّارٌ لِّمَن تَابَ وَءَامَنَ وَعَمِلَ صَـٰلِحًا ثُمَّ ٱهْتَدَىٰ ۝ ﴾ (۲۰/طٰہٰ:۸۲)

''ہاں بے شک میں انہیں بخش دینے والا ہوں جو توبہ کریں، ایمان لائیں، نیک عمل کریں اور راہِ راست پر بھی رہیں۔''

⑩ تمام گناہوں کی معافی کا وعدہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ قُلْ يَـٰعِبَادِىَ ٱلَّذِينَ أَسْرَفُوا۟ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا۟ مِن رَّحْمَةِ ٱللَّهِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ يَغْفِرُ ٱلذُّنُوبَ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلْغَفُورُ ٱلرَّحِيمُ ۝ ﴾ (۳۹/الزمر:۵۳)

''(میری جانب سے) کہہ دیجیے کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے تم اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہوں کو بخش دیتا ہے، واقعی وہی بڑی بخشش بڑی رحمت والا ہے۔''

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

یہ آیت اپنے عموم کے اعتبار سے ہر گناہ کو شامل ہے، خواہ کفر و شرک ہو خواہ شک و نفاق ہو، خواہ قتل و فسق ہو، خواہ کچھ بھی ہو، جو اللہ کی طرف رجوع کرے، اللہ اس کی طرف مائل ہوگا، جو توبہ کرے اللہ اسے معاف کر دے گا۔ (ابن کثیر ۴/۷۷)

ایک اشکال اور اس کا جواب

بہت سے لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ شرک کرنے والے کو معافی نہیں ملتی، تو واضح رہنا چاہیے یہ بات اس شخص کے بارے میں ہے جو شرک کرتا رہا اور توبہ کے بغیر مر گیا۔ مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن باز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ آیت ﴿ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِۦ وَيَغْفِرُ

مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ (۴/النساء:۱۱۶) اس مشرک کے بارے میں ہے جو توبہ کے بغیر مرا ہو۔ اللہ تعالیٰ اسے معاف نہیں کرے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝﴾ (۵/المائدۃ:۷۲)

''جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرے اس پر اللہ نے جنت کو حرام قرار دے دیا ہے۔ اس کا ٹھکانہ جہنم ہے، ظالموں (مشرکوں) کا کوئی بھی مددگار نہیں۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾ (۶/الانعام:۸۸)

''اگر وہ (انبیاء) بھی شرک کرتے تو ان کے سب اعمال ضائع ہو جاتے۔''

اس مفہوم کی آیات بہت زیادہ ہیں۔

(شبهات و اشکالات حول بعض الاحادیث والآیات، ص:۴۳،۱۳)

احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ گناہ کرنے والا جب توبہ کے آداب و شرائط کے ساتھ توبہ کرتا ہے تو اس کی توبہ قبول ہوتی ہے۔ زانی، شرابی اور چور کے بارے میں حدیث میں ((وَالتَّوْبَةُ مَعْرُوْضَةٌ بَعْدُ)) کے الفاظ سے بتا دیا گیا کہ کبائر کے مرتکبین کے لیے توبہ کا دروازہ بہرحال کھلا ہے۔ (دیکھیے بخاری، المحاربین، اثم الزناۃ، ح:۶۸۱۰)

سو آدمیوں کے قاتل کی توبہ کی قبولیت اور اس کی مغفرت کا تذکرہ احادیث میں موجود ہے۔

(بخاری، الانبیاء باب:۵۴، ح:۳۴۷۰؛ مسلم، التوبۃ، قبول توبۃ القاتل، ح:۲۷۶۶)

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جب بنی اسرائیل میں یہ ہے تو اس امت مرحوم کے لیے قاتل کی توبہ کے دروازے بند کیوں ہوں؟ ہم پر پہلے بہت زیادہ پابندیاں تھیں جن سب سے ہمیں اللہ نے آزاد کر دیا اور رحمۃ للعالمین جیسے سردار انبیاء کو بھیج کر وہ دین ہمیں دیا جو آسانیوں اور راحتوں والا، سیدھا، صاف اور سہل ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ۱/ ۴۳۷)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((يَضْحَكُ اللّٰهُ إِلٰى رَجُلَيْنِ يَقْتُلُ أَحَدُهُمَا الْآخَرَ يَدْخُلَانِ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُ هٰذَا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلُ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَى الْقَاتِلِ فَيُسْلِمُ فَيُسْتَشْهَدُ))

(بخاری، الجهاد، الکافر یقتل المسلم ... ح: ۲۸۲۶؛ مسلم، الأمارة، بیان الرجلین یقتل احدهما الاخر یدخلان الجنة، ح:۱۸۹۰)

''اللہ دو آدمیوں کی طرف دیکھ کر ہنستا ہے، جن میں سے ایک دوسرے کو قتل کرتا ہے، وہ دونوں جنت میں داخل ہوتے ہیں۔ قتل ہونے والا اللہ کے راستے میں لڑتا لڑتا قتل (شہید) ہوجاتا ہے، پھر اللہ قاتل کو بھی توبہ کی توفیق دے دیتا ہے وہ مسلمان ہوکر اللہ کی راہ میں جامِ شہادت نوش کرتا ہے۔''

ایک حدیث میں ہے:

((وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ تَابَ))

(بخاری، الرقاق، مایتقی من فتنة المال، ح: ۶۴۳۶؛ مسلم، الزکوة، لوکان لابن ادم وادیین لابتغی ثالثا، ح: ۱۰۴۹)

''اللہ توبہ کرنے والے کی توبہ قبول کرتا ہے۔''

احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ جس آدمی کو دنیا میں سزا ہوجاتی ہے وہ اس کے گناہ کا کفارہ بن جاتی ہے۔ (بخاری، الحدود، کفارة الحدود، ح:۶۷۸۴)

شارح عقیدہ طحاویہ لکھتے ہیں:

صغائر اور کبائر گناہ توبہ کے بعد یقیناً معاف کردیے جاتے ہیں وہ مشیت کے ساتھ معلق نہیں ہیں۔ (ص:۴۷۳)

اگر کسی کے گناہ دنیا میں مستور رہے تو ایسا شخص اللہ کی مشیت کے ساتھ معلق ہوگا، اللہ تعالیٰ چاہے تو سزا دے یا معاف کرے۔ (بخاری، ح:۶۷۸۴)

البتہ وہ احادیث جن میں یہ آتا ہے کہ قاتل کو مقتول لے کر آئے گا ان کے بارے میں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

یہ بالکل ٹھیک ہیں۔ چونکہ اس میں انسانی حق ہے، وہ توبہ سے ٹل نہیں جاتا۔ بلکہ انسانی

حق تو توبہ ہونے کی صورت میں بھی حقدار کو پہنچانا ضروری ہے۔ جس طرح قتل ہے، اسی طرح چوری ہے، غصب ہے، تہمت ہے اور دوسرے حقوق انسانی ہیں جن کا توبہ سے معاف نہ ہونا اجماعاً ثابت ہے بلکہ توبہ کی صحت کی شرط ہے کہ ان حقوق کو ادا کرے۔ اور جب ادائیگی محال ہے تو قیامت کے روز اس کا مطالبہ ضروری ہے۔ لیکن مطالبہ سے سزا کا واقع ہونا ضروری نہیں۔ ممکن ہے کہ قاتل کے سب اعمال صالحہ مقتول کو دے دیے جائیں یا بعض دے دیے جائیں اور اس کے پاس پھر بھی کچھ رہ جائیں اور یہ بخش دیا جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ قاتل کا مطالبہ اللہ اپنے فضل وکرم سے اپنے پاس سے اور اپنی طرف سے حور وقصور اور بلند درجات جنت دے کر پورا کر دے اور اس کے عوض وہ اپنے قاتل سے درگزر کرنے پر خوش ہو جائے اور قاتل کو اللہ بخش دے۔ (تفسیر ابن کثیر ۱/۴۳۸)

ایک اور اشکال کا جواب

قاتل کی توبہ کے بارے میں ایک اشکال باقی رہ جاتا ہے، وہ یہ کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کے نزدیک قاتل مومن کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ اسے سب زجرو توبیخ پر محمول کیا جائے گا کیونکہ ابن عباس خود یہ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص مومن کو قتل کر دے اس کی توبہ قبول ہو جاتی ہے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے آکر ان سے سوال کیا کہ کیا قاتل مومن کی توبہ قبول ہو جاتی ہے؟ انہوں نے فرمایا: نہیں! اس کے لیے تو صرف جہنم ہے۔ جب وہ شخص چلا گیا تو اہلِ مجلس نے عرض کیا: آپ تو اس طرح کا فتویٰ نہیں دیتے ہیں آپ تو ہم سے یہ فرمایا کرتے تھے کہ قاتل مومن کی توبہ قبول ہو جاتی ہے، آج کیا بات ہوئی (کہ آپ نے فرما دیا اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی، اس کے لیے صرف جہنم ہے؟) ابن عباس نے فرمایا کہ یہ شخص غصہ میں بھرا ہوا تھا، میرا گمان یہ ہے کہ اس کا ارادہ کسی مومن کو قتل کرنے کا تھا (یہ اسی لیے معلوم کرنے آیا تھا کہ اگر قبولیتِ توبہ کی گنجائش نکل آئی تو قتل کرنے کے بعد توبہ کر لوں گا اس لیے میں نے اس سے کہہ دیا کہ قاتل مومن کی توبہ قبول نہیں ہوتی تاکہ یہ قتل سے رُک جائے۔) لوگوں نے کسی شخص کو اس کے پیچھے بھیجا کہ دیکھ کر آئے وہ کہاں جاتا ہے اس کا کیا ارادہ ہے! معلوم ہوا کہ واقعی اس کا ارادہ کسی مومن کو قتل کرنے کا تھا۔

کیا خودکشی کی کوئی جائز صورت بھی ہے؟

سوال کیا بعض حالات میں خودکشی جائز ہے؟

جواب خودکشی کرنا انسان کے بزدل، بے صبر اور ناشکرا ہونے کی نشاندہی کرتا ہے جو کہ کسی بھی مسلمان کے لیے زیبا نہیں ہے۔ دراصل خودکشی کے مرتکب ویسی زندگی نہیں چاہتے جیسی انہیں مل چکی ہوتی ہے لیکن وہ اس بات سے صرفِ نظر کر لیتے ہیں کہ دنیا دارالجزاء نہیں، دارالامتحان ہے۔

خودکشی کی ممانعت میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴾ (۴/النساء:۳۰)

''اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو، بیشک اللہ تم پر بہت رحم کرنے والا ہے۔''

دوسری آیت میں فرمایا:

﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ (۲/البقرۃ:۱۹۵)

''اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو۔''

اس لیے ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ کسی بڑے سے بڑے نقصان اور بڑی سے بڑی مصیبت میں صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((عَجَبًا لِاَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنَّ اَمْرَهٗ كُلَّهٗ لَهٗ خَيْرٌ وَلَيْسَ ذٰلِكَ لِاَحَدٍ اِلَّا لِلْمُؤْمِنِ اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ وَ اِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ)) (مسلم، الزھد، المؤمن امرہ کلہ خیر، ح:۲۹۹۹)

''مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے، اس کا کوئی کام خیر و برکت سے خالی نہیں، اور مومن کے علاوہ کسی اور کو یہ سعادت میسر بھی نہیں۔ اگر اسے کوئی مسرت نصیب ہوتی ہے تو اللہ کا شکر گزار ہوتا ہے، یہ اس کے حق میں خیر کا باعث ہوتا ہے۔''

نیز مصیبت پر صبر کرنے والوں کے بارے میں ارشادِ رب العالمین ہے:

﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ (۳۹/الزمر:۱۰)

''صبر کرنے والوں کو اُن کا اجر بے حساب ملے گا۔''

مزید برآں صبر کرنے والے اللہ کی نوازشات اور رحمتوں کے مستحق نیز ہدایت یافتہ ہیں۔(۲/البقرۃ:۱۵۷)

لہٰذا انسان کو زندگی کی نعمت کی قدر پہچانتے ہوئے اس جرم سے باز رہنا چاہیے۔

البتہ اگر کسی مسلمان کو خطرہ لاحق ہو جائے کہ اسے کفار قید و بند کی صعوبتوں میں ڈال کر مسلمانوں کے راز افشا کروالیں گے تو دریں صورت بعض اہل علم نے اپنی جان تلف کرنے کی اجازت دی ہے۔ان کا استدلال سورۃ البروج میں مذکور اصحاب الاخدود کے واقعہ کا پس منظر بھی ہے۔جس کا ذکر صحیح مسلم میں بھی ہے۔

(نیز دیکھیے شیخ محمد ابن ابراہیم آل شیخ کی تالیف العملیات الاستشھادیۃ فی الاسلام)

خودکشی کی ایک قسم وہ ہے جس میں انسان دماغی بیماری (مثلاً شیزوفرینیا) کی وجہ سے اپنی جان لے لیتا ہے۔ایسے لوگوں پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔اس لیے کہ ان کا ذہن ان کے اختیار میں نہیں ہوتا۔اس قسم کے لوگ شریعت کی نظر میں مرفوع القلم کہلاتے ہیں۔واللہ اعلم۔

مرد و عورت کی جنس مخالف سے مشابہت؟

سوال آج کل اکثر دیکھا جاسکتا ہے کہ بہت سے مرد عورتوں اور بہت سی عورتیں مردوں جیسی حرکات وسکنات اختیار کرتی ہیں۔لڑکیاں لڑکوں کا جبکہ لڑکے لڑکیوں کا روپ دھارے نظر آتے ہیں۔ان میں سے بہت سی عورتیں اور مرد وہ بھی ہیں جو ایک جیسا لباس استعمال کرتے ہیں۔کیا شریعت اس کی اجازت دیتی ہے؟ یا ایسا کرنا گناہ ہے؟ اگر یہ مشابہت گناہ ہے تو اس گناہ کی نوعیت کیا ہے؟ آیا یہ صغیرہ گناہ ہے یا کبیرہ؟

جواب اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت کو علیحدہ علیحدہ ساخت پر پیدا کیا ہے۔مرد و عورت ایک نہیں بلکہ دو اصناف ہیں۔لہٰذا ان دونوں اصناف کو اپنا علیحدہ علیحدہ تشخص قائم رکھنا چاہیے۔ان کی صنفی شناخت کو باقی رکھنا اللہ تعالیٰ کی منشاء ہے، اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے مردوں کو عورتوں اور عورتوں کو مردوں کی مشابہت سے روکا ہے۔ہم اپنے معاشرے میں مردوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ عورتوں کی طرح ریشم کا لباس پہنتے ہیں، سونے کے زیورات استعمال کرتے ہیں، گلے میں زنجیر اور پیروں میں پازیب اور کانوں میں بالیاں وغیرہ ڈال لیتے ہیں،

عورتوں کی طرح لمبے لمبے بال رکھتے ہیں اور داڑھی وغیرہ مونڈھ کر عورتوں جیسی شکل وصورت اختیار کرتے ہیں جبکہ عورتیں مردوں جیسی وضع قطع اختیار کرتی ہیں، مردوں جیسا لباس پہنتی ہیں، مردوں کے جوتوں جیسے جوتے پہنتی ہیں، انہی کی طرح پگڑی یا ٹوپی پہنتی ہیں، بالوں کی ہیئت مردوں جیسی بنا کر بے حجاب گھر سے باہر نکلتی ہیں، شلوار وغیرہ کو ٹخنوں سے اوپر رکھتی ہیں۔

عورتوں کے مردوں اور مردوں کے عورتوں سے مشابہت کرنے کو بعض لوگ معیوب نہیں سمجھتے بلکہ اسے تہذیب وثقافت اور ترقی کا نام دیتے ہیں جبکہ شریعتِ اسلامی میں مردوں کا عورتوں اور عورتوں کا مردوں سے مشابہت کرنا گناہِ کبیرہ ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم ﷺ نے لعنت کی ہے۔ یعنی اس قسم کی حرکتیں کرنے والے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور کر دیے جاتے ہیں، اس سے بڑھ کر اور کیا وعید ہوگی! اس سلسلے میں چند احادیث ملاحظہ کریں:

① ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

لعن النبی ﷺ المخنثین من الرجال والمترجلات من النساء وقال ((اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ))

(بخاری، اللباس، اخراج المتشبهین بالنساء من البیوت، ح:۵۸۸۶)

”نبی ﷺ نے ان مردوں پر لعنت کی جو (بناوٹی طور پر) مخنث بنتے ہیں اور مردوں کی طرح بننے والی عورتوں پر لعنت کی ہے، اور آپ نے فرمایا کہ ان زنانہ بننے والے مردوں کو اپنے گھروں سے نکال دو۔“

② ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں:

لعن رسول اللہ ﷺ المتشبهین من الرجال بالنساء والمتشبهات من النساء بالرجال

(بخاری، اللباس، المتشبهین بالنساء والمتشبهات بالرجال ح: ۵۸۸۵؛ ابوداؤد، اللباس، فی لباس النساء، ح:۴۰۹۷)

”اللہ کے رسول ﷺ نے ان مردوں پر لعنت بھیجی ہے جو عورتوں جیسا چال چلن اختیار کریں اور ان عورتوں پر لعنت بھیجی ہے جو مردوں جیسا چال چلن

اختیار کریں۔"

③ ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

لعن رسول اللہ ﷺ الرجل یلبس لبسة المرأة والمرأة تلبس لبسة الرجل

(ابوداؤد، اللباس، فی لباس النساء، ح: ۴۰۹۸؛ مسند احمد ۲/ ۳۲۵، حاکم ۴/ ۱۹۴؛ ابن حبان: ۵۷۵۱)

"اللہ کے رسول ﷺ نے لعنت کی ہے ایسے مرد پر جو عورت جیسا لباس پہنے اور ایسی عورت پر جو مرد جیسا لباس پہنے۔"

④ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا گیا کہ ایک عورت (مردوں جیسا) جوتا پہنتی ہے (اس کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟) تو وہ فرماتی ہیں:

لعن رسول اللہ الرجلة من النساء (ابوداؤد، ایضاً، ح: ۴۰۹۹)

"اللہ کے رسول ﷺ نے مردوں کی طرح بننے والی عورت پر لعنت کی ہے۔"

⑤ اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے سے ایک عورت کمان لٹکائے ہوئے گزری تو آپ نے فرمایا:

لعن اللہ المتشبهات من النساء بالرجال و المتشبهين من الرجال بالنساء (الطبرانی الاوسط، ح: ۴۰۰۳)

"اللہ نے ان عورتوں پر لعنت کی جو مردوں کی مشابہت اختیار کریں اور ان مردوں پر بھی جو لعنت بھیجی جو عورتوں کی مشابہت اختیار کریں۔"

⑥ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((ثَلَاثَةٌ لَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ: اَلْعَاقُ لِوَالِدَیْهِ وَالدَّیُّوْثُ وَالرَّجِلَةُ مِنَ النِّسَاءِ)) (حاکم ۱/ ۷۲)

"والدین کی نافرمانی کرنے والا، دیوث اور مرد نُما عورت۔"

⑦ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((لَیْسَ مِنَّا مَنْ تَشَبَّهَ مِنَ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ وَلَا مَنْ تَشَبَّهَ مِنَ الرِّجَالِ

بِالنِّسَاءِ))(مسند احمد، ح:٦٨٣٦)

''وہ ہم میں سے نہیں ہیں جو عورتیں مردوں کی اور مرد عورتوں کی مشابہت اختیار کریں۔''

مذکورہ بالا احادیث میں سے پہلی تین احادیث پر شارح مسلم امام نووی رحمہ اللہ نے درج ذیل باب قائم کیا ہے:

تحريم تشبه الرجال بالنساء وتشبه النساء بالرجال، في لباس و حركة و غير ذالك (رياض الصالحين ٢/ ٤٢٦)

''لباس اور حرکت وادا وغیرہ میں مردوں کو عورتوں کی اور عورتوں کو مردوں کی مشابہت اختیار کرنا حرام ہے۔''

لہٰذا جس مسلمان تک اسلامی تعلیمات پہنچ چکی ہوں اسے چاہیے کہ اس لعنتی اور دوزخ میں دھکیلنے والے کام سے اجتناب کرے۔ مسلمان اور مومن ہونے کا یہی تقاضا ہے۔

اسلامی آداب واخلاق

کیا کسی حالت میں اکڑ کر چلنے کی اجازت ہے؟

سوال چال میں میانہ روی سے کیا مراد ہے؟ کیا شریعتِ اسلامی میں کوئی ایسی شکل ہے کہ آدمی کو اکڑ کر چلنے کی اجازت ہو؟

جواب قرآنِ حکیم میں لقمان حکیم کی نصیحت موجود ہے جو انہوں نے اپنے بیٹے سے کی تھی، انہوں نے فرمایا:

﴿ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ ﴾ (۳۱/لقمٰن:۱۹)

''اپنی رفتار میں میانہ روی اختیار کرو۔''

میانہ روی سے مراد یہ ہے کہ نہ تو چال میں مغرور لوگوں جیسی رعونت پائی جائے، نہ سفلی مزاج رکھنے والوں کا چھچھورا پن اور نہ بیماروں جیسی کمزوری کا اظہار ہو بلکہ چال میں وقار اور متانت پائی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا ﴾ (۲۵/الفرقان:۶۳)

''رحمٰن کے (نیک) بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں۔''

اکڑ کر چلنے کی ممانعت ہے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴾ (۱۷/بنی اسراءیل:۳۷)

''اور زمین پر اکڑ کر نہ چل کہ نہ تو تُو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ بلندی میں پہاڑوں کو پہنچ سکتا ہے۔''

لقمان حکیم نے اپنے بیٹے سے فرمایا:

﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴾ (۳۱/لقمٰن:۱۸)

''اور زمین پر اترا کر نہ چل! کسی تکبر کرنے والے شیخی خورے کو اللہ پسند نہیں کرتا۔''

البتہ رمل کو اسلام نے مشروع کیا ہے۔ نبی ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم جب مدینہ سے بیت اللہ کی زیارت کے لیے آئے تو نبی ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا کہ وہ طواف کے ابتدائی تین

چکروں میں رمل کریں یعنی پہلوانوں کی طرح اکڑ اکڑ کر تیز تیز چلیں۔

کفارِ مکہ کا خیال تھا کہ مدینے کی آب و ہوا موافق نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان کمزور ہو چکے ہیں۔لہٰذا وہ ان کے مقابلے کی اب سکت نہیں رکھتے۔ان کی اس غلط فہمی کو مسلمانوں نے رمل سے دُور کیا۔

اسی طرح میدانِ جہاد میں دشمن کو مرعوب کرنے کے لیے اکڑ کر چلنا جائز ہے، جیسے کہ ابودجانہ رضی اللہ عنہ کا عمل ہے، دیگر اوقات میں تواضع اور انکساری سے ہی چلنا چاہیے۔

پیٹ کے بل لیٹ کر سونا؟

سوال بعض لوگوں کو اُلٹا سونے کی عادت ہوتی ہے، کیا اس طرح سونا درست ہے؟

جواب دائیں پہلو پر لیٹنا مسنون ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم بھی یہی ہے۔براء بن عازب فرماتے ہیں: مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جب تُو اپنے سونے کی جگہ پر آئے تو نماز کا سا وضو کر لے، پھر دائیں کروٹ پر لیٹ اور یوں دعا کر:

((اَللّٰهُمَّ اَسْلَمْتُ وَجْهِي إِلَيْكَ وَفَوَّضْتُ أَمْرِي إِلَيْكَ وَأَلْجَأْتُ ظَهْرِيْ إِلَيْكَ رَغْبَةً وَّرَهْبَةً إِلَيْكَ لَامَلْجَأَ وَلَا مَنْجَا مِنْكَ إِلَّا إِلَيْكَ اَللّٰهُمَّ اٰمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِيْ أَنْزَلْتَ وَبِنَبِيِّكَ الَّذِيْ أَرْسَلْتَ))

(بخاری، الوضوء، فضل من بات علی الوضوء، ح: ۲۴۷)

''اللہ! آپ کے ثواب کے شوق میں اور آپ کے عذاب کے ڈر سے مَیں نے اپنے آپ کو آپ کے سپرد کیا اور اپنا کام آپ کو سونپ دیا اور اپنی پشت کو آپ کے حوالے کر دیا، آپ سے بھاگ کر کہیں پناہ اور ٹھکانا نہیں مگر آپ کے ہی پاس۔یا اللہ! مَیں آپ کی کتاب (قرآن) پر ایمان لایا جسے آپ نے اتارا اور آپ کے نبی پر جسے آپ نے بھیجا۔''

ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب سونے لگتے تو اپنا دایاں ہاتھ اپنے رخسار کے نیچے رکھتے اور پھر یہ دعا تین بار پڑھتے:

((اَللّٰھُمَّ قِنِیْ عَذَابَكَ یَوْمَ تَبْعَثُ عِبَادَكَ))

(ابوداوٗد، الادب، ما یقال عند النوم، ح: ۵۰۴۵؛ ترمذی، ح: ۳۳۹۸؛ مسنداحمد، ۵/ ۳۸۲)

''اللہ! مجھے اس دن کے عذاب سے بچالینا جس دن تُو اپنے بندوں کو (اخروی زندگی کے لیے) اٹھائے گا۔''

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جب کوئی تم میں سے اپنے بستر پر جائے تو اپنے تہبند کا ایک کونہ پکڑ کر بستر کو جھاڑے اور بسم اللہ کہے، اس لیے کہ وہ نہیں جانتا کہ اس کے بعد اس کے بستر پر کونسی چیز آئی۔ پھر جب لیٹنے لگے تو دائیں کروٹ پر لیٹے اور کہے:

((سُبْحَانَكَ رَبِّیْ بِكَ وَضَعْتُ جَنْبِیْ وَ بِكَ اَرْفَعُهٗ اِنْ اَمْسَكْتَ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلَهَا وَ اِنْ اَرْسَلْتَهَا فَاحْفَظْهَا بِمَا تَحْفَظُ بِهٖ عِبَادَكَ الصَّالِحِیْنَ))

(مسلم، الذکر و الدعاء و التوبة و الاستغفار، الدعاء عند النوم، ح: ۱۳۲۷)

''پاک ہے تُو میرے رب! تیرا نام لے کر میں کروٹ زمین پر رکھتا ہوں اور تیرے نام سے اٹھاؤں گا۔ اگر تُو میری جان روک لے تو اسے بخش دے اور اگر چھوڑ دے (بدن میں آنے کے لیے) تو اس کی حفاظت کرنا جس سے تُو حفاظت کرتا ہے اپنے نیک بندوں کی۔''

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ انسان کو سوتے وقت دائیں پہلو پر لیٹنا چاہیے۔ چت لیٹنا بھی جائز ہے، چنانچہ حدیثِ نبوی ہے:

((وَلَا تَضَعْ اِحْدٰی رِجْلَیْكَ عَلَی الْاُخْرٰی اِذَا اسْتَلْقَیْتَ))

(مسلم، اللباس و الزینة، النھی عن اشتمال الصماء......، ح: ۲۰۹۹)

''جب تُو چت لیٹتا ہے تو اپنا ایک پاؤں دوسرے پاؤں پر مت رکھ۔''

اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر گھٹنا کھڑا کر کے ایک پاؤں پر دوسرا پاؤں رکھا جائے تو اس سے ستر کھلنے کا خدشہ ہوتا ہے۔ اسی لیے ایسا کرنا منع کیا گیا ہے۔ البتہ اگر ایک پاؤں دوسرے پر اس طرح رکھ لیا جائے کہ ستر کھلنے کا امکان نہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔

پہلو تبدیل بھی کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِذَا رَاٰی اَحَدُکُمْ رُؤْیَا یَکْرَهُهَا فَلْیَبْصُقْ عَنْ یَسَارِهٖ وَ لْیَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ ثَلاثًا وَ یَتَحَوَّلْ عَنْ جَنْبِهِ الَّذِیْ کَانَ عَلَیْهِ))

(ابو داوٗد، الادب، ما جاء فی الرؤیا، ح:۵۰۲۲)

''جب تم میں سے کوئی برا خواب دیکھے تو اپنی بائیں طرف تھوکے اور تین بار شیطان سے اللہ کی پناہ مانگے، اور جس پہلو پر تھا اس سے پھر کر دوسری کروٹ لے لے۔''

ایک حدیث کے مطابق پہلو بدلتے وقت درج ذیل دعا پڑھنا مسنون ہے:

ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو پہلو بدلتے تو یہ کلمات کہتے:

((لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ رَبُّ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا الْعَزِیْزُ الْغَفَّارُ))

(صحیح الجامع ۴/ ۲۱۳؛السنن الکبری للنسائی، عمل الیوم و اللیلة، ح:۱۰۶۳۴)

''اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں وہ اکیلا زبردست ہے۔ آسمانوں، زمین اور ان کے درمیان والی چیزوں کا رب، جو غلبے والا اور بہت بخشنے والا ہے۔''

مذکورہ بالا صورتوں میں سے کوئی بھی صورت اختیار کی جا سکتی ہے مگر الٹا لیٹنا منع ہے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو پیٹ کے بل لیٹے ہوئے دیکھا تو فرمایا:

((اِنَّ هٰذِهٖ ضَجْعَةٌ لَّا یُحِبُّهَا اللّٰهُ))

(ترمذی، الادب، ما جاء فی کراهیة الاضطجاع......، ح:۲۷۶۸)

''لیٹنے کا یہ انداز ایسا ہے کہ اللہ اسے پسند نہیں کرتا۔''

ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس سے گزرے جبکہ میں پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا تو آپ نے مجھے

اپنے پاؤں سے چھوتے ہوئے فرمایا:

((يَا جُنَيْدِبُ إِنَّمَا هٰذِهِ ضَجْعَةُ أَهْلِ النَّارِ))

(ابن ماجة، الادب، النهى عن الاضطجاع ، ح:٣٧٢٣)

”جنیدب! لیٹنے کا یہ انداز جہنمیوں کا ہے۔“

لہٰذا جن لوگوں کو اُلٹا لیٹنے کی عادت ہے انہیں چاہیے کہ اپنی اس عادت کو بدلنے کی کوشش کریں تاکہ اللہ کے رسول ﷺ کی نافرمانی سے بچ سکیں۔ نیز ہمیں چاہیے کہ اپنے بچوں کی تربیت بھی اسی کے مطابق کریں تاکہ بُری عادات بچوں میں منتقل نہ ہوں۔

الٹا جوتا سیدھا کرنا؟

سوال کیا اُلٹے جوتے کو سیدھا کرنے کا حکم شریعتِ محمدی نے دیا ہے؟

جواب الٹے جوتے کو سیدھا کرنا اسے صاف رکھنے کے لیے زیادہ مفید ہے۔ تاہم اسے سیدھا کرنے کا شرعی حکم مجھے معلوم نہیں۔

پیالہ کٹ وغیرہ کی شرعی حیثیت؟

سوال ہمارے معاشرے میں جہاں کئی اور فیشن رواج پا رہے ہیں وہاں بالوں کے کاٹنے کے بارے میں بھی کئی نت نئے رواج جنم لے رہے ہیں، کہ جس کے مطابق کچھ بال کاٹ دیے جاتے ہیں اور بعض چھوڑ دیے جاتے ہیں، مثلاً پیالہ کٹ وغیرہ نیز بچوں کے بال اس انداز سے کاٹے جاتے ہیں کہ چند بالوں کو چھوڑ کر باقی سب بال کاٹ دیے جاتے ہیں، یہ بالوں کی چوٹی کسی بزرگ کے نام پر رکھی جاتی ہے۔ کیا اس طرح کا طرزِ عمل درست ہے؟ خصوصاً بچوں کے بعض بال کاٹنے اور بعض باقی رکھنے کے حوالے سے راہنمائی کریں۔

جواب سر کے کچھ بال منڈوانا اور کچھ چھوڑ دینا عربی زبان میں قزع کہلاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے قزع سے منع کیا ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

نهى رسول الله عن القزع

(بخاري، اللباس، القزع، ح:٥٩٢١؛ مسلم، اللباس، كراهية القزع، ح:٢١٢٠)

”عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

رأى رسول اللهﷺ صبيا قد حلق بعض شعره و ترك بعضه فنهاهم عن ذلك و قال:((احْلِقُوهُ كُلَّهُ أَوِ اتْرُكُوهُ كُلَّهُ))

(ابوداوٗد، الترجل، الذؤابة، ح:۴۱۹۵؛ مسلم، ح:۲۱۲۰)

''اللہ کے رسول ﷺ نے ایک بچے کو دیکھا کہ اس کے سر کے کچھ بال مونڈ ھے ہوئے ہیں اور کچھ چھوڑے ہوئے، تو آپ نے لوگوں کو ایسا کرنے سے منع کر دیا اور فرمایا: اس کے سارے بال مونڈ دو یا سارے چھوڑ دو۔''

اگر کسی نے سر کے چند بال (چوٹی کی صورت میں) لمبے رکھنے کی کسی بزرگ کے لیے نذر مانی ہو تو اور بھی بُرا ہے بلکہ یہ شرک کے زمرے میں آ جائے گا۔ کیونکہ غیر اللہ کے نام کی نذر ماننا شرک ہے۔

ناخن بڑھانے کی شرعی حیثیت

سوال آج کل خواتین میں یہ فیشن عام چل نکلا ہے کہ وہ اپنے ایک ہاتھ کے ناخن لمبے رکھتی ہیں، خاص کر ایک انگلی کا ناخن بڑھا لیتی ہیں۔ شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

جواب اللہ کے رسول ﷺ نے ناخن کاٹنے کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا ناخنوں کو بڑھانا نبی اکرم ﷺ کے حکم کی نافرمانی ہے جو کسی مسلمان کے لیے روا نہیں۔ بعض احادیث میں ناخن کاٹنے کو فطرت میں شمار کیا گیا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

((خَمْسٌ مِّنَ الْفِطْرَةِ: اَلْخِتَانُ وَالْاِسْتِحْدَادُ وَ تَقْلِيمُ الْأَظْفَارِ وَ نَتْفُ الْإِبِطِ وَ قَصُّ الشَّارِبِ)) (مسلم، الطهارة، خصال الفطرة، ح:۲۵۷)

''پانچ چیزیں فطرت میں سے ہیں: ختنہ کرنا، زیرِ ناف بال صاف کرنا، ناخن تراشنا، بغلوں کے بال اکھاڑنا اور مونچھیں کاٹنا۔''

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے دس چیزوں کو فطرت میں سے قرار دیا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے:

((عَشَرَةٌ مِّنَ الْفِطْرَةِ: قَصُّ الشَّارِبِ وَ إِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ وَ السِّوَاكُ وَ اسْتِنْشَاقُ الْمَاءِ وَ قَصُّ الْأَظْفَارِ وَ غَسْلُ الْبَرَاجِمِ وَ نَتْفُ الْإِبِطِ وَ حَلْقُ الْعَانَةِ وَ انْتِقَاصُ الْمَاءِ))(ایضاً،ح:۲۶۱)

”دس چیزیں فطرت میں سے ہیں: مونچھیں کاٹنا، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، ناخن کاٹنا، انگلیوں کے درمیان جوڑوں کا دھونا، بغلوں کے بال اکھاڑنا، زیرِناف بال صاف کرنا اور استنجا کرنا۔“

مصعب بن شیبہ (راوی) بیان کرتے ہیں: دسویں چیز مجھے یاد نہیں رہی، ہوسکتا ہے وہ کلی کرنا ہو۔ (ایضاً)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ناخن بڑھانا فطرت کی خلاف ورزی ہے۔ اگر یہ یہود ونصاریٰ اور دیگر کفار کی نقالی میں کیا جائے تو اور بھی بُرا اور مزید سنگین جُرم ہے، کیونکہ نبی ﷺ نے غیر مسلموں کی مشابہت اختیار کرنے سے منع کیا ہے۔ ناخنوں کو چالیس دن کے اندر اندر تراش لینا چاہیے، اس سے زیادہ تاخیر کرنا نبی اکرم ﷺ کی حکم عدولی ہے۔

سالگرہ منانے کی شرعی حیثیت

سوال لڑکے یا لڑکی کی پیدائش کا دن منانا، اس پر کیک کاٹنا اور کھانا وغیرہ کھلانا جائز ہے یا ناجائز؟ بعض حضرات کہتے ہیں کہ سالگرہ منانے کا تعلق اسلام سے نہیں ہے یہ دنیاداری کا ایک طریقہ ہے جیسے ہم محمد علی جناح وغیرہ کے دن مناتے ہیں۔ اب تو کئی راسخ العقیدہ اور کتاب وسنت کے علمبردار گھرانے بھی سالگرہ منانے میں شامل ہوگئے ہیں۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کردیں تاکہ میری اور باقی حضرات کی اصلاح ہوسکے۔

جواب پیدائش کا دن (سالگرہ) منانا عیسائیوں کا طریقہ ہے۔ وہ Birth Day مناتے ہیں، کیک کاٹنے کی رسم بھی عیسائیوں کی ہے۔ بعض عاقبت نا اندیش مسلمان بھی عیسائیوں کی اندھی تقلید میں سالگرہ منانے لگے ہیں، بلکہ نصرانیوں کے ساتھ مل کر کرسمس کیک بھی کاٹتے ہیں۔ حالانکہ نبی اکرم ﷺ نے نہ صرف یہود ونصاریٰ اور دیگر کافر قوموں کی مشابہت کرنے سے روکا بلکہ ان کی مخالفت کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے:

((مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ))

(ابوداود، اللباس، فی لبس الشھرۃ، ح: ۴۰۳۱)

”جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ انہیں سے ہے۔“

یہ ایک قدرتی امر ہے کہ جب کوئی شخص ظاہری طور پر کسی قوم سے وضع قطع اور چال چلن میں مشابہت اختیار کرتا ہے تو آہستہ آہستہ غیر محسوس انداز میں اس کا باطن بھی انہیں کے رنگ میں رنگا جاتا ہے اور اس کی اپنی شناخت اور پہچان ختم ہو جاتی ہے، اسی لیے ہمیں کفار کی مشابہت سے منع کیا گیا ہے۔

بعض حضرات کی یہ بات بڑی عجیب ہے کہ سالگرہ منانا دنیاداری کا ایک طریقہ ہے، اس طرح تو ہر ناجائز کام ''دنیاداری'' کہہ کر جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ جیسے بعض لوگ کسی کے فوت ہونے پر قل دسواں چالیسواں وغیرہ کی رسمیں ادا کرتے ہیں جب ان سے کہا جاتا ہے کہ یہ طریقہ غلط ہے تو کہتے ہیں کہ جناب دنیاداری ہے کیا کریں، ''ناک'' بھی تو رکھنی ہے! کھانے پر قرآن پڑھتے ہیں، لوگوں میں قرآن کے پارے اور سورتیں تقسیم کروا کر پڑھواتے ہیں جسے وہ ایصال ثواب سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جی دنیاداری ہے۔ عجیب بات ہے! بدعات کو دنیاداری کا نام دے کر جائز قرار دیا جا رہا ہے۔ حالانکہ ہم سب جانتے اور مانتے ہیں کہ اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے اور دنیاداری کا طریقہ بھی ہمیں اسلام ہی بتاتا ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ''ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں'' ورنہ سالگرہ منانے اور کیک کاٹنے کے علاوہ ہمیں کوئی کام نہ ہوتا، مثلاً ایک دیہات یا محلے کی آبادی اگر تین چار سو نفوس پر مشتمل ہے تو وہاں تقریباً روزانہ کسی نہ کسی کی سالگرہ منائی جا رہی ہوگی۔ اس کے ساتھ اگر بڑوں اور بزرگوں کی برسیاں بھی شامل کر لی جائیں تو سارا وقت انہی کاموں میں لگ جائے۔ کیونکہ کوئی دن ایسا نہیں ہوگا جس دن دسیوں بیسیوں بڑے پیدا یا فوت نہ ہوئے ہوں، دُور نہ جائیں سوا چودہ صدیوں سے تو ہماری اپنی تاریخ متجاوز ہے، کتنے پیدا ہوئے اور کیسے کیسے عظیم لوگ اس دارِ فانی سے رحلت کر گئے۔

ہم اگر اپنے چند ''بزرگوں'' کی ولادت یا وفات کا دن منانا شروع کر دیں تو یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ واقعتاً وہ کام درست بھی ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کیا کسی کی سالگرہ فی الحقیقت منائی بھی جا سکتی ہے یا نہیں؟ مثلاً ایک شخص ۱۵ ربیع الاول، ۱۸ مئی بروز اتوار پیدا ہوا، اب اگر کوئی آدمی اس کی سالگرہ منانا

چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ ۱۵ ربیع الاول، ۱۸ مئی بروز اتوار کو منائے، اب ظاہر ہے کہ یہ ناممکن ہے، پیدا اِتوار کو ہوا اور اس کا یوم ولادت بدھ کو منایا جارہا ہے، کیا بدھ اس کی پیدائش کا دن ہے؟ ویسے ہم مسلمان اگر سوچیں تو جب کوئی سالگرہ منارہا ہوتا ہے تو اس وقت اس کے سال سے کئی دن اوپر گزر چکے ہوتے ہیں۔ اگر ایک ۳۵، ۴۰ سالہ مسلمان شخص اپنا یوم ولادت منائے تو کیا یہ واقعتاً اپنا یوم ولادت منارہا ہوتا ہے جبکہ قمری سن (اسلامی سن) کے اعتبار سے (عیسوی سن کے مقابلے میں) اتنے عرصے میں تقریباً ایک سال کا فرق واقع ہو چکا ہوتا ہے۔ فافهم و تدبر!

اسلامیات کے پیپر میں غلط جواب دینا گناہ ہے؟

سوال اسلامیات کا امتحان دیتے وقت اگر پرچے میں سوال کا جواب غلط دے دیا جائے تو کیا گناہ تو نہیں ہوتا؟

جواب اگر آپ کو صحیح جواب معلوم نہ ہو تو اپنی طرف سے غلط جواب مت لکھیں جبکہ آپ کو علم ہے کہ جواب غلط ہے۔ پیپر چیکر کو دھوکہ دینے کی کوشش مت کریں۔ اگر آپ کا خیال ہو کہ خامہ فرسائی کرتے ہوئے کچھ نہ کچھ جواب صحیح لکھ لوں گا تو ضرور تحریر کریں۔

متذبذب ہونے کی حالت بھی جواب تحریر کرنے میں ان شاء اللہ کوئی گناہ نہیں ہوگا کیونکہ آپ امتحان دے رہے ہیں۔ (واللہ اعلم بالصواب)

کیا باکسنگ ناجائز ہے؟

سوال کیا باکسنگ (مکّے بازی) ناجائز ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دیں؟

جواب شریعت مطہرہ کی رُو سے باکسنگ ناجائز ہے کیونکہ اس میں چہرے کو نشانہ بنایا جاتا ہے جب کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چہرے پر مارنے سے منع کیا ہے۔ اس سلسلے کی چند احادیث درج ذیل ہیں:

① ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِذَا قَاتَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَجْتَنِبِ الْوَجْهَ))

(مسلم ، البر والصلة ، النهى عن ضرب الوجه ، ح: ۲۶۱۲)

''جب تم میں سے کوئی شخص لڑے تو چہرے پر مارنے سے گریز کرے۔''

② ((اِذَا قَاتَلَ اَحَدُکُمْ اَخَاہُ فَلَا یَلْطِمَنَّ الْوَجْهَ)) (ایضاً)

''جب تم میں کوئی اپنے بھائی سے لڑ پڑے تو چہرے پر طمانچہ نہ مارے۔''

ایسا کھیل کافروں، انسانیت کے دشمنوں اور تہذیب و تمدن کے قاتلوں کے ہاں تو محبوب ہو سکتا ہے مسلمانوں کے ہاں نہیں۔

البتہ دورانِ جنگ باکسنگ جائز ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴾ (۸/الانفال:۱۲)

''ان (کفار) کی گردنوں کے اوپر ضرب لگاؤ اور ان کے پور پور پر مارو۔''

اس کی مزید وضاحت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ غزوہ حنین میں جب کفار نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا محاصرہ کرلیا تو آپ اپنے خچر سے اتر پڑے۔ آپ نے زمین سے مٹی کی ایک مٹھی لی اور اسے کفار کے چہروں کی طرف پھینک کر فرمایا:

((شَاهَتِ الْوُجُوْهُ))

''چہرے بگڑ جائیں۔''

تو اللہ تعالیٰ نے ان سب کی آنکھوں کو مٹی سے بھر دیا۔ وہ الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوئے اور اللہ نے انہیں شکست دی۔

(مسلم، الجهاد والسير، غزوة حنين، ح: ۱۷۷۷)

اس حدیث کی روشنی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے چہروں کو نشانہ بنایا اور ان کے چہرے بگڑنے کی بدعا کی۔

چھینک آنے پر I am Sorry کہنا؟

سوال اہل مغرب کی نقالی میں بعض 'تعلیم یافتہ' لوگوں میں یہ رواج پایا جاتا ہے کہ جب کسی کو لوگوں کے سامنے چھینک آتی ہے تو وہ I am sorry کہتا ہے۔ کیا ایک مسلمان ایسے موقع پر اس طرح کے الفاظ استعمال کرسکتا ہے؟

جواب چھینک کو عربی زبان میں عطاس کہتے ہیں جس کا معنی کھلنا اور پھوٹنا ہے۔

چھینک آنے پر انسان کی طبیعت کھل جاتی ہے۔ سر کی گرانی دُور ہو جاتی ہے اور وہ تازہ دم ہو جاتا ہے۔ قوائے انسانی میں جلا پیدا ہوتی ہے، دماغ کی رگوں اور اس کے پٹھوں کی رکاوٹیں دُور ہو جاتی ہیں تو انسان فرحت محسوس کرتا ہے۔ لہٰذا چھینک آنے پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

چھینک کا جواب دینا ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حقوق ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

((وَإِذَا عَطَسَ فَحَمِدَ اللّٰهَ فَشَمِّتْهُ))

(مسلم ، السلام ، من حق المسلم للمسلم رد السلام ، ح: ۲۱۶۲)

"اور جب اسے چھینک آئے اور وہ اللہ کی حمد کرے تو اسے یَرْحَمُكَ اللّٰهُ کہو۔"

عہدِ نبوی میں چھینک آنے پر اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کا رواج عام تھا۔ انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دو آدمیوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں چھینکا ان میں سے ایک کی چھینک پر آپ نے یَرْحَمُكَ اللّٰهُ کہا اور دوسرے کی چھینک پر نہیں کہا۔ اس پر دوسرا شخص بولا: اللہ کے رسول! آپ نے اس کی چھینک پر یَرْحَمُكَ اللّٰهُ کہا جبکہ میری چھینک پر نہیں کہا؟ آپ نے جواباً فرمایا:

((إِنَّ هٰذَا حَمِدَ اللّٰهَ وَلَمْ تَحْمَدِ اللّٰهَ))

(بخاری ، الادب ، لا یشمت العاطس اذا لم یحمد اللہ ، ح: ۶۲۲۵)

"اس نے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہا تھا اور تم نے نہیں کہا تھا۔"

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِذَا عَطَسَ أَحَدُكُمْ فَلْيَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلْيَقُلْ لَهُ أَخُوهُ أَوْ صَاحِبُهُ يَرْحَمُكَ اللّٰهُ فَإِذَا قَالَ لَهُ يَرْحَمُكَ اللّٰهُ فَلْيَقُلْ يَهْدِيكُمُ اللّٰهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ)) (ایضاً ، اذا عطس کیف یشمت ، ح: ۶۲۲۴)

"جب تم میں سے کسی کو چھینک آئے تو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہے اور اس کا بھائی یا ساتھی یَرْحَمُكَ اللّٰهُ کہے (اللہ آپ پر رحم کرے) جب اسے یَرْحَمُكَ اللّٰهُ کہہ دیا جائے تو وہ (چھینکنے والا) کہے: ((يَهْدِيكُمُ اللّٰهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ))

"اللہ تمہیں سیدھے راستے پر رکھے اور تمہارے حالات درست کرے۔"

ابوایوب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جب تم میں سے کسی کو چھینک آئے تو یوں کہے:((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ))

(ترمذی، الادب، ما یقول العاطس اذا عطس، ح:۲۷۴۱)

"ہر حالت میں اللہ کا شکر اور تعریف ہے۔"

ایک اور حدیث میں ہے:

رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی مجھے چھینک آئی تو میں نے کہا:

الحمدلله حمداً كثيراً طيباً مباركاً فيه مباركا عليه كما يحب ربنا ويرضى

"ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے، تعریف بہت زیادہ پاکیزہ، جس میں برکت کی گئی ہے جس پر برکت نازل کی گئی ہے۔ جس طرح ہمارا رب محبت کرتا ہے اور پسند کرتا ہے۔"

جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو پوچھا: نماز میں یہ الفاظ کس نے کہے ہیں..... تین دفعہ پوچھا..... میں نے عرض کیا: میں نے کہے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تمیں سے زیادہ فرشتے اس کی طرف جلدی سے بڑھے کہ ان میں سے کون اسے لے کر اوپر چڑھے۔

(ابوداؤد، الصلاۃ، مایستفتح به الصلاۃ من الدعاء، ح:۷۷۳؛ ترمذی، ح:۴۰۴)

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ جب ایک مسلمان کو چھینک آئے تو وہ ((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ)) ((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ)) اور الحمدلله حمدا كثيرا طيبامباركا فيه مباركا عليه كما يحب ربنا ويرضى میں سے جو بھی چاہے کلمات کہہ سکتا ہے۔ I am sorry کہنے کا کوئی تک نہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ حدیث نبوی میں ہے کہ ((اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْعُطَاسَ))

(بخاری، الادب، ما یستحب من العطاس وما یکرہ من التثاؤب، ح: ۶۲۲۳)

''اللہ چھینک کو پسند کرتا ہے۔''

مگر اَن پڑھ لوگ sorry (افسوس) کرتے ہیں۔ نیز انسان کو چھینک سے کئی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

اس پر پڑھے لکھے جہلاء کا I am sorry کہنا چہ معنی دارد؟

چھینک آئے تو کیا کوئی یاد کر رہا ہوتا ہے؟

سوال جب کسی انسان کو چھینک آتی ہے تو کیا اسے کوئی یاد کر رہا ہوتا ہے؟ ہمارے ایک دوست کو چھینک آئی تو انہوں نے کہا: لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ میں نے ان سے کہا: یہ تم نے کیا کہا ہے؟ الحمد للہ کہنا چاہیے تو انہوں نے کہا: میں بھی یہی کہا کرتا تھا، مجھے کسی عالم نے کہا تھا کہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ کہنا چاہیے کیونکہ کوئی (بُرے الفاظ میں) یاد کرتا ہے تو کیا واقعتاً کوئی یاد کر رہا ہوتا ہے؟

جواب چھینک آنے پر اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنی چاہیے۔ حدیث نبوی ہے:

((اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْعُطَاسَ وَيَكْرَهُ التَّثَاؤُبَ فَاِذَا عَطِسَ فَحَمِدَاللّٰهَ فَحَقٌّ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ سَمِعَهٗ اَنْ يُّشَمِّتَهٗ))

(بخاری، الادب، مایستحب من العطاس، ح: ۶۲۲۳)

''یقیناً اللہ چھینک کو پسند کرتا ہے اور جمائی کو ناپسند کرتا ہے جب کسی کو چھینک آئے تو وہ اللہ کی تعریف کرے تو سننے والے ہر مسلمان پر حق ہے کہ چھینک کا جواب دے۔''

دو آدمیوں کو نبی ﷺ کے پاس چھینک آئی تو آپ نے ایک کی چھینک کا جواب دیا دوسرے کی چھینک کا جواب نہ دیا۔ تو اس آدمی نے کہا: اللہ کے رسول! آپ نے اس کی چھینک کا جواب دیا مگر میری چھینک کا جواب نہیں دیا؟ تو آپ نے فرمایا:

((اِنَّ هٰذَا حَمِدَ اللّٰهَ وَلَمْ تَحْمَدِ اللّٰهَ))

(ایضاً، لایشمت العاطس اذا لم یحمداللہ، ح: ۶۲۲۵)

''اس نے اللہ کی تعریف کی تھی اور تم نے اللہ کی تعریف نہیں کی تھی۔''

چھینک آنے پر اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنے کے مختلف الفاظ احادیث میں ملتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

"جب تم میں سے کسی کو چھینک آئے تو وہ اَلْحَمْدُلِلّٰہِ کہے تو اس کا مسلمان بھائی یا ساتھی کہے: یَرْحَمُکَ اللّٰہُ (اللہ آپ پر رحم کرے) جب وہ اسے یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہہ دے تو وہ کہے:

((یَھْدِیْکُمُ اللّٰہُ وَیُصْلِحُ بَالَکُمْ))

"اللہ آپ کو ہدایت دے اور تمہارے حالات درست کرے۔"

(ایضاً، اذا عطس کیف یشمت، ح: ۶۲۲۴)

بعض احادیث میں ((اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ)) (ہر حالت میں اللہ کی تعریف ہے) کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔(ترمذی:۲۷۳۸)

رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے اللہ کے رسول ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی مجھے چھینک آئی تو میں نے کہا:

الحمدلله حمدا كثيرا طيبا مباركا فيه مباركا عليه كما يحب ربنا و يرضى (ایضاً،ح:۴۰۴)

"ہر قسم کی تعریف اللہ کے لیے ہے، تعریف بہت زیادہ، پاکیزہ جس میں برکت کی گئی ہے جس پر برکت نازل کی گئی ہے جس طرح ہمارا رب چاہتا ہے اور پسند کرتا ہے۔"

جب اللہ کے رسول ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو پوچھا:

نماز میں یہ الفاظ کس نے کہے ہیں؟ میں نے عرض کی: میں نے کہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تیس سے زیادہ فرشتے اس (کلام) کی طرف جلدی سے بڑھے کہ ان میں سے کون اسے لے کر اوپر چڑھے۔"

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ یہ الفاظ کہے جائیں تو اور زیادہ ثواب ملتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام احادیث سے معلوم ہوا کہ چھینک آنے پر الحمدللہ کہنا چاہیے نہ کہ لاحول

ولاقوة الا باللہ۔ بعض لوگ چھینک آنے پر سورۃ الفاتحہ پڑھتے ہیں اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں۔ دوسری یہ بات بھی غلط ہے کہ جب چھینک آتی ہے تو کوئی یاد کررہا ہوتا ہے۔ چھینک تو جسمانی مسئلہ ہے جس کا تعلق انسان کے نظامِ تنفس کے ساتھ ہے۔ جب چھینک آتی ہے تو دماغ میں رکے ہوئے فضلات اور بخارات خارج ہوجاتے ہیں۔ دماغی رگوں اور پٹھوں کی رکاوٹیں ختم ہوجاتی ہیں، جس کی وجہ سے انسان کئی بیماریوں سے محفوظ ہوجاتا ہے۔ لوگوں کا یہ کہنا کہ جب چھینک آتی ہے تو کوئی یاد کررہا ہوتا ہے مشاہدے کے خلاف ہے اور عقلی طور پر بھی غلط ہے۔

کئی دفعہ کوئی یاد کررہا ہوتا ہے مگر چھینک نہیں آتی۔

کوئی یاد نہ کررہا ہو تب بھی چھینک آجاتی ہے، بعض دفعہ کسی کو جاننے والے دو چار یا آٹھ دس آدمی ہوتے ہیں ان میں سے کتنے ہوں گے جو رات کے دو بجے اسے یاد کررہے ہوں گے مگر چھینک تو اس وقت بھی آجاتی ہے۔

اگر یہ بات درست ہو تو پھر تو جس سے دشمنی کرنی ہو اُسے یاد کرنا شروع کردیا جائے تاکہ وہ ہر وقت چھینکیں ہی مارتا رہے اور اپنا کوئی کام نہ کرسکے بلکہ چھینکیں مار مار کر بے ہوش ہوجائے!

بعض اوقات سورج کی طرف ترچھا دیکھنے سے بھی چھینک آجاتی ہے۔

بعض چیزوں کو سونگھنے سے بھی چھینکیں آتی ہیں۔

بعض اوقات آدمی کو علاج کے طور پر بھی چھینکیں دلوائی جاتی ہیں۔

اگرچہ چھینک کو روکنا درست نہیں مگر آدمی روکنا چاہے تو ایک خاص وقت میں ناک بند کرکے روک بھی سکتا ہے، تو کیا ناک بند کرنے سے یاد کرنے والے کا منہ بھی بند ہوجاتا ہے کہ وہ یاد کرنا چھوڑ دیتا ہے!

مزید برآں چھینک تو دو چار سیکنڈ کی بات ہوتی ہے جبکہ اتنے وقت میں کوئی کسی کو کیا یاد کرسکتا ہے۔ لہٰذا یہ بات ہر لحاظ سے قطعی طور پر غلط ہے کہ جب چھینک آتی ہے تو کوئی یاد کررہا ہوتا ہے۔

مختصر نام سے بلانا؟

سوال کیا کسی کو بلاتے وقت اسے مختصر نام سے بلانا جائز ہے؟

جواب کسی کو محبت و پیار اور شفقت سے مختصر نام سے بلانا جائز ہے۔ بشرطیکہ اس اختصار کا معنی غلط نہ بنتا ہو اور جسے مختصر نام سے بلایا جا رہا ہو وہ برا محسوس نہ کرتا ہو۔ نبی اکرم ﷺ ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کو بعض اوقات عائش کہہ کر بلاتے تھے، ابوسلمہ بن عبدالرحمن رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

قال رسول اللهﷺيوما((يَا عَائِشُ هٰذَا جِبْرِيْلُ يُقْرِئُكِ السَّلَامَ))

فقلت وعليه السلام و رحمة الله و بركاته ترى ما لا ارى

(بخاری ، المناقب ، فضل عائشة ، ح:٣٧٦٨)

”ایک دن رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: عائش! یہ جبریل ہیں تمہیں سلام کہتے ہیں، تو میں نے کہا: وعليه السلام و رحمة الله وبركاته۔ آپ کو وہ چیزیں دکھائی دیتی ہیں جو ہمیں نہیں دکھائی دیتیں۔“

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو نبی اکرم ﷺ نے ابو ھر کہہ کر بلایا تھا۔ ابوہریرہ فرماتے ہیں:

قال لى النبىﷺ((يَا اَبَا هِرٍّ))

(بخاری ، الادب ، من دعا صاحبه فنقص من اسمه حرفا)

”مجھے نبی ﷺ نے فرمایا: ابوہر!“

(واقعہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے بخاری، الاطعمة، ح:٥٣٧٥)

اسی طرح نبی اکرم ﷺ نے اپنے ایک غلام انجشہ رضی اللہ عنہ کو انجش کہہ کر بلایا۔ انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

كانت ام سليم فى الثقل وانجشة غلام النبىﷺ يسوق بهن فقال النبىﷺ ((يَا اَنْجَشَ! رُوَيْدَكَ سُوْقَكَ بِالْقَوَارِيْرِ))

(بخاری ، الادب ، من دعى صاحبه...... ، ح: ٦٢٠٢)

”ام سلیم بھی اُن عورتوں میں تھیں (جو اونٹوں پر سوار جا رہی تھیں) اور نبی ﷺ کا غلام انجشہ ان اونٹوں کو ہانک رہا تھا تو نبی ﷺ نے فرمایا: انجش! ذرا اس

طرح (آہستگی سے) لے چل جیسے شیشوں کو لے جاتا ہے۔"

لیکن نام بگاڑنا درست نہیں جیسے اقبال کو بالا، منور کو منا، جاوید کو جیدا اور محمود کو مودا وغیرہ کہنا۔ نام بگاڑنے سے بسا اوقات عقیدہ توحید پر بھی حرف آتا ہے۔ بعض دفعہ نام بگاڑنا اللہ تعالیٰ کی ادبی کے زمرے میں آتا ہے، مثلاً عبداللہ کو عبدللے یا ڈلا کہہ کر بلانا، عبدالرشید کو شیدا، عبدالرحمٰن کو مانا، رب نواز کو ربو کہہ کر بلانا اللہ تعالیٰ کی بے ادبی ہے۔ بعض لوگ عبدالرحمٰن نامی شخص کو رحمٰن کہہ کر بلاتے ہیں جو غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو رحمٰن کہنا صحیح نہیں۔ اور کچھ لوگ تو بچوں کا نام ہی رحمٰن رکھ دیتے ہیں، یہ عقیدۂ توحید کے خلاف ہے، ایسا نام فوراً تبدیل کر دینا چاہیے۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا حکمران وقت سے اختلاف

سوال کچھ لوگ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ پر واقعہ کربلا کے حوالے سے تنقید کرتے ہیں، کیا ان کی یہ سوچ درست ہے؟

جواب حسین رضی اللہ عنہ پر تنقید کرنا ہرگز جائز نہیں بلکہ ان کے مقام و مرتبے کے لحاظ سے توہین اور بے ادبی ہے، ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ کا خوف کرنا چاہیے، اور ان کے بارے میں نازیبا کلمات زبان پر لانے سے ڈرنا چاہیے، آپ رضی اللہ عنہ نے یزید کی بیعت سے انکار ایک اصولی اور بنیادی اختلاف کی بنا پر کیا تھا جس میں وہ حق بجانب تھے، اور پھر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حسنین کا مقام و مرتبہ بیان کیا اور جس انداز سے اپنی بیٹی کے جگر گوشوں سے محبت و الفت کا اظہار کیا اسے سامنے رکھتے ہوئے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس طرح کے توہین آمیز الفاظ استعمال کرنا کسی مسلمان کو زیب نہیں دیتا، اللہ تعالیٰ ہمیں ان پاکیزہ ہستیوں کا صحیح احترام کرنے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے، آمین۔

(دیکھیے فتاویٰ صراطِ مستقیم از مولانا محمود احمد میرپوری رحمہ اللہ)

چھپکلی کو مارنا ثواب ہے؟

سوال کیا کرلے (چھپکلی) کو مارنا کارِ ثواب ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو آدمی کرلے یا چھپکلی کو مارتا ہے اس پر غسل فرض ہو جاتا ہے تو کیا یہ بات صحیح ہے؟

جواب کرلے کو مارنا باعث اجر وثواب ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے کرلوں کو مارنے کا حکم دیا تھا۔ ام شریک رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں:

ان رسول اللهﷺ امر بقتل الاوزاغ و قال:((كَانَ يَنْفُخُ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ عليه السلام))

(بخاری، بدأ الخلق، ح:۳۳۵۹؛ مسلم، السلام، استحباب قتل الوزغ، ح:۲۲۳۷)

''اللہ کے رسول ﷺ نے چھپکلیوں کے مارنے کا حکم دیا اور آپ نے فرمایا: یہ ابراہیم علیہ السلام (کی آگ) پر پھونکیں مارتی تھیں۔''

بعض احادیث میں کرلے کو پوری قوت سے ایک ہی چوٹ میں مارنے کی فضیلت بھی بیان ہوئی ہے، ارشادِ نبوی ہے:

((مَنْ قَتَلَ وَزْغَةً فِيْ أَوَّلِ ضَرْبَةٍ فَلَهُ كَذَا وَ كَذَا حَسَنَةً، وَمَنْ قَتَلَهَا فِي الضَّرْبَةِ الثَّانِيَةِ فَلَهُ كَذَا وَ كَذَا حَسَنَةً لِدُوْنِ الْأُوْلٰى وَإِنْ قَتَلَهَا فِي الضَّرْبَةِ الثَّالِثَةِ فَلَهُ كَذَا وَ كَذَا حَسَنَةً لِدُوْنِ الثَّانِيَةِ))

(مسلم، ایضاً، ح:۲۲۴۰)

''جو چھپکلی کو پہلی چوٹ میں مار دے اس کے لیے اتنی اتنی نیکیاں ہیں اور جو اسے دوسری چوٹ میں مارے دے اس کے لیے پہلے شخص سے کم اتنی اتنی نیکیاں ہیں اور اگر تیسری چوٹ میں مارے تو اس کے لیے (دوسرے سے کم) اتنی اتنی نیکیاں ہیں۔''

ایک اور روایت میں ہے:

((مَنْ قَتَلَ وَزْغًا فِيْ أَوَّلِ ضَرْبَةٍ كُتِبَ لَهُ مِائَةُ حَسَنَةٍ وَ فِي الثَّانِيَةِ دُوْنَ ذٰلِكَ وَ فِي الثَّالِثَةِ دُوْنَ ذٰلِكَ)) (ایضاً)

''جو شخص کسی کرلے (چھپکلی) کو پہلی چوٹ میں مار ڈالے اس کے لیے سو نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں۔ دوسری چوٹ سے مارنے پر اس سے کم اور تیسری چوٹ سے مارنے پر اس سے کم۔''

احادیث میں وزغ کا لفظ استعمال ہوا ہے، امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وزغ سام ابرص سے بڑا جانور ہے۔ (سام ابرص چھپکلی کو کہتے ہیں۔)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام نووی رحمہ اللہ کی اس سے مراد گرلا ہے اور یہی بات لوگوں میں بھی مشہور ہے۔ واللہ تعالٰی اعلم بالصواب

باقی لوگوں کا یہ کہنا کہ گرلے یا چھپکلی کو مارنے سے غسل فرض ہو جاتا ہے، اس کا شریعت مطہرہ میں کوئی ثبوت نہیں ہے یہ لوگوں کا اپنی طرف سے بنایا ہوا مسئلہ ہے۔

کون سی گمشدہ چیز کی تشہیر کرنی چاہیے؟

سوال جس شخص کو کوئی گمشدہ چیز ملے تو کیا اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ سال بھر اس کا اعلان کرواتا رہے؟

جواب اس بات کا فیصلہ گمشدہ چیز کی حیثیت اور نوعیت دیکھ کر کیا جا سکتا ہے۔

گری پڑی یا گمشدہ چیز کی عموماً تین صورتیں ہو سکتی ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:

اولاً: ایسی چیز جو معمولی حیثیت کی ہو اور کھانے کے طور پر استعمال ہوتی ہو اُسے صاف کر کے کھایا بھی جا سکتا ہے اور اس سے فائدہ بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس کا اعلان کرنا ضروری نہیں۔ اس کی دلیل انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث ہے جس میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک راستے سے گزرے، آپ نے راستے میں گری پڑی ایک کھجور دیکھی تو فرمایا:

((لَوْلَا أَنِّي أَخَافُ أَنْ تَكُونَ مِنَ الصَّدَقَةِ لَأَكَلْتُهَا))

(بخاری ، اللقطة ، اذا وجد تمرة فی الطریق ، ح:۲۴۳۱)

''اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ یہ کھجور صدقے کی ہے تو میں اسے کھا لیتا۔''

نوٹ: صدقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل کے لیے حرام ہے۔

ثانیاً: ایسی چیز معمولی نوعیت کی ہو لیکن کھانے کے لیے کام آنے والی نہ ہو تو لوگوں میں اس کی تشہیر تین دن تک کرتا رہے جیسے چاقو، چھڑی وغیرہ۔

(التحاف الكرام شرح بلوغ المرام من ادلة الاحكام، ص:۶۱۵)

ثالثاً: اگر چیز قیمتی ہو تو سال بھر اس کا اعلان کروائے۔ ذرائع ابلاغ کے ذریعے اس کی تشہیر

کرے اگر اس چیز کا اصل مالک نہ ملے تو اسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ احتیاطاً اس کی نشانیاں اور تعداد وغیرہ یاد رکھ لے، اگر بعد میں مالک آجائے تو اتنی قیمت ادا کر دے یا مالک اسے خود بخود چھوڑ دے۔ زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ ایک آدمی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اُس نے گری پڑی چیز کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

((اَعْرِفْ عِفَاصَهَاوَ وِكَاءَ هَا ثُمَّ عَرِّفْهَا سَنَةً فَإِنْ جَاءَ صَاحِبُهَا وَإِلَّا فَشَأْنُكَ بِهَا)) قال فضالة الغنم؟ قال: ((هِيَ لَكَ اَوْ لِاَخِيْكَ اَوْلِلذِّئْبِ)) قال فضالة الابل؟ قال: ((مَالَكَ وَلَهَا مَعَهَا سِقَاؤُهَا وَحِذَاؤُهَا تَرِدُ الْمَاءَ وَ تَأْكُلُ الشَّجَرَ حَتّٰى يَلْقَاهَا رَبُّهَا))

(بخاری، اللقطة، اذا لم یوجد صاحب اللقطة بعدسنة فهی لمن وجدها، ح:۲۴۲۹)

''اُس کی تھیلی اور تسمہ پہچان رکھو پھر سال بھر تک لوگوں سے دریافت کرتے رہو اگر اس کا مالک آجائے تو بہتر ورنہ تمہارا اختیار ہے۔ اُس نے پوچھا: گمشدہ بکری کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ تمہاری ہے، تمہارے بھائی کی یا پھر بھیڑیے کی۔ اس نے گمشدہ اونٹ کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: تمہیں اس سے کیا سروکار؟ اس کا پانی اور اس کے جوتے اس کے پاس ہیں۔ گھاٹ پر آکر پانی پی لے گا اور درختوں کے پتے کھا لے گا یہاں تک کہ اس کا مالک آکر اسے لے لے۔''

ایک اور حدیث میں ہے:

((عَرِّفْهَا سَنَةً ثُمَّ اَعْرِفْ وِكَاءَ هَا وَ وِعَاءَ هَا وَ عِفَاصَهَا ثُمَّ اسْتَنْفِقْ بِهَا فَإِنْ جَاءَ رَبُّهَا فَاَدِّهَا إِلَيْهِ))

(ترمذی، الاحکام، ماجاء فی اللقطة، ح:۱۳۷۲)

''اس کی ایک سال تک پہچان کرواؤ۔ پھر اس کا تسمہ، ظرف اور تھیلی پہچان رکھو، پھر اسے خرچ کرلو، اب اگر اس کا مالک آجائے تو اسے ادا کر دو۔''

اگر چیز بہت ہی زیادہ قیمتی ہو تو اس کا تین سال تک انتظار کیا جائے گا جیسے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے ایک صحابی کو ایک سال انتظار کا حکم دیا۔ مالک نہ ملنے پر پھر ایک سال کا حکم دیا۔ تیسری مرتبہ پھر ایک سال انتظار کرنے کا حکم دیا۔ (ایضاً، ح:۱۳۷۴)

لہٰذا چیز کی نوعیت دیکھ کر مذکورہ بالا صورتوں میں سے متعلقہ صورت کو اختیار کیا جائے گا۔

(واللہ اعلم بالصواب)

﴿ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾ اور ﴿ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾

سوال ہم نے ایک خاتون سے مسئلہ سنا کہ اگر کوئی فوت ہو جائے تو ﴿ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾ کہنا چاہیے، البتہ اگر کوئی چیز گم ہو جائے یا کوئی نقصان ہو جائے تو ﴿ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾ پڑھنا چاہیے۔ کیا یہ بات درست ہے؟

جواب صبر کرنے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۝ ﴾ (۲/البقرۃ:۱۵۵،۱۵۶)

”اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیں، جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں: ﴿ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾ (یقیناً ہم اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔)“

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کوئی فوت ہو گیا ہو یا کوئی دوسری مصیبت آئی ہو ہر حالت میں ﴿ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾ کہنا چاہیے۔ ﴿ قَالُوْٓا ﴾ تو صرف یہ بتانے کے لیے ہے کہ وہ صبر کرنے والے ﴿ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾ کہتے ہیں۔

خلافِ حقیقت فیصلے سے حقیقت نہیں بدلتی

سوال کسی آدمی کے خلاف ایک پلاٹ کے سلسلے میں میرا مقدمہ عدالت میں چل رہا تھا۔ عدالت نے شہادتوں کی بنیاد پر میرے حق میں فیصلہ دے دیا ہے لیکن اب میں سوچتا ہوں کہ اگرچہ عدالت نے میرے حق میں فیصلہ صادر کر دیا ہے مگر پلاٹ پر درحقیقت میرا کوئی حق نہیں تھا۔ مقدمے میں ہار جیت انا کا مسئلہ بن گیا تھا، پوچھنا یہ ہے جب جج نے میرے حق میں فیصلہ سنا دیا ہے تو کیا اس پلاٹ پر میرا حق ہے یا نہیں؟

جواب غلط فیصلے سے حقیقت نہیں بدلتی۔ جس کا حق ہو اسے دینا چاہیے، اگر غلطی سے یا گواہوں کی غلط گواہی سے خلافِ حقیقت فیصلہ ہو گیا ہو تو قاضی پر تو کوئی گناہ نہیں کیونکہ اس نے تو شہادتوں کی بنیاد پر فیصلہ کرنا ہوتا ہے لہٰذا ظاہری طور پر یہ فیصلہ نافذ العمل ہوتا ہے لیکن قاضی کے فیصلے سے حرام حلال اور حلال حرام نہیں ہوتا۔

اگر چہ آپ کے حق میں عدالت نے فیصلہ دے دیا ہے مگر پلاٹ اس فیصلے سے آپ کے لیے حلال نہیں ہوا۔ اللہ کا خوف کرتے ہوئے صاحبِ حق کو اُس کا حق واپس کر دینا چاہیے۔

اس سلسلے میں ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ وَإِنَّكُمْ تَخْتَصِمُونَ إِلَيَّ وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ أَنْ يَكُونَ أَلْحَنُ بِحُجَّتِهِ مِنْ بَعْضٍ فَأَقْضِي لَهُ بِنَحْوِ مَا أَسْمَعُ فَمَنْ قَضَيْتُ لَهُ بِحَقِّ أَخِيهِ فَإِنَّمَا أَقْطَعُ لَهُ قِطْعَةً مِّنَ النَّارِ))

(بخاری، الاحکام، موعظة الامام للخصوم، ح:۷۱۶۹؛ مسلم، ح:۱۷۱۳)

"یقیناً مَیں ایک انسان ہی ہوں اور تم میرے پاس جھگڑے لے کر آتے ہو (تاکہ مَیں فیصلہ کروں) اور شاید تم میں سے کوئی آدمی اپنی دلیل پیش کرنے میں دوسرے سے زیادہ تیز اور چرب زبان ہو مَیں جو کچھ سنوں (اور اس سے جس نتیجے پر پہنچوں) اس کے مطابق اس کے حق میں فیصلہ کر دوں (حالانکہ وہ حق پر نہیں) تو جس شخص کے لیے مَیں اس کے بھائی کے حق کا فیصلہ کر دوں تو مَیں اس کے لیے جہنم کی آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔"

کیا دَم کرنا شریعت سے ثابت ہے؟

سوال کیا دم کرنا شریعت مطہرہ سے ثابت ہے؟ اگر ثابت ہے تو اس کا طریقہ کیا ہے؟ کیا کوئی شخص اپنے آپ کو دم کر سکتا ہے؟

جواب بہت سی احادیث سے دم کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔ کسی سے دم کروانا اور خود کرنا دونوں کا ثبوت سنت مطہرہ سے ملتا ہے۔ کسی کو یا خود کو دم کرتے وقت نبی اکرم ﷺ مختلف طریقے اختیار کیا کرتے تھے۔ دعائیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ جسم پر ہاتھ پھیرتے۔ درد

کی جگہ پر ہاتھ رکھوا کر بھی دم کرنے کی تلقین کرتے۔

عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم مریض کے جسم پر اپنا دایاں ہاتھ پھیرتے اور یہ دعا پڑھتے تھے:

((اَذْهِبِ الْبَاْسَ رَبَّ النَّاسِ وَاشْفِ اَنْتَ الشَّافِيْ لَا شِفَاءَ اِلَّا شِفَاءُ كَ شِفَاءً لَّا يُغَادِرُ سَقَمًا))

(بخاري، المرضى، دعاء العائد للمريض، ح:٥٦٧٥؛ مسلم، ح:٢١٩١)

''لوگوں کے رب! بیماری کو دور کر اور شفا عطا کر تو ہی شفا دینے والا ہے۔ تیری شفا کے سوا کوئی شفا نہیں۔ ایسی شفا دے کہ جو کسی بیماری کو نہیں چھوڑتی۔''

عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہی روایت ہے کہ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیمار پڑتے تو اپنے اوپر معوذتین (سورة الفلق اور سورة الناس) سے دم کرتے (اس طرح کہ پھونک کے ساتھ کچھ تھوک بھی نکلتا) پھر جب (مرض الموت میں) آپ کی تکلیف بڑھ گئی تو میں ان سورتوں کو پڑھ کر آپ کے ہاتھوں سے برکت کی امید پر آپ کے جسم پر پھیرتی تھی۔

(بخاري، فضائل القرآن، فضل المعوذات، ح:٥٠١٦)

بیماری کے علاوہ بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب رات کو بستر پر تشریف لاتے تو سورۃ الاخلاص، الفلق اور الناس پڑھ کر اپنے اوپر دم کرتے تھے۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات جب بستر پر آرام کرتے تو ﴿قل هو الله احد﴾، ﴿قل اعوذ برب الفلق﴾ اور ﴿قل اعوذ برب الناس﴾ (تینوں سورتیں) پڑھ کر اپنی دونوں ہتھیلیوں کو ملا کر ان پر پھونکتے اور پھر دونوں ہتھیلیوں کو جہاں تک ممکن ہوتا اپنے جسم پر پھیرتے تھے۔ پہلے سر اور چہرہ پر ہاتھ پھیرتے اور پھر سامنے کے بدن پر۔ یہ عمل آپ تین دفعہ کرتے تھے۔ (ایضا)

عثمان بن ابو العاص رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جسم کے درد کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا:

اپنا ہاتھ درد کی جگہ پر رکھو پھر تین دفعہ بسم اللہ کہو اور سات دفعہ یہ کلمات پڑھو:

((اَعُوْذُ بِاللّٰهِ وَقُدْرَتِهٖ مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُ وَاُحَاذِرُ))

(مسلم، السلام، استحباب وضع يده على موضع الالم مع الدعاء، ح:٢٢٠٢)

''مَیں اللہ سے اور اُس کی قدرت کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں اس چیز کی برائی سے جو مَیں پاتا ہوں اور جس سے مَیں ڈرتا ہوں۔''

عثمان فرماتے ہیں:

مَیں نے اسی طرح کیا تو اللہ نے میری تکلیف دُور کر دی۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حسنین (حسن وحسین رضی اللہ عنہما) کو دم کرتے اور فرماتے تھے کہ تمہارے بزرگ دادا (ابراہیم علیہ السلام) بھی اسماعیل واسحاق علیہما السلام کو ان کلمات سے دم کرتے تھے:

((اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَّهَامَّةٍ وَمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَّامَّةٍ))

(بخاری، احادیث الانبیاء، باب:۱۰، ح:۳۳۷۱)

''مَیں پناہ مانگتا ہوں اللہ کے پورے کلمات کے ذریعے ہر ایک شیطان سے، ہر زہریلے جانور سے اور ہر نقصان پہنچانے والی نظر بد سے۔''

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جبریل علیہ السلام نے آ کر کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ بیمار ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ تو جبریل علیہ السلام نے یہ پڑھ کر دم کیا:

((بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُّؤْذِيْكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ اَوْ عَيْنٍ حَاسِدٍ، اَللّٰهُ يَشْفِيْكَ بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ))

(مسلم، السلام، الطب والمرضی و الرقی، ح:۲۱۸۶)

''اللہ کا نام لے کر مَیں آپ پر دم کرتا ہوں ہر اس چیز سے جو آپ کو تکلیف دے، ہر نفس اور ہر حاسد کی نظر بد سے، اللہ آپ کو شفا دے، مَیں اللہ کا نام لے کر آپ پر دم کرتا ہوں۔''

تصویرِ وطن

نظریۂ پاکستان اقوالِ اقبال کی روشنی میں

سوال علامہ اقبال (مصورِ پاکستان) کے نقطۂ نظر کے مطابق نظریۂ پاکستان کیا ہے؟

جواب نظریۂ پاکستان کی بنیاد دینِ اسلام ہے۔جس کی بنا پر برِصغیر کے مسلمان اپنے اکثریتی علاقوں میں اسلام کا تہذیبی، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی نظام عملی طور پر نافذ کر سکیں۔ نیز بلاخوف وخطر اور بے جا مداخلت سے محفوظ رہ کر اسلام پر عمل کر سکیں۔

پاکستان ایک نظریے کا نتیجہ ہے اور اس نظریے کی بنیاد اسلام ہے۔یہی نظریہ وہ بنیاد ہے جس پر پاکستان کی عمارت تعمیر کی گئی۔اس بنیاد کو ختم کر کے عمارت کو قائم رکھنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔

علامہ اقبال کے بیان کردہ نظریۂ پاکستان کو مختصر طور پر درج ذیل نکات کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے:

1 اسلام ایک زندہ طاقت ہے

خطبہ الٰہ آباد کے موقع پر اقبال نے کہا:

''آج آپ نے جس شخص کو آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے اعزاز سے نوازا ہے۔وہ اب بھی اسلام کو ایک زندہ طاقت سمجھتا ہے۔وہ طاقت جو اِنسان کے ذہن کو وطن اور نسل کے تصور سے نجات دلا سکتی ہے.....''

2 اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے

''اسلام چند عقائد کا مجموعہ نہیں بلکہ یہ ایک ضابطہ حیات ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری راہنمائی کرتا ہے۔اسلامی تعلیمات پر عمل کیے بغیر مسلمان دین اور دنیا میں سُرخرو نہیں ہو سکتے۔''

3 دین اور سیاست جدا نہیں:

سیاست میں جبر وتشدد اس وقت پیدا ہوا جب اس سے دین کو نکال دیا گیا۔علامہ اقبال دین اور اخلاق سے عاری نظامِ حکومت کو ظالمانہ قرار دیتے ہیں۔ان کے نزدیک سیاست کو

دین سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

4 مغربی نظریہ قومیت کی تردید

اقبال نے مغربی نظریہ قومیت کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ اس میں کفر والحاد اور مادہ پرستی کے بیج دکھائی دیتے ہیں جو اُن کے نزدیک انسانیت کے لیے تباہ کن ہیں۔ انہوں نے اسلام کو مسلم قومیت کی بنیاد قرار دیتے ہوئے کہا۔

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پہ انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

5 علیحدہ اسلامی ریاست کا مطالبہ

اس مطالبے کا مقصد یہ تھا کہ "مسلمان اپنی مرضی کے مطابق اسلامی تہذیب وتمدن کو پروان چڑھا سکیں۔"

6 مغربی جمہوریت کی مذمت

اقبال نے ایسی جمہوریت کی مذمت کی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا کوئی عمل دخل نہ ہو۔ وہ ایسے سیاسی نظام اور جمہوریت کی مذمت کرتے ہیں جس کی بنیاد مذہبی ضابطہ اخلاق پر نہ ہو۔

تُو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندرون چنگیز سے تاریک تر
جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گِنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

7 اتحادِ عالمِ اسلامی

علامہ محمد اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے سے مسلمانانِ ہند کو یکجہتی اور اتحاد کا درس دیا اور ان میں ایک پلیٹ فارم پر متحد اور منظم ہونے کا جذبہ پیدا کیا۔ انہوں نے مسلم ریاستوں میں پروان چڑھنے والی قوم پرست تحریکوں کی مخالفت کی اور امتِ مسلمہ کو اِس کے خطرناک انجام سے آگاہ کرتے ہوئے کہا ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

اللہ تعالیٰ ہمیں اور ہمارے حکمرانوں کو صحیح سوچ عطا کرے نیز انہیں نظریہ پاکستان پر کاربند رہنے کی توفیق عنایت کرے۔

سب سے پہلے پاکستان؟

سوال ''سب سے پہلے پاکستان'' کے نعرے کی اسلامی نقطۂ نظر سے کیا حیثیت ہے؟

جواب پاک سرزمین محسن حقیقی کا بہت بڑا عطیہ ہے مگر عاقبت نااندیشوں نے اس نعمت کی قدر نہ جان کر اپنے احسان فراموش اور ناشکرے ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ جس عظیم مقصد کے لیے اس سرزمین کو حاصل کیا گیا تھا وہ خواب ہنوز شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا۔ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے، اس کی بقا اور سلامتی کا دارومدار بھی اسلام پر ہی ہے۔ بصورت دیگر پاکستان کے وجود کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا۔ مگر وائے ناکامی ہمارے بیشتر حکمران اسلام کے نام سے الرجک ہی رہے ہیں۔ بعض نے ''کرسی'' کی خاطر اسلام کا نام استعمال کیا اور یوں اسلام کو بدنام کیا۔ کچھ غدارانِ وطن اپنے اہم راز بھی دشمنان اسلام پر افشاں کرتے رہے ہیں۔ بہت سے ''بے بنیاد'' اس خدشے کا شکار رہے ہیں مبادا کہ عالمی برادری کہیں انہیں بنیاد پرست ہونے کا طعنہ نہ دے دے۔ ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ اس حقیقت کا غماز ہے۔

''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگانے سے پہلے کیا ہی اچھا ہوتا کہ اسلامی نظریاتی کونسل سے فتویٰ طلب کرلیا جاتا، لیکن ایسا شاید اس لیے نہیں کیا گیا کہ خطرہ تھا کہ ''اسلامی'' کا

لفظ کہیں ان پر ''اسلام پسند'' اور ''انتہا پسند'' ہونے کے الزام کا موجب نہ بن جائے۔ لگتا ہے کہ علامہ اقبال نے بھی ایسے ہی ''دانشوروں'' کے بارے میں کہا تھا۔

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کہ شرمائیں یہود

مسلمانانِ پاکستان کو یہی زیب دیتا ہے کہ وہ ''سب سے پہلے پاکستان'' کی بجائے ''سب سے پہلے اسلام'' کی بات کریں۔ صوبائیت، وطنیت اور قومیت کے نعرے امت مسلمہ کی ساکھ کو بُری طرح متاثر کرتے ہیں۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے نعرے کو سب سے پہلے پنجاب، سب سے پہلے سندھ، سب سے پہلے بلوچستان اور سب سے پہلے خیبر پختون خواہ وغیرہ کی طرح کے نعرے کیا مسلم امہ کو زیب دیتے ہیں؟ قطعاً نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامیانِ پاکستان میں ''سب سے پہلے پاکستان'' کے نعرے کو کوئی پذیرائی حاصل نہیں ہو سکی۔ بہت تھوڑی سی اقلیت پندرہ فیصد بلکہ اس سے بھی کم افراد (عیش پسند طبقے) اس نعرہ کو مقبول بنانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں اپنے اللے تللے ختم ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ حالی نے کہا تھا۔

تن آسانیاں چاہیں اور آبرو بھی
وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی

یہ دشمن کی سوچ اور چال ہے کہ مسلمانوں کو رنگ و نسل اور قومیت کے چکروں میں الجھا کر اختلافات کی خلیج پیدا کر دی جائے اور یوں Divide and Rule ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کے اصول پر انہیں الگ الگ کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے غلام اور خدّام بنا لیا جائے۔

وقت آ گیا ہے کہ سارا عالمِ اسلام ''سب سے پہلے اسلام'' پر متحد ہو کر مشترکہ لائحہ عمل اختیار کرے اور کفر کی یلغار کے آگے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائے۔

واللہ المستعان و علیه التکلان

مصنف کی تحریری کاوشیں

① شوقِ عمل، ارکانِ اسلام کی ترغیب، قرآنِ مجید اور صحیح احادیث کی روشنی میں (مطبوع)
② سیاحتِ امت المعروف بہ شوقِ جہاد، قرآن اور معتبر احادیث کی روشنی میں (مطبوع)
③ مظلوم صحابیات رضی اللہ عنہن (مطبوع)
④ فتاویٰ افکارِ اسلامی (مطبوع)
⑤ خوش نصیبی کی راہیں (طریق الهجرتین از امام ابن قیم کا ترجمہ اور تلخیص وتعلیق) (مطبوع)
⑥ جہنم اور جہنمیوں کے احوال (النار حالها و احوال اهلها کا ترجمہ وتعلیق) (مطبوع)
⑦ جنت میں خواتین کے لیے انعامات (احوال النساء فی الجنة کا ترجمہ وتعلیق) (مطبوع)
⑧ غسل، وضو اور نماز کا طریقہ، مع قرآنی دعائیں اور اذکار (الوضوء و الغسل و الصلاة از شیخ محمد بن صالح العثیمین کا ترجمہ وتعلیق) (مطبوع)
⑨ بدعات کا انسائیکلوپیڈیا (قاموس البدع کا ترجمہ واستدراکات) (مطبوع)
⑩ مقامِ قرآن (تالیف: میاں انوار اللہ، راقم الحروف) (مطبوع)
⑪ انسان اور قرآن (تالیف: میاں انوار اللہ، راقم الحروف) (زیرِ طبع)
⑫ علومِ اسلامیہ (نصابی کتاب) (تالیف: پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد اسرائیل فاروقی، راقم الحروف) (مطبوع)
⑬ اسلامی تعلیمات (نصابی کتاب) (پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد اسرائیل فاروقی، راقم الحروف) (مطبوع)
⑭ سجدۂ تلاوت کے احکام اور آیاتِ سجدہ کا پیغام (زیرِ طبع)
⑮ تفسیر مجمع النکات (زیرِ طبع)
⑯ تفسیر میں عربی لغت سے استدلال کا منہج (علومِ اسلامی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ) (زیرِ طبع)
⑰ صداقتِ نبوتِ محمدی (دلائل النبوة از ڈاکٹر منقذ بن محمود السقار کا ترجمہ وتعلیق) (زیرِ طبع)
⑱ اسلام کے بنیادی عقائد ونظریات اور اعمال و آداب، شرح اربعین نووی (زیرِ طبع)
⑲ فرقہ پرستی کے اسباب اور ان کا حل (الافترق۔ اسبابها و علاجها کا ترجمہ وتعلیق) (زیرِ طبع)
⑳ دنیا ڈھلتی چھاؤں (الدنیا ظل زائل کا ترجمہ) (زیرِ طبع)
㉑ التأثیر الاسلامی فی شعر حالی الأردی (عربی زبان و ادب میں مقالہ برائے ایم اے / ایم فل) (عربی) (زیرِ طبع)

۳۱۰ سوالات کے
جوابات
فتاویٰ افکارِ اسلامی